جاوید احمد غامدی

البیان

ق ۔ الناس

۵۰ — ۱۱۴

۵

البیان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست

باب ششم

باب ہفتم

باب ششم

ق ۔ التحریم

قیامت کا اثبات،
اُس کے حوالے سے قریش کو انذار و بشارت
اور مسلمانوں کا تزکیہ و تطہیر

باب ششم

ق - التحریم

۵۰ —— ۶۶

یہ قرآن مجید کا چھٹا باب ہے۔ اِس میں 'ق' (۵۰) سے 'التحریم' (۶۶) تک سترہ سورتیں ہیں۔ اِن سورتوں کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن میں سے پہلی سات سورتیں ام القریٰ مکہ میں اور آخری دس ہجرت کے بعد مدینہ میں نازل ہوئی ہیں۔

قرآن مجید کے دوسرے ابواب کی طرح یہ چیز اِس باب میں بھی ملحوظ ہے کہ یہ مکی سورتوں سے شروع ہوتا اور مدنیات پر ختم ہو جاتا ہے۔

اِس کے مخاطب مکی سورتوں میں قریش مکہ اور مدنیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ماننے والے ہیں۔ اہل کتاب اُنھی کے ضمن میں زیر بحث آئے ہیں۔ مکی سورتوں میں اِس لیے کہ اُن کے زمانۂ نزول میں وہ بھی قریش کی حمایت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے لیے میدان میں آچکے تھے، اور مدنیات میں اِس لیے کہ مسلمانوں کے اندر منافقین کے بعض گروہ اُنھی کے زیر اثر تھے۔

اِس کا موضوع قیامت کا اثبات، اُس کے حوالے سے قریش کو انذار و بشارت اور مسلمانوں کا تزکیہ وتطہیر ہے۔ اللہ و رسول کے لیے تسلیم واطاعت کے تقاضے اِسی تزکیہ و تطہیر کے ذیل میں اور اُس وقت کی صورت حال کے لحاظ سے بیان ہوئے ہیں۔

ق - الذاريات

٥٠ ــــــ ٥١

ق - الذاریات

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ دونوں کا موضوع اثبات قیامت اور اُس کے حوالے سے انذار و بشارت ہے۔ دوسری سورہ میں اثبات قیامت کے تاریخی دلائل، البتہ پہلی سورہ کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ اِس کے ساتھ قرآن کے انذار عذاب کو بھی ثابت کیا گیا ہے۔ دونوں میں خطاب قریش سے ہے اور اِن کے مضمون سے واضح ہوتا ہے کہ ام القریٰ مکہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ انذار عام میں نازل ہوئی ہیں۔

دونوں سورتوں کا خاتمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی کے مضمون پر ہوا ہے۔

سورۃ ق

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

قٓ ۚ وَالۡقُرۡاٰنِ الۡمَجِيۡدِ ۚ ۞ ① بَلۡ عَجِبُوۡۤا اَنۡ جَآءَهُمۡ مُّنۡذِرٌ مِّنۡهُمۡ فَقَالَ الۡكٰفِرُوۡنَ هٰذَا شَىۡءٌ عَجِيۡبٌ ۚ ② ءَاِذَا مِتۡنَا وَكُنَّا

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورۂ 'ق' ہے[۱]۔ قرآن مجید (آپ ہی اپنا) گواہ ہے[۲]۔ نہیں، اِن کے جھٹلانے کی وجہ وہ نہیں ہے جو یہ ظاہر کر رہے ہیں، بلکہ اِنھیں تعجب اِس بات پر ہوا ہے کہ (روز قیامت کے لیے) ایک خبردار کرنے والا خود اِنھی کے اندر سے اِن کے پاس آ گیا ہے۔ چنانچہ اِن منکروں نے کہا ہے کہ یہ بڑی عجیب بات ہے۔ کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو

---

[۱] اِس نام کے معنی کیا ہیں؟ اِس کے متعلق ہم نے اپنا نقطۂ نظر سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱ کے تحت تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

[۲] اصل میں 'وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'و' قسم کے لیے ہے اور اِن کا مقسم علیہ محذوف ہے، اِس کی وجہ یہ ہے کہ کلام کے سیاق و سباق سے وہ خود واضح ہو جاتا ہے۔ قرآن میں اِس طرح کی قسمیں بطور شہادت آتی ہیں۔ لفظ 'الْمَجِيْد' قرآن میں اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر بھی آیا ہے اور قرآن کی صفت کے طور پر بھی۔ اِس کے معنی بزرگ، بلند مرتبہ اور صاحب عظمت کے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...ہر کلام متکلم کی صفات کا مظہر ہوتا ہے۔ اِس وجہ سے جس طرح اللہ تعالیٰ بزرگ و برتر ہے، اُسی طرح اُس کا کلام بھی بزرگ و برتر ہے اور یہ برتری و بزرگی قرآن کی ایک ایک آیت سے نمایاں ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ کوئی صاحب ذوق قرآن کو سنے یا پڑھے اور اُس کی عظمت و

تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ﴿۳﴾
قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ﴿۴﴾
بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ﴿۵﴾

جائیں گے تو دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟ یہ واپسی تو بڑی بعید ہے[۳]۔ ۱-۳

(ہمارے علم کو بھی یہ اپنے لحاظ سے دیکھتے ہیں، دراں حالیکہ) اِن کے جسموں سے زمین جو کچھ کھاتی ہے، وہ سب ہم نے جان رکھا ہے اور ہمارے پاس وہ کتاب بھی ہے جو ہر چیز کو محفوظ رکھتی ہے[۴]۔ نہیں، (وہ بات نہیں، جو یہ کہہ رہے ہیں)، بلکہ اِنھوں نے

ق
۵۰

شوکت سے متاثر و مرعوب نہ ہو۔ اگر کوئی اُس کی عظمت و جلالت سے متاثر نہ ہو تو وہ یا تو نہایت ہی بلید ہے یا اُس کا دل بالکل سیاہ ہو چکا ہے۔ آدمی تو درکنار اگر یہ قرآن پہاڑوں پر بھی اتارا جاتا تو وہ بھی، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے، اللہ تعالیٰ کی خشیت سے پاش پاش ہو جاتے۔''

(تدبر قرآن ۷/۵۳۳)

۳؎ اِس جملے کی ابتدا لفظ 'بَلْ' سے ہوئی ہے۔ یہ اِس بات پر دلیل ہے کہ اِس سے پہلے نفی کا ایک جملہ مقدر ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُس کو کھول دیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ قرآن سے اِن کے فرار کا باعث یہ نہیں ہے کہ یہ فی الواقع اُس کو شاعری، کہانت، سحر و ساحری یا القاے شیطانی کے قسم کی کوئی چیز سمجھتے ہیں اور اِس بات پر دل سے مطمئن ہو گئے ہیں کہ یہ خدا کا کلام نہیں ہے، بلکہ اِس کا باعث اِن کا استکبار ہے کہ یہ اپنے ہی اندر کے ایک شخص کو خدا کا بھیجا ہوا رسول ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ یہ قرآن کے بھی منکر ہو گئے ہیں اور قیامت کے بارے میں بھی کہتے ہیں کہ یہ تو بالکل ہی بعید از قیاس چیز ہے۔ آخر مرنے اور مر کر مٹی ہو جانے کے بعد کوئی شخص دوبارہ کس طرح زندہ ہو سکتا ہے؟

۴؎ یعنی ایک تو ہمارا ذاتی علم ہے جو ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے، دوسرے تمام مخلوقات کا ریکارڈ محفوظ کرنے کے لیے ہم نے ایک دفتر بھی قائم کر رکھا ہے جس میں روح و جسم سے

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝٦ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا

حق کو جھٹلایا ہے، جب کہ وہ اِن کے پاس آ گیا ہے۔[5] اِس لیے اب یہ الجھن میں پڑے ہوئے ہیں۔[6] ۴-۵

(یہ نہیں مانتے) تو کیا اِنھوں نے اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھا؟ ہم نے کس طرح اُس کو بنایا اور اُس کو سنوارا ہے اور اُس میں کہیں کوئی رخنہ نہیں ہے۔ اور زمین کو ہم نے بچھایا

ق ۵۰

متعلق تمام معلومات اُن کے جزئیات کے ساتھ درج کر دی گئی ہیں۔ انسان کے منتشر اجزا کو اکٹھا کر کے اُسے دوبارہ زندہ کر دینے اور اُس کے اقوال و افعال کا محاسبہ کرنے میں ہمیں کوئی دشواری آخر کس طرح پیش آ سکتی ہے؟

۵ مطلب یہ ہے کہ اِن کے جھٹلانے کی وجہ وہ شبہات نہیں ہیں جو یہ قیامت کے بارے میں پیش کر رہے ہیں، بلکہ ضد اور ہٹ دھرمی ہے۔ چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ اِنھوں نے جانتے بوجھتے ایک صریح حق کو جھٹلایا ہے اور وہ بھی اُس وقت، جب وہ قرآن مجید کی صورت میں بالکل واضح طریقے سے اِن کے سامنے آ گیا ہے۔

۶ یعنی ایک بات کو مانتے اور اُسی وقت اُس کے کسی بدیہی تقاضے کا انکار کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ایسی الجھن میں مبتلا ہو گئے ہیں جس سے نکلنے کی کوئی راہ اِن کو سجھائی نہیں دے رہی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...انسان کی گم راہی میں سب سے زیادہ دخل اُس کے اِسی تضاد فکر کو ہے۔ یا تو وہ اپنی سہل انگاری کے سبب سے رطب و یابس، ہر قسم کے نظریات اپنے ذہن میں جمع کر لیتا ہے یا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں صحیح نظریات و عقائد کے ساتھ باطل نظریات بھی جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُس کی زندگی مجموعۂ اضداد بن جاتی ہے۔ اگر انسان اپنے افکار کا برابر جائزہ لیتا رہے، تنقید کی صلاحیت مردہ نہ ہونے دے اور خواہشات نفس کی

فِيهَا مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ﴿٧﴾ تَبْصِرَةً وَّذِكْرَىٰ لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ ﴿٨﴾ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُّبَٰرَكًا فَأَنبَتْنَا بِهِ جَنَّٰتٍ وَحَبَّ الْحَصِيدِ ﴿٩﴾ وَالنَّخْلَ بَاسِقَٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيدٌ ﴿١٠﴾ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ

اور اُس میں پہاڑ جمائے اور ہر قسم کی خوش منظر چیزیں اُس میں اگا دیں، ہر اُس بندے کی بصیرت اور یاددہانی کے لیے جو توجہ کرنے والا ہو[7]۔ اور آسمان سے ہم نے برکتوں والا پانی برسایا[8]، پھر اُس سے باغ اور فصلیں اگائیں جو کاٹ لی جاتی ہیں[9] اور کھجوروں کے بلند و

پیروی میں حق کے ساتھ باطل کا جوڑ ملانے کی کوشش نہ کرے تو وہ شیطان کے اِس فتنے سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ لیکن ایسے لوگ کم ہوتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۷/۵۳۸)

۷۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اُس عظیم قدرت و حکمت کی طرف توجہ دلائی ہے جو زمین و آسمان کے ہر حصے اور ہر گوشے سے نمایاں ہے اور جسے ہر صاحب بصیرت کھلی آنکھوں کے ساتھ دیکھ سکتا ہے۔ اِس کے لیے دو لفظ استعمال ہوئے ہیں: ایک 'تَبْصِرَة' اور دوسرے 'ذِکْرٰی'۔ استاذ امام نے اِن کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''...'تَبْصِرَة' سے مراد آنکھوں کے اندر بصیرت پیدا کرنا ہے کہ وہ ظاہر سے گزر کر اُس حقیقت تک پہنچ سکیں جس کی طرف ظاہر رہنمائی کر رہا ہے۔ اور 'ذِکْرٰی' سے مراد غفلت کے حجاب کو دور کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کے چپہ چپہ کو ایسے عجائب اور کرشموں سے بھر دیا ہے جو آنکھوں کے پردے اٹھانے اور دلوں کے جھنجھوڑنے اور جگانے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن یہ کرشمے اُن پر کارگر ہوتے ہیں جن کے اندر اثر پذیری کی حس موجود ہو۔ جو لوگ اپنی محسوس پرستی کی وجہ سے اپنی یہ حس لطیف مردہ کر چکے ہوں، اُن کے لیے یہ ساری کائنات ایک عالم ظلمات ہے۔'' (تدبر قرآن ۷/۵۳۹)

۸۔ اصل میں 'مَآءً مُّبٰرَکًا' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اِن میں 'مُبٰرَکًا' کی صفت بارش کی اُس فیض بخشی کو نمایاں کرنے کے لیے آئی ہے جو لوگوں کے لیے زرخیزی اور شادابی کا باعث

وَ اَحۡيَيۡنَا بِهٖ بَلۡدَةً مَّيۡتًا ؕ كَذٰلِكَ الۡخُرُوۡجُ ﴿۱۱﴾
كَذَّبَتۡ قَبۡلَهُمۡ قَوۡمُ نُوۡحٍ وَّ اَصۡحٰبُ الرَّسِّ وَ ثَمُوۡدُ ﴿۱۲﴾ وَ عَادٌ وَّ فِرۡعَوۡنُ وَ اِخۡوَانُ لُوۡطٍ ﴿۱۳﴾ وَّ اَصۡحٰبُ الۡاَيۡكَةِ وَ قَوۡمُ تُبَّعٍ ؕ كُلٌّ

بالا درخت اگا دیے جن میں تہ بر تہ خوشے لگتے ہیں[10]، بندوں کی روزی کے لیے[11]۔ اور مردہ زمین کو ہم نے اِسی پانی سے زندہ کر دیا۔ (مرنے والوں کا زمین سے) نکلنا بھی اِسی طرح ہوگا۔ ۶-۱۱

اِن سے پہلے نوح کی قوم، اصحاب الرس[12]، ثمود اور عاد اور فرعون[13] اور لوط کے بھائیوں

بنتی ہے۔

۹؎ یہ اہتمام ربوبیت کے اِس پہلو کی طرف اشارہ ہے کہ یہ فصلیں صرف پکنے کے وقت ہی کام نہیں آتیں، بلکہ کاٹ کر ذخیرہ کر لی جاتی ہیں اور اِس کے بعد برابر کام آتی رہتی ہیں۔

۱۰؎ باغوں اور فصلوں کے بعد کھجوروں کا ذکر بطور خاص فرمایا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...یہ عام کے بعد خاص کا ذکر اِس لیے ہوا کہ عرب کا خاص میوہ یہی تھا جو اُن کے لیے بہترین پھل بھی تھا اور بڑی حد تک اُن کی غذائی ضرورت بھی پوری کرتا تھا۔ اِس کی دراز قامتی اور اِس کے تہ بہ تہ خوشوں کی طرف اشارہ مخاطب کے اندر مشاہدۂ کائنات کی حس اور شکر گزاری کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے ہے کہ وہ قدرت کی اِن نشانیوں کو دیکھے اور اِن سے وہ اثر لے جو ایک حساس اور بیدار دل کو لینا چاہیے۔“ (تدبر قرآن ۷/۵۴۱)

۱۱؎ قدرت و حکمت کے بعد اب ربوبیت کے پہلو کو نمایاں کیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ جس پروردگار کی قدرت، حکمت اور پروردگاری کی یہ شانیں وہ دیکھ رہے ہیں، اُس کے لیے کیا مشکل ہے کہ اِن کی موت کے بعد اِنھیں دوبارہ اٹھا کھڑا کرے؟ اور وہ کیوں ایسا نہ کرے اور اِن سے اپنی نعمتوں کا حساب کیوں نہ لے، جب کہ اِن کی پرورش کے لیے اُس نے یہ غیر معمولی اہتمام کیا ہے۔

كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيۡدِ ﴿۱۴﴾ اَفَعَيِيۡنَا بِالۡخَلۡقِ الۡاَوَّلِ ؕ بَلۡ هُمۡ فِىۡ لَبۡسٍ مِّنۡ خَلۡقٍ جَدِيۡدٍ ﴿۱۵﴾
وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ وَنَعۡلَمُ مَا تُوَسۡوِسُ بِهٖ نَفۡسُهٗ ۚۖ وَنَحۡنُ

اور ایکہ والوں اور تبع کی قوم نے بھی اِسی طرح جھٹلایا تھا۔ ہر ایک نے میرے رسولوں کو جھٹلایا تو (دیکھ لو کہ) میری وعید اُن پر واقع ہو کر رہی[۱۴]۔ (اِن سے پوچھو)، پھر کیا ہم پہلی مرتبہ تخلیق سے عاجز رہے؟ نہیں، (اِن میں سے کوئی یہ کہنے کی جسارت نہیں کر سکتا)، بلکہ از سر نو پیدا کیے جانے کے بارے میں یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں[۱۵]۔ ۱۲-۱۵

ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اُس کے دل میں جو وسوسے گزرتے ہیں، اُنھیں

۱۲؎ یہ عرب کی اقوام بائدہ میں سے کسی قوم کا حوالہ ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول بھیجا اور اُس کو جھٹلانے کی پاداش میں اُس قوم پر اپنا عذاب نازل کر دیا۔

۱۳؎ قوم فرعون کے بجائے یہ تنہا فرعون کا ذکر اِس لیے ہوا ہے کہ اصل مجرم کی حیثیت درحقیقت اُسے ہی حاصل تھی۔

۱۴؎ یہ اُس سنت الٰہی کا حوالہ ہے جو رسولوں کے ذریعے سے اتمام حجت کے بعد لازماً ظہور میں آجاتی ہے۔

۱۵؎ یہ جملہ طنزیہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...مطلب یہ ہے کہ جب یہ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ پہلی بار پیدا کرنے میں ہم کو کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی تو دوبارہ کیوں رکاوٹ پیش آئے گی؟ اِن لال بجھکڑوں سے کوئی پوچھے کہ کسی چیز کو پہلی بار بنانا مشکل ہوتا ہے یا دوسری بار! اگر ایک نقاش نقش ثانی نقش اول کے مقابل میں زیادہ بہتر کھینچ سکتا ہے تو ہم دنیا کو از سر نو زیادہ آسانی سے کیوں نہیں پیدا کر سکتے!“

(تدبر قرآن ۷/۵۴۳)

اَقۡرَبُ اِلَیۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ ﴿۱۶﴾
اِذۡ یَتَلَقَّی الۡمُتَلَقِّیٰنِ عَنِ الۡیَمِیۡنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِیۡدٌ ﴿۱۷﴾ مَا یَلۡفِظُ مِنۡ قَوۡلٍ اِلَّا لَدَیۡهِ رَقِیۡبٌ عَتِیۡدٌ ﴿۱۸﴾
وَجَآءَتۡ سَکۡرَۃُ الۡمَوۡتِ بِالۡحَقِّ ؕ ذٰلِکَ مَا کُنۡتَ مِنۡهُ تَحِیۡدُ ﴿۱۹﴾

بھی ہم جانتے ہیں اور ہم تو اُس کی رگ جاں سے بھی زیادہ اُس سے قریب ہیں[16]۔ ۱۶
اِنھیں یاد رکھنا چاہیے، جب دو لینے والے دائیں اور بائیں بیٹھے ہوئے لے رہے ہوتے ہیں[17]، انسان کی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکلتا، مگر ایک حاضر باش نگران اُس کے پاس موجود ہوتا ہے[18]۔ ۱۷-۱۸

(افسوس، تم لوگ انکار ہی کرتے رہے) اور موت کی جان کنی اُس حقیقت کے ساتھ آ پہنچی[19] (جس پر دنیا کی زندگی میں پردہ پڑا ہوا تھا[20])۔ یہ وہی چیز ہے جس سے

۱۶؎ مطلب یہ ہے کہ اقوال و افعال تو ایک طرف، انسان کے دل میں جو وسوسے پیدا ہوتے ہیں، ہم اُن کو بھی جانتے ہیں۔ ہمارا علم اور ہماری قدرت لوگوں کے ہر پہلو کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اُن کے ظاہر و باطن کی کوئی چیز ہم سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔

۱۷؎ اصل الفاظ ہیں: 'عَنِ الۡیَمِیۡنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِیۡدٌ'۔ اِن میں 'الۡیَمِیۡنِ' کے بعد 'قَعِیۡدٌ' کا لفظ عربیت کے عام قاعدے کے مطابق بہ تقاضاے ایجاز حذف کر دیا ہے۔

۱۸؎ یعنی اتمام حجت کے لیے یہ مزید اہتمام بھی ہم نے کر رکھا ہے کہ دو فرشتے انسان کے دائیں اور بائیں مقرر کر دیے ہیں تاکہ اُس کے نیک و بد، تمام اقوال و اعمال کا ریکارڈ وہ ہماری عدالت کے لیے تیار رکھیں۔

۱۹؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَجَآءَتۡ سَکۡرَۃُ الۡمَوۡتِ بِالۡحَقِّ'۔ ماضی کا صیغہ یہاں اور اِس سے آگے کی آیتوں میں اظہار قطعیت اور قیامت کے منظر کو نگاہوں کے سامنے مصور کر دینے کے لیے

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ﴿۲۰﴾ وَجَاۗءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَاۗىِٕقٌ وَّشَهِيْدٌ ﴿۲۱﴾ لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاۗءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ﴿۲۲﴾ وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ ﴿۲۳﴾ اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۲۴﴾ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ

تم گریزاں رہے۔اور (وہ دیکھو) صور پھونکا گیا۔ یہ وہی دن ہے جس کی وعید ہم نے تمھیں سنائی تھی۔ ہر شخص حاضر ہو گیا ہے، اِس طرح کہ اُس کے ساتھ ایک ہانک کر لانے والا ہے اور ایک گواہی دینے والا۔ تم اِس دن سے غفلت میں رہے تو اب وہ پردہ ہم نے تم سے ہٹا دیا جو تمھارے آگے پڑا ہوا تھا۔ سو آج تو تمھاری نگاہ بہت تیز ہے[۲۱]۔ (ہماری عدالت برپا ہو گئی) اور اُس مجرم کے ساتھی (ہانکنے والے فرشتے) نے کہا[۲۲]: یہ جو میری تحویل میں تھا، حاضر ہے۔ حکم دیا گیا: تم دونوں جہنم میں جھونک دو[۲۳] ہر ناشکرے، مخالف،

اختیار کیا گیا ہے۔

۲۰؎ یعنی قیامت، جس کی ابتدا موت کے ساتھ ہی ہو جاتی ہے۔ انسان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اُس کا انجام کیا ہوا اور آگے اُس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

۲۱؎ یہ مجرموں کی فضیحت کے لیے طنز کا جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس چیز کا امکان تمھیں دور دور تک نظر نہیں آتا تھا، آج دیکھ لو، وہ کس طرح بے نقاب ہو گئی ہے۔

۲۲؎ یہ بات ہانکنے والا فرشتہ بھی کہہ سکتا ہے اور شہادت دینے والا بھی۔ پیچھے دونوں کا ذکر ہے، لیکن ہم نے اِس سے ہانکنے والا فرشتہ اِس لیے مراد لیا ہے کہ مجرم اصلاً اُسی کے چارج میں ہو گا اور اُسی کی ذمہ داری ہو گی کہ وہ اُسے عدالت میں پیش کرے۔

۲۳؎ یہ محض حکم کا بیان ہے۔ اِس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہی دونوں اُسے جہنم میں ڈالیں گے۔ وہ اگر اُسے جہنم میں جھونکنے والے فرشتوں کے حوالے کر دیتے ہیں تو حکم کا منشا یقیناً پورا ہو

مُّرِيْبِ ۨ﴿۲۵﴾ الَّذِیْ جَعَلَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـھًا اٰخَرَ فَاَلْقِیٰہُ فِی الْعَذَابِ الشَّدِیْدِ ﴿۲۶﴾

خیر سے روکنے والے[۲۴]، حد سے بڑھنے والے، شک میں پڑے ہوئے کو،[۲۵] جس نے اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو خدا بنایا ہے۔[۲۶] سو ڈال دو اِس کو سخت عذاب میں[۲۷]۔ ۱۹-۲۶

جائے گا۔

۲۴۔ لفظ 'خَیْر' یوں تو نیکی اور بھلائی کے تمام کاموں کے لیے عام ہے، لیکن قرینہ موجود ہو تو یہ بالعموم اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی نیکی کے لیے آتا ہے۔

۲۵۔ اصل میں لفظ 'مُرِیْب' استعمال ہوا ہے۔ اِس کے معنی ہیں: وہ شخص جو شک میں مبتلا ہو۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... یوں تو یہ لفظ عام ہے۔ توحید یا آخرت جس باب میں بھی شک ہو، وہ اِس کے مفہوم میں داخل ہے، لیکن قرآن میں اِس کا معروف استعمال اُس شک کے لیے ہوا ہے جو قیامت کے بارے میں ہو، جو اِس سورہ میں موضوع بحث ہے۔ یہاں اِس صفت کا ذکر اُن تمام صفات کی اصل کی حیثیت سے ہوا ہے جو اوپر بیان ہوئی ہیں۔ قیامت کے باب میں شک ہی وہ چیز ہے جو آدمی کو ناشکرا، معاند، بخیل اور تعدی کرنے والا بناتا ہے۔ چنانچہ اِن تمام بیماریوں کے ذکر کرنے کے بعد اُس اصل بیماری کا پتا بھی دے دیا جس سے یہ تمام بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔"

(تدبر قرآن ۷/۵۵۲)

۲۶۔ یہاں اسلوب بدل دیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ شرک کا ذکر خاص اہتمام کے ساتھ کرنا پیش نظر ہے۔ عربیت کے جو اسالیب اِن آیات میں اختیار کیے گئے ہیں، استاذ امام نے اُن کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"... جب صفات کا ذکر حرف عطف کے بغیر ہو تو اِس کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ یہ تمام صفات موصوف میں بہ یک وقت موجود ہیں۔ ساتھ ہی یہ نکتہ بھی نگاہ میں رہے کہ یہاں صفات کے

قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۲۷﴾ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ﴿۲۸﴾ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۲۹﴾

اُس[۲۸] کے ساتھی (شیطان) نے کہا[۲۹]: پروردگار، اِس کو میں نے سرکش نہیں بنایا، بلکہ یہ خود ہی پرلے درجے کی گم راہی میں پڑا ہوا تھا[۳۰]۔ فرمایا: اب میرے سامنے جھگڑا نہ کرو، میں نے پہلے ہی تمھیں اپنی وعید سے آگاہ کر دیا تھا[۳۱]۔ میرے ہاں بات کبھی بدلی نہیں

ق
۵۰

بیان میں ترتیب فروع سے اصول کی طرف ہے۔ ناشکری اور بخل سے آغاز کیا ہے، انکار قیامت اور شرک پر ختم کیا ہے۔ اِس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ آدمی اگر قیامت کے باب میں مشتبہ اور شرک میں مبتلا ہو تو اُس کا کردار وہ بنتا ہے جو اِن آیات میں بیان ہوا۔‘‘

(تدبر قرآن ۷/۵۵۲)

۲۷؎ جہنم میں جھونک دو کا جو حکم اوپر دیا گیا ہے، یہ اُسی کی تاکید ہے۔ مجرم کی صفات کا حوالہ دینے کے بعد مزید شدت اور تاکید کے ساتھ فرمایا ہے کہ اِس کو جہنم کے سخت عذاب میں جھونک دو۔

۲۸؎ اِس سے آگے اب جہنم کے باڑے میں داخل ہونے کے بعد کا ماجرا بیان ہو رہا ہے۔

۲۹؎ یہ وہی شیطان ہے جس کے بارے میں سورۂ زخرف (۴۳) کی آیت ۳۶ میں فرمایا ہے کہ سنت الٰہی کے مطابق اُن لوگوں پر مسلط کر دیا جاتا ہے جو اللہ کی یاد سے غافل ہو جاتے ہیں۔

۳۰؎ شیطان نے یہ اِس بات کی دلیل بیان کی ہے کہ یہ شخص اگر اُس کی گرفت میں آیا تو اِس لیے کہ گم راہی سے اپنی محبت کی وجہ سے یہ سنت الٰہی کے مطابق اِس کا مستحق بن چکا تھا۔

۳۱؎ یہ اُس وعید کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر سورۂ اعراف (۷) کی آیات ۱۶-۱۸ میں ہوا ہے۔ اُس میں ابلیس نے چیلنج دیا ہے کہ اُسے مہلت ملی تو وہ بنی آدم کی اکثریت کو گم راہ کر کے چھوڑے گا۔ اِس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جن و انس میں سے جو تیری پیروی کریں گے، میں

یَوۡمَ نَقُوۡلُ لِجَہَنَّمَ ہَلِ امۡتَلَاۡتِ وَ تَقُوۡلُ ہَلۡ مِنۡ مَّزِیۡدٍ ﴿۳۰﴾ وَ اُزۡلِفَتِ الۡجَنَّۃُ لِلۡمُتَّقِیۡنَ غَیۡرَ بَعِیۡدٍ ﴿۳۱﴾ ہٰذَا مَا تُوۡعَدُوۡنَ لِکُلِّ

جاتی اور میں اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ہوں[۳۲]۔ ۲۷-۲۹

اُس دن کو یاد رکھو، جب ہم جہنم سے پوچھیں گے: کیا تو بھر گئی ہے؟ اور وہ جواب دے گی: کیا کچھ اور بھی ہے[۳۳]؟ اور جنت اُن لوگوں کے قریب لائی جائے گی جو خدا سے

بھی تیرے سمیت اُن سب کو جہنم میں بھر دوں گا۔

۳۲۔ اصل میں 'مَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں مبالغہ پر جو نفی آئی ہے، وہ مبالغہ فی النفی کے لیے ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔ یہ وہی بات ہے جو دوسرے مقامات میں 'اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظۡلِمُ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ'* (اللہ ذرّے کے برابر بھی کسی پر ظلم نہیں کرتا) اور 'اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظۡلِمُ النَّاسَ شَیۡئًا'** (اللہ لوگوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا) کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ اِس اسلوب کی مثالیں قرآن مجید اور کلام عرب، دونوں میں موجود ہیں۔

۳۳۔ یہ سوال و جواب صورت حال کی تعبیر بھی ہو سکتا ہے اور بیان واقعہ بھی۔ مدعا یہ ہے کہ جس جوش غضب کے ساتھ اللہ تعالیٰ سوال کرے گا، اِسی جوش کے ساتھ جہنم بھی جواب دے گی کہ اور بھی ہوں تو لے آیئے، میرے اندر بڑی وسعت ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''یہ سوال و جواب اللہ تعالیٰ کی بے نیازی اور اُس کے بے پایاں غضب کی تصویر ہے کہ دوزخیوں کو دوزخ میں بھرتے ہوئے ذرا بھی اُس کو تردد لاحق نہیں ہو گا، بلکہ وہ پوری بے نیازی سے سب کو جہنم میں پھنکوا دے گا اور پھر جہنم سے پوچھے گا کہ کیوں تیرا پیٹ اچھی طرح بھر گیا یا نہیں؟ مطلب یہ ہے کہ کوئی اِس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اتنی بے شمار خلقت کو جہنم میں جھونکنے کے بعد اللہ تعالیٰ کو کچھ تاسف ہو گا کہ اپنی پیدا کی ہوئی اتنی مخلوق کو میں نے آگ میں جھونک دیا، بلکہ

*النساء ۴: ۴۰۔

**یونس ۱۰: ۴۴۔

اَوَّابٍ حَفِيۡظٍ ﴿۳۲﴾ مَنۡ خَشِیَ الرَّحۡمٰنَ بِالۡغَیۡبِ وَجَآءَ بِقَلۡبٍ مُّنِیۡبِ ﴿۳۳﴾

ڈرنے والے ہیں اور وہ کچھ زیادہ دور نہ ہوگی۔[۳۴] یہی وہ چیز ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، ہر اُس شخص کے لیے جو بہت رجوع کرنے والا اور اپنے پروردگار کے حدود کی حفاظت کرنے والا تھا،[۳۵] جو بن دیکھے رحمٰن سے ڈرتا تھا[۳۶] اور ایسا دل لے کر حاضر ہوا

اُس کے جوش غضب کا یہ حال ہوگا کہ اور بھی ہوں تو اُن کو بھی وہ جہنم کا ایندھن بنا دے۔"
(تدبر قرآن ۷/۵۵۷)

۳۴۔ یعنی جنت ایک پیش کش کی طرح اُن کے سامنے لائی جائے گی، دراں حالیکہ وہ کچھ زیادہ دور نہ ہوگی، مگر اُن کی عزت افزائی کے لیے مزید قریب لا کر اُنھیں پیش کر دی جائے گی۔ اِس کے لیے 'غَیۡرَ بَعِیۡدٍ' کے جو الفاظ اصل میں آئے ہیں، وہ ہمارے نزدیک 'اَلۡجَنَّۃ' سے حال واقع ہوئے ہیں۔

۳۵۔ اصل الفاظ ہیں: 'هٰذَا مَا تُوۡعَدُوۡنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيۡظٍ'۔ اِن میں 'هٰذَا' سے اشارہ اُسی جنت کی طرف ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے، مگر یہ علیٰ سبیل التاویل مذکر اِس لیے آ گیا ہے کہ اِس سے مراد یہاں صلہ اور انعام ہے۔ 'مَا تُوۡعَدُوۡنَ' میں عربیت کے قاعدے کے مطابق ایک فعل ناقص حذف ہو گیا ہے، یعنی 'مَا كُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ'۔ مطلب یہ ہے کہ اِس کردار کے لوگ ہوں گے جو دوزخ والوں کے مقابلے میں جنت کے مستحق ٹھیریں گے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اِن دونوں صفتوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اِن میں سے ایک کا تعلق دل سے ہے اور دوسری کا تعلق عمل سے۔ اگر آدمی کا دل زندہ و بیدار ہو تو زندگی کے تمام ہنگاموں کے اندر اُس کا دل برابر اپنے رب کی طرف رجوع رہتا ہے۔ کسی وقت بھی اُس پر ایسی غفلت یا سرکشی کی حالت طاری نہیں ہوتی کہ اُسے خدا کے حدود و محارم کا بھی کچھ ہوش نہ رہے اور وہ اُن کو توڑ تاڑ کے رکھ دے۔ نفس کی کسی اکساہٹ کے باعث اگر اُس سے کبھی تجاوز صادر ہو جاتا ہے تو اُس کا دل فوراً متنبہ ہوتا ہے اور وہ توبہ و استغفار کے ذریعے سے پھر اپنے رویے کی اصلاح کر لیتا ہے۔" (تدبر قرآن ۷/۵۵۹)

ادْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ ﴿۳۴﴾ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ ﴿۳۵﴾

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ ؕ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿۳۶﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ

ہے جو (خدا کی طرف) متوجہ رہتا تھا۔[۳۷] جاؤ، ہماری جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ یہ ہمیشہ رہنے کا دن ہے اور اُنھیں وہاں جو چاہیں گے، ملے گا اور ہمارے پاس مزید بھی ہے۔ ۳۰-۳۵

(یہ[۳۸] خبردار ہو جائیں)، اِن سے پہلے کتنی ہی قومیں ہم نے ہلاک کی ہیں جو قوت میں اِن سے کہیں بڑھ کر تھیں۔ سو (عذاب آیا تو) جدھر سینگ سمایا، اُن کے لوگ شہروں میں اُدھر ہی چل کھڑے ہوئے کہ ہے کوئی پناہ کی جگہ؟[۳۹] اِس میں اُن لوگوں کے لیے یقیناً بڑی

۳۶؎ قیامت اللہ تعالیٰ کی رحمت کا تقاضا ہے۔ یہاں صفت 'رحمٰن' کا حوالہ اِسی حقیقت کی طرف اشارے کے لیے آیا ہے۔ چنانچہ سورۂ انعام (۶) کی آیت ۱۲ میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے کہ وہ تمھیں ضرور قیامت کے دن جمع کر کے رہے گا۔

۳۷؎ یعنی رنج و راحت اور امید و بیم کی کوئی حالت بھی اُسے اپنے پروردگار سے منہ موڑنے پر آمادہ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ہر حال میں اُس سے لو لگائے رہتا تھا۔

۳۸؎ اِس سے آگے اب خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ قرآن کا عام انداز ہے کہ انذار کی سورتوں کے آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی کا مضمون ہوتا ہے۔ یہ اُسی کی تمہید ہے۔

۳۹؎ یہ اُس افراتفری، پریشانی اور سراسیمگی کی تصویر ہے جو عذاب دیکھنے کے بعد لوگوں میں پیدا ہوئی۔ اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اُن میں سے کچھ مارے گئے اور کچھ پناہ کی جگہ تلاش کر لینے

لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ ﴿۳۷﴾

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴿۳۸﴾ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ

ق ۵۰

یاددہانی ہے جو (سینوں میں) دل رکھتے ہوں یا کان لگا کر توجہ سے سنیں۔[۴۰] ۳۶-۳۷

(اِنھیں تعجب ہے کہ مرنے کے بعد یہ کس طرح اُٹھائے جائیں گے)؟ حقیقت یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں اور اُن کے درمیان کی چیزوں کو ہم نے چھ دن[۴۱] میں پیدا کر دیا تھا اور ہمیں کوئی تکان بھی لاحق نہیں ہوئی تھی۔[۴۲] سو جو کچھ یہ کہتے ہیں، اُس پر صبر کرو، (اے پیغمبر) اور

میں کامیاب ہو گئے۔

۴۰؎ یعنی اگر دل بیدار نہیں ہے تو کم سے کم اتنی بات تو ہو کہ کان لگا کر اور توجہ کے ساتھ سننے کے لیے تیار ہو جائیں۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"...یہ توجہ بھی انسان کے لیے بڑی خیر و برکت کا باعث ہے۔ اِس سے بھی بسا اوقات دل کی غفلت دور اور اُس کی عبرت پذیری کی صلاحیت زندہ ہو جاتی ہے، لیکن جو شخص ایسا بدقسمت ہو کہ نہ اُس کا دل ہی بیدار ہو اور نہ وہ کسی معقول آدمی کی بات سننے ہی کے لیے اپنے کان کھولنے پر آمادہ ہو تو ایسے آدمی کے اندر کوئی معقول بات کدھر سے راہ پائے گی؟" (تدبر قرآن ۷/ ۵۶۵)

۴۱؎ اصل میں لفظ 'اَيَّام' آیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے ایام ہیں جن کی مدت وہی جانتا ہے۔ اِنھیں زمین کے ایام نہیں سمجھنا چاہیے۔

۴۲؎ اِس جملے کا انداز طنزیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک مرتبہ پیدا کرنے کے بعد ہم تھک نہیں گئے کہ دوبارہ پیدا کرنے سے عاجز رہ جائیں گے۔ ہمارا دم خم اُسی طرح قائم ہے، جس طرح پہلے

قَبۡلَ طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ وَ قَبۡلَ الۡغُرُوۡبِ ﴿۳۹﴾ وَ مِنَ الَّیۡلِ فَسَبِّحۡہُ وَ اَدۡبَارَ السُّجُوۡدِ ﴿۴۰﴾

اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرتے رہو[۴۳]، سورج کے نکلنے اور اُس کے غروب ہونے سے پہلے[۴۴] اور رات میں بھی اُس کی تسبیح کرو اور سورج کے سجدہ ریز ہو جانے کے بعد بھی[۴۵]۔ ۳۸-۴۰

ق ۵۰

تھا۔ چنانچہ جب چاہیں گے، پورے عالم کو دوبارہ اٹھا کھڑا کریں گے۔ اِس میں ضمناً ایک لطیف تعریض بائیبل کے اُس ترجمے پر بھی ہے جس میں بیان ہوا ہے کہ خدا نے چھ دن میں زمین و آسمان بنائے اور ساتویں دن آرام کیا۔

۴۳؎ یہ ذکر کے پہلو سے نماز کی تعبیر ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...یہ ذکر دو عنصروں سے مرکب ہے: ایک 'تسبیح'، دوسرا 'حمد'۔ تسبیح میں تنزیہہ کا پہلو غالب ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کو اُن باتوں سے پاک اور منزہ قرار دینا جو اُس کی شان کے منافی ہیں۔ 'حمد' میں اثبات کا پہلو نمایاں ہے، یعنی اُس کو اُن صفات سے متصف قرار دینا جو اُس کے شایان شان ہیں۔ یہ نفی اور یہ اثبات، دونوں مل کر اللہ تعالیٰ کے صحیح تصور کو دل میں راسخ کرتے ہیں اور اِسی رسوخ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندے کا صحیح تعلق قائم ہوتا ہے جو تمام صبر و توکل کی بنیاد ہے۔ اگر اِن کے اندر کسی پہلو سے کوئی ضعف یا عدم توازن پیدا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے متعلق آدمی کا تصور غلط ہو جاتا ہے اور یہ غلطی اُس کے سارے نظام فکر و عمل کو بالکل درہم برہم کر کے رکھ دیتی ہے۔" (تدبر قرآن ۷/ ۵۶۷)

۴۴؎ یعنی فجر اور عصر کے وقت۔

۴۵؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَمِنَ الَّیۡلِ فَسَبِّحۡہُ وَاَدۡبَارَ السُّجُوۡدِ'۔ اِن میں 'مِنَ الَّیۡلِ فَسَبِّحۡہُ' کے الفاظ مقدم کیے گئے ہیں۔ اِس سے مقصود یہ ہے کہ دین میں اہمیت و عظمت کے لحاظ سے نمازوں

وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴿٤١﴾ يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ط ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ ﴿٤٢﴾ اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَ اِلَيْنَا

اور سنو، جس دن پکارنے والا قریب ہی سے پکارے گا،[۴۶] جس دن یہ (صور کی) چنگھاڑتی ہوئی آواز اُس (دن کی منادی) کے ساتھ سنیں گے جس کا آنا برحق ہے۔ وہ (زمین سے مردوں کے) نکلنے کا دن ہوگا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم ہی زندگی دیتے اور ہم

کی ترتیب واضح رہے۔ سورۂ طٰہٰ (۲۰) کی آیت ۱۳۰ میں بھی یہی اسلوب ہے۔ اِنھیں موخر کر دیجیے تو 'السُّجُوْد' کے بارے میں واضح ہو جاتا ہے کہ اِس کا الف لام پیچھے مذکور طلوع و غروب کے مضاف الیہ پر دلالت کے لیے ہے، یعنی 'اَدْبَارَ سُجُوْدِ الشَّمْس'۔ اِس سے مراد ظہر اور مغرب کی نمازیں ہیں۔ اِس لیے کہ سورج کے سجود کی ایک ابتدا اور ایک انتہا ہے۔ وہ جب سمت راس سے جھکتا ہے تو اُس کے سجود کی ابتدا ہوتی ہے اور غروب ہو جاتا ہے تو اپنے سجود کی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔

نماز کی یہ ہدایت صبر حاصل کرنے کی ایک تدبیر کے طور پر ہوئی ہے، اِس لیے کہ صبر کی توفیق جس کو بھی ہوتی ہے، اللہ کی مدد سے ہوتی ہے اور اللہ کی مدد حاصل کرنے کا واحد ذریعہ نماز ہے۔ اِس کے جو اوقات بیان ہوئے ہیں، وہ اگر غور کیجیے تو خدا کی عبادت اور قبولیت دعا کے لیے نہایت موزوں ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...شب و روز کے چوبیس گھنٹوں کے اندر جو اوقات اِس کائنات میں کسی بڑے تغیر کی علامت ہیں، جو عالم کے مصرف حقیقی کی عظمت و قدرت کی یاددہانی کرنے والے ہیں اور جن میں اِس کائنات کی دوسری نمایاں چیزیں بھی اپنے خالق کے آگے سرافگندہ ہوتی ہیں، وہی اوقات ہماری نمازوں کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔" (تدبر قرآن ۷/ ۵۶۷)

۴۶؎ یہ اِس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ آج تو یہ غافل اِسے بہت دور کی بات سمجھتے ہیں،

ق
۵۰

الْمَصِيْرُ ﴿۴۳﴾ يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ؕ ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ ﴿۴۴﴾

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ قف فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ﴿۴۵﴾

ہی مارتے ہیں اور (ایک دن سب کو) پلٹنا بھی ہماری ہی طرف ہے[۴۷]۔ اُس دن، جب زمین اِن کے اوپر سے کھل جائے گی، یہ تیزی سے نکل کر بھاگ رہے ہوں گے۔ (اِن کا) یہ حشر ہمارے لیے بہت آسان ہے۔ ۴۱-۴۴

(تم اِن کا غم نہ کرو، اے پیغمبر)، ہم جانتے ہیں جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں[۴۸] اور (یاد رکھو کہ) تم اِن پر کوئی داروغہ مقرر نہیں کیے گئے ہو۔ سو قرآن کے ذریعے سے یاددہانی کرو، اُنھیں جو میری تنبیہ سے ڈرتے ہوں۔ ۴۵

لیکن اُس دن یہی محسوس کریں گے کہ پکارنے والا گویا اِن کے کانوں میں پکار رہا ہے۔ قیامت کے بارے میں ایک عاقل کو جس طرح ہوشیار اور چوکنا رہنا چاہیے، یہ اُس کی صحیح تصویر ہے۔

۴۷؎ یعنی جب یہ حقیقت ہے کہ زندگی اور موت ہم ہی دیتے ہیں تو دوبارہ زندہ کر دینے کو مستبعد کیوں سمجھا جائے؟ ہم نہ صرف یہ کہ دوبارہ زندہ کریں گے، بلکہ اِس کے بعد پلٹنا بھی ہماری ہی طرف ہوگا۔ اِن کے مزعومہ شرکا و شفعا میں سے کوئی بھی وہاں اِن کا ملجا و ماویٰ نہ بن سکے گا۔

۴۸؎ مطلب یہ ہے کہ جانتے ہیں تو اِن سے نمٹیں گے بھی اور جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں، اُس کا خمیازہ بھی اِنھیں لازماً بھگتنا پڑے گا۔

ق ۵۰

سورۃ الذاریات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَ الذّٰرِیٰتِ ذَرۡوًا ﴿۱﴾ فَالۡحٰمِلٰتِ وِقۡرًا ﴿۲﴾ فَالۡجٰرِیٰتِ یُسۡرًا ﴿۳﴾ فَالۡمُقَسِّمٰتِ اَمۡرًا ﴿۴﴾ اِنَّمَا تُوۡعَدُوۡنَ لَصَادِقٌ ﴿۵﴾ وَّ اِنَّ الدِّیۡنَ

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

تند ہوائیں گواہی دیتی ہیں جو غبار اڑاتی ہیں[۴۹]، پھر (پانی سے لدے ہوئے بادلوں کا) بوجھ اٹھاتی ہیں[۵۰]، پھر نرمی کے ساتھ چلتی ہیں[۵۱]، پھر الگ الگ معاملہ کرتی ہیں[۵۲]۔ (یہ

۴۹؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَالذّٰرِیٰتِ ذَرۡوًا'۔ اِن میں 'ذَرۡوًا' تاکیدِ فعل کے لیے ہے۔ لفظ 'تند' سے ہم نے اِسی مفہوم کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ عربی زبان کا یہ خاص اسلوب ہے جسے اردو ترجمے میں منتقل کرنا آسان نہیں ہے۔

۵۰؎ اصل میں 'فَالۡحٰمِلٰتِ وِقۡرًا' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ اور اِس کے بعد کی دونوں صفتیں بھی ہواؤں کی ہیں، اِس لیے کہ 'ف' سے عطف ہوئی ہیں جو یہاں ترتیب پر دلالت کر رہا ہے۔

۵۱؎ یہ برسنے سے پہلے ہواؤں کی کیفیت بیان ہوئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...عام قاعدہ یہ ہے کہ پہلے تند اور غبار انگیز ہوائیں چلتی ہیں جو مختلف سمتوں سے بادلوں کو ہانک ہانک کر لاتی اور جس علاقے کو سیراب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے، اُس پر اُن کو تہ بہ تہ جما دیتی ہیں۔ پھر ہوا کی رفتار نرم ہو جاتی ہے اور مینہ برسنا شروع ہو جاتا ہے۔''

(تدبر قرآن ۷/۵۷۹)

۵۲؎ یعنی جہاں برسنا ہے، برستی ہیں اور جس علاقے کو نیم تشنہ اور خشک چھوڑنا ہوتا ہے، چھوڑ دیتی ہیں۔ اِسی طرح کسی قوم کے لیے ابر رحمت کی بشارت بنتی ہیں اور کسی کے لیے عذاب کا

لَوَاقِعٌ ﴿٦﴾ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ﴿٧﴾
اِنَّكُمْ لَفِیْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ﴿٨﴾ یُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ﴿٩﴾ قُتِلَ

گواہی دیتی ہیں) اور دھاریوں والا آسمان[۵۳] بھی کہ جس عذاب[۵۴] کی وعید تمھیں سنائی جا رہی ہے، وہ یقیناً سچ ہے اور جزا و سزا واقع ہو کر رہے گی[۵۵]۔ ۱-۷

یہ حقیقت ہے کہ تم لوگ ایک صریح تضاد میں مبتلا ہو[۵۶]۔ ہماری اِس وعید سے وہی

طوفان بلا خیز، جس کی زد میں جو آتا ہے، تباہ ہو جاتا ہے۔

۵۳؎ یہ اُس آسمان کی تصویر ہے جس میں بادلوں کے ٹکڑے تہ بر تہ موجوں اور تو بر تو روئی کے گالوں کی طرح بکھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہواؤں کے بعد یہ بادلوں کی گواہی اُسی مضمون کی تکمیل کے لیے ہے جو ہواؤں کی گواہی سے بیان کرنا مقصود ہے۔ ہوا اور بادلوں میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے۔ پچھلی قوموں کی تباہی میں شمال کی باد تند اور سرما کے سرخ دھاریوں والے بادلوں کو بڑا دخل رہا ہے۔ چنانچہ ہواؤں کی ہلاکت خیزی کو نمایاں کرنے کے لیے یہ اضافہ کر دیا ہے۔

۵۴؎ اِس سے مراد وہ عذاب ہے جو رسولوں کی تکذیب کے نتیجے میں اُن کی قوموں پر اِسی دنیا میں آ جاتا ہے۔

۵۵؎ یہ وہ بات ہے جس پر ہوا اور بادلوں کے عجائب تصرفات کی گواہی پیش کی گئی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں بارہا دیکھ چکے ہو کہ یہی ہوائیں بادلوں کو اٹھاتی اور سرکش قوموں پر ایسا طوفان بنا کر برساتی رہی ہیں کہ چشم زدن میں وہ خس و خاشاک کی طرح اڑ جاتی تھیں، اور یہی ہوائیں بہت سی قوموں کے لیے خدا کی رحمت و برکت اور دشمنوں سے اُن کی نجات کا ذریعہ بنتی رہی ہیں۔ لہٰذا بصیرت کی نگاہ ہو تو اب بھی دیکھ سکتے ہو کہ ہوا اور بادلوں کے ذریعے سے جزا و سزا کے یہ واقعات گواہی دے رہے ہیں کہ جس عذاب کی وعید تمھیں سنائی جا رہی ہے اور جس قیامت سے خبردار کیا جا رہا ہے، وہ آ کر رہیں گے۔

۵۶؎ یعنی ایک چیز کو مانتے ہو اور اُسی کے لوازم اور مقتضیات کو ماننے سے انکار کر دیتے ہو۔

الذاریات ۵۱

الْخَرّٰصُوْنَ ﴿۱۰﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ ﴿۱۱﴾ يَسْـَٔلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۱۲﴾ يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ﴿۱۳﴾ ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ ؕ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۱۴﴾

منہ موڑ سکتا ہے جس کی عقل الٹ دی گئی ہو[۵۷]۔ اِس کے بارے میں یہ اٹکل دوڑانے والے ہلاک ہوں[۵۸] جو غفلت کی نیند سوئے ہوئے ہیں، بالکل بے خبر ہیں[۵۹]۔ پوچھتے ہیں: روزِ جزا کب آئے گا[۶۰]؟ اُس دن آئے گا، جس دن یہ آگ پر تپائے جائیں گے[۶۱]۔ اب چکھو، اپنے اُس فتنے کا مزہ جس میں تم مبتلا رہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے تھے۔ ۸-۱۴

۵۷؎ یعنی جو صحیح طریقے سے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ہی سے محروم کر دیا گیا ہو۔ یہ ہدایت و ضلالت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ چنانچہ انسان جب اپنی عقل کو خواہشوں اور تعصّبات کا تابع بنا لیتا ہے تو اُسے وہ چیز بھی نظر نہیں آتی جس کی شہادت خود اُس کے وجود سے اور اُس کے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی کائنات کے ہر گوشے سے مل رہی ہو۔

۵۸؎ یعنی قیامت کو جھٹلانے کے لیے جن کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، بلکہ محض اٹکل کے گھوڑے ہیں جنھیں وہ فکر و خیال کی وادیوں میں دوڑاتے رہتے ہیں۔

۵۹؎ یہ قرآن نے وجہ بتائی ہے کہ اِن لوگوں نے خدا کی دی ہوئی روشنی کو چھوڑ کر اپنے قیاسات کو رہنما کیوں بنایا ہے۔ اِس کے لیے اصل میں 'اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'سَاهُوْنَ' خبر کے بعد دوسری خبر ہے جس سے اُن کی غفلت کا تسلسل ظاہر ہوتا ہے اور 'غَمْرَة' کا لفظ اُس غفلت کو بیان کرتا ہے جو خواہشاتِ نفس کی تاریکی میں گھر جانے کے بعد انسان پر طاری ہوتی ہے۔

۶۰؎ یعنی استہزا کے انداز میں پوچھتے ہیں کہ جس روزِ جزا سے ڈرا رہے ہو، وہ کہاں ہے؟ اُس

اِنَّ الۡمُتَّقِيۡنَ فِىۡ جَنّٰتٍ وَّعُيُوۡنٍ ﴿۱۵﴾ اٰخِذِيۡنَ مَاۤ اٰتٰهُمۡ رَبُّهُمۡ ؕ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا قَبۡلَ ذٰلِكَ مُحۡسِنِيۡنَ ﴿۱۶﴾ كَانُوۡا قَلِيۡلًا مِّنَ الَّيۡلِ مَا يَهۡجَعُوۡنَ ﴿۱۷﴾

پرہیزگار[۶۲] البتہ اُس دن باغوں اور چشموں میں ہوں گے[۶۳]۔ اُن کے پروردگار نے جو کچھ اُنھیں بخشا ہے[۶۴]، لے رہے ہوں گے[۶۵]۔ وہ اِس سے پہلے خوبی سے عمل کرنے

کا ظہور کب ہوگا؟

۶۱۔ تپانے کے لیے جو لفظ اصل میں آیا ہے، اُس کی بلاغت استاذ امام نے واضح فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"... یہاں 'یُفْتَنُوْنَ' سے دو معنوں کی طرف اشارہ ہو رہا ہے: ایک تو جلانے اور تپانے کے معنی کی طرف، دوسرے اِس حقیقت کی طرف کہ جس آگ پر یہ لوگ تپائے جائیں گے، یہ اُن شہوات و زخارف کی آگ ہوگی جن سے وہ دنیا میں آزمائے گئے اور جن کی محبت میں گرفتار ہو کر وہ جزا کے دن سے بے پروا ہوئے۔" (تدبر قرآن ۷/ ۵۸۶)

۶۲۔ اصل میں لفظ 'اَلْمُتَّقِيْنَ' آیا ہے۔ اِس سے یہاں خاص طور پر وہ لوگ مراد ہیں جو روز جزا سے بے پروا نہیں رہے، بلکہ ہمیشہ متنبہ رہے کہ ایک دن خدا کے حضور میں پیش ہو کر اپنے قول و فعل کا حساب دینا ہے۔

۶۳۔ یعنی باغوں اور چشموں میں گھرے ہوئے ہوں گے۔ اُن کے لیے ہر طرف نعمت ہی نعمت ہوگی۔

۶۴۔ یعنی بخش دیا ہے۔ اب وہ جس طرح چاہیں اور جب چاہیں، اُس سے متمتع اور محظوظ ہوں۔ اصل میں ماضی کا صیغہ اِسی مفہوم پر دلالت کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔

۶۵۔ اصل میں 'اٰخِذِيْنَ' کا لفظ آیا ہے۔ یہ حال واقع ہوا ہے اور تصویر حال کا فائدہ دے رہا ہے کہ وہ ہر گھڑی وہ کچھ پا رہے ہیں جو اُن کے پروردگار نے اُنھیں عطا فرمایا ہے۔

الذاریات ۵۱

وَبِالۡاَسۡحَارِ هُمۡ يَسۡتَغۡفِرُوۡنَ ﴿۱۸﴾ وَفِيۡۤ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ ﴿۱۹﴾

وَفِي الۡاَرۡضِ اٰيٰتٌ لِّلۡمُوۡقِنِيۡنَ ﴿۲۰﴾ وَفِيۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۲۱﴾ وَفِي السَّمَآءِ رِزۡقُكُمۡ وَمَا تُوۡعَدُوۡنَ ﴿۲۲﴾ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ

والے تھے۔ راتوں میں بہت کم سوتے تھے[۶۶] اور اُن کے آخری وقتوں میں (اپنے پروردگار سے) مغفرت مانگتے تھے[۶۷]، اور اُن کے مالوں میں حق تھا سائل اور محروم[۶۸] کے لیے۔ ۱۵-۱۹

(ہوا اور بادلوں ہی میں نہیں)، جو یقین کرنا چاہیں، اُن کے لیے زمین میں بھی نشانیاں ہیں[۶۹] اور تمھارے وجود میں بھی[۷۰]۔ پھر کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟ اور آسمان میں تو تمھارے

۶۶؎ اِس سے واضح ہے کہ شب بیداری اُن لوگوں کی خاص علامت ہے جو پرہیز گار اور خوبی سے عمل کرنے والے ہیں۔

۶۷؎ یعنی شب خیزی کے بعد جب سحر طلوع ہوتی ہے تو اپنے پروردگار سے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اِس سے معلوم ہوا کہ وہ نہ تو اِس بات کے متوقع ہوتے کہ اِس شب بیداری اور رکوع و سجود کے صلے میں اُن کو حضور و شہود کا کوئی بڑا مقام حاصل ہو گا اور نہ وہ اِس طرح کی کسی چیز کے طلب گار ہی بنتے، بلکہ اُن کی طلب صرف یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگذر فرمائے۔ چنانچہ اُن کی شب کی تمام عبادت و ریاضت کا اختتام استغفار پر ہوتا ہے۔“
>
> (تدبر قرآن ۷/ ۵۹۳)

۶۸؎ اِس سے مراد وہ محتاج ہیں جو اپنی خودداری کے باعث کسی مال دار کے دروازے پر سائل بن کر حاضر نہیں ہوتے۔ قرآن میں دوسری جگہ ہدایت فرمائی ہے کہ اِس طرح کے محتاجوں کی مدد کے لیے دینے والوں کو خود اُن کے پاس پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

وَالۡاَرۡضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثۡلَ مَاۤ اَنَّكُمۡ تَنۡطِقُوۡنَ ﴿۲۳﴾

لیے روزی بھی ہے[۷۱] اور وہ چیز بھی جس کی وعید تمھیں سنائی جا رہی ہے[۷۲]۔ سو قسم ہے آسمان و زمین کے پروردگار کی، اُس کا آنا یقیناً حق ہے اُسی طرح، جیسے تم بول دیتے ہو[۷۳]۔ ۲۰-۲۳

الذاریات ۵۱

۶۹؎ یعنی معاد اور روز جزا کی نشانیاں، جیسے بارش کے بعد مردہ زمین سے زندگی کی نمود اور انسان کے لیے ربوبیت کا غیر معمولی اہتمام جو تقاضا کرتا ہے کہ اُسے اُن نعمتوں کے لیے مسئول ٹھیرایا جائے جو اُسے دی گئی ہیں۔ اِسی طرح قوموں کی تباہی کے آثار اور ذریت ابراہیم کی دینونت جسے ہر شخص بچشم سر دیکھ سکتا ہے۔

۷۰؎ جیسے انسان کی ناتمامی، اُس کے اندر خیر و شر کا شعور اور عدل کامل کی غیر معمولی طلب اور نینداور بیداری میں زندگی، موت اور برزخ کے احوال جو ہر انسان پر شب و روز گزرتے ہیں۔

۷۱؎ یعنی بارش جو روزی کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہ مسبب بول کر اُس سے سبب کو مراد لیا ہے۔

۷۲؎ اِس سے مراد وہ عذاب ہے جو رسولوں کی تکذیب کے نتیجے میں لازماً آتا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے آیت کے استدلال کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یعنی یہ آسمان تو آئے دن تمھارے سامنے جزا و سزا کی شہادت دیتا رہتا ہے۔ اِسی کے اندر سے اللہ تعالیٰ تمھارا رزق بھی برساتا ہے اور اِسی کے اندر سے نافرمانی و سرکشی کرنے والوں پر جب چاہے، عذاب بھی برسا دیتا ہے۔ نہ رحمت کے لیے اُسے کوئی الگ اہتمام کرنا پڑتا اور نہ نقمت کے لیے کوئی الگ توپ نصب کرنا پڑتی۔ تو جس کا یہ جمال و جلال برابر دیکھتے ہو، اُس سے کیوں بعید سمجھتے ہو کہ وہ جب چاہے، اُسی چیز کو تمھاری تباہی کا ذریعہ بنا دے جو تمھاری زندگی کا ذریعہ ہے؟'' (تدبر قرآن ۷/ ۶۰۰)

۷۳؎ یہ اوپر کے پورے استدلال کو سمیٹ کر فرمایا ہے کہ آسمان و زمین بھی گواہ ہیں اور اُن کا پروردگار بھی کہ جس روز جزا کی یاددہانی تمھیں کی جا رہی ہے اور جس عذاب سے ڈرایا جا رہا ہے، وہ ہر حال میں واقع ہوں گے۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں، خدا کو اِس میں ذرا بھی مشکل پیش نہ آئے

هَلۡ اَتٰىكَ حَدِيۡثُ ضَيۡفِ اِبۡرٰهِيۡمَ الۡمُكۡرَمِيۡنَ ﴿۲۴﴾ اِذۡ دَخَلُوۡا عَلَيۡهِ فَقَالُوۡا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوۡمٌ مُّنۡكَرُوۡنَ ﴿۲۵﴾ فَرَاغَ اِلٰۤى

(اِس کی نشانیاں تاریخ میں بھی ہیں[۴۷])۔ تمھیں ابراہیم کے معزز مہمانوں کی حکایت پہنچی ہے[۵]؟ جب وہ اُس کے پاس آئے تو کہا: تم پر سلامتی ہو۔ اُس نے جواب دیا: تمھیں

گی۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ چشم زدن میں یہ اُسی طرح واقع ہو جائیں گے، جس طرح تم بول دیتے ہو۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...یہ تمثیل بھی ہمارے سمجھانے کے لیے محض ایک تمثیل ہے، ورنہ اصل حقیقت یہ ہے کہ ہمارے لیے ایک لفظ کو بولنا بھی اتنا آسان نہیں ہے، جتنا اللہ تعالیٰ کے لیے سارے جہان کو پیدا کر دینا۔ ہم ایک لفظ بولنے کے لیے نہ جانے کتنے ادوات وآلات کے محتاج ہیں جو سب کے سب خدا کے بخشے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کسی چیز کا بھی محتاج نہیں ہے۔" (تدبر قرآن ۷/ ۶۰۲)

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ جن نشانیوں کی طرف اِن آیتوں میں توجہ دلائی گئی ہے، اُن میں الاقرب فالاقرب کی ترتیب ہے۔ سب سے پہلے زمین، اُس کے بعد نفس اور آخر میں آسمان کی نشانیوں کی طرف متوجہ کیا ہے۔ نفس درمیان میں ہے اور اِسے درمیان ہی میں ہونا چاہیے، اِس لیے کہ ایک پہلو سے یہ زمین کی طرف رجحان رکھتا ہے اور دوسرے پہلو سے آسمان کی طرف۔ پھر اسی نفس سے ماخوذ ایک تمثیل سے استدلال کو مکمل کر دیا ہے، یعنی 'اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثۡلَ مَاۤ اَنَّكُمۡ تَنۡطِقُوۡنَ'۔

۴۷؎ سورہ کی ابتدا میں ہوا اور بادلوں میں نعمت و نقمت کی نشانیوں سے استدلال کیا ہے۔ اِسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے آگے تاریخ کے دلائل ہیں۔ اِن کی تمہید ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کے واقعے سے اٹھائی ہے۔ اِس میں دکھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جو فرشتے قوم لوط کے لیے عذاب لے کر آئے، اُنھی فرشتوں نے اپنی مہم میں پہلے ابراہیم علیہ السلام کو ایک ذی علم فرزند کی بشارت بھی دی۔ اِس واقعے کی یہی جامع حیثیت ہے جو مقتضی ہوئی کہ تمہید اسی سے اٹھائی جائے۔

اَهۡلِهٖ فَجَآءَ بِعِجۡلٍ سَمِيۡنٍ ﴿٢٦﴾ فَقَرَّبَهٗۤ اِلَيۡهِمۡ قَالَ اَلَا تَاۡكُلُوۡنَ ﴿٢٧﴾ فَاَوۡجَسَ مِنۡهُمۡ خِيۡفَةً ؕ قَالُوۡا لَا تَخَفۡ ؕ وَبَشَّرُوۡهُ بِغُلٰمٍ عَلِيۡمٍ ﴿٢٨﴾

بھی سلام ہے ـــــ کچھ اجنبی سے لوگ ہیں[6]! پھر نظر بچا کر[7] اپنے گھر والوں کے پاس گیا اور (اُن کے لیے) فربہ بچھڑے کا بھنا ہوا گوشت لایا[8] اور اُن کے آگے پیش کر دیا۔ (مگر اُنھوں نے ہاتھ نہیں بڑھایا)۔ اُس نے کہا: کیوں آپ کھاتے نہیں؟ پھر (اُن کے تردد کو دیکھ کر) اُس نے اپنے دل میں اُن سے کچھ اندیشہ محسوس کیا[9]۔ وہ بولے: ڈریے نہیں اور

۵ے اِس میں خطاب صیغۂ واحد سے ہے، لیکن یہ وہی اسلوب ہے جس میں مخاطب تو کوئی گروہ یا جماعت ہوتی ہے، مگر اُس کے ایک ایک فرد کو متوجہ کرنے کے لیے صیغۂ واحد سے خطاب کرتے ہیں۔ اصطلاح میں اِسے 'خطاب لغیر معین' کہا جاتا ہے۔ آیت میں استفہام کا اسلوب اِس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ مخاطبین بات کی اہمیت کو سمجھیں اور اُسے پوری توجہ سے سنیں۔

۶ے یہ الفاظ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے زبان سے نہیں، بلکہ اپنے دل میں کہے۔ اُنھیں تعجب ہو رہا تھا کہ اِس دیار میں یہ اجنبی لوگ کہاں سے آئے ہیں۔

۷ے شریف، فیاض اور کریم النفس میزبانوں کا یہی طریقہ رہا ہے۔ وہ مہمان کی نظر بچا کر ضیافت کا اہتمام اِس لیے کرتے ہیں کہ مہمان تکلفاً یہ نہ کہیں کہ اِس تکلیف کی کیا ضرورت ہے۔

۸ے اصل الفاظ ہیں: 'فَجَآءَ بِعِجۡلٍ سَمِيۡنٍ' (وہ فربہ بچھڑا لایا)۔ یہ اُسی طرح کا اسلوب ہے، جس طرح ہم کہتے ہیں کہ اُس نے مہمانوں کو مرغ کھلایا۔ چنانچہ سورۂ ہود (۱۱) کی آیت ۶۹ میں وضاحت ہے کہ یہ 'عِجۡلٍ حَنِيۡذٍ'، یعنی بھنا ہوا بچھڑا تھا۔

۹ے اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھانے سے حضرت ابراہیم سمجھ گئے کہ یہ فرشتے ہیں جو انسانی صورت میں آئے ہیں۔

فَاَقۡبَلَتِ امۡرَاَتُہٗ فِیۡ صَرَّۃٍ فَصَکَّتۡ وَجۡہَہَا وَ قَالَتۡ عَجُوۡزٌ عَقِیۡمٌ ﴿۲۹﴾
قَالُوۡا کَذٰلِکِ ۙ قَالَ رَبُّکِ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ الۡحَکِیۡمُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۳۰﴾ قَالَ فَمَا

اُسے ایک ذی علم فرزند کی بشارت دی۔[80] اُس کی بیوی یہ سن کر حیرانی کے عالم میں[81] آگے بڑھی، اپنا ماتھا پیٹا[82] اور بولی: بڑھیا بانجھ، اب جنے گی؟[83] اُنھوں نے کہا: تیرے پروردگار نے یہی کچھ فرمایا ہے۔ وہ بڑا حکیم و علیم ہے۔ ابراہیم نے پوچھا: پھر اے فرستادگان الٰہی،

۸۰؎ سورۂ ہود (۱۱) کی آیت ۷۱ میں تصریح ہے کہ یہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کی پیدایش کی بشارت تھی۔ اِس میں ذی علم کا لفظ اشارہ کرتا ہے کہ یہ فرزند نبی ہوگا۔

۸۱؎ اصل میں ’فِیۡ صَرَّۃٍ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ ’صر الفرس اذنیہ‘ سے نکلا ہوا محاورہ ہے جس سے تعجب اور حیرانی کی حالت کو ظاہر کرتے ہیں۔

۸۲؎ اصل الفاظ ہیں: ’فَصَکَّتۡ وَجۡہَہَا‘۔ عورتیں کسی بات پر اظہار تعجب کرنا چاہیں تو پیشانی پر ہاتھ مار کر بات کرنا اُن کا عام طریقہ ہے۔ یہ اُسی کا بیان ہے۔ غور کیجیے تو قرآن نے اِن دو لفظوں میں اُن کی حیرت اور خوشی کی پوری تصویر کھینچ دی ہے۔

۸۳؎ ابراہیم علیہ السلام کو یہ بشارت اتنی بلند آواز سے دی گئی کہ اُن کے پیچھے کھڑی ہوئی اُن کی بیوی نے بھی سن لی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اِس سے اُن کو جو حیرت اور ساتھ ہی جو خوشی ہوئی ہوگی، اُس کا اندازہ کون کرسکتا ہے! چنانچہ وہ یہ سنتے ہی اپنے تعجب کے اظہار کے لیے لپکیں اور خاص نسوانی انداز میں اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر بولیں کہ میں تو ایک بڑھیا بانجھ ہوں، کیا اب اِس عمر اور اِس حالت میں میں جنوں گی! حضرت سارہ کے اِس فقرے کے ایک ایک لفظ کے اندر جو حیرت، جو خوشی اور اِس بشارت کی تصدیق مزید کی جو خواہش جھلک رہی ہے، وہ محتاج بیان نہیں ہے۔“ (تدبر قرآن ۷/ ۶۰۹)

خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۲﴾ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ﴿۳۳﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۴﴾ فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۳۶﴾ وَتَرَكْنَا فِيْهَآ

تمھیں کیا مہم درپیش ہے؟ اُنھوں نے جواب دیا: ہمیں مجرموں کی ایک قوم کی[۸۴] طرف بھیجا گیا ہے کہ اُس پر سنگ گل برسا دیں جو تمھارے پروردگار کے ہاں اُن لوگوں کے لیے نشان زدہ ہیں[۸۵] جو حد سے بڑھے ہوئے ہوں۔ پھر اُس بستی سے ہم نے سب ایمان والوں کو نکالا تو وہاں ایک کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر نہیں پایا[۸۶]۔ (تب ہم نے

۸۴۔ سورۂ ہود (۱۱) کی آیت ۷۰ میں وضاحت ہے کہ اُنھوں نے قوم لوط کا نام بھی لیا تھا۔ یہاں نام کا ذکر اِس لیے حذف کر دیا ہے کہ پوری توجہ اِس بات پر رہے کہ قوم لوط کو جو کچھ بھگتنا پڑا، وہ اُن کے عمل کی سزا تھی۔

۸۵۔ یعنی جو پہلے سے اِس کام کے لیے محفوظ کیے گئے ہیں۔ اِنھیں ڈھونڈنے کے لیے کہیں دور نہیں جانا پڑے گا۔ تمھارے پروردگار کی بھیجی ہوئی تند و تیز آندھیاں اِنھی کے قدموں سے اِن پتھروں کو اُٹھائیں گی اور اِن پر برسا دیں گی۔ قرآن مجید کے دوسرے مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم لوط پر یہ عذاب اُسی غبار اڑاتی ہوا کے طوفان اور رعد و برق سے آیا جس کا ذکر سورہ کی ابتدا میں ہوا ہے۔

۸۶۔ اِس سے پہلے لفظ 'مُؤْمِنِيْن' اور یہاں 'مُسْلِمِيْن' استعمال ہوا ہے۔ اِس کی وجہ کیا ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اوپر والی آیت میں نجات کے باب میں سنت الٰہی بیان ہوئی ہے اور سنت الٰہی یہی ہے کہ عذاب سے نجات صرف سچے اہل ایمان ہی پاتے ہیں۔ اِس دوسری آیت میں علاقے کا

اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿٣٧﴾

وَفِيْ مُوْسٰۤى اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿٣٨﴾

فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿٣٩﴾ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ

پتھر برسا دیے) اور اُن لوگوں کے لیے (عبرت کی) ایک بڑی نشانی وہاں چھوڑ دی جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہوں۔[۸۷] ۲۴-۳۷

یہی نشانی موسیٰ کی سرگذشت میں بھی ہے، جب ہم نے اُس کو ایک واضح سند[۸۸] کے ساتھ فرعون کی طرف بھیجا تو اُس نے غرور سے منہ موڑا اور بولا: یہ جادوگر ہے یا کوئی خبطی ہے۔[۸۹] اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اُسے اور اُس کے لشکروں کو پکڑا اور اُنھیں سمندر

حال بیان ہوا ہے کہ ایک خاندان کے سوا وہاں مسلمانوں کا کوئی گھرانا سرے سے تھا ہی نہیں۔ اِس گھرانے کے لیے لفظ 'مُسْلِمِيْن' استعمال فرمایا جس میں وسعت ہے۔ اِس کے اندر پختہ اور خام، بالغ اور نابالغ، سب سما سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ ظاہری اعتبار سے حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی بھی اُس میں شامل تھی، لیکن آخری وقت میں وہ اُس سے خارج کر دی گئی۔''

(تدبر قرآن ۷/۶۱۲)

۸۷۔ یہ قریش کو توجہ دلائی ہے کہ قوم لوط کے مساکن ــــ سدوم اور عمورہ ــــ تمھاری گزرگاہوں پر ہیں۔ اِنھیں دیکھ لو کہ رسولوں کی تکذیب کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

۸۸۔ اشارہ ہے اُن غیر معمولی معجزات کی طرف جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے۔ یہ گویا اِس بات کی سند تھے کہ وہ پروردگار عالم کی طرف سے مامور ہو کر آئے ہیں۔

۸۹۔ یعنی جب معجزے دیکھے تو کہا جادوگر ہے اور جب دعوت سنی تو کہا کہ یہ تو کوئی دیوانہ ہے جو خدا کا پیغمبر ہونے کا مدعی بن کر آ گیا ہے۔

فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيْمٌ ﴿٤٠﴾

وَفِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ﴿٤١﴾ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ﴿٤٢﴾

وَفِيْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ ﴿٤٣﴾ فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿٤٤﴾ فَمَا اسْتَطَاعُوْا

میں پھینک دیا اور وہ ملامت زدہ ہو کر رہ گیا۔[90] ۳۸-۴۰

یہی نشانی عاد کی سرگذشت میں بھی ہے، جب ہم نے اُن پر بے فیض اور خشک ہوا چلا دی۔ وہ جس چیز پر بھی گزرتی تھی، اُسے ریزہ ریزہ کیے بغیر نہیں چھوڑتی تھی۔ ۴۱-۴۲

اور یہی نشانی ثمود کی سرگذشت میں بھی ہے، جب اُن سے کہا گیا کہ تھوڑی مدت کے لیے مزے کر لو۔[91] مگر (اِس تنبیہ پر بھی) اُنھوں نے اپنے پروردگار کے حکم سے منہ موڑا اور سرتابی کی[92] تو اُنھیں کڑک نے آلیا[93] اور وہ دیکھتے رہے۔[94] پھر نہ اُن کے لیے اٹھنا

---

۹۰ دوسری جگہ فرمایا ہے کہ نہ اُن پر آسمان رویا نہ زمین نے آنسو بہائے۔ قرآن کے اشارات اور بائیبل کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس واقعے میں بھی اُنھی ہواؤں کے تصرفات کو دخل تھا جن کی شہادت سورہ کی ابتدا میں پیش کی گئی ہے۔ کتاب خروج میں ہے:

"پھر موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اُسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصے ہو گیا۔" (۲۱:۱۴)

۹۱ یہ غالباً اُس وقت کا ذکر ہے، جب عذاب کی علامت کے طور پر اونٹنی نامزد کر دی گئی اور اُنھیں بتا دیا گیا کہ اب یہی مہلت ہے۔ اِس کے بعد تمھارے لیے کوئی گنجایش باقی نہ رہے گی۔

۹۲ اصل الفاظ ہیں: 'فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ'۔ یہ فعل 'عَنْ' کے ساتھ آئے، جس طرح یہاں آیا ہے، تو اِس میں اعراض کا مفہوم متضمن ہوتا ہے۔

مِنْ قِيَامٍ وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ﴿٤٥﴾
وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿٤٦﴾

ممکن ہوا اور نہ وہ اپنا بچاؤ کر سکے۔[95] ۴۳-۴۵

اِس سے پہلے قوم نوح کو بھی ہم نے اِسی طرح پکڑا۔ یقیناً وہ بھی نافرمان لوگ تھے۔[96] ۴۶

۹۳ اصل میں لفظ 'الصّٰعِقَةُ' آیا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بادصرصر اور رعد و برق کے طوفان کی ایک جامع تعبیر ہے۔ سورۂ احقاف (۴۶) کی آیات ۲۴-۲۵ میں قرآن نے اِس کی تفصیل کر دی ہے۔

۹۴ اصل الفاظ ہیں: 'وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ'۔ اِن دو لفظوں میں کئی باتیں چھپی ہوئی ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''ایک یہ کہ یہ عذاب کھلم کھلا، ڈنکے کی چوٹ آیا۔ یہ لوگ اُس کو دیکھتے رہے، لیکن اپنا کوئی بچاؤ نہ کر سکے۔

دوسری یہ کہ عذاب دفعتاً اِن پر آدھمکا جس کے بعد اِن کو ایک لمحے کی بھی فرصت نہ مل سکی۔ دوسرے مقام میں فرمایا ہے: 'اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً، فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ'* (ہم نے اُن کے اوپر ایک ہی ڈانٹ بھیجی تو وہ باڑے والے کے باڑے کی خشک اور ریزہ ریزہ لکڑیوں کے مانند ہو کے رہ گئے)۔

تیسری یہ کہ اُس کو دیکھ کر بالکل سراسیمہ ہو کے رہ گئے۔ اِن کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کریں۔'' (تدبر قرآن ۷/۶۱۸)

۹۵ سورۂ اعراف (۷) کی آیت ۹۱ میں یہی مضمون اِس طرح بیان ہوا ہے کہ اُنھیں کپکپی نے آ پکڑا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے۔

۹۶ قوم نوح کا ذکر آخر میں اور اِس اجمال کے ساتھ اِس لیے ہوا ہے کہ اُس کی سرگذشت

* القمر ۵۴: ۳۱۔

الذاریات ۵۱

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴿٤٧﴾ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ﴿٤٨﴾ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿٤٩﴾ فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٥٠﴾ۚ

(پھر کیا مشکل ہے کہ ہم اِنھیں دوبارہ اٹھا کھڑا کریں؟ تم دیکھتے نہیں ہو کہ) آسمان کو ہم نے عظیم قدرت کے ساتھ[97] بنایا ہے اور ہم بڑی وسعت رکھنے والے ہیں[98]۔ اور زمین کو ہم نے بچھا دیا ہے، سو کیا خوب بچھانے والے ہیں[99]! اور ہم نے ہر چیز کے جوڑے بنائے ہیں تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو[100]۔ اِس لیے دوڑو اللہ کی طرف، میں اُس کی طرف

اپنی شہرت اور قدامت کے باعث کسی تفصیل کی متقاضی نہ تھی اور بنا بریں گویا تمام قوموں کی سرگذشت تھی۔ چنانچہ 'فِیْ مُوْسٰی' اور 'فِیْ عَادٍ' کی جگہ اِس میں اسلوب بھی بدل دیا ہے تاکہ قاری متنبہ ہو جائے کہ اِس سرگذشت کی اہمیت الگ ہے۔

97 اصل میں 'بِاَیْدٍ' کا لفظ آیا ہے۔ اِس کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس خدا کی قدرت ایسی عظیم ہے کہ وہ اِس ناپیدا کنار آسمان کو وجود میں لا سکتا ہے، اُس کے لیے مرنے کے بعد لوگوں کو اٹھا کھڑا کرنا کیا مشکل ہے۔

98 یعنی آسمان کو پیدا کرنے کے بعد ہماری قدرت کہیں ختم نہیں ہو گئی۔ ہم اب بھی جو چاہیں اور جس وقت چاہیں، بغیر کسی تردد کے کر سکتے ہیں۔

99 یہ اب زمین میں خدا کے عجائبات حکمت و ربوبیت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...(اِن) سے واضح ہوتا ہے کہ اِس کا خالق صرف ایک بے پناہ قدرت رکھنے والا ہی نہیں ہے، بلکہ جس طرح اُس کی قدرت بے پناہ ہے، اُسی طرح اُس کی حکمت، رحمت، پروردگاری اور اُس کے جود و کرم کی بھی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ پھر یہیں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اُس کی یہ صفات بھی متقاضی ہیں کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں وہ اپنے بندوں کے درمیان انصاف

وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۵۱﴾ كَذٰلِكَ مَاۤ اَتَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿ۚ۵۲﴾ اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴿ۚ۵۳﴾ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَاۤ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ﴿٘۵۴﴾ وَّ ذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰی تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۵۵﴾

سے تمھیں ایک کھلا خبردار کرنے والا ہوں۔ اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو معبود نہ بناؤ۔ (قیامت کا مرحلہ آئے گا تو اِن میں سے کوئی تمھارے کام نہ آئے گا)۔ میں (اِس حقیقت کے بارے میں بھی) اُس کی طرف سے تمھیں ایک کھلا خبردار کرنے والا ہوں۔ ۴۷-۵۱

(تم مطمئن رہو، اے پیغمبر)۔ اِسی طرح ہوتا رہا ہے۔ اِن سے پہلوں کے پاس بھی جو رسول آیا، اُنھوں نے اُس کو یہی کہا کہ جادوگر ہے یا دیوانہ۔ کیا یہ ایک دوسرے کو یہی وصیت کرتے رہے ہیں؟ نہیں، بلکہ یہ ہیں ہی سرکش لوگ! سو اِن سے اعراض کرو، اب تم پر کوئی الزام نہیں[۱۰۱]، اور یاددہانی کرتے رہو، اِس لیے کہ جو ماننے

کرے اور اُس کے کامل عدل اور اُس کی کامل رحمت کا ظہور ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو اُس کی صفات رحمت و ربوبیت کی نفی ہو جاتی ہے، حالاں کہ اِس دنیا کا ہر گوشہ اُس کی شہادت سے معمور ہے۔'' (تدبر قرآن ۷/ ۶۲۷)

۱۰۰؎ یعنی اِس بات کی یاددہانی کہ اِس دنیا کی ہر چیز جب جوڑا جوڑا ہے اور اِس میں علل اپنے معلولات کے ساتھ، قویٰ آلات کے ساتھ، طبائع ارادوں کے ساتھ اور ارواح اجسام کے ساتھ جوڑ دیے گئے ہیں اور اِس کے نتیجے میں اپنی معنویت کا اظہار کر رہے ہیں؛ مرد ہو یا عورت، زمین ہو یا آسمان، کوئی چیز اپنے جوڑے کے بغیر غایت کو نہیں پہنچتی تو دنیا کو بھی اپنا ایک جوڑا چاہیے جس سے وہ ایک بامقصد اور بامعنی چیز بنے۔ ہر عاقل مانے گا کہ دنیا کا یہ جوڑا آخرت ہے، اِس لیے کہ دنیا کی تکمیل اُسی سے ہوتی ہے۔

الذاریات
۵۱

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ﴿۵۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ

والے ہوں، اُنھیں یاددہانی نفع پہنچاتی ہے۔۵۲-۵۵

(اِن سرکشوں کو اب اِن کے حال پر چھوڑ دو)۔ میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اِس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں، (اور اُن سے تقاضا بھی یہی ہے)۔ میں اُن سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ مجھے کھلائیں[۱۰۱،۱۰۲]۔ اللہ تو خود

۱۰۱؎ مطلب یہ ہے کہ آپ کی ذمہ داری صرف دعوت و تبلیغ ہے۔ یہ لوگ نہیں مانتے تو نہ مانیں۔ آپ عنداللہ بری ہیں۔ اِن کے بارے میں اب آپ سے کوئی پرسش نہ ہوگی۔ الزام جو کچھ ہے، اِنھی پر ہے اور عنقریب یہ اُس کا نتیجہ بھی بھگت لیں گے۔

۱۰۲؎ مطلب یہ ہے کہ نہ میری کوئی احتیاج اِن سے وابستہ ہے، نہ میں نے اپنے لیے اِن سے کچھ چاہا ہے۔ میں نے اِن سے بندگی کا تقاضا کیا ہے اور یہ اِنھی کی ضرورت ہے۔ اِن کی پیدایش ہی اِس لیے ہوئی ہے کہ خدا کی زمین پر اُس کے بندے بن کر رہیں۔ سعادت و کمال کے جو مدارج یہ اِس کے نتیجے میں طے کریں گے، اُن کا صلہ بھی اِنھیں ہی ملے گا۔ اِن کے وجود کی غایت اور زندگی کا نصب العین یہی ہے اور یہی ہونا چاہیے۔ میرے پیغمبر اِسی حقیقت کی یاددہانی کے لیے آتے ہیں۔ وہ اِن سے میری یا اپنی کوئی ضرورت پوری کرنے کے لیے نہیں آتے۔

آیت میں جس بندگی کا تقاضا کیا گیا ہے، اُس کے لیے اصل میں لفظ 'عبادت' آیا ہے۔ اِس کے معنی ائمۂ لغت اِس طرح بیان کرتے ہیں کہ: 'اصل العبودية الخضوع و التذلل'* (عبادت اصل میں عاجزی اور پستی ہے)۔ یہ چیز اگر خدا کی رحمت، قدرت، ربوبیت اور حکمت کے صحیح شعور کے ساتھ پیدا ہو تو اپنے آپ کو بے انتہا محبت اور بے انتہا خوف کے ساتھ خدا کے سامنے

* لسان العرب ۹/۱۰۔

ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴿۵۸﴾

فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا

روزی رساں ہے، بڑے زور اور بڑی قوت والا ہے۔[۱۰۳] ۵۶-۵۸

(اُنھیں کچھ مہلت دو)، اِس لیے کہ اِن ظالموں[۱۰۴] کے لیے بھی وہی پیمانہ ہے، جیسا

آخری حد تک جھکا دینے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ خشوع، خضوع، اخبات، انابت، خشیت، تضرع، قنوت وغیرہ، یہ سب الفاظ قرآن میں اِسی حقیقت کی تعبیر کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ یہ دراصل ایک داخلی کیفیت ہے جو انسان کے اندر پیدا ہوتی اور اُس کے نہاں خانۂ وجود کا احاطہ کر لیتی ہے۔ انسان کے ظاہری وجود میں اِس کیفیت کا ظہور رکوع و سجود، تسبیح و تحمید، دعا و مناجات اور جان و مال کی قربانی کی صورت میں ہوتا ہے۔ یہی اصل عبادت ہے، لیکن انسان چونکہ اِس دنیا میں اپنا ایک عملی وجود بھی رکھتا ہے، اِس وجہ سے یہ عبادت انسان کے اُس عملی وجود سے متعلق ہوتی اور اِس طرح پرستش کے ساتھ اطاعت کو بھی شامل ہو جاتی ہے۔ اُس وقت یہ انسان سے مطالبہ کرتی ہے کہ اُس کا باطن جس ہستی کے سامنے جھکا ہوا ہے، اُس کا ظاہر بھی اُس کے سامنے جھک جائے۔ اُس نے اپنے آپ کو اندرونی طور پر جس کے حوالے کر دیا ہے، اُس کے خارج میں بھی اُس کا حکم جاری ہو جائے، یہاں تک کہ اُس کی زندگی کا کوئی پہلو اِس سے مستثنیٰ نہ رہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ہر لحاظ سے وہ اپنے پروردگار کا بندہ بن جائے۔

جنوں اور انسانوں کا ذکر اِس آیت میں ایک درجے کی مخلوق کی حیثیت سے ہوا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کو اللہ تعالیٰ نے ارادہ و اختیار کی نعمت سے نوازا ہے، اور دونوں اللہ تعالیٰ کے ہاں جواب دہ اور یکساں اجر کے حق دار ہیں۔

۱۰۳۔ اصل میں لفظ 'اَلْمَتِيْنُ' آیا ہے۔ یہ حالت رفع میں ہے اور اِس کا فاعل ہمارے نزدیک محذوف ہے، یعنی 'اَلْمَتِيْنُ قُوَّتُه'۔

يَسۡتَعۡجِلُوۡنِ ﴿۵۹﴾ فَوَيۡلٌ لِّلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ يَّوۡمِهِمُ الَّذِيۡ يُوۡعَدُوۡنَ ﴿۶۰﴾

اِن کے (اگلے) ہم مشربوں[۱۰۵] کے لیے تھا۔ سو مجھ سے جلدی نہ مچائیں۔ اِن منکروں کے لیے آخر کو بڑی خرابی ہے اِن کے اُس دن کی وجہ سے جس سے اِنھیں خبردار کیا جا رہا ہے۔ ۵۹-۶۰

۱۰۴۔ ظالم کا لفظ یہاں 'ظالم لنفسه' کے معنی میں ہے، یعنی وہ لوگ جنھوں نے خدا کے مقابلے میں سرکشی اختیار کی اور اِس طرح اپنی جان پر ظلم ڈھایا۔

۱۰۵۔ اُن قوموں کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔

لاہور

۲۲/ اگست ۲۰۰۹ء

الطور - النجم

٥٢ ـــــ ٥٣
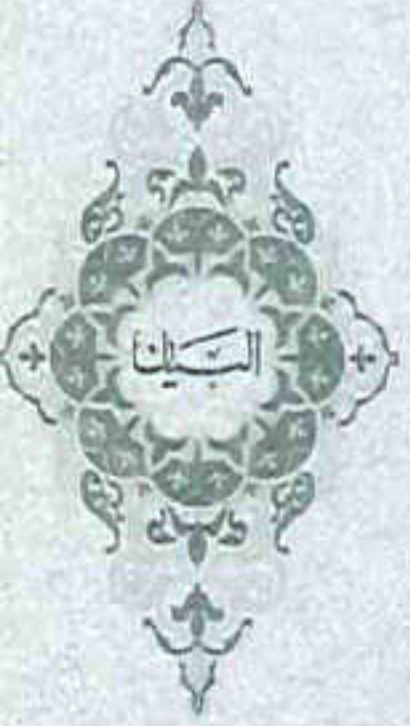
الطور - النجم

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ دونوں کا موضوع اثبات قیامت اور اُس کے حوالے سے انذار و بشارت ہے۔ پہلی سورہ میں انذار عذاب اور سرداران قریش کے رویے پر تنقید، اور دوسری سورہ میں خدا اور آخرت کے بارے میں اُن کے جاہلانہ عقائد کی تردید کا پہلو نمایاں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی کا مضمون دونوں سورتوں میں ہے۔ دونوں میں خطاب قریش سے ہے اور اِن کے مضمون سے واضح ہوتا ہے کہ ام القریٰ مکہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ انذار عام میں نازل ہوئی ہیں۔

سورۃ الطور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَ الطُّوۡرِ ۙ﴿۱﴾ وَ کِتٰبٍ مَّسۡطُوۡرٍ ۙ﴿۲﴾ فِیۡ رَقٍّ مَّنۡشُوۡرٍ ۙ﴿۳﴾ وَّ الۡبَیۡتِ الۡمَعۡمُوۡرِ ۙ﴿۴﴾ وَ السَّقۡفِ الۡمَرۡفُوۡعِ ۙ﴿۵﴾ وَ الۡبَحۡرِ الۡمَسۡجُوۡرِ ۙ﴿۶﴾ اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ لَوَاقِعٌ ۙ﴿۷﴾

—— ۱ ——

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

طور گواہی دیتا ہے[۱] اور جھلی کے کھلے اوراق میں لکھی ہوئی کتاب بھی[۲]۔ اِسی طرح آباد گھر، یہ تمھاری زمین گواہی دیتی ہے اور آسمان کی اونچی چھت اور لبریز سمندر

۱؎ اِس سے جبل طور مراد ہے جس کی ایک مقدس وادی طویٰ میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو نبوت دی گئی اور خدا کے اخلاقی قانون کی بنیاد پر ایک قوم کو اٹھانے اور دوسری کو گرانے کا فیصلہ کیا گیا۔ فرعون اور اُس کے لشکروں کی غرقابی کے بعد بنی اسرائیل کو اِسی کے دامن میں تورات ملی اور اُن سے شریعت الٰہی کی پابندی کا عہد لیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی جس دینونت کا ظہور بنی اسرائیل کی تاریخ میں بغیر کسی انقطاع کے ہوتا رہا ہے، یہ پہاڑ اُس کی تاریخی علامت ہے۔ قرآن نے جزا و سزا پر اس کی گواہی اِسی لحاظ سے پیش کی ہے۔

۲؎ یعنی تورات، جس میں بنی اسرائیل کے لیے دینونت کا پورا قانون اُس کی تمام جزئیات کے ساتھ مرقوم ہے۔ اِس کے ساتھ 'فِیۡ رَقٍّ مَّنۡشُوۡرٍ' کی صفت آئی ہے۔ 'رَقّ' باریک کھال کو کہتے ہیں جو زمانۂ قدیم میں لکھنے کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ یہ حوالہ کیوں دیا گیا ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...اِس کتاب کے پھیلے ہوئے اوراق میں ہونے کا حوالہ یہاں خلق پر اتمام حجت کے پہلو سے ہے۔ یعنی یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، بلکہ ایک آشکارا حقیقت ہے جو بالکل کھلے اور پھیلے ہوئے اوراق میں بیان ہوئی ہے۔ جو شخص چاہے، اِس کو پڑھ سکتا ہے اور اگر پڑھ نہیں سکتا

مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ﴿٨﴾

يَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ﴿٩﴾ وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ﴿١٠﴾ فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿١١﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ ﴿١٢﴾ يَوْمَ

بھی[٣] کہ تیرے پروردگار کا عذاب[٤] واقع ہو کر رہے گا، اُسے کوئی ہٹانے والا نہیں ہے۔ ۱-۸

اُس دن، جب آسمان کپکپا کر لرزے گا اور پہاڑ چلنے لگ جائیں گے۔ سو اُس دن بد بختی ہے جھٹلانے والوں کی جو اپنی سخن سازیوں میں لگے ہوئے کھیل رہے ہیں[٥]۔ جس

تو اِس کو پڑھوا کر سن سکتا ہے۔ بلکہ اُس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اِس کتاب کے حاملین سے مطالبہ کرے کہ وہ اُس کو بتائیں اور سنائیں کہ اِس کتاب میں اللہ تعالیٰ نے کیا بیان فرمایا ہے۔‘‘
(تدبر قرآن ۸/ ۱۷)

[٣] یہ آفاق کی گواہی ہے۔ زمین و آسمان اور لبریز سمندر اُس پوری کائنات کا بیان ہیں جو ہمارے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی ہے۔ زمین کے لیے ’آباد گھر‘، آسمان کے لیے ’اونچی چھت‘ اور سمندر کے لیے ’لبریز‘ کے الفاظ خدا کی قدرت، عظمت، ربوبیت اور کبریائی کو ظاہر کرتے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ زمین کے نباتات، جمادات اور حیوانات، آسمان کی سقف نیلگوں میں قدرت کے عجائب تصرفات اور سمندر میں گونا گوں آیات الٰہی، یہ سب گواہی دیتے ہیں کہ کائنات عبث نہیں بنائی گئی اور انسان بھی اِس میں کوئی شتر بے مہار نہیں ہے۔ یہ اپنی غایت کو پہنچے گی اور انسان کو بھی لازماً مسئول ٹھیرایا جائے گا۔ اِسی طرح یہ گواہی دیتے ہیں کہ جس پروردگار نے یہ عظیم کائنات بنا دی ہے، اُس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے کہ جب چاہے، ایک نئی دنیا بنائے اور انسان کو بھی اُس میں مرنے کے بعد دوبارہ اٹھا کھڑا کرے۔

[٤] اِس سے مراد یہاں آخرت کا عذاب ہے۔ اِس کی وضاحت آگے کی آیات سے ہو جاتی ہے۔

[٥] یہ اُن سخن سازیوں کا بیان ہے جن سے قریش کے متمردین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے

يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ۝١٣ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ۝١٤
اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ۝١٥ اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ
سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝١٦
اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ ۝١٧ فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۚ

دن وہ دھکے دے دے کر دوزخ کی آگ کی طرف لے جائے جائیں گے، کہا جائے گا: یہ وہی آگ ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ اب بتاؤ، یہ جادو ہے یا تمھیں کچھ سجھائی نہیں دے رہا؟ جاؤ، اِس میں جا پڑو، پھر اِسے برداشت کرو یا نہ کرو، تمھارے لیے یکساں ہے[6]۔ تم وہی بدلہ پا رہے ہو جو تم کرتے رہے۔ ۹-۱۶

پرہیزگار[7]، البتہ باغوں اور نعمتوں میں ہوں گے۔ اُن کے پروردگار نے جو کچھ اُنھیں بخشا ہے، اُس سے لطف لے رہے ہوں گے، اور اِس سے بھی کہ اُن کے پروردگار

کی کوشش کرتے تھے، مطلب یہ ہے کہ قرآن کا انذار ان لوگوں کے لیے ایک کھیل بن گیا ہے جس سے یہ دل بہلاتے اور اپنے لیے تفریح کا سامان کرتے ہیں۔ یہ کبھی سنجیدگی کے ساتھ اُس پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ جتنی باتیں اُس پر چھانٹتے ہیں، محض تفریح کے طور پر چھانٹتے ہیں۔

[6] مطلب یہ ہے کہ تم صبر کرو یا روؤ چلاؤ، دونوں تمھارے لیے برابر ہیں۔ یہاں نہ صبر کی داد ہے، نہ آہ و فغاں اور نالہ و فریاد کے لیے کوئی شنوائی ہے۔ تمھیں یہیں رہنا ہے، اِس سے اب تمھارے لیے کوئی مفر نہیں ہے۔

[7] اصل میں لفظ 'اُلْمُتَّقِیْن' آیا ہے۔ اِس سے مراد یہاں وہ لوگ ہیں جنھوں نے پیغمبر کے انذار کا مذاق اڑانے کے بجائے اُس کی باتیں دل کے کانوں سے سنیں، اُن پر غور کیا اور ہمیشہ کے لیے حرز جاں بنا لیا۔

وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿۱۸﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـئًۢا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴿۲۰﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ كُلُّ امْرِیٍٔ ۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ﴿۲۱﴾

نے اُنھیں دوزخ کے عذاب سے بچا لیا۔ اب کھاؤ اور پیو مزے سے[8]، اپنے اُن اعمال کے صلے میں جو تم کرتے رہے ہو۔ وہ برابر بچھے ہوئے تختوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے[9] اور آہو چشم گوریاں ہم نے اُن سے بیاہ دی ہوں گی۔ ۱۷-۲۰

جو لوگ ایمان لائے ہیں اور اُن کی اولاد بھی کسی درجۂ ایمان میں[10] اُن کے نقشِ قدم پر چلی ہے، اُن کی اِس اولاد کو بھی ہم (اُنھی کے درجے میں) اُن کے ساتھ ملا دیں گے[11] اور اُن کے عمل میں اُن کے لیے کوئی کمی نہ کریں گے[12]، (اِس لیے کہ) ہر ایک اپنی کمائی کے

[8] اصل میں لفظ 'هَنِيْٓـئًا' آیا ہے۔ یہ مصدر محذوف کی صفت ہے، یعنی 'كُلُوْا وَاشْرَبُوْا اَكْلًا وَّشُرْبًا هَنِيْٓـئًا'۔

[9] یہ اُن کی نشست گاہوں کے کمال درجہ آراستہ ہونے اور باہم محبت اور بے تکلفی کے ساتھ آمنے سامنے بیٹھ کر باتیں کرنے کی تصویر ہے۔

[10] یہ ترجمہ ایمان کی تنکیر کے لحاظ سے ہے، اِس لیے کہ اصل میں 'وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ' کے الفاظ آئے ہیں۔

[11] یہ مزید بشارت ہے کہ ایمان والوں کی اولاد اگر اپنے ایمان کی بنیاد پر کسی ادنیٰ سے ادنیٰ درجے میں بھی جنت کی مستحق ہو جائے گی تو اللہ تعالیٰ اُس کے والدین پر اتمام نعمت کے لیے اُسے وہی درجہ عطا فرما دیں گے جو اُس کے والدین کا ہے اور دونوں کو ایک ہی جگہ اکٹھا کر دیں گے۔

اِس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ یہی معاملہ اُس صورت میں بھی ہو گا، جب والدین کسی نیچے کے

وَاَمۡدَدۡنٰهُمۡ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحۡمٍ مِّمَّا يَشۡتَهُوۡنَ ﴿۲۲﴾ يَتَنَازَعُوۡنَ فِيۡهَا كَاۡسًا لَّا لَغۡوٌ فِيۡهَا وَلَا تَاۡثِيۡمٌ ﴿۲۳﴾ وَيَطُوۡفُ عَلَيۡهِمۡ غِلۡمَانٌ لَّهُمۡ كَاَنَّهُمۡ

بدلے میں رہن ہے[۱۳]۔ ہم اُن کی پسند کے میوے اور گوشت اُن کو برابر دیتے چلے جائیں گے[۱۴]۔ وہ اُس میں شراب کے جام ایک دوسرے سے لے رہے ہوں گے جس میں نہ یاوہ گوئی

درجے میں ہوں گے، اِس لیے کہ والدین اور اولاد کا جو تعلق خاطر اولاد کو والدین کے درجے تک اٹھانے کا باعث بن رہا ہے، وہی تعلق خاطر اِس دوسری صورت میں بھی موجود ہے۔

۱۲؎ یعنی اِس یک جائی کے لیے والدین کا درجہ کم کر کے اُنھیں نیچے نہیں اتارا جائے گا، بلکہ اُن سے ملانے کے لیے اولاد کا درجہ بڑھا کر اُسے اوپر پہنچا دیا جائے گا۔

۱۳؎ یعنی والدین، خواہ بجائے خود کتنے ہی بڑے مرتبے کے لوگ ہوں، اُن کی اولاد اُسی صورت میں اُن کے ساتھ ملائی جائے گی، جب وہ اپنے ایمان و عمل سے جنت کا استحقاق پیدا کر لے، اِس لیے کہ ہر بندے کا نفس خدا کے پاس رہن ہے۔ وہ اپنی کمائی خدا کے حضور میں پیش کرے گا تو یہ رہن چھڑائے گا، لیکن چھڑا لے تو اِس کے بعد جہاں تک درجات کا تعلق ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اُن میں جو اضافہ چاہے، کر سکتا ہے۔ اِس سے کسی ضابطے کی نفی نہیں ہوتی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''یہ اِس بات کی تعلیم ہے کہ ہر شخص اپنی اولاد اور اپنے متعلقین کو ایمان کی راہ دکھانے کی کوشش، جس حد تک اُس کے امکان میں ہو، ضرور کرے۔ ایمان کے بغیر کسی شخص کو بھی نجات حاصل نہیں ہو گی، اگرچہ وہ کسی نبی اور رسول کی اولاد ہی کیوں نہ ہو۔ البتہ، یہ ضرور ہے کہ کسی کی اولاد نے اگر ایمان کی راہ اختیار کر لی تو گو اُس کا ایمان ادنیٰ درجے کا ہی ہو، لیکن اُس کو اپنے رفیع المنزلت بزرگوں کی معیت جنت میں ضرور حاصل ہو جائے گی۔'' (تدبر قرآن ۸/ ۲۷)

۱۴؎ اصل میں لفظ 'اَمۡدَدۡنٰهُمۡ' آیا ہے۔ یہ اِس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جتنے لوگ بڑھیں گے، اُسی کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور لطف و عنایت میں بھی اضافہ ہوتا رہے گا۔

لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ ﴿٢٤﴾

وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿٢٥﴾ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ﴿٢٦﴾ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ وَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ﴿٢٧﴾ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ ﴿٢٨﴾

ہوگی، نہ دوسروں پر گناہ کی تہمتیں۔ اور چھپا کر رکھے ہوئے موتیوں کی طرح[15] (خوب صورت) لڑکے، اُنھی کے لیے خاص، اُن کی خدمت میں دوڑتے پھر رہے ہوں گے۔ ۲۱-۲۴

وہ (پیچھے کا حال) پوچھتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوں گے۔ کہیں گے: ہم اِس سے پہلے اپنے گھر والوں کے بارے میں ڈرتے رہتے تھے[16]۔ سو اللہ نے ہم پر فضل فرمایا اور ہمیں دوزخ کی جھلسا دینے والی ہوا کے عذاب سے بچا لیا ہے۔ ہم اِس سے پہلے اُسی (پروردگار) کو پکارتے تھے[17]۔ اِس میں شبہ نہیں کہ وہ بڑا با وفا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے[18]۔ ۲۵-۲۸

۱۵؎ عربی زبان میں یہ تشبیہ غایت درجہ نفاست و نزاکت کو بیان کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔

۱۶؎ یعنی اپنی عاقبت کے ساتھ ہمیں اپنے اہل و عیال کی عاقبت کی فکر بھی رہی اور ہم اُنھیں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے اور اُسی کے لیے جینے اور مرنے کی تلقین کرتے رہے۔

۱۷؎ یہ جملہ اوپر کے جملے 'اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ' سے متعلق ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اِس جملے کو اصلاً آنا تو اوپر والے جملے ہی کے ساتھ تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان کی مبادرت ظاہر کرنے کے لیے 'فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا' کو اِس پر مقدم کر دیا اور اِس کو موخر کر دیا۔ اِس تاخیر میں یہ بلاغت ہے کہ انسان کی نجات میں اصل عامل کی حیثیت عقیدۂ توحید کو حاصل ہے۔ جس نے اِس کی حفاظت کی، وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا مستحق ٹھیرا اور جس نے اِس میں

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ﴿۲۹﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ﴿۳۰﴾ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ

لٰہذا یاد دہانی کرتے رہو، (اے پیغمبر، اور پروا نہ کرو)، اِس لیے کہ اپنے پروردگار کے فضل سے[19] تم نہ کاہن ہو نہ دیوانے۔ کیا یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک شاعر ہے جس کے لیے ہم گردش روزگار کے منتظر ہیں[20]؟ اِن سے کہہ دو: اچھا، انتظار کرو کہ میں بھی تمھارے

خرابی پیدا کی، اُس نے اپنی عاقبت برباد کی۔ اُن کا مطلب یہ ہے کہ ہم اِس عقیدے میں مستحکم رہے، اِس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان فرمایا۔'' (تدبر قرآن ۲۹/۸)

۱۸؎ یعنی اپنے بندوں سے جو وعدے اُس نے کیے ہیں، اُن سب کو پورا کرنے والا ہے، اور صرف پورا کرنے والا ہی نہیں، اُنھیں اپنے افضال وعنایات سے مزید نوازنے والا بھی ہے۔

۱۹؎ یہ الفاظ یہاں دلیل کے محل میں ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...یعنی تم پر تمھارے رب کا جو فضل و انعام ہے، وہ ایسی چیز نہیں ہے کہ آنکھیں اور عقل رکھنے والوں سے وہ مخفی رہ سکے۔ تمھاری زبان فیض ترجمان سے اللہ تعالیٰ نے جو چشمۂ حکمت و معرفت جاری کر رکھا ہے، اُس کو کاہنوں کی خرافات سے کیا تعلق؟ تم جس کردار کے حامل ہو، کس کاہن کے اندر اُس کا کوئی ادنیٰ پرتو بھی پایا گیا ہے؟ تم راست بازی اور حق گوئی کے مظہر کامل ہو اور کاہن دروغ گو اور لپاڑیے ہوتے ہیں۔ تم روح القدس سے فیض پاتے ہو اور کاہن شیاطین سے الہام حاصل کرنے کے لیے کان لگاتے ہیں اور اِس میں بھی وہ بالکل جھوٹی نمایش کرتے ہیں۔ اِس طرح تم کو جو دیوانہ کہتے ہیں، وہ خود دیوانے ہیں۔ آخر تم سے بڑا فرزانہ، ذی ہوش، دانش مند اور حکیم اُنھوں نے کس کو پایا ہے؟'' (تدبر قرآن ۳۲/۸)

۲۰؎ اِس بات سے وہ اپنے پیرووں کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ قرآن بھی ایک طرح کی شاعری ہی ہے۔ اِسے وحی والہام کا درجہ دے کر تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے شاعروں کی طرح اپنی فصاحت وبلاغت کی دھوم مچا کر یہ پیغمبر بھی ایک دن گردش روزگار کی

الْمُتَرَبِّصِيْنَ ﴿۳۱﴾ اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴿۳۲﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴿۳۴﴾

ساتھ انتظار کرتا ہوں۔ کیا اِن کی عقلیں اِنھیں یہی کچھ سجھاتی ہیں یا یہ ہیں ہی سرکش لوگ[۲۱]! کیا یہ کہتے ہیں کہ اِس نے یہ قرآن خود ہی گھڑ لیا ہے؟ نہیں، یہ بات نہیں ہے، بلکہ یہ ماننا نہیں چاہتے[۲۲]۔ سو اپنی بات میں سچے ہیں تو اِسی شان کا کوئی کلام بنا لائیں[۲۳]۔ ۲۹-۳۴

نذر ہو جائیں گے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اِسے سنجیدگی سے سنا جائے اور مان لیا جائے کہ جس عذاب کی وعید یہ سنا رہے ہیں، وہ فی الواقع آ جائے گا۔

۲۱۔ مطلب یہ ہے کہ اِن کی سرکشی ہی یہ باتیں اِن سے کہلوا رہی ہے، اِس میں علم و عقل کو کوئی دخل نہیں ہے۔

۲۲۔ اصل الفاظ ہیں: 'بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ'۔ اِن میں فعل ارادۂ فعل کے لیے ہے۔ مدعا یہ ہے کہ یہ خوب جانتے ہیں کہ اِس طرح کا کلام نہ تم اپنی طرف سے پیش کر سکتے ہو، نہ کوئی دوسرا پیش کر سکتا ہے۔ لیکن یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ نہیں مانیں گے، اِس لیے طرح طرح کی باتیں چھانٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۲۳۔ یعنی اِس شان کا کلام کہ عربی زبان کے اسالیب بلاغت اور علم و ادب کی روایت سے واقف ادبی ذوق کے حاملین اِسے پڑھیں تو صاف محسوس کریں کہ اِس کے مانند کوئی کلام انسانی ذہن کے لیے تخلیق کرنا ممکن نہیں ہے۔ اِس شان کا کلام کہ جس میں قرآن ہی کی طرح خدا بولتا ہوا نظر آئے، جو اُن حقائق کو واضح کرے جن کا واضح ہونا انسانیت کی شدید ترین ضرورت ہے اور وہ کسی انسان کے کلام سے کبھی واضح نہیں ہوئے، جو اُن معاملات میں رہنمائی کرے جن میں

الطور ۵۲

اَمۡ خُلِقُوۡا مِنۡ غَيۡرِ شَىۡءٍ اَمۡ هُمُ الۡخٰلِقُوۡنَ ﴿۳۵﴾ اَمۡ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ ۚ بَلۡ لَّا يُوۡقِنُوۡنَ ﴿۳۶﴾

(اِن سے پوچھو، یہ آخرت کو نہیں مانتے تو) کیا بغیر کسی خالق کے پیدا ہو گئے ہیں یا آپ ہی اپنے خالق ہیں؟ یا زمین اور آسمانوں کو اِنھوں نے پیدا کیا ہے؟ نہیں، یہ بات نہیں ہے، بلکہ یہ یقین نہیں رکھتے[۲۴]۔ ۳۵-۳۶

رہنمائی کے لیے کوئی دوسرا ذریعہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے، جس میں نہ فکر وخیال کا کوئی تناقض ہو، نہ متکلم کے دل و دماغ میں پیدا ہونے والی کیفیات کی کوئی جھلک دکھائی دے اور نہ راے اور نقطۂ نظر کی تبدیلی کے کوئی آثار کہیں دیکھے جا سکتے ہوں۔ ایک ایسا کلام جس کے حق میں وجدان گواہی دے، علم و عقل کے مسلمات جس کی تصدیق کریں، جو ویران دلوں کو اِس طرح سیراب کر دے، جس طرح مردہ زمین کو بارش سیراب کرتی ہے، جس میں وہی شان اور وہی تاثیر ہو جو قرآن کا پڑھنے والا اگر اُس کی زبان سے واقف ہو تو اُس کے لفظ لفظ میں محسوس کرتا ہے۔

۲۴؎ مطلب یہ ہے کہ اِن کا مرض بے یقینی ہے، ورنہ یہ اِس تضاد فکر میں مبتلا نہ ہوتے۔ یہ مانتے ہیں کہ زمین و آسمان کا اور اِن کا خالق اللہ ہی ہے، مگر نہیں سمجھتے کہ پھر قیامت بعید از امکان کیسے ہو گئی؟ جو پہلی مرتبہ پیدا کرنے پر قادر ہوا، وہ دوسری مرتبہ پیدا کرنے سے عاجز کیوں رہ جائے گا؟ اِن کا خالق اگر اللہ پروردگار عالم ہے تو وہ اِن سے کیوں نہیں پوچھے گا کہ اِنھیں جس مقصد کے لیے پیدا کیا گیا، اِنھوں نے اُسے پورا کیا ہے یا نہیں؟ جس نے اِنھیں پیدا کیا ہے، اُس کا یہ حق کیوں نہیں ہے کہ اپنے بنائے ہوئے گھر میں وہ اِن کے رویے پر اِنھیں مسئول ٹھیرائے؟ یہ اُس سے بے خوف کس طرح ہو گئے جو زمین کو ذرا سا ہلا دے تو اِن کا نام و نشان باقی نہ رہے اور آسمان کو حکم دے تو وہ چشم زدن میں اِنھیں صفحۂ ہستی سے مٹا کر زمین کو اِن کے وجود سے پاک کر دے؟

اَمۡ عِنۡدَهُمۡ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمۡ هُمُ الۡمُصَۜيۡطِرُوۡنَ ﴿۳۷﴾ اَمۡ لَهُمۡ سُلَّمٌ يَّسۡتَمِعُوۡنَ فِيۡهِ ۚ فَلۡيَاۡتِ مُسۡتَمِعُهُمۡ بِسُلۡطٰنٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۳۸﴾ اَمۡ لَهُ الۡبَنٰتُ وَلَكُمُ الۡبَنُوۡنَ ﴿۳۹﴾

اَمۡ تَسۡـَٔلُهُمۡ اَجۡرًا فَهُمۡ مِّنۡ مَّغۡرَمٍ مُّثۡقَلُوۡنَ ﴿۴۰﴾ اَمۡ عِنۡدَهُمُ

(یہ کس برتے پر اکڑ رہے ہیں)؟ تیرے پروردگار کے خزانے کیا اِنھی کے پاس ہیں یا اُن پر اِنھی کا حکم چلتا ہے[25]؟ کیا اِن کے پاس کوئی سیڑھی ہے کہ اُس پر چڑھتے اور آسمان کی باتیں سن لیتے ہیں (کہ اِن کے لیے وہاں بھی عیش ہے)؟ اگر ایسا ہے تو اِن میں سے جس نے سنا ہے، وہ کوئی واضح دلیل پیش کرے۔ (یہ ذرا اپنے عقائد کو دیکھیں)، کیا (وہ جو زمین و آسمان کا خالق ہے)، اُس کے لیے بیٹیاں ہیں اور تمھارے لیے بیٹے[26]؟ ۳۷-۳۹

(یہ کیوں نہیں سنتے)؟ کیا تم اِن سے کوئی اجر مانگتے ہو کہ وہ اِس تاوان کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں[27]؟ کیا اِن کے پاس غیب کا علم ہے، سو یہ خود ہی لکھ لیتے ہیں (اور

۲۵ یہ اُن متمردین کے غرور پر ضرب لگائی ہے جو اپنی رفاہیت کے نشے میں پیغمبر کا مذاق اڑاتے اور اُس کے انذار کو کسی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

۲۶ یعنی اِس سے زیادہ مضحکہ خیز عقیدہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ تم خدا کے لیے اولاد تجویز کرتے ہو اور اولاد بھی لڑکیاں جن کا وجود تمھیں اپنے گھر میں اور خود اپنے لیے گوارا نہیں ہے۔

۲۷ یہ مخاطبین کی حق بے زاری پر اظہار تعجب ہے کہ اگر رسول کی کوئی غرض تم سے وابستہ ہوتی یا وہ کوئی معاوضہ مانگتا تو اُس سے تمھارے فرار کی یہ کم سے کم ایک معقول وجہ ہوتی، لیکن تمھیں تو یہ نعمت مفت دی جا رہی ہے اور تم اِسے سننے کے بھی روادار نہیں ہو۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

الطور ۵۲

الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۴۱﴾ اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا ؕ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ ﴿۴۲﴾
اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۴۳﴾

اپنی ہدایت کے لیے کسی پیغمبر کی ضرورت محسوس نہیں کرتے)؟ کیا یہ کوئی چال چلنا چاہتے ہیں؟ تو جنھوں نے کفر کیا ہے، یہ چال اُنھی پر الٹی پڑے گی۔[۲۸] کیا اللہ کے سوا اِن کے لیے کوئی اور الٰہ ہے (جو اِنھیں بچا لے گا؟ ہرگز نہیں)، اللہ پاک ہے اُن سے جو یہ شریک ٹھیراتے ہیں۔ ۴۰-۴۳

”...اہل عرب امی، یعنی دین و شریعت سے بے خبر تھے۔ اُن کی اِس بے خبری کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اللہ کی ہدایت معلوم کرنے کے طالب بنتے، بالخصوص جب کہ اُن کے ہاں حضرت اسمٰعیل کے زمانے سے یہ روایت بھی چلی آ رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ اُن کے اندر سے ایک رسول اٹھائے گا جو لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لائے گا اور جس سے دنیا کی تمام قومیں ہدایت پائیں گی۔ اُن پر واجب تھا کہ جب اُنھی کے اندر کے ایک بہترین شخص نے اُن کو اللہ کے راستے کی دعوت دی تو وہ اُس کی بات سنتے اور سنجیدگی سے اُس پر غور کرتے، لیکن توقع کے خلاف اُنھوں نے اِس کے بالکل خلاف روش اختیار کی۔ اُن کی اِسی حالت پر قرآن نے اِس آیت میں تعجب کا اظہار فرمایا ہے۔“ (تدبر قرآن ۸/۳۹)

۲۸ یعنی اگر یہ بات ہے تو یاد رکھیں کہ یہ چال اِنھی منکروں پر الٹی پڑے گی اور یہ خود اپنے دام میں گرفتار ہو جائیں گے۔ اِس جملے میں جو تہدید ہے، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اُس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”مطلب یہ ہے کہ جو لوگ حق سے برگشتہ رہنے اور لوگوں کو اُس سے برگشتہ کرنے کے لیے اپنے ضمیر کے بالکل خلاف اِس طرح کی چالیں چلتے ہیں، وہ حق کی دعوت دینے والوں کا کچھ بھی نہیں بگاڑتے، بلکہ خود اپنے ہی کو تباہی کے کھڈ میں گراتے ہیں۔ نجات و فلاح کا راستہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعے سے بتایا ہے۔ کوئی شخص اِس سے ہٹ

وَاِنۡ يَّرَوۡا كِسۡفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَّقُوۡلُوۡا سَحَابٌ مَّرۡكُوۡمٌ ﴿۴۴﴾
فَذَرۡهُمۡ حَتّٰى يُلٰقُوۡا يَوۡمَهُمُ الَّذِىۡ فِيۡهِ يُصۡعَقُوۡنَ ﴿۴۵﴾ يَوۡمَ لَا يُغۡنِىۡ
عَنۡهُمۡ كَيۡدُهُمۡ شَيۡـًٔا وَّلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ﴿۴۶﴾
وَاِنَّ لِلَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا عَذَابًا دُوۡنَ ذٰلِكَ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۷﴾

(یہ نہیں مانیں گے) اور اگر آسمان سے کوئی ٹکڑا بھی گرتا ہوا دیکھیں گے تو کہیں گے: یہ تو تہ بہ تہ بادل ہیں (جو امڈے چلے آرہے ہیں[29])۔ اِس لیے اِنھیں چھوڑو، یہاں تک کہ یہ اپنے اُس دن کو پہنچ جائیں جس دن اِن کے ہوش جاتے رہیں گے، جس دن نہ اِن کی کوئی چال اِن کے کچھ کام آئے گی، نہ کوئی مدد اِنھیں پہنچے گی۔ ۴۴-۴۶

اِن ظالموں کے لیے اِس کے سوا بھی عذاب ہے[30]، مگر اِن میں سے اکثر نہیں جانتے۔

(اِس لیے اِنھیں چھوڑو) اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنے پروردگار کے فیصلے کا انتظار

کر دوسری راہ اختیار کرتا ہے تو وہ اپنی ضلالت کو ہدایت ثابت کرنے کے لیے صحیح راہ بتانے والوں پر خواہ کتنی ہی تہمتیں تراشے اور کج روی کی حمایت میں کتنی ہی دلیلیں گھڑے، لیکن جب انجام اُس کے سامنے آئے گا، تب اُس پر واضح ہو جائے گا کہ وہ خود اپنے ہی دام میں اسیر ہو کر اِس منزل تک پہنچا ہے۔'' (تدبر قرآن ۸/ ۴۰)

۲۹۔ اِس جملے میں ثمود کے واقعے کی طرف بھی ایک لطیف اشارہ ہے۔ سورۂ احقاف (۴۶) کی آیت ۲۴ میں بیان ہوا ہے کہ اُنھیں جس عذاب سے خبردار کیا جا رہا تھا، وہ اُن کے سروں پر آ گیا تو اُس وقت بھی وہ یہی کہہ رہے تھے کہ یہ تو بادل ہیں جو ہمیں سیراب کرنے کے لیے آئے ہیں۔

۳۰۔ یہ قیامت سے پہلے اُس عذاب کا ذکر ہے جو سنت الٰہی کے مطابق اُن لوگوں پر لازماً آتا ہے جو رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد بھی اُنھیں جھٹلانے پر مصر رہتے ہیں۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۴۸﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴿۴۹﴾

کرو[۳۱]۔ یہ تمھیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے، اِس لیے کہ تم ہماری نگاہ میں ہو[۳۲]۔ اور (ثابت قدمی کے لیے) اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرو جس وقت تم نماز کے لیے اٹھتے ہو[۳۳] اور رات میں بھی اُس کی تسبیح کرو اور اُس وقت بھی جب ستارے پلٹتے ہیں[۳۴]۔ ۴۷-۴۹

الطور
۵۲

۳۱۔ اصل میں 'وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'ل' کا صلہ دلیل ہے کہ صبر یہاں انتظار کے مفہوم پر متضمن ہے۔

۳۲۔ ہر صاحب ذوق اندازہ کر سکتا ہے کہ دو لفظوں کے اِس جملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کیا کچھ تسلی، دل نوازی اور تسکین پوشیدہ ہے۔

۳۳۔ یعنی سو کر اٹھتے ہو۔ 'حِيْنَ تَقُوْمُ' کے جو الفاظ اصل میں آئے ہیں، اُنھیں اگر سورۂ مزمل (۷۳) کی آیتوں کی روشنی میں دیکھیے، جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تہجد کے لیے اٹھنے کی ہدایت کی گئی ہے، تو اِن کی کوئی دوسری تاویل نہیں ہو سکتی۔ سورۂ شعراء (۲۶) کی آیات ۲۱۸-۲۱۹ سے بھی اِسی مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ وہاں اِنھی الفاظ پر 'تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ' کا عطف اِس کا واضح قرینہ ہے۔

۳۴۔ نماز کی یہ ہدایت صبر حاصل کرنے کی ایک تدبیر کے طور پر آئی ہے، اِس لیے کہ صبر کی توفیق جس کو بھی ملتی ہے، اللہ کی مدد سے ملتی ہے اور اللہ کی مدد حاصل کرنے کا واحد ذریعہ نماز ہے۔

سورۃ النجم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالنَّجۡمِ اِذَا ہَوٰی ۙ﴿۱﴾ مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمۡ وَمَا غَوٰی ۚ﴿۲﴾ وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡہَوٰی ؕ﴿۳﴾ اِنۡ ہُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی ۙ﴿۴﴾ عَلَّمَہٗ شَدِیۡدُ الۡقُوٰی ۙ﴿۵﴾ ذُوۡ مِرَّۃٍ ؕ

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

تارے گواہی دیتے ہیں، جب وہ گرتے ہیں[۳۵] کہ تمھارا رفیق نہ بھٹکا ہے، نہ بہکا ہے[۳۶]۔ وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتا[۳۷]، یہ (قرآن) تو ایک وحی ہے جو اُسے کی جاتی ہے۔ اُس کو

۳۵۔ یہ اُنھی تاروں کا ذکر ہے جن کے متعلق بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُنھیں 'رُجُوۡمًا لِّلشَّیٰطِیۡنِ'* (شیطانوں کے لیے سنگ ساری) بنا رکھا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ یہ جب گرتے ہیں تو زبان حال سے گواہی دیتے ہیں کہ ہم اُن راستوں کی پاسبانی کر رہے ہیں جن سے جبریل امین اِس قرآن کو لے کر آتے ہیں۔ اُن میں کسی شیطان کے لیے دراندازی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اِسے جنوں کا الہام اور کاہنوں کا کلام قرار دے کر رد کرنے کی کوشش نہ کرو۔ اِس کی حریم قدس تک اِن شیطانوں کی رسائی کہاں! یہ تو اُس کے قریب بھی پھٹکنا چاہیں تو شہاب ثاقب کی صورت میں ہم اِن پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

۳۶۔ رفیق سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔ اِس کے بعد دو لفظ استعمال ہوئے ہیں: ایک 'ضَلَّ' اور دوسرا 'غَوٰی'۔ 'ضَلَّ' اُس گم راہی کے لیے آتا ہے، جب کوئی شخص راستہ نہ جاننے کی وجہ سے کسی غلط راستے پر چل پڑے اور 'غَوٰی' کا تعلق اُس گم راہی سے ہے جو انسان نفس کی اکساہٹ سے اور جان بوجھ کر اختیار کر لیتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اِس آیت میں 'صَاحِبُکُمۡ' کے لفظ سے ہوا ہے۔ یہ دلیل کے محل میں

* الملک ۶۷: ۵۔

فَاسۡتَوٰی ۙ﴿۶﴾ وَ ہُوَ بِالۡاُفُقِ الۡاَعۡلٰی ؕ﴿۷﴾ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ۙ﴿۸﴾ فَکَانَ قَابَ

ایک زبردست قوتوں والے نے تعلیم دی ہے جو بڑا صاحب کردار، بڑا صاحب حکمت ہے۔[۳۸] چنانچہ وہ نمودار ہوا، اِس طرح کہ وہ آسمان کے اونچے کنارے پر تھا۔[۳۹] پھر قریب

ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''لفظ 'صَاحِب' یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے استعمال ہوا ہے اور ضمیر خطاب کے مخاطب قریش ہیں۔ اُن کو خطاب کر کے کہا جا رہا ہے کہ یہ پیغمبر جو تمھارے اپنے دن رات کے ساتھی ہیں، تمھارے لیے کوئی اجنبی نہیں ہیں۔ تم اِن کے ماضی و حاضر، اِن کے اخلاق و کردار اور اِن کے رجحان و ذوق سے اچھی طرح واقف ہو۔ تم نے کب اِن کے اندر کوئی ایسی بات دیکھی ہے جس سے یہ شبہ بھی ہو سکے کہ اِن میں کہانت یا نجوم کا کوئی میلان پایا جاتا ہے۔ اِس طرح کا ذوق کسی کے اندر ہوتا ہے تو دن رات کے ساتھیوں سے وہ عمر بھر چھپا نہیں رہتا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جو چیز اتنی مدت تک تم نے اُن کے اندر کبھی محسوس نہیں کی، اب جب اُنھوں نے نبوت کا دعویٰ کیا اور تم کو اللہ کا کلام سنایا تو تم نے اِن کو کاہن اور نجومی کہنا شروع کر دیا، حالاں کہ اِن کی زندگی اور اِن کا کلام شاہد ہے کہ اِن کے اندر کسی ضلالت یا غوایت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔''
(تدبر قرآن ۸/ ۵۳)

۳۷؎ یعنی کاہن اور نجومی تو جو کچھ کہتے ہیں، اپنے نفس کی تحریک سے کہتے ہیں، لیکن اِس کلام کا منبع اور منشا اور ہے۔ نفس اور اُس کی خواہشوں سے اِس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

۳۸؎ یعنی جس فرشتے نے یہ کلام پیغمبر پر اتارا ہے، وہ تمام اعلیٰ صلاحیتوں کا حامل اور علم و عقل اور سیرت و کردار کے لحاظ سے نہایت محکم ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِس امر کا کوئی امکان نہیں ہے کہ کوئی دوسری روح اُس کو متاثر یا مرعوب کر سکے، اُس سے خیانت کا ارتکاب کرا سکے یا اُس کی تعلیم میں کوئی خلط مبحث کر سکے یا اُس سے کوئی فروگذاشت ہو سکے یا اُس کو کوئی وسوسہ لاحق ہو سکے۔ اِس طرح کی تمام کمزوریوں سے اللہ تعالیٰ نے اُس کو محفوظ رکھا ہے تاکہ جو فرض اُس کے سپرد فرمایا ہے، اُس کو وہ بغیر کسی خلل و فساد کے پوری دیانت و

قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝ۚ۹ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ۝ؕ۱۰ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝۱۱ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا یَرٰى ۝۱۲

وَ لَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۝ۙ۱۳ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۝۱۴ عِنْدَهَا

ہوا اور جھک پڑا،[۴۰] یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اُس سے کچھ کم فاصلہ رہ گیا۔[۴۱] پھر اللہ نے وحی کی اپنے بندے کی طرف جو وحی کی۔ جو کچھ اُس نے دیکھا، وہ دل کا وہم نہ تھا۔ اب کیا تم اُس چیز پر اُس سے جھگڑتے ہو جو وہ آنکھوں سے دیکھ رہا ہے؟ ۱-۱۲

اور اُس نے ایک مرتبہ پھر اُسے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اترتے دیکھا ہے،[۴۲] جس کے

امانت کے ساتھ ادا کر سکے۔'' (تدبر قرآن ۸/ ۵۳)

۳۹؎ اصل میں 'الْاُفُقُ الْاَعْلٰی' کے الفاظ آئے ہیں، یعنی وہ افق جو سمت راس میں ہوتا ہے۔ یہ پہلی وحی اور جبریل امین کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی ملاقات کا ذکر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ بالکل جلی اور غیر مشتبہ صورت میں اِس طرح نمودار ہوئے، جس طرح ماہ تمام یا مہر نیم روز نمودار ہوتا ہے اور پیغمبر نے کھلی آنکھوں کے ساتھ اُن کا مشاہدہ کیا۔

۴۰؎ یہ اُس التفات و اہتمام اور غایت شفقت کا بیان ہے جس کے ساتھ جبریل امین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم دی تا کہ جو ہدایات آپ کو دی جا رہی ہیں، آپ اُنھیں اچھی طرح سن اور سمجھ لیں۔

۴۱؎ یہ تشبیہ اہل عرب کے ذوق کے لحاظ سے ہے اور غایت قرب و اتصال کی تعبیر کے لیے آئی ہے۔ اِس میں 'اَوْ' اِس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ پیش نظر محض قرب کا بیان ہے، اِس سے مقدار فاصلہ کی تعیین مقصود نہیں ہے۔ یہ کم یا زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔

۴۲؎ یہ دوسری ملاقات کا ذکر ہے۔ اِس کے بعد، معلوم ہے کہ یہ سلسلہ تواتر کے ساتھ شروع ہو گیا۔ مدعا یہ ہے کہ پیغمبر کو یہ مشاہدہ ایک ہی بار نہیں ہوا کہ اِس کو کوئی وہم یا مغالطہ قرار دیا جا سکے۔

جَنَّةُ الْمَاْوٰى ﴿١٥﴾ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ﴿١٦﴾ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ﴿١٧﴾ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴿١٨﴾

پاس ہی جنت الماویٰ ہے[43]، جب سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ کہ چھا رہا تھا[44]۔ اُس کی نگاہ نہ بہکی، نہ بے قابو ہوئی[45]۔ اُس نے اپنے پروردگار کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھی ہیں[46]۔ ۱۳-۱۸

اُنھوں نے جبریل علیہ السلام کو دوبارہ بھی دیکھا ہے اور اِس موقع پر بھی وہ اُن کے سامنے اپنی اصلی صورت میں نمودار ہوئے ہیں۔ اِس ملاقات کا مقام سدرۃ المنتہیٰ بتایا گیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''سدرۃ المنتہیٰ' وہ مقام ہے جہاں اِس عالم ناسوت کی سرحدیں ختم ہوتی ہیں۔ 'سِدْرَۃ' بیری کے درخت کو کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے یہ بیری کا درخت عالم ناسوت اور عالم لاہوت کے درمیان ایک حد فاصل ہے۔ ہمارے لیے یہ سارا عالم نادیدہ ہے۔ نہ ہم عالم ناسوت اور عالم لاہوت کے حدود کو جانتے اور نہ اِن دونوں کے درمیان کے اِس نشان فاصل کی حقیقت سے واقف ہیں جس کو یہاں 'سِدْرَۃ' سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ یہ چیزیں متشابہات میں داخل ہیں۔ اِس وجہ سے، قرآن کی ہدایت کے مطابق، اِن پر ایمان لانا چاہیے، اِن کی حقیقت کے درپے ہونا جائز نہیں ہے۔ اِن کی حقیقت صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ جن کا علم راسخ ہوتا ہے، اُن کے علم میں اِن چیزوں سے اضافہ ہوتا ہے۔ رہے وہ لوگ جو اِن کی حقیقت جاننے کے درپے ہوتے ہیں، وہ ٹھوکر کھاتے اور گم راہی میں مبتلا ہوتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۸/۵۶)

۴۳؎ اِس سے مراد وہ جنت ہے جس میں اہل ایمان اول اول اتارے جاتے ہیں۔ یہ عالم لاہوت کا نقطۂ آغاز ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مشاہدہ عالم ناسوت اور عالم لاہوت کے نقطۂ اتصال پر ہوا ہے۔

۴۴؎ یہ اسلوب بیان بتاتا ہے کہ سدرہ پر اُس وقت انوار و تجلیات کا ایسا ہجوم تھا کہ الفاظ اُس کی تعبیر و تصویر سے قاصر ہیں۔

۴۵؎ یعنی اِس ہجوم تجلیات کے باوجود آپ کی نگاہ نہ چوندھیائی، نہ بے قابو ہوئی، بلکہ آپ

اَفَرَءَيۡتُمُ اللّٰتَ وَالۡعُزّٰى ⑲ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الۡاُخۡرٰى ⑳ اَلَكُمُ

(اِس کے برخلاف جو کچھ تم مانتے ہو، اُس کا ماخذ کیا ہے)؟ ذرا بتاؤ، تم نے اِس لات اور عزیٰ اور تیسری، مگر درجے میں دوسری منات کی حقیقت پر کبھی غور بھی کیا ہے؟[47] (تم

پورے سکون، ضبط اور یک سوئی کے ساتھ دیکھتے رہے۔

[46] اِن نشانیوں کی کوئی تفصیل نہیں کی گئی، اِس لیے کہ نہ الفاظ اِس تفصیل کے متحمل ہو سکتے ہیں اور نہ وہ ہمارے علم و عقل اور تصورات کی گرفت میں آسکتی ہیں۔ تاہم آیت کے الفاظ سے واضح ہے کہ یہ نشانیاں اُن نشانیوں سے بالاتر تھیں جن کا مشاہدہ ہم انفس و آفاق میں کرتے ہیں۔

یہاں تک جو مباحث آئے ہیں، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اپنی تفسیر میں اُن کا خلاصہ کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جو لوگ قرآن کریم کو نجوم و کہانت کے قسم کی چیز قرار دے کر اُس کی وقعت گھٹانی چاہتے تھے، اُن کو خطاب کر کے مندرجہ ذیل حقائق اُن کے سامنے رکھے گئے ہیں:

۱۔ یہ قرآن جس روز جزا و سزا سے تم کو آگاہ کر رہا ہے، اُس کو کوئی معمولی بات نہ سمجھو۔ یہ تمھارے کاہنوں اور نجومیوں کی ہفوات کی قسم کی کوئی چیز نہیں ہے جو اُس کے پیش کرنے والے نے خود اپنے جی سے گھڑ لی ہو، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی وحی ہے جو اُس نے سب سے زیادہ مقرب فرشتے کے ذریعے سے اپنے اِس خاص بندے پر اِس لیے نازل کی ہے تاکہ وہ تمھیں اُس آنے والے دن سے، اُس کے ظہور سے پہلے، اچھی طرح آگاہ کر دے۔

۲۔ جس فرشتے کے ذریعے سے یہ وحی آئی ہے، وہ خدا کا نہایت مقرب فرشتہ ہے، اِس وجہ سے اِس اہم ذمہ داری کے لیے اللہ تعالیٰ نے اُس کا انتخاب فرمایا۔ وہ نہایت امین ہے، خدا کی امانت میں وہ کوئی خیانت نہیں کر سکتا۔ وہ نہایت قوی ہے، مجال نہیں ہے کہ کوئی دوسری طاقت اُس کو مرعوب یا مغلوب کر سکے۔ وہ تمام اعلیٰ علمی و اخلاقی صفات سے متصف ہے، اِس وجہ سے اِس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ وہ کسی مغالطے میں مبتلا ہو سکے یا کوئی اُسے دھوکا دے سکے، یا وہ کسی کی جانب داری یا کسی کی ناحق مخالفت کرے۔

الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ﴿٢١﴾ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴿٢٢﴾ اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ

انھیں خدا کی بیٹیاں کہتے ہو۔ سبحان اللہ)، تمھارے لیے بیٹے ہیں اور اُس کے لیے بیٹیاں؟

۳۔ اِس فرشتے کو پیغمبر نے دو بار نہایت وضاحت سے دیکھا ہے۔ پہلی بار اُس کا مشاہدہ افق اعلیٰ میں ہوا اور دوسری بار سدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔ اِس شبہے کی گنجایش نہیں ہے کہ یہ محض کوئی وہم تھا جو اُس کو لاحق ہوا اور اُس نے اُس کو تمھارے سامنے بیان کر دیا۔

۴۔ فرشتے نے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جو تعلیم دی، وہ ایک شفیق استاد کی طرح نہایت قریب سے، اُس کے اوپر جھک کر دی، جس کو پیغمبر نے اچھی طرح سنا اور سمجھا۔ یہ نہیں ہوا کہ دور سے اُس کے کانوں میں کوئی آواز آپڑی ہو جس کے سننے یا سمجھنے میں کوئی شبہ یا تردد لاحق ہوا ہو۔''
(تدبر قرآن ۸/۵۸)

۷۴؎ یہ سوال اپنے اندر استخفاف و تحقیر اور تعجب کا مضمون لیے ہوئے ہے۔ یعنی کہاں جبریل امین جیسی ہستی اور اُن کے غیر معمولی مردانہ اوصاف اور کہاں یہ دیویاں جنھیں تم خدا کی بیٹیاں بنائے بیٹھے ہو! آگے کی آیات سے واضح ہو جائے گا کہ یہ فرشتوں کے بت تھے جنھیں مشرکین عرب خدا کی بیٹیاں قرار دے کر اُن کی پرستش کرتے تھے۔ اِن کی عظمت تمام مشرکین کے نزدیک یکساں مسلم تھی اور اِن کی نسبت اُن کا عقیدہ تھا کہ 'تلك الغرانيق العلى، وان شفاعتهن لترتجى' (یہ بڑے مرتبے کی دیویاں ہیں اور پوری امید ہے کہ اِن کی شفاعت قبول کی جائے گی)۔ اِن میں سے لات کا نام 'الالهة' کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ اہل عرب جس طرح معبود اعظم کو 'الاله' کہتے تھے، اُسی طرح سب سے بڑی دیوی کے لیے اُنھوں نے 'الالهة' کا لفظ اختیار کیا جو کثرت استعمال سے 'اللات' ہو گیا۔ 'عزیٰ' 'عزیز' اور 'اعز' کی مونث ہے۔ صاف واضح ہے کہ یہ نام اللہ ہی کے ایک نام 'العزیز' کی رعایت سے رکھا گیا ہے۔ 'منات' 'منية' کے مادے سے ہے، یعنی وہ دیوی جس کے قرب کی تمنا کی جائے یا جو تمناؤں کے برآنے کا ذریعہ ہو۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''قرآن کے بیان سے یہ بات بھی واضح ہے کہ یہ تینوں دیویاں اِس اعتبار سے اگرچہ ایک ہی زمرے سے تعلق رکھنے والی تھیں کہ یہ سب عالی مرتبہ خیال کی جاتی تھیں۔ تاہم اِن میں باہم

سَمَّيْتُمُوهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ﴿۲۳﴾ ؕ

پھر تو یہ بڑی بھونڈی تقسیم ہوئی[۴۸] نہیں، یہ محض نام ہیں جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں، اِن کے حق میں اللہ نے کوئی سند نہیں اتاری۔ (اِن کی حماقت پر افسوس)، یہ محض وہم و گمان اور اپنے نفس کی خواہشوں کے پیرو ہیں، حالاں کہ اِن کے پاس اِن کے پروردگار کی طرف سے نہایت واضح ہدایت آ چکی ہے[۴۹]۔ ۱۹-۲۳

فرق مراتب بھی تھا۔ لات اور عزیٰ کا مرتبہ سب سے اونچا تھا۔ 'منات' اگرچہ زمرے میں اِنھی کے اندر شمار ہوتی تھی، لیکن مرتبے کے لحاظ سے یہ اِن سے فروتر تھی۔ چنانچہ قرآن نے اِس کا ذکر دو صفتوں کے ساتھ کیا ہے: ایک 'ثَالِثَة' اور دوسری 'اُخْرٰی'۔ پہلی صفت اُس کے زمرے کا پتا دیتی ہے کہ یہ اُنھی تین کی تیسری ہے۔ دوسری صفت 'اُخْرٰی' اُس کے درجے کا پتا دیتی ہے کہ ہر چند یہ شامل تو اُنھی میں تھی، لیکن یہ دوسرے نمبر پر تھی۔ 'اُولیٰ' اور 'اُخْرٰی' کے الفاظ درجے کو واضح کرنے کے لیے عربی زبان میں بھی معروف ہیں اور اِس مفہوم کے لیے قرآن میں بھی یہ آئے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۸/۶۱)

۴۸؎ اِن فقروں کا اسلوب طنزیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اول تو اللہ رب العٰلمین سے بیٹے بیٹیاں منسوب کرنا ہی پرلے درجے کی سفاہت ہے، لیکن تم نے مزید یہ ستم بھی کیا ہے کہ ایک ایسی چیز اُس کی طرف منسوب کر دی ہے جسے اپنے لیے باعث ذلت سمجھتے ہو۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کا مرتبہ تمھارے نزدیک تم سے بھی فروتر ہے۔

۴۹؎ اِس جملے میں اسلوب بدل گیا ہے۔ اُن کی محرومی اور بدبختی پر ملامت اور اُن کے فکر و خیال کی پستی پر اظہار افسوس کے لیے اللہ تعالیٰ نے غائب کا اسلوب اختیار فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اِس سے بڑھ کر بدنصیبی کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ قرآن مجید کی صورت میں خدا کی واضح ہدایت آ جانے کے بعد بھی یہ اپنے ظنون و اوہام اور خواہشات نفس کی پیروی پر اصرار کر رہے ہیں۔

اَمۡ لِلۡاِنۡسَانِ مَا تَمَنّٰی ﴿۲۴﴾ فَلِلّٰہِ الۡاٰخِرَۃُ وَ الۡاُوۡلٰی ﴿۲۵﴾ وَ کَمۡ مِّنۡ مَّلَکٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغۡنِیۡ شَفَاعَتُہُمۡ شَیۡئًا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اَنۡ یَّاۡذَنَ اللّٰہُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یَرۡضٰی ﴿۲۶﴾

اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ لَیُسَمُّوۡنَ الۡمَلٰٓئِکَۃَ تَسۡمِیَۃَ الۡاُنۡثٰی ﴿۲۷﴾

(یہ اپنی خواہش سے جو چاہیں بنالیں، لیکن) کیا آدمی وہ سب کچھ پالے گا جو اُس نے چاہا؟ (ہرگز نہیں)، سو (یاد رکھیں کہ) دنیا اور آخرت، سب اللہ ہی کے اختیار میں ہے، (اُس کے قوانین کسی کی خواہش سے نہیں بدلتے)۔ اور (اِن کے معبودوں کا کیا ذکر)، آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے ہیں جن کی شفاعت کچھ بھی کام نہ آسکے گی، مگر جب اللہ اجازت دے جس کو چاہے اور جس کے لیے پسند کرے۔۲۴-۲۶

جو آخرت کو نہیں مانتے، وہی فرشتوں کے نام عورتوں کے نام پر رکھتے ہیں[۵۰]، حالاں کہ

یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ شرک کا ماخذ بالعموم یہی دو چیزیں ہوتی ہیں۔ نفس چاہتا ہے کہ خدا کے تقرب اور اُس کی جنت کے حصول کی کوئی آسان راہ نکالی جائے اور شیطان اِس خواہش کو پورا کرنے کے لیے ظنون و اوہام کی ایک پوری دیو مالا بنا کر لے آتا ہے کہ فلاں اور فلاں کو خدا کے ہاں یہ درجہ حاصل ہے، اُسے معبود بنالو، دنیا اور آخرت، دونوں کی سعادتیں تمھارے دروازے پر ہوں گی۔

۵۰؎ یعنی جس طرح ماننے کا حق ہے، آخرت کو اُس طرح نہیں مانتے۔ اُن کے نزدیک یہ ایک عقیدہ تو ہے، مگر خدا کے کامل عدل کے ظہور کا دن نہیں ہے جس میں ہر ایک ٹھیک اپنے ایمان و عمل کے مطابق اپنے کیے کی جزا یا سزا پائے گا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اِس طرح کی باتیں ماننے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں کہ اگر آخرت ہوئی بھی تو ہمارے یہ دیوی دیوتا ہمارے لیے ڈھال بن جائیں گے اور ہمیں خدا کے عذاب سے بچالیں گے۔

وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـــًٔا ۝۲۸ فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ڏ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝۲۹ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۙ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى ۝۳۰

اُنھیں اِس معاملے کا کوئی علم نہیں ہے، وہ محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں[۵۱]، اور گمان حق کی جگہ کچھ بھی کام نہیں دے سکتا۔ اِس لیے، (اے پیغمبر)، اُن سے اعراض کرو جنھوں نے ہماری یاددہانی[۵۲] سے اعراض کیا ہے اور دنیا کی زندگی کے سوا جنھیں کچھ مطلوب نہیں ہے[۵۳]۔ اُن کا مبلغ علم یہی ہے[۵۴]۔ (اُن کو اب اُن کے حال پر چھوڑ دو)، اِس میں شبہ نہیں کہ تیرا پروردگار خوب جانتا ہے کہ اُس کے راستے سے کون بھٹک گیا ہے اور وہ اُن کو بھی خوب جانتا ہے جو (اُس کی) ہدایت پر ہیں[۵۵]۔ ۲۷-۳۰

۵۱۔ اصل میں لفظ 'الظَّنّ' آیا ہے۔ یہ یہاں علم کے مقابل میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی وہ بات جس کے حق میں نہ عقل و فطرت گواہی دیں اور نہ وحی کی شہادت موجود ہو، اِس لیے کہ علم انسان کو اِنھی دو ذرائع سے حاصل ہوتا ہے۔

۵۲۔ یعنی قرآن۔ اِس لیے کہ وہ آخرت اور اُس کے نتائج و عواقب کی یاددہانی کرتا ہے۔

۵۳۔ یہ اُن کے اعراض کی اصل علت بتائی ہے۔

۵۴۔ مطلب یہ ہے کہ یہ محض دنیا کے ظاہر ہی کو دیکھ سکتے ہیں اور اتنے تنگ نظر ہیں کہ اِسی پر ریجھ کر خدا کی اُس ابدی بادشاہی سے بے پروا ہو بیٹھے ہیں جو اِس دنیا کا باطن ہے اور جس کے وجود پر اِس کا ذرہ ذرہ شہادت دے رہا ہے۔

۵۵۔ یعنی جانتا ہے تو ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ بھی کرے گا جس کا وہ مستحق ہوگا۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۙ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ۚ ﴿٣١﴾ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ

زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، اللہ ہی کے اختیار میں ہے[۵۶]۔ اِس کا نتیجہ یہی نکلے گا کہ برائی کرنے والوں کو وہ اُن کے عمل کی سزا دے اور اُن لوگوں کو اچھی جزا دے جنھوں نے اچھے کام کیے[۵۷]، جو بڑے گناہوں اور کھلی بے حیائیوں سے بچتے رہے، مگر یہ کہ کبھی کچھ آلودہ ہو گئے[۵۸]۔ (وہ اُنھیں معاف فرما دے گا)، تیرے پروردگار کا دامن مغفرت یقیناً بہت وسیع ہے۔ (آدم کے بیٹو، تم اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہو)؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمھیں اُس وقت سے جانتا ہے، جب اُس نے تمھیں (براہ راست)

۵۶؎ اوپر کی آیات میں شرک اور شفاعت کی جو تردید فرمائی ہے، یہ اُس کا نتیجہ سامنے رکھ دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اپنے مزعومہ شرکا اور سفارشیوں کے اعتماد پر غافل بیٹھے ہوئے ہیں، وہ محض فریب نفس میں مبتلا ہیں۔ زمین و آسمان کا اختیار اللہ ہی کے پاس ہے۔ اُس کے فیصلوں پر کوئی اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ یہ اُس کے حضور میں پہنچیں گے تو اُس کے سوا کوئی مولیٰ و مرجع تلاش نہ کر سکیں گے۔

۵۷؎ یعنی بروں کو تو صرف برائی کا بدلہ ملے گا، اِس لیے کہ انصاف کا تقاضا یہی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ صاحب جود و کرم ہے، وہ نیکوں کو صرف نیکیوں کا صلہ نہیں دے گا، بلکہ اپنے افضال و عنایات سے بھی نوازے گا۔ جزا کے لیے اچھی جزا کے الفاظ اِسی حقیقت کی وضاحت کے لیے آئے ہیں۔

۵۸؎ یعنی اچھی جزا اِس رویے کے صلے میں ملے گی، اُس کے لیے کسی کی شفاعت، بزرگی اور حسب و نسب کی برتری کام نہ آئے گی۔ حق تلفی سے، جان و مال اور آبرو کے خلاف زیادتی سے اور بدکاریوں سے بچنا ہر حال میں ضروری ہے۔ یہ بڑے بڑے گناہ ہیں۔ جو لوگ اِن سے بچتے ہیں،

مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ﴿۳۲﴾

زمین سے اٹھایا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں ابھی جنین ہی تھے۔ سو اپنی پاکیزگی کے دعوے نہ کرو۔ (تمھارے لیے تقویٰ ہی باعث شرف ہے اور) جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے، اُنھیں وہ خوب جانتا ہے۔[59] ۳۱-۳۲

وہ چھوٹے گناہوں کے ارتکاب پر بھی راضی نہیں ہوتے۔ تاہم چلتے چلتے ٹھوکر لگ جائے تو اللہ اُنھیں توبہ و اصلاح کی توفیق دیتا ہے اور وہ اِس سے بھی اپنے آپ کو پاک کر لیتے ہیں۔ اِس کے لیے اصل میں 'اِلَّا اللَّمَمَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِن کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اِلْمَام' اور 'لَمَم' کے اصل معنی کسی جگہ ذرا دیر کے لیے اتر پڑنے کے ہیں۔ مجاہد اور ابن عباس سے 'لَمَم' کا مفہوم یہ نقل ہوا ہے کہ آدمی کسی گناہ میں آلودہ تو ہو جائے، لیکن پھر اُس سے کنارہ کش ہو جائے۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان سے یہ مطالبہ نہیں ہے کہ وہ معصوم بن کر زندگی گزارے۔ جذبات اور خواہشوں سے مغلوب ہو کر گناہ کا مرتکب ہو جانا اُس سے بعید نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ مطالبہ اُس سے ضرور ہے کہ اُس کی حس ایمانی اتنی بیدار رہے کہ کوئی گناہ اُس کی زندگی کا اِس طرح احاطہ نہ کر لے کہ اُس کے لیے اُس سے پیچھا چھڑانا ہی ناممکن ہو جائے۔ بلکہ جب بھی اُس کا نفس اُس کو ٹھوکر کھلائے، وہ متنبہ ہوتے ہی توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لے۔ جو لوگ اِس طرح زندگی گزارتے ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کے گناہوں کو معاف فرما دے گا۔ اُس کا دامن مغفرت بہت وسیع ہے۔'' (تدبر قرآن ۸/۷۱)

۵۹ یعنی ایاز قدر خود بہ شناس۔ اپنی حیثیت کو سمجھو، پانی، کیچڑ اور پھر ذلیل پانی کی ایک بوند سے پیدا ہونے والی مخلوق کے لیے زیبا نہیں ہے کہ اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھ کر کسی استحقاق کا مطالبہ کرے۔ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ مخاطبین پاسبان حرم اور ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کی اولاد تھے اور

اَفَرَءَیْتَ الَّذِیْ تَوَلّٰیﺫ ﴿۳۳﴾ وَاَعْطٰی قَلِیْلًا وَّاَکْدٰی ﴿۳۴﴾ اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَیْبِ فَهُوَ یَرٰی ﴿۳۵﴾ اَمْ لَمْ یُنَبَّاْ بِمَا فِیْ صُحُفِ مُوْسٰی ﴿۳۶﴾ وَاِبْرٰهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰٓی ﴿۳۷﴾

(یہ بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں)، سو کیا تم نے اُس شخص کو دیکھا ہے جس نے منہ پھیر لیا اور (خدا کے دیے ہوئے رزق میں سے) تھوڑا سا دے کر رک گیا؟[60] (وہ سمجھتا ہے کہ آخرت میں بھی عالی مقام ہوگا)۔ کیا اُس کے پاس غیب کا علم ہے کہ وہ (اپنے مراتب کو) دیکھ رہا ہے؟[61] کیا اُسے اُن باتوں کی خبر نہیں پہنچی جو موسیٰ کے صحیفوں میں ہیں اور ابراہیم کے

اپنی اِن نسبتوں کی وجہ سے اُنھی اوہام میں مبتلا تھے جن میں اب مسلمان مبتلا ہیں اور اپنے آپ کو امت مرحومہ قرار دے کر ایمان و عمل کی تمام ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو چکے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یہاں تک کہ اُن کے اندر کتنے خاندان ہیں جن میں پیدا ہو جانا ہی جنت کی ضمانت ہے۔ اور کتنے قبرستان ہیں جن میں دفن ہونا ہی ابدی بادشاہی کی بشارت ہے۔ اِس سے بحث نہیں کہ پیدا ہونے والے اور مرنے والے کے عقائد و اعمال کیا رہے!“ (تدبر قرآن ۸/۷۳)

۶۰؎ اصل میں لفظ ’اَکْدٰی‘ آیا ہے۔ یہ ’اکدی الحافر‘ کے محاورے سے نکلا ہوا لفظ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... ’اکدی الحافر‘ کا مفہوم یہ ہے کہ کھودنے والے کے آگے کھدائی کے وقت کوئی ایسی چٹان آ گئی جس کا توڑنا اُس کے لیے دشوار ہو گیا۔ یہ بخیلوں کی عام روش بیان ہوئی ہے کہ اگر مارے باندھے کبھی کچھ خرچ کرتے بھی ہیں تو تھوڑا سا خرچ کرتے ہی اُن پر بخل کا ایسا دورہ پڑتا ہے کہ اُن کی مٹھیاں بھنچ جاتی ہیں اور اگر کوئی اُن کو اکسانے کی کوشش کرے تو وہ اُس کا منہ نوچنے کو دوڑتے ہیں کہ کہاں تک خرچ کیے جاؤں، چلو ہٹو، میں تو ڈھیروں مال لٹا چکا ہوں۔“

(تدبر قرآن ۸/۷۵)

۶۱؎ ’اَفَرَءَیْتَ الَّذِیْ‘ سے یہاں تک یہ اُن لوگوں کے کردار کی تمثیل ہے جو اونچے مراتب

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ﴿۳۸﴾ وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ﴿۳۹﴾ وَاَنَّ سَعْیَہٗ

صحیفوں میں بھی، جس نے وفا کا حق ادا کر دیا؟[۶۲] یہ کہ کوئی جان دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گی اور یہ کہ انسان کو آخرت میں وہی ملے گا جو اُس نے دنیا میں کمایا ہے[۶۳] اور یہ کہ

کے مدعی تھے، مگر خدا کے دیے ہوئے رزق میں سے اُس کی راہ میں کچھ دینے کے لیے تیار نہیں تھے اور اگر کبھی دیتے تھے تو محض چھدا تارنے کے لیے۔ 'الذی' اور 'التی' عربی زبان میں جس طرح متعین افراد کے لیے آتے ہیں، اُسی طرح تمثیلی کرداروں کو بیان کرنے کے لیے بھی آتے ہیں۔ یہاں موقع دلیل ہے کہ 'اَلَّذِیْ' اِسی مقصد سے آیا ہے۔ اسلوب کلام، اگر غور کیجیے تو طنز و تحقیر کا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اِن بوالفضولوں کو دیکھو، اونچے مراتب کے مدعی ہیں، مگر خدا کی راہ میں کچھ دینے کا حوصلہ کر بھی لیں تو تھوڑا سا خرچ کر کے اِس طرح رک جاتے ہیں، گویا زمین کھودنے نکلے تھے کہ آگے کوئی ایسی چٹان آگئی جس کا توڑنا ناممکن ہو گیا ہے۔

۶۲ یعنی وہ صحیفے جن میں اِن پیغمبروں کی تعلیمات جمع کر دی گئی ہیں۔ یہاں اگرچہ مخاطب اصلاً قریش ہیں، مگر اِس دور میں اہل کتاب بھی مختلف حوالوں سے زیر بحث رہتے تھے، اِس لیے ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ حضرت موسیٰ کے صحیفوں کا ذکر بھی ہوا ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ، البتہ اِس صفت کا اضافہ ہے کہ جس نے وفا کا حق ادا کر دیا۔ اِس کی وجہ کیا ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''...اِس صفت کی یاددہانی میں قریش اور اہل کتاب، دونوں کو تنبیہ ہے کہ اُن کو دنیا اور آخرت میں جو رتبۂ بلند ملا، وہ اپنے رب کے ساتھ کامل وفاداری کے صلے میں ملا اور تمھارا حال یہ ہے کہ کرنے کرانے کے تو کچھ نہیں، لیکن ابراہیم کے نام پر استخوان فروشی کی ایک دکان کھول رکھی ہے۔'' (تدبر قرآن ۸/۷۶)

۶۳ یہ شفاعت سے متعلق تمام باطل تصورات کی تردید بھی ہے اور اِس حقیقت کا نہایت واضح بیان بھی کہ آدمی کو خدا کے ہاں دوسروں کی نیکی یا بدی سے کوئی فائدہ یا نقصان نہیں پہنچ سکتا، الّا یہ کہ

سَوۡفَ یُرٰی ﴿۴۰﴾ ثُمَّ یُجۡزٰىہُ الۡجَزَآءَ الۡاَوۡفٰی ﴿۴۱﴾ وَ اَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الۡمُنۡتَہٰی ﴿۴۲﴾

جو کچھ اُس نے کمایا ہے، وہ عنقریب دیکھا جائے گا، پھر اُس کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور یہ کہ آخر کار پہنچنا تیرے رب ہی کے پاس ہے۔[۶۴] ۳۳-۴۲

اُس کی سعی و جہد کو بالواسطہ یا بلاواسطہ اُس نیکی یا بدی میں دخل ہو۔ چنانچہ ہر شخص کو متنبہ رہنا چاہیے کہ خدا کے حضور میں کوئی کسی کے کام نہ آئے گا۔ ہر ایک کو اپنا بوجھ خود اٹھانا ہوگا اور جس کو جو کچھ ملے گا، اپنی ہی محنت کے صلے میں ملے گا۔ نہ نوح اپنے بیٹے کو بچا سکیں گے، نہ ابراہیم خلیل اللہ کی دعا اُن کے باپ کے کام آئے گی اور نہ لوط جیسے جلیل القدر پیغمبر اپنی بیوی کے لیے ڈھال بن سکیں گے۔

توبہ و استغفار سے متعلق یہ بات، البتہ واضح رہنی چاہیے کہ یہ بھی آدمی کی اپنی سعی ہے۔ چنانچہ قرآن میں جس شفاعت کا اثبات ہے، وہ اِس کے سوا کچھ نہیں کہ بندہ جب مغفرت چاہتا ہے تو طالب مغفرت کے ساتھ ہو کر یہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی درخواست ہے۔ شفاعت کا اصل مفہوم یہی ہے۔ لہٰذا بندے کی طرف سے توبہ و استغفار کے بغیر اِس کا کوئی تصور نہیں ہے۔ شفاعت کرنے والا استغفار میں فرد ثانی اور مغفرت چاہنے والے کی زبان ہوتا ہے اور دعا و مناجات اور خضوع و تذلل میں اُس کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ قرآن نے اِس کے بارے میں چند باتیں مزید واضح فرمائی ہیں:

ایک یہ کہ شفاعت کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اُس کی اجازت کے بغیر کوئی شخص بھی شفاعت نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ اُس کے مقرب فرشتے بھی اپنی طرف سے آگے بڑھ کر کوئی بات نہیں کہہ سکتے۔ اِس لیے پہلے خدا کو راضی کرنا ضروری ہے تاکہ شفاعت کا اذن ملے اور وہ قبول بھی ہو جائے۔

دوسری یہ کہ اذن الٰہی کے بعد بھی اُسی کے بارے میں زبان کھولنے کی اجازت ہوگی جس کے لیے اللہ پسند فرمائے گا۔ کوئی شخص اپنی مرضی سے کسی کے متعلق کوئی بات نہ کر سکے گا۔

تیسری یہ کہ جس کے لیے اللہ پسند فرمائے گا، اُس کے متعلق بھی وہی بات کہی جائے گی جو ہر لحاظ سے صحیح ہوگی۔

وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى ﴿۴۳﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا ﴿۴۴﴾ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۴۵﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ﴿۴۶﴾ وَاَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى ﴿۴۷﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَاَقْنٰى ﴿۴۸﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ﴿۴۹﴾ وَاَنَّهٗ اَهْلَكَ عَادَا الْاُوْلٰى ﴿۵۰﴾ وَثَمُوْدَاۡ فَمَاۤ اَبْقٰى ﴿۵۱﴾ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ

اور[۶۵] (اِس پر مزید) یہ کہ وہی ہنساتا اور وہی رلاتا ہے اور یہ کہ وہی مارتا اور وہی جلاتا ہے، اور یہ کہ پانی کی ایک بوند سے جب وہ ٹپکا دی جاتی ہے، وہی نر و مادہ کا جوڑا پیدا کرتا ہے، اور یہ کہ اُسی کے ذمے ہے دوبارہ اٹھانا، اور یہ کہ وہی غنی کرتا اور سرمایہ دار بناتا ہے، اور یہ کہ وہی شعریٰ کا رب ہے[۶۶]۔ ۴۳-۴۹

۶۴۔ یعنی کوئی اِس غلط فہمی میں نہ رہے کہ مرنے کے بعد کوئی اور اُس کا مولیٰ و مرجع بن جائے گا اور اُسے خدا کے حضور میں جواب دہی سے بچا لے گا۔ سب کی پیشی خدا ہی کے حضور میں ہوگی اور اُس کے فیصلے بغیر کسی مداخلت کے، جس طرح وہ چاہے گا، نافذ ہو جائیں گے۔

۶۵۔ موسیٰ و ابراہیم کے صحیفوں کا حوالہ پچھلی آیت پر ختم ہوا۔ یہاں سے آگے اب قرآن کے عام اسلوب کے مطابق توسیع کلام ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...قرآن میں جگہ جگہ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ایک قول کا حوالہ دیا جاتا ہے اور اُس کے ساتھ ایسے اضافے بھی کر دیے جاتے ہیں جو اگرچہ لفظاً تو اُس قول کا جزو نہیں ہوتے، لیکن معناً اُسی پر مبنی ہوتے ہیں۔ اِس سے بات کی پوری وضاحت بھی ہو جاتی ہے اور کلام مطابق حال بھی ہو جاتا ہے۔" (تدبر قرآن ۸/۸۰)

۶۶۔ 'شِعْرٰی' ایک ستارے کا نام ہے جو موسم بہار میں طلوع ہوتا ہے۔ انگریزی میں اِسے sirius کہتے ہیں۔ اہل عرب اِس کو بہت مبارک سمجھتے تھے اور بہار کی تمام شادابیاں اِسی سے منسوب کرتے تھے۔ مدعا یہ ہے کہ جب غم اور خوشی، موت اور زندگی، خلق و تدبیر اور فقر و غنا، یہاں تک کہ

قَبۡلُ ؕ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا هُمۡ اَظۡلَمَ وَ اَطۡغٰى ﴿۵۲﴾ وَ الۡمُؤۡتَفِكَةَ اَهۡوٰى ﴿۵۳﴾ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ﴿۵۴﴾ فَبِاَىِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ﴿۵۵﴾

هٰذَا نَذِيۡرٌ مِّنَ النُّذُرِ الۡاُوۡلٰى ﴿۵۶﴾ اَزِفَتِ الۡاٰزِفَةُ ﴿۵۷﴾ لَيۡسَ لَهَا مِنۡ

اور یہ کہ عاد اولیٰ[۶۷] کو اُسی نے ہلاک کیا اور ثمود کو بھی، پھر کسی کو باقی نہیں چھوڑا۔ اور اِن سے پہلے قوم نوح کو بھی، اِس لیے کہ یہ سب تھے ہی نہایت ظالم اور سرکش لوگ۔ اور (قوم لوط کی) اوندھی گری ہوئی بستی[۶۸] کو بھی اُس نے اٹھا کر پھینک دیا، پھر اُن پر چھا دیا جو کچھ کہ چھا دیا[۶۹]۔ اب بتاؤ، تم اپنے پروردگار کے کن کن کرشموں کے بارے میں جھگڑتے رہو گے؟ ۵۰-۵۵

یہ اگلے نذیروں ہی میں سے ایک نذیر ہے[۷۰]۔ آنے والی آ پہنچی[۷۱]۔ اللہ کے سوا اِسے

بعث بعد الموت، سب اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے تو کوئی دوسرا کس حق کی بنا پر مولیٰ و مرجع بنے گا۔ یہ مال و ثروت جس کی فراوانی تمھیں آمادۂ تکبر کرتی ہے، یہ بھی خدا کی دین ہے۔ اِس میں کسی شعریٰ کو کوئی دخل نہیں ہے۔ شعریٰ کا رب بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

۶۷؎ عاد کو یہاں عاد اولیٰ اِس لیے کہا ہے کہ ثمود اِنھی کے بقایا میں سے تھے اور اُنھیں عاد ثانی کہا جاتا ہے۔

۶۸؎ اصل میں لفظ 'الْمُؤْتَفِكَة' آیا ہے۔ یہ ٹھیک اُس عذاب کی تعبیر ہے جو قوم لوط پر آیا۔ قرآن نے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن پر غبار انگیز ہوا بھیجی جو تند ہو کر طوفان بن گئی اور اُس نے اُن پر اِس طرح پتھروں کی بارش کی کہ اُن کے گھر بھی الٹ کر اوندھے ہو گئے۔

۶۹؎ یہ اسلوب اُس وقت اختیار کیا جاتا ہے، جب کسی ایسی صورت حال کو تعبیر کرنا پیش نظر ہو جو الفاظ کی گرفت سے باہر ہو جائے۔

۷۰؎ یعنی قرآن مجید۔ سورہ کی ابتدا اِسی کے ذکر سے ہوئی ہے، اِس لیے اسم اشارہ مشار الیہ

دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ﴿٥٨﴾ اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ﴿٥٩﴾ وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ ﴿٦٠﴾ وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ ﴿٦١﴾ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ﴿٦٢﴾ السجدة

کوئی ہٹانے والا نہیں ہے۔ پھر کیا ہماری اِس بات پر تعجب کرتے ہو؟ ہنستے ہو، روتے نہیں؟ تم (پندار کے نشے میں) غافل پڑے ہو؟ سو (ہوش میں آؤ اور) اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤ اور اُس کی بندگی کرو۔ ۵۶-۶۲

کے ذکر کے بغیر آ گیا ہے۔

۱؎ اشارہ ہے اُس عذاب کی طرف جو رسولوں کی تکذیب کے نتیجے میں اُن کی قوموں پر لازماً آتا ہے۔

لاہور

۲/ستمبر ۲۰۰۹ء

القمر - الرحمٰن

۵۴ــــــ۵۵

القمر - الرحمٰن

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ دونوں میں ترجیع ہے، چنانچہ یہ ظاہری مناسبت بھی بالکل واضح ہے۔ دونوں سورتوں کا موضوع اثبات قیامت اور اُس کے حوالے سے انذار و بشارت ہے۔ پہلی سورہ میں خدا کی دینونت کے ظہور اور دوسری سورہ میں انفس و آفاق کے اندر اُس کی رحمت، قدرت اور حکمت و ربوبیت کی نشانیوں سے استدلال کیا گیا ہے۔

دونوں میں خطاب قریش سے ہے جو عذاب کے لیے کسی نشانی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اُنھیں ایک ایک واقعے اور ایک ایک نشانی کی طرف توجہ دلا کر متنبہ کیا گیا ہے کہ اِن نشانیوں کو کیوں نہیں دیکھتے اور اِن واقعات سے کیوں عبرت حاصل نہیں کرتے؟ ترجیع کی آیتیں دونوں سورتوں میں اِنھی ہٹ دھرم اور ضدی مخاطبین کو جھنجھوڑنے کے لیے آئی ہیں۔

اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ ام القریٰ مکہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ انذار عام میں نازل ہوئی ہیں۔

سورۃ القمر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَانۡشَقَّ الۡقَمَرُ ① وَاِنۡ یَّرَوۡا اٰیَۃً یُّعۡرِضُوۡا وَیَقُوۡلُوۡا

— ۱ —

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

وہ گھڑی[1] قریب آ گئی جس سے اِنھیں خبردار کیا جا رہا ہے اور چاند شق ہو گیا[2]۔ (مگر یہ نہ مانیں گے) اور خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، اُس سے منہ ہی موڑیں گے اور

۱؎ یعنی قیامت کی گھڑی جو رسول کے مکذبین کے لیے اُس عذاب سے شروع ہو جاتی ہے جو اُس کی تکذیب پر اصرار کے نتیجے میں اُن پر لازماً آتا ہے۔

۲؎ قیامت کی جس گھڑی سے خبردار کیا ہے، یہ اُس کی علامت بیان ہوئی ہے۔ سورۂ حٰم السجدہ (۴۱) کی آیت ۵۳ میں فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انذار کی تقویت اور آپ کی قوم پر اتمام حجت کے لیے اللہ تعالیٰ عنقریب انفس و آفاق میں اپنی بعض غیر معمولی نشانیاں دکھائیں گے۔ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اِنھی میں سے ایک نشانی چاند کے شق ہو جانے کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''اِس طرح کی نشانیوں کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ رسول نے اِن کو اپنے معجزے کے طور پر پیش کیا ہو، بلکہ اِن کا ظہور کسی اعلان و تحدی کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ کفار نے بعینہٖ اُسی نشانی کا مطالبہ کیا ہو جو ظاہر ہوئی، بلکہ اُن کی طرف سے کسی مطالبے کے بغیر محض اِس لیے بھی اِن کا ظہور ہوتا ہے کہ کفار کے پیش کردہ شبہات کا اُن کو جواب مل جائے۔ کفار قیامت کو جو بہت بعید از عقل چیز خیال کرتے تھے، اُس کا ایک بہت بڑا سبب یہ بھی تھا کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ یہ ساری کائنات ایک دن بالکل درہم برہم ہو جائے۔ پہاڑوں سے

سِحۡرٌ مُّسۡتَمِرٌّ ﴿۲﴾ وَکَذَّبُوۡا وَاتَّبَعُوۡۤا اَہۡوَآءَہُمۡ وَکُلُّ اَمۡرٍ مُّسۡتَقِرٌّ ﴿۳﴾ وَلَقَدۡ

کہیں گے: یہ تو جادو ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے[2]۔ (چنانچہ یہی ہوا ہے) اور اِنھوں نے اب بھی جھٹلا دیا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کی ہے[3]۔ اور (ہم نے اُسی وقت اِن کو نہیں پکڑا، اِس لیے کہ ہمارے ہاں) ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔

متعلق اُن کا جو سوال قرآن میں نقل ہوا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن چیزوں کو وہ بالکل اٹل، غیر متزلزل اور غیر فانی سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے شق قمر کی نشانی دکھا کر اُن کو بتایا کہ اِس کائنات کی چیزوں میں سے کوئی چیز بھی، خواہ وہ کتنی ہی عظیم ہو، نہ خود مختار ہے، نہ غیر فانی، نہ غیر متزلزل، بلکہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہے۔ وہ جب چاہے گا، اِن سب کو درہم برہم کر کے رکھ دے گا۔'' (تدبر قرآن ۸/۹۱)

[3] یہ جملہ اِس بات کی صریح دلیل ہے کہ شق قمر کا یہ واقعہ مستقبل کی کوئی خبر نہیں ہے، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیش آنے والا ایک واقعہ ہے جس سے قرآن نے عذاب اور قیامت کے وقوع پر استدلال کیا ہے۔ اِس لیے کہ 'اِنۡشَقَّ الۡقَمَرُ' کے معنی اگر یہ کیے جائیں کہ چاند شق ہو جائے گا تو اِس کے بعد یہ جملہ بالکل بے جوڑ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہجرت سے تقریباً ۵ سال پہلے پیش آیا۔ قمری مہینے کی چودھویں رات تھی۔ چاند تھوڑی دیر پہلے طلوع ہوا تھا۔ یکایک وہ شق ہوا اور اُس کا ایک ٹکڑا سامنے کی پہاڑی کے ایک طرف اور دوسرا ٹکڑا دوسری طرف نظر آیا۔ ایک لحظے کے لیے لوگوں نے یہ کیفیت دیکھی اور پھر دونوں ٹکڑے باہم مل گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُس وقت منیٰ میں تشریف فرما تھے۔ آپ نے لوگوں کو توجہ دلائی کہ خدا کی یہ نشانی دیکھو اور گواہ رہو۔ قریش نے اِسے جادو قرار دے کر جھٹلانے کی کوشش کی*۔ قرآن نے اِسی پر تبصرہ کیا ہے کہ اِس طرح کی ہر نشانی کے بارے میں یہ منکرین یہی

* بخاری، رقم ۳۶۵۶، ۴۵۸۳۔ احمد، رقم ۱۶۷۹۶۔

جَآءَهُمۡ مِّنَ الۡاَنۡۢبَآءِ مَا فِيۡهِ مُزۡدَجَرٌ ۝۴ حِكۡمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغۡنِ النُّذُرُ ۝۵
فَتَوَلَّ عَنۡهُمۡ ۘ يَوۡمَ يَدۡعُ الدَّاعِ اِلٰى شَىۡءٍ نُّكُرٍ ۝۶ خُشَّعًا اَبۡصَارُهُمۡ يَخۡرُجُوۡنَ
مِنَ الۡاَجۡدَاثِ كَاَنَّهُمۡ جَرَادٌ مُّنۡتَشِرٌ ۝۷ مُّهۡطِعِيۡنَ اِلَى الدَّاعِ ؕ يَقُوۡلُ
الۡكٰفِرُوۡنَ هٰذَا يَوۡمٌ عَسِرٌ ۝۸

القمر
۵۴

اِن کے سامنے ماضی کی وہ سرگذشتیں آ چکی ہیں جن میں اِن کے لیے بہت کچھ سامانِ عبرت ہے، نہایت دل نشیں حکمت۔ مگر تنبیہات (اِن سرکشوں کے معاملے میں) کیا کام دیں گی! اِس لیے اِن سے رُخ پھیر لو اور اُس دن کا انتظار کرو[۵]، جس دن پکارنے والا اُس چیز کے لیے پکارے گا جو سخت ناگوار ہوگی۔ اِن کی نگاہیں اُس دن جھکی ہوں گی۔ یہ پکارنے والے کی طرف دوڑتے ہوئے اِس طرح قبروں سے نکلیں گے گویا بکھری ہوئی ٹڈیاں ہیں۔ اُس وقت یہ منکر کہیں گے: یہ دن تو بہت مشکل آیا ہے۔ ۱-۸

کہیں گے کہ جادو ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے۔ اِس سے وہ یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ جادو ہونے کے لحاظ سے بھی اِس میں کوئی ندرت نہیں ہے۔ یہ اُسی طرح کے کرشمے ہیں جو اِس سے پہلے کے جادوگر دکھاتے رہے اور جو برابر منتقل ہوتے چلے آ رہے ہیں۔

۴؎ یہ تکذیب کی علت بیان فرمائی ہے کہ یہ اپنی خواہشوں کے غلام ہو چکے ہیں، اِس لیے خیال کرتے ہیں کہ جزا و سزا کو مانیں گے تو اِن خواہشوں سے دست بردار ہونا پڑے گا، لہٰذا انکار کر دیتے ہیں اور پیغمبر کو جھٹلانے کے لیے طرح طرح کی سخن سازیاں کرتے ہیں۔

۵؎ اصل الفاظ ہیں: 'فَتَوَلَّ عَنۡهُمۡ، يَوۡمَ يَدۡعُ الدَّاعِ'۔ جملے کی تالیف سے واضح ہے کہ 'تَوَلَّ' یہاں 'اِنۡتَظِرۡ' کے مفہوم پر متضمن ہے۔ ہم نے ترجمے میں اِسے کھول دیا ہے۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا وَقَالُوْا مَجْنُوْنٌ وَّازْدُجِرَ ﴿٩﴾ فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ﴿١٠﴾ فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ﴿١١﴾ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ﴿١٢﴾ وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ﴿١٣﴾ تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا ۚ جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ﴿١٤﴾ وَلَقَدْ

اِن[6] سے پہلے نوح کی قوم نے بھی اِسی طرح جھٹلایا۔ سو ہمارے بندے[7] کو اُنھوں نے جھوٹا قرار دیا اور کہا کہ یہ دیوانہ ہے[8] اور وہ بری طرح جھڑکا گیا۔ آخر اُس نے اپنے پروردگار سے فریاد کی کہ میں مغلوب ہو چکا، اب تو اِن سے بدلہ لے۔ تب ہم نے موسلا دھار بارش سے آسمان کے دروازے کھول دیے اور زمین کو (اِس طرح) پھاڑا کہ وہ چشمے ہی چشمے ہو گئی[9]۔ پھر زمین و آسمان کا پانی اُس نشان پر باہم مل گیا جو اُس کے لیے مقرر کیا گیا تھا اور نوح کو ہم نے ایک تختوں اور کیلوں والی پر اٹھا لیا[10] جو

۶۔ اِس سے آگے اُسی استدلال کی تفصیل ہے جو آیت ۴ میں بالاجمال بیان ہوا ہے۔ یہ رسولوں کی بعثت کے بعد ظہور دینونت کے واقعات ہیں جو تاریخی ترتیب سے بیان کیے گئے ہیں۔

۷۔ اصل میں لفظ 'عَبْدَنَا' آیا ہے۔ نوح علیہ السلام کے لیے اِس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس التفات و محبت کا اظہار ہو رہا ہے، وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

۸۔ مدعا یہ تھا کہ اِس شخص کو عذاب اور قیامت کا خبط ہو گیا ہے۔ اب کوئی اور چیز اِسے نظر نہیں آتی، اٹھتے بیٹھتے عذاب ہی آتا دکھائی دیتا ہے۔

۹۔ یہ اُس طوفان کی تصویر ہے جو نوح علیہ السلام کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اُن کی قوم پر آیا۔

۱۰۔ نوح علیہ السلام کی کشتی کے لیے اِس تعبیر میں بڑی بلاغت ہے۔ استاذ امام امین احسن

تَرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۵﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۱۶﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۷﴾

ہماری حفاظت میں چلتی رہی۔ یہ ہم نے اِس لیے کیا کہ ہم اُس کی خاطر بدلہ لیں جس کی ناقدری کی گئی۔ اور اِس سرگذشت کو ہم نے (عبرت کی) ایک نشانی بنا کر چھوڑ دیا۔ پھر ہے کوئی عبرت حاصل کرنے والا؟ سو دیکھ لو، کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھی میری تنبیہ[11]! ہم نے اِس قرآن کو یاددہانی کے لیے نہایت موزوں بنا دیا ہے[12]۔ پھر کیا ہے کوئی یاددہانی حاصل کرنے والا؟ ۹-۱۷

القمر ۵۴

اصلاحی نے اِس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”...اِس کا ذکر اِس کے اجزاے تعمیر کی تفصیل کے ساتھ یہاں، میرے نزدیک، اللہ تعالیٰ کی قدرت، حکمت، عنایت، رحمت اور شان کے اظہار کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طوفان نے پوری قوم کی قوم کا بیڑا غرق کر دیا، جس سے کوئی متنفس بھی نہ بچ سکا، اُس سے اللہ تعالیٰ نے اپنے جن بندوں کو بچانا چاہا، اُن کو میخوں سے جڑے ہوئے لکڑی کے تختوں پر بچا لیا۔ یعنی اصل چیز اللہ تعالیٰ کی رحمت و عنایت ہے، وہ شامل حال ہو تو لکڑی کے چند تختے طوفان نوح سے بچا لیتے ہیں اور وہ شامل حال نہ ہو تو بڑے سے بڑے جنگی جہاز چشم زدن میں بلبلے کی طرح بیٹھ جاتے ہیں اور مضبوط سے مضبوط بند تنکوں کی طرح سیلاب کے زور میں بہ جاتے ہیں۔“

(تدبر قرآن ۸/۹۸)

۱۱۔ اصل میں لفظ ’نُذُرِ‘ آیا ہے۔ یہ انذار سے اسم ہے، یعنی ڈراوا، تنبیہ، آگاہی اور تہدید و وعید۔

۱۲۔ اصل میں لفظ ’یَسَّرْنَا‘ آیا ہے۔ اِس کے معنی محض آسان بنانے کے نہیں ہیں، بلکہ کسی چیز کو پیش نظر مقصد کے لیے موزوں بنانے اور تمام لوازم و متعلقات سے آراستہ کر کے پوری طرح تیار کر دینے کے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ تمھاری تعلیم و تذکیر کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ قرآن اتارا ہے جو

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿١٨﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ﴿١٩﴾ تَنْزِعُ النَّاسَ ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ﴿٢٠﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿٢١﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿٢٢﴾

اِسی طرح عاد نے جھٹلایا تو دیکھ لو کہ کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھی میری تنبیہ! ہم نے ایک پیہم نحوست کے دن اُن پر بادِ تند مسلط کر دی[۱۳] جو لوگوں کو اِس طرح اکھاڑ پھینکتی تھی، جیسے وہ اکھڑی ہوئی کھجوروں کے تنے ہوں۔ سو دیکھ لو کہ کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھی میری تنبیہ! ہم نے اِس قرآن کو یاددہانی کے لیے نہایت موزوں بنا دیا ہے۔ پھر کیا ہے کوئی یاددہانی حاصل کرنے والا؟ ۱۸-۲۲

تمھاری فصیح و بلیغ ٹکسالی زبان میں ہے؛ اسے تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا جا رہا ہے تاکہ پوری جمعیت خاطر کے ساتھ اِس سے استفادہ کر سکو؛ اِس کی سورتیں محکم بھی ہیں اور مفصل بھی تاکہ ایجاز کے طالب اِنھیں آسانی کے ساتھ حرز جاں بنالیں اور وضاحت کے خوگر ہر چیز کو تفصیل کے ساتھ سمجھ لیں؛ ایک ہی مضمون کو اتنی مختلف صورتوں اور گوناگوں پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے کہ کسی معاملے میں کوئی ابہام باقی نہ رہے؛ سورتیں اِس طرح ترتیب دی گئی ہیں کہ یہ ترتیب بجاے خود فہم مدعا کی کلید بن گئی ہے۔ لہٰذا خدا کی اِس عنایت اور اِس نعمت عظمیٰ سے کیوں فائدہ نہیں اٹھاتے؟ تم کیوں یہ چاہتے ہو کہ اِس کے بجاے عذاب کا تازیانہ تمھاری پیٹھ پر برسا دیا جائے؟

۱۳؎ بادِ تند کے لیے اصل میں 'صَرْصَر' کا لفظ آیا ہے۔ یہ شمال کی اُس طوفانی ہوا کو کہتے ہیں جو سردیوں میں چلتی ہے۔ پیہم نحوست کے دن سے مراد کوئی معین دن نہیں ہے، بلکہ عربی زبان کے عام اسلوب کے مطابق وقت اور زمانہ ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ یہی مضمون 'اَيَّامٌ نَّحِسَات' کے الفاظ

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ﴿٢٣﴾ فَقَالُوْٓا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ﴿٢٤﴾ ءَاُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ﴿٢٥﴾ سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ﴿٢٦﴾ اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ﴿٢٧﴾ وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ﴿٢٨﴾ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ﴿٢٩﴾ فَكَيْفَ كَانَ

القمر ۵۴

ثمود نے بھی اِس تنبیہ کو جھٹلا دیا اور کہنے لگے: کیا ہم اپنے ہی اندر کے ایک اکیلے آدمی کی پیروی کریں گے؟ اِس کے معنی تو یہ ہیں کہ ہم فی الواقع گم راہی میں پڑے اور جہنم میں گئے۔[۱۴] کیا ہم میں سے اِسی پر یاددہانی نازل ہوئی ہے؟ نہیں، بلکہ یہ پرلے درجے کا جھوٹا اور برخود غلط ہے۔ اچھا، یہ کل ہی جان لیں گے کہ کون پرلے درجے کا جھوٹا اور برخود غلط ہے۔ ہم اونٹنی کو اِن کے لیے آزمایش بنا کر بھیجنے والے ہیں، سو اِن کو دیکھتے رہو اور صبر کرو اور اِنھیں بتا دو کہ پانی اِن میں اور اونٹنی میں بانٹ دیا گیا ہے۔ اب ہر ایک اپنی باری کے دن آئے گا۔[۱۵] اِس پر اُنھوں نے اپنے سردار سے فریاد

میں بیان ہوا ہے اور یہ تصریح بھی آئی ہے کہ یہ عذاب اُن پر سات راتیں اور آٹھ دن مسلط رہا۔ لفظ 'مُسْتَمِرّ' سے اِسی حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

۱۴؎ یہ اُنھوں نے پیغمبر کی کہی ہوئی بات خود اُنھی پر الٹ دی ہے۔ یعنی تم سمجھتے ہو کہ میری بات نہیں مانو گے تو گم راہی میں ہو گے اور جہنم میں پڑو گے، مگر ہم تو اِس کے برخلاف یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے ہی اندر کے ایک اکیلے آدمی کو رسول مان لیا تو گم راہی میں ہوں گے اور جہنم میں پڑیں گے۔

۱۵؎ یعنی ایک اونٹنی نامزد کر کے صالح علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ پانی کی باری اُن میں اور اونٹنی میں تقسیم کر دی جائے اور اُنھیں بتا دیا جائے کہ جو باری اللہ کی نامزد کردہ اونٹنی کے لیے مقرر ہے،

عَذَابِیْ وَ نُذُرِ ﴿۳۰﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ صَیْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِیْمِ الْمُحْتَظِرِ ﴿۳۱﴾ وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۳۲﴾ كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍ بِالنُّذُرِ ﴿۳۳﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ حَاصِبًا اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ

کی۔ چنانچہ وہ بڑھا اور اُس نے اونٹنی کی کوچیں کاٹ دیں۔ پھر دیکھ لو کہ کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھی میری تنبیہ! ہم نے ایک ہی ڈانٹ[16] اُن پر بھیجی اور وہ باڑے والے کی روندی ہوئی باڑ کی طرح چورا ہو کر رہ گئے[17]۔ ہم نے اِس قرآن کو یاددہانی کے لیے نہایت موزوں بنا دیا ہے۔ پھر کیا ہے کوئی یاددہانی حاصل کرنے والا؟ ۲۳-۳۲

قوم لوط نے بھی تنبیہ کو جھٹلا دیا۔ ہم نے اُن پر پتھر برسانے والی ہوا مسلط کر دی۔

اُس میں کوئی اُس سے تعرض نہ کرے گا۔ اگر اِس طرح کی جسارت کی گئی تو اُن کی یہ جسارت عذاب کا پیش خیمہ بن جائے گی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ’’...یہ امتحان اللہ تعالیٰ نے اِس لیے مقرر فرمایا کہ اُن کے اندر کا سارا کھوٹ باہر آ جائے اور آشکارا ہو جائے کہ اُن کی سرکشی کا پارا کتنا چڑھ چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ اِس تنبیہ کے بعد کہ یہ اونٹنی عذاب الٰہی کا نشان ہے، اُس کو گزند پہنچانے کی جسارت وہی کر سکتے تھے جن کو خود پیغمبر پر ہاتھ اٹھانے میں کوئی خوف مانع نہیں ہو سکتا تھا۔ کسی قوم کے طغیان کی یہی حد ہے جس پر پہنچ جانے کے بعد وہ اللہ کے عذاب کی مستحق ہوتی ہے۔ اِس کے بعد اتمام حجت کے لیے کوئی اور چیز باقی نہیں رہ جاتی۔‘‘ (تدبر قرآن ۸/۱۰۶)

۱۶؎ اصل میں لفظ ’صَیْحَة‘ آیا ہے۔ سورۂ ذاریات میں یہی مدعا لفظ ’الصّٰعِقَة‘ سے ادا کیا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ بادصرصر اور رعد و برق کے طوفان کی یہ ایک جامع تعبیر ہے۔ سورۂ احقاف (۴۶) کی آیات ۲۴-۲۵ میں قرآن نے اِس کی تفصیل کر دی ہے۔

۱۷؎ مویشی پالنے والے بالعموم اپنے گلے کی حفاظت کے لیے لکڑیوں اور جھاڑیوں کی ایک باڑ

نَجَّيۡنٰهُمۡ بِسَحَرٍ ﴿۳۴﴾ نِّعۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِنَا ؕ كَذٰلِكَ نَجۡزِيۡ مَنۡ شَكَرَ ﴿۳۵﴾ وَلَقَدۡ اَنۡذَرَهُمۡ بَطۡشَتَنَا فَتَمَارَوۡا بِالنُّذُرِ ﴿۳۶﴾ وَلَقَدۡ رَاوَدُوۡهُ عَنۡ ضَيۡفِهٖ فَطَمَسۡنَاۤ اَعۡيُنَهُمۡ فَذُوۡقُوۡا عَذَابِيۡ وَنُذُرِ ﴿۳۷﴾ وَلَقَدۡ صَبَّحَهُمۡ بُكۡرَةً عَذَابٌ مُّسۡتَقِرٌّ ﴿۳۸﴾ فَذُوۡقُوۡا عَذَابِيۡ وَنُذُرِ ﴿۳۹﴾ وَلَقَدۡ يَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّكۡرِ فَهَلۡ مِنۡ مُّدَّكِرٍ ﴿۴۰﴾

صرف لوط کے گھر والے اُس سے محفوظ رہے۔ ہم نے خاص اپنی عنایت سے اُن کو پچھلی رات نکال دیا۔ ہم اُن لوگوں کو اِسی طرح صلہ دیتے ہیں جو شکرگزار رہیں۔ لوط نے یقیناً اُن کو ہماری پکڑ سے خبردار کیا تھا، مگر وہ اُس کی تنبیہ میں حجتیں نکالتے رہے اور اُس کے درپے ہوئے کہ اپنے مہمانوں سے ہاتھ اٹھا لے تو ہم نے اُن کی آنکھیں موند دیں[18] کہ چکھو اب میرے عذاب اور میری تنبیہ کا مزہ۔ (پھر ہوا یہ کہ) صبح سویرے ایک ایسے عذاب نے اُن کو آ ہی لیا، جس نے آ کر ڈیرے ڈال دیے ـــــ لو چکھو، اب میرے عذاب اور میری تنبیہ کا مزہ۔ ہم نے اِس قرآن کو یاددہانی کے لیے نہایت موزوں بنا دیا ہے۔ پھر کیا ہے کوئی یاددہانی حاصل کرنے والا؟ ۳۴-۴۰

بنا دیتے ہیں۔ اِس قسم کی باڑ بارش، ہوا اور جانوروں کی آمد و رفت سے پامال ہو کر رفتہ رفتہ بالکل چورا ہو جاتی ہے۔ قوم ثمود کی روندی ہوئی لاشوں کو اِسی چورے سے تشبیہ دی گئی ہے۔

۱۸؎ یہ عذاب کی تمہید تھی۔ لوط علیہ السلام کی منت سماجت کے باوجود جب وہ باز نہیں آئے تو اُن کی آنکھیں موند دی گئیں اور جو آنکھوں کی بصیرت سے محروم تھے، وہ اُن کی بصارت سے بھی محروم ہو گئے۔ بائیبل میں یہ واقعہ اِس طرح بیان ہوا ہے:

”...تب وہ اُس مرد یعنی لوط پر پل پڑے اور نزدیک آئے تا کہ کواڑ توڑ ڈالیں۔ لیکن اُن مردوں (یعنی فرشتوں) نے اپنے ہاتھ بڑھا کر لوط کو اپنے پاس گھر میں کھینچ لیا اور دروازہ بند کر دیا اور اُن مردوں کو جو گھر کے دروازے پر تھے، کیا چھوٹے کیا بڑے، اندھا کر دیا، سو وہ دروازہ

وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ﴿۴۱﴾ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿۴۲﴾

اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ ﴿۴۳﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ﴿۴۴﴾ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴿۴۵﴾

یہی تنبیہ فرعون کے لوگوں کے پاس آئی۔ اُنھوں نے بھی ہماری تمام نشانیوں[19] کو جھٹلا دیا تو ہم نے اُنھیں پکڑا، جس طرح کوئی زبردست اور بڑی قوت والا پکڑتا ہے۔ ۴۱-۴۲

(قریش کے لوگو، پھر) تمھارے یہ منکرین کیا اُن سے کچھ بہتر ہیں یا صحیفوں میں تمھارے لیے کوئی معافی لکھی ہوئی ہے؟ کیا اِن کا زعم ہے کہ ہم ایسا جتھا ہیں جو مقابلہ کر لے گا؟ (سن لو)، اِن کا یہ جتھا عنقریب شکست کھا جائے گا اور یہ پیٹھ پھیر کر بھاگ رہے ہوں گے۔[20] ۴۳-۴۵

ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئے۔'' (پیدائش ۱۹: ۹-۱۱)

۱۹؎ اِس سے انذار کی وہ تمام نشانیاں مراد ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے سے مصر میں ظاہر ہوئیں۔ اِن کی پوری تفصیل بائیبل میں موجود ہے۔ قرآن نے بھی دوسرے مقامات میں اِن کا حوالہ دیا ہے۔

۲۰؎ یہ صریح پیشین گوئی ہے جو ہجرت سے برسوں پہلے کر دی گئی تھی اور جس طرح کی گئی تھی، حرف بہ حرف اُسی طرح پوری ہو گئی۔ قریش پر اتمام حجت کے بعد یہ منظر پہلی مرتبہ معرکۂ بدر کے موقع پر دیکھا گیا۔ خدا کی افواج قاہرہ کے مقابل میں اُن کے جتھے اِس کے بعد کسی میدان میں بھی ٹھیر نہیں سکے، یہاں تک کہ مکہ فتح ہو گیا اور لوگوں نے ہر جگہ اُنھیں اپنی آنکھوں سے پیٹھ پھیر کر

بَلِ السَّاعَةُ مَوۡعِدُهُمۡ وَالسَّاعَةُ اَدۡهٰى وَاَمَرُّ ﴿۴۶﴾

اِنَّ الۡمُجۡرِمِيۡنَ فِىۡ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ﴿۴۷﴾ يَوۡمَ يُسۡحَبُوۡنَ فِى النَّارِ عَلٰى وُجُوۡهِهِمۡ ذُوۡقُوۡا مَسَّ سَقَرَ ﴿۴۸﴾

اِنَّا كُلَّ شَىۡءٍ خَلَقۡنٰهُ بِقَدَرٍ ﴿۴۹﴾ وَمَاۤ اَمۡرُنَاۤ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمۡحٍۢ بِالۡبَصَرِ ﴿۵۰﴾

نہیں، بلکہ اِن سے جو وعدہ ہے، اُس کے پورا ہونے کا اصل وقت تو قیامت کا دن ہے اور قیامت کا دن (اِن منکروں کے لیے) بڑا سخت اور بڑا ہی تلخ ہو گا[۲۱]۔ ۴۶

یہ مجرم درحقیقت بڑی گم راہی میں ہیں اور یقیناً دوزخ میں پڑیں گے[۲۲]۔ یہ اُس دن کو یاد رکھیں، جس دن یہ مونھوں کے بل اُس کی آگ میں گھسیٹے جائیں گے[۲۳] ــــ اب چکھو دوزخ کی لپٹ کا مزہ۔ ۴۷-۴۸

بھاگتے ہوئے دیکھ لیا۔

۲۱۔ یعنی جس ہزیمت اور پامالی کا ذکر اوپر ہوا ہے، اُس سے تو سنت الٰہی کے مطابق یہ اِسی دنیا میں دوچار ہوں گے، اِس لیے کہ اِنھوں نے خدا کے رسول کو جھٹلا دیا ہے، لیکن اِن کو جو وعید سنائی جا رہی ہے، اُس کے ظہور کا اصلی دن قیامت کا دن ہے جو اِن کے لیے بڑا ہی کٹھن ہو گا۔

۲۲۔ اصل میں لفظ 'سُعُر' آیا ہے۔ یہ جمع کی صورت میں ہے۔ لفظ 'جَنّٰت' بھی آگے جمع کی صورت میں آیا ہے۔ اِس سے مقصود کسی چیز کی وسعت یا اُس کے اطراف و جوانب اور طبقات کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

۲۳۔ یہ انتہائی ذلت کی تصویر ہے۔ اِس سے اُس صورت حال کا تصور کیا جا سکتا ہے جس سے متمردین اپنے استکبار کی وجہ سے قیامت کے دن دوچار ہوں گے۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَآ اَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۵۱﴾

وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ ﴿۵۲﴾ وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ﴿۵۳﴾

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ﴿۵۴﴾ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿۵۵﴾

(یہ جلدی نہ مچائیں)۔ ہم نے ہر چیز ایک اندازے کے ساتھ پیدا کی ہے اور ہمارا حکم بس ایک ہی حکم ہوگا جو پلک جھپکنے میں پورا ہو جائے گا۔ تمھارے ہم مشربوں کو ہم (اِس سے پہلے اِسی طرح) ہلاک کر چکے ہیں[۲۴]۔ پھر کیا ہے کوئی یاددہانی حاصل کرنے والا؟ ۴۹-۵۱

اِنھوں نے جو کچھ کیا ہے، وہ سب دفتروں میں درج ہے اور ہر چھوٹی بڑی بات لکھی جا چکی ہے۔ ۵۲-۵۳

اِس کے برخلاف جو خدا سے ڈرنے والے ہیں، وہ باغوں اور نہروں (کے عیش) میں ہوں گے[۲۵]، سچی عزت کی جگہ[۲۶]، بڑے صاحب اقتدار بادشاہ کے حضور میں۔ ۵۴-۵۵

۲۴؎ یہ اُنھی ہم مشربوں کی طرف اشارہ ہے جن کی سرگذشتیں اوپر بیان ہوئی ہیں۔

۲۵؎ اصل الفاظ ہیں: 'فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ'۔ 'فِيْ' کے بعد ایک مضاف عربی زبان کے عام اسلوب کے مطابق حذف ہو گیا ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

۲۶؎ اصل میں 'فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'صِدْق' کی اضافت اُس مقام کی عزت، پایداری اور ابدیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

سورة الرحمٰن

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلرَّحۡمٰنُ ۙ﴿۱﴾ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ﴿۲﴾ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ ۙ﴿۳﴾ عَلَّمَہُ الۡبَیَانَ ﴿۴﴾ اَلشَّمۡسُ وَ الۡقَمَرُ بِحُسۡبَانٍ ۪﴿۵﴾ وَّ النَّجۡمُ وَ الشَّجَرُ یَسۡجُدٰنِ ﴿۶﴾ وَ السَّمَآءَ رَفَعَہَا وَ وَضَعَ الۡمِیۡزَانَ ۙ﴿۷﴾ اَلَّا تَطۡغَوۡا فِی الۡمِیۡزَانِ ﴿۸﴾ وَ اَقِیۡمُوا الۡوَزۡنَ بِالۡقِسۡطِ وَ لَا تُخۡسِرُوا الۡمِیۡزَانَ ﴿۹﴾

الرحمٰن
۵۵

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی۔ اِس لیے کہ اُس نے انسان کو پیدا کیا ہے، اُسے نطق و بیان کی صلاحیت عطا فرمائی ہے[۲۷]۔ ۱-۴

(تم نشانی چاہتے ہو تو دیکھو)، سورج اور چاند ایک حساب سے گردش میں ہیں، اور تارے اور درخت، سب سجدہ ریز ہیں۔ اور اُس نے آسمان کو اونچا کیا اور اُس میں میزان قائم کر دی کہ (اپنے دائرۂ اختیار میں) تم بھی میزان میں خلل نہ ڈالو اور

۲۷؎ یعنی تمھارا پروردگار سراسر رحمت ہے۔ اُس نے تمھیں جانور نہیں، بلکہ انسان بنا کر پیدا کیا اور نطق و بیان کی صلاحیت عطا فرمائی ہے۔ یہ صلاحیت بتاتی ہے کہ تم ایک صاحب عقل اور صاحب ادراک ہستی ہو، خیر و شر میں تمیز کر سکتے ہو، کلیات سے جزئیات اور جزئیات سے کلیات بنا سکتے ہو، استدلال، استنباط اور اجتہاد کی صلاحیت رکھتے ہو۔ اِس کے بعد ضروری تھا کہ تم سے بات کی جائے۔ تمھارے پروردگار نے یہی کیا ہے اور تمھاری پیٹھ پر تادیب کا تازیانہ برسانے کے بجائے قرآن کے ذریعے سے تمھاری تعلیم کا اہتمام کر دیا ہے۔

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ﴿۱۰﴾ فِيْهَا فَاكِهَةٌ ۙ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ﴿۱۱﴾ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ﴿۱۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۳﴾

انصاف کے ساتھ سیدھی تول تولو اور وزن میں کمی نہ کرو۔[۲۸] ۵-۹

اور زمین کو اُس نے اپنی مخلوقات کے لیے بچھا دیا ہے۔ اُس میں میوے ہیں اور کھجور کے درخت ہیں جن کے پھل غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں، اور بھوسی والے غلے اور خوشبو والے پھول بھی[۲۹] ـــــ پھر، اے جن و انس، تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو

۲۸؎ مطلب یہ ہے کہ دین و دنیا کے تمام معاملات میں جس عدل و قسط کی دعوت قرآن دے رہا ہے اور جس کی خلاف ورزی کے نتائج سے خبردار کر رہا ہے، اُس کی گواہی تو یہ پوری کائنات اپنے وجود سے دے رہی ہے۔ یہ بتا رہی ہے کہ آسمان کے سیارے اور ستارے، سب خدا کے حکم کے پابند ہیں اور ٹھیک اُس توازن پر قائم ہیں جو اُن کے خالق نے اُن کے اندر رکھ دیا ہے۔ اِس کا تقاضا یہی ہے اور یہی ہونا چاہیے کہ تم بھی قائم بالقسط ہو کر حق کی شہادت دو اور خدا کی دنیا میں کسی جگہ بھی ڈنڈی ماری کی زندگی بسر نہ کرو، ورنہ اِس کی سزا دنیا میں بھی بھگتو گے اور آخرت میں بھی اِس کا وبال تم پر لازماً آئے گا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اِس سے معلوم ہوا کہ ناپ تول میں کامل انصاف کا حکم ایک عظیم حکم ہے۔ یہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے اُس میزان عدل کی ایک فرع ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اِس عالم کا نظام قائم فرمایا ہے اور یہیں سے یہ بات بھی نکلی کہ جو قوم اِس میں فساد برپا کر دیتی ہے، وہ سارے نظام تمدن میں فساد برپا کر دیتی ہے۔“ (تدبر قرآن ۱۳۰/۸)

۲۹؎ آسمان کے بعد اب یہ زمین کے اسباب ربوبیت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اِس اہتمام کو دیکھتے ہو اور اِس کے بعد بھی اپنے پروردگار کو نہیں پہچانتے اور سمجھتے ہو کہ وہ تمھیں یونہی چھوڑے رکھے گا اور کبھی پرسش کے لیے نہیں بلائے گا۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ ہم نے

خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ صَلۡصَالٍ کَالۡفَخَّارِ ﴿۱۴﴾ وَخَلَقَ الۡجَآنَّ مِنۡ مَّارِجٍ مِّنۡ نَّارٍ ﴿۱۵﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۱۶﴾

جھٹلاؤ گے؟[30] ۱۰-۱۳

انسان کو اُس نے ٹھیکری کی طرح بجتی ہوئی مٹی سے[31] اور جنوں کو آگ کی لپٹ سے بنایا۔ پھر اے جن و انس، تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے؟[32] ۱۴-۱۶

تمھارے لیے صرف پیٹ بھرنے ہی کا سامان نہیں کیا، اِس کے ساتھ تمھارے ذوق جمال، لذت کام و دہن اور شوق آرایش کا سامان بھی کیا ہے، اور جو کچھ دیا ہے، ایک ایک دانے اور ایک ایک پھل کی پیکنگ دیکھو، کس خوب صورتی، کتنے اہتمام اور کیسی جدت طرازیوں کے ساتھ دیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...آسمان کے لیے 'رَفَعَ' کا لفظ استعمال فرمایا تھا۔ اِس کے مقابل میں زمین کے لیے 'وَضَعَ' کا لفظ نہایت موزوں اور معنی خیز استعمال فرمایا کہ آسمان کو شامیانے کی طرح تان دیا اور زمین کو فرش کی طرح بچھا دیا تاکہ اُس کی مخلوقات کے لیے یہ ایک آرام دہ مکان بن جائے۔ پھر جس طرح آسمان پر سورج، چاند اور ستاروں کے چراغ اور قمقمے لگا دیے کہ اِس گھر کو روشنی اور حرارت حاصل ہوتی رہے، اُسی طرح اِس گھر میں مختلف قسم کے پھلوں، غلوں اور پھولوں کے انبار بھی لگا دیے کہ اِس کے مکینوں کو غذا بھی حاصل ہو، اِس کے پھلوں سے وہ لذت اندوز اور خوش کام ہوں اور اِس کے پھول اُن کے لیے باصرہ نوازی اور معطر مشامی کا سامان بھی مہیا کریں۔'' (تدبر قرآن ۸/ ۱۳۱)

۳۰؎ اصل الفاظ ہیں: 'فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ'۔ امام حمید الدین فراہی نے اپنی کتاب ''مفردات القرآن'' میں کلام عرب کے شواہد سے واضح کر دیا ہے کہ اِس آیت میں جو لفظ 'اٰلَآء' آیا ہے، اِس کے معنی صرف نعمت کے نہیں ہیں، بلکہ یہ اِس سے وسیع تر معنی کے لیے آتا ہے اور اِس کے اندر نعمت، قدرت، نشانی، کرشمہ، کارنامہ، اُعجوبہ اور اِس نوعیت کے تمام مفاہیم

الرحمٰن ۵۵

رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ﴿١٧﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿١٨﴾

وہی مشرق کا رب ہے، اُس کے دونوں کناروں تک، اور وہی مغرب کا رب ہے، اُس کے دونوں کناروں تک [۴۳]۔ پھر اے جن و انس، تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو

شامل ہو جاتے ہیں۔ اردو زبان کا لفظ 'شان' ہمارے نزدیک اِن مفاہیم کو کسی حد تک ادا کر دیتا ہے۔

انسانوں کے ساتھ اِس میں جنوں کو بھی مخاطب کیا گیا ہے، اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس زمانے میں وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ قرآن نے دوسرے مقامات میں اِس کی تصریح فرمائی ہے۔ اِس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اُن کے اخیار جس طرح قرآن کی تصدیق کے لیے آگے بڑھے، اُن کے اشرار اُسی طرح قریش کی مخاصمت میں اُن کی کمک کے لیے بھی پہنچے ہوں گے۔ چنانچہ قرآن نے اُنھیں بھی سرزنش کر دی ہے۔

۴۱؎ یہ انسان کی تخلیق کے اُس مرحلے کا ذکر ہے، جب زمین کے پیٹ میں اُس کی خلقت کے پایۂ تکمیل کو پہنچ جانے کے بعد سڑا ہوا گارا انڈے کے خول کی طرح خشک ہو گیا تا کہ وہ ٹوٹے اور نک سک سے درست پورا انسان اُس سے باہر نکل آئے۔

۴۲؎ یعنی جس پروردگار نے مٹی کے ٹھیکرے اور آگ کے شعلے سے ایسی غیر معمولی مخلوقات پیدا کر دیں، اُس کے لیے کیا بعید ہے کہ اِن مخلوقات کو مرنے کے بعد جب چاہے، دوبارہ اٹھا کھڑا کرے۔ تم اِسے جھٹلاتے ہو تو گویا اِس پہلی تخلیق میں اپنے پروردگار کے عجائب قدرت کو جھٹلاتے ہو۔ ذرا سوچو کہ کس طرح جھٹلاتے ہو؟

۴۳؎ اصل میں 'مَشْرِقَيْن' اور 'مَغْرِبَيْن' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ مثنیٰ کے صیغے ہیں۔ عربی زبان میں مثنیٰ جس طرح تعداد بیان کرتا ہے، اُسی طرح کسی چیز کے احاطۂ اطراف کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں یہ اِسی مفہوم میں ہے۔ ہم نے ترجمے میں اِسے واضح کر دیا ہے۔

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ﴿۱۹﴾ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ﴿۲۰﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۱﴾

يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴿۲۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۳﴾

جھٹلاؤ گے![۳۴] ۱۷-۱۸

اُس نے دو دریا چھوڑ دیے، دونوں ٹکراتے ہیں، مگر اُن کے درمیان ایک پردہ حائل رہتا ہے جس سے وہ آگے نہیں بڑھتے۔[۳۵] پھر اے جن و انس، تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے![۳۶] ۱۹-۲۱

دونوں سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں۔[۳۷] پھر اے جن و انس، تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! ۲۲-۲۳

۳۴؎ یعنی مشرق و مغرب، سب جس کے زیرنگیں ہیں، اُس کی بلا شرکت غیرے خدائی اور اُس کے حضور میں پیشی کا انکار کرتے ہو تو سوچو کہ کس چیز کا انکار کرتے ہو؟

۳۵؎ یہ کیفیت ہر اُس جگہ پیدا ہو جاتی ہے، جہاں کوئی بڑا دریا آ کر سمندر میں گرتا ہے۔ چنانچہ کھاری اور شیریں، دونوں دریا آپس میں ٹکراتے ہیں، لیکن خدائے علیم و قدیر اُن کے درمیان ایک ایسا پردہ ڈال دیتا ہے کہ ملنے کے باوجود دونوں اپنے اپنے مزاج پر قائم رہتے ہیں۔

۳۶؎ یعنی جس پروردگار کی قدرت اپنی یہ شانیں دکھاتی ہے، اُس کے بارے میں کس طرح سوچتے ہو کہ وہ تمھیں دوبارہ اٹھا دینے سے قاصر رہ جائے گا؟ تم اِس کو جھٹلاتے ہو تو سوچو کہ کیسی زبردست قدرت اور حکمت کو جھٹلاتے ہو۔

۳۷؎ مطلب یہ ہے کہ ایک دریا کھاری ہوتا ہے اور ایک شیریں اور خدا دونوں سے تمھارے لیے زینت کی یہ غیر معمولی چیزیں پیدا کر دیتا ہے۔

الرحمٰن ۵۵

وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿۲۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۵﴾

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿۲۶﴾ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿۲۷﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۸﴾

يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ﴿۲۹﴾ فَبِاَيِّ

الرحمٰن ۵۵

یہ جہاز اُسی کے ہیں جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح اونچے اٹھے ہوئے ہیں۔[۳۸] پھر اے جن و انس، تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! ۲۴-۲۵

زمین پر جو بھی ہیں، سب فانی ہیں اور تیرے پروردگار کی عزت و جلالت والی ذات ہی باقی رہنے والی ہے۔ پھر اے جن و انس، تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے![۳۹] ۲۶-۲۸

زمین اور آسمانوں میں جو بھی ہیں، سب (اپنی حاجتیں) اُسی سے مانگتے ہیں۔[۴۰]

۳۸؎ یعنی یہ جہاز جو تم نے بنائے ہیں، یہ بھی اُسی کے ہیں۔ اِس لیے کہ اُس کے پیدا کیے ہوئے اسباب اور اُس کی دی ہوئی عقل سے وجود میں آئے ہیں۔ پھر وہی ہے جو غضب ناک سمندر کے سینے کو اِن کے لیے ہموار سڑکوں میں تبدیل کر دیتا ہے اور یہ ہر جگہ دوڑتے پھرتے ہیں۔

۳۹؎ مدعا یہ ہے کہ تم قرآن کے انذار کو سنو یا نہ سنو، وہ جس چیز سے خبردار کر رہا ہے، وہ ایک دن واقع ہو جائے گی اور صرف اللہ پروردگار عالم کی جلیل و کریم ذات باقی رہ جائے گی۔ پھر بتاؤ کہ اُس دن کسے جھٹلانے کی جسارت کرو گے؟

۴۰؎ اصل میں لفظ 'سُؤَال' آیا ہے۔ یہ اپنے ثمر اور نتیجے کے لحاظ سے استعمال ہوا ہے۔ یعنی

الَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۰﴾

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ﴿۳۱﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۲﴾ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴿۳۳﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۴﴾

ہر آن وہ ایک نئی شان میں ہے۔ پھر اے جن وانس، تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے![۴۱] ۲۹-۳۰

الرحمٰن ۵۵

اے بھاری جتھو، ہم تمھارے لیے فارغ ہوئے جاتے ہیں[۴۲]۔ پھر بتاؤ، تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! اے گروہ جن وانس، زمین اور آسمانوں کی سرحدوں سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ دیکھو۔ نہیں بھاگ سکتے، اِس کے لیے

جس سے بھی مانگیں، چونکہ پاتے خدا سے ہیں، اِس لیے درحقیقت اُسی سے مانگتے ہیں۔

۴۱؎ مطلب یہ ہے کہ دنیا کو بنانے کے بعد اُس کا خالق اُس سے الگ ہو کر کسی گوشۂ خلوت میں نہیں بیٹھ گیا ہے، بلکہ اپنی کائنات کا نظم ونسق چلا رہا ہے اور بصیرت کی آنکھیں ہوں تو ہر آن تم اُسے ایک نئی شان میں دیکھ سکتے ہو۔ اِس کے بعد بھی مغالطے پیدا کرتے ہو تو سوچو کہ کس ہستی کو اور اُس کی کن کن شانوں کو جھٹلاتے ہو؟

۴۲؎ جنوں اور انسانوں کو بھاری جتھے کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ اِس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ تمھارے سرکشوں کے لشکر، خواہ کتنے ہی بھاری بھرکم ہو جائیں، خدا کی طاقت کے سامنے تنکوں کی طرح اڑ جائیں گے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ اب زیادہ دیر نہیں ہو گی کہ مہلت ختم ہو جائے گی اور تم ہماری عدالت میں پکڑ بلائے جاؤ گے۔ باقی کاموں کو چھوڑ کر اب ہم اِسی کام کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔

يُرۡسَلُ عَلَيۡكُمَا شُوَاظٌ مِّنۡ نَّارٍ ۙ۬ وَّ نُحَاسٌ فَلَا تَنۡتَصِرٰنِ ﴿۳۵﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۶﴾

فَاِذَا انۡشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتۡ وَرۡدَةً كَالدِّهَانِ ﴿۳۷﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۸﴾ فَيَوۡمَئِذٍ لَّا يُسۡـَٔلُ عَنۡ ذَنۡۢبِهٖۤ اِنۡسٌ وَّ لَا جَآنٌّ ﴿۳۹﴾

پروانہ چاہیے۔[۴۳] پھر تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! تم پر آگ کا شعلہ اور (پگھلا ہوا) تانبا چھوڑ دیا جائے گا[۴۴] اور تم اُس سے بچاؤ نہ کر سکو گے۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے![۴۵] ۳۱-۳۶

پھر کیا بنے گی اُس وقت، جب آسمان پھٹ جائے گا اور اتری ہوئی کھال کی طرح لال ہو جائے گا؟ اُس وقت، اے جن و انس، تم اپنے رب کی کن کن شانوں

۴۳؎ اصل میں لفظ 'سُلْطٰن' آیا ہے۔ اِس کے معنی اختیار و اقتدار کے بھی ہیں اور سند کے بھی۔ یہاں یہ اِسی دوسرے معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زمین و آسمان کی سرحدوں سے نکلنے کے لیے خدا کا حکم نامہ چاہیے اور وہ خدا ہی دے سکتا ہے، اُسے کوئی دوسرا تمھارے لیے جاری نہیں کر سکتا۔

۴۴؎ یہ شہاب ثاقب کے اجزا ہیں جن کے متعلق قرآن کے دوسرے مقامات میں تصریح ہے کہ شیاطینِ جن اپنے حدود سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ اُن پر پھینکے جاتے ہیں۔ اِن کی ایک قسم حجری فلزاتی شہاب (siderolites) ہیں۔ اِن کے تجزیے سے معلوم ہوا ہے کہ لوہے اور پتھر کے علاوہ اِن میں تانبے اور کانسی کے اجزا بھی ہوتے ہیں۔

۴۵؎ یعنی اِس بے کراں کائنات میں حفاظت کے اِس اہتمام اور اِس کے مقابل میں اپنی بے بسی اور بے اختیاری کو دیکھتے ہو، مگر خدا کی عظمت کا اعتراف نہیں کرتے۔ پھر بتاؤ کہ اپنے پروردگار کی کن کن قدرتوں کو نظر انداز کر کے حقائق کو جھٹلاتے رہو گے!

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۰﴾ یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمٰهُمْ فَیُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِیْ وَ الْاَقْدَامِ ﴿۴۱﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۲﴾ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ یُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ یَطُوْفُوْنَ بَیْنَهَا وَ بَیْنَ حَمِیْمٍ اٰنٍ ﴿۴۴﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۵﴾

وَ لِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴿۴۶﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۷﴾

الرحمٰن ۵۵

کو جھٹلاؤ گے! پھر کسی انسان اور کسی جن سے اُس دن اُس کا گناہ پوچھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔[۴۶] پھر تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! مجرم وہاں اپنی علامت سے پہچان لیے جائیں گے، پھر پیشانی کے بالوں اور پاؤں سے پکڑے جائیں گے (اور جہنم میں پھینک دیے جائیں گے)۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! یہ وہی جہنم ہے جس کو یہ مجرم جھٹلاتے رہے۔ (اب) اُس کے اور کھولتے ہوئے پانی کے درمیان گردش کرتے رہیں گے۔[۴۷] پھر اے جن و انس، تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! ۳۷-۴۵

(یہ اِن مجرموں کا بدلہ ہے) اور جو اپنے پروردگار کے حضور میں پیشی سے ڈرتے رہے، اُن کے لیے دو باغ ہیں۔ پھر اے جن و انس، تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو

۴۶؎ مطلب یہ ہے کہ آدمی کے ہاتھ پاؤں، بلکہ اُس کا ایک ایک بن مو اُس کے جرائم کی گواہی دے گا۔ اِس کے لیے کسی تحقیق و تفتیش کی ضرورت نہ ہوگی۔

۴۷؎ یہ اُس انتہائی بے بسی کی تصویر ہے جس سے وہ دوزخ میں دوچار ہوں گے۔ اُس کی آگ اُنھیں جھلسے گی تو بھاگ بھاگ کر پانی کے چشموں کی طرف جائیں گے، مگر وہاں کھولتا ہوا پانی ہوگا جس سے کسی کی پیاس نہ بجھے گی۔ اُن کی عمریں اِسی گردش میں بیت جائیں گی۔

ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ﴿۴۸﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۹﴾ فِيْهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ ﴿۵۰﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۱﴾ فِيْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ﴿۵۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۳﴾ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى فُرُشٍۭ بَطَآىِٕنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ؕ وَجَنَا الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ ﴿۵۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۵﴾ فِيْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ۙ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴿۵۶﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۷﴾

الرحمٰن ۵۵

جھٹلاؤ گے![۴۸] بہت سی شاخوں والے۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! دونوں میں دو چشمے بہتے ہوئے۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! اُن میں ہر میوے کی الگ الگ قسمیں۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! وہ ایسے فرشوں پر بیٹھے ہوں گے، تکیے لگائے ہوئے، جن کے استر دبیز ریشم کے ہوں گے[۴۹] اور دونوں باغوں کے پھل جھکے پڑ رہے ہوں گے۔[۵۰] پھر تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! اُن میں[۵۱] شرمیلی نگاہوں والیاں ہوں گی جنھیں اُن سے پہلے کسی

۴۸؎ یعنی جب یہ نعمتیں ہم اپنے اُن پرہیزگار بندوں کو دیں گے جو دنیا میں تمھارے استہزا کا ہدف بنتے رہے تو بتاؤ اُس وقت حسرت سے اپنا سر پیٹو گے یا ہماری نعمتوں کا انکار کرو گے؟

۴۹؎ مطلب یہ ہے کہ جب استر دبیز ریشم کے ہوں تو ابرے کیا ہوں گے؟ اِس کا اندازہ تم خود کر سکتے ہو۔

۵۰؎ چنانچہ جس کا جی چاہے گا، اپنا ہاتھ بڑھا کر اُن کا پھل حاصل کر لے گا، اِس کے لیے اُسے کوئی زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی۔

۵۱؎ اصل میں 'فِيْهِنَّ' کا لفظ آیا ہے۔ اِس میں ضمیر کا مرجع وہ تمام نعمتیں ہیں جو پیچھے مذکور ہیں یا جنت کے لوازم کی حیثیت سے بدیہی طور پر سمجھی جا سکتی ہیں۔

كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ ﴿۵۸﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۹﴾ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴿۶۰﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۱﴾ وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ﴿۶۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۳﴾ مُدْهَآمَّتٰنِ ﴿۶۴﴾

انسان یا جن نے ہاتھ نہیں لگایا ہوگا۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! ایسی خوبصورت جیسے یاقوت اور مونگے ہوں۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! نیکی کا صلہ نیکی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟[۵۲] پھر تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! ۴۶-۶۱

اور اِن کے سوا دو باغ اور بھی ہیں۔[۵۳] پھر اے جن و انس، تم اپنے رب کی کن کن

الرحمٰن ۵۵

۵۲ یعنی نیکی کا صلہ فضل و کرم اور لطف و عنایت ہی ہو سکتا ہے، برائی یا بے پروائی تو نہیں ہو سکتا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...یہ بات چونکہ انسانی فطرت میں راسخ ہے، کوئی عاقل سلامتی عقل و ہوش کے ساتھ اِس کا انکار نہیں کر سکتا، اِس وجہ سے بات ایسے اسلوب میں فرمائی ہے جو ایک واضح حقیقت کے بیان کا ہے۔ لفظ 'اِحْسَان' نیکی کے معنی میں بھی آتا ہے اور نیک صلے کے معنی میں بھی۔ اِس آیت میں یہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ دونوں ہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔''

(تدبر قرآن ۸/۱۴۸)

۵۳ دو مزید باغوں کا ذکر اتمام نعمت کے لیے ہوا ہے۔ یعنی صرف دو نہیں، اِن کے علاوہ دو اور باغ بھی اُن کے لیے ہوں گے۔ اِن باغوں کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں، اُن سے واضح ہے کہ پہلے دو باغ ہموار علاقے میں اور مستقل قیام گاہوں کے لیے ہوں گے اور دوسرے دو پہاڑی مقامات پر اور سیر و تفریح کی غرض سے آکر رہنے کے لیے۔ 'حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِی الْخِیَامِ' اور 'فِیْهِمَا عَیْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ' کے الفاظ اِس فرق کی طرف صاف اشارہ کرتے ہیں۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۵﴾ فِیۡہِمَا عَیۡنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ﴿۶۶﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۷﴾ فِیۡہِمَا فَاکِہَۃٌ وَّ نَخۡلٌ وَّ رُمَّانٌ ﴿۶۸﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۹﴾ فِیۡہِنَّ خَیۡرٰتٌ حِسَانٌ ﴿۷۰﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۷۱﴾ حُوۡرٌ مَّقۡصُوۡرٰتٌ فِی الۡخِیَامِ ﴿۷۲﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۷۳﴾ لَمۡ یَطۡمِثۡہُنَّ اِنۡسٌ قَبۡلَہُمۡ وَ لَا جَآنٌّ ﴿۷۴﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۷۵﴾ مُتَّکِـِٕیۡنَ عَلٰی رَفۡرَفٍ خُضۡرٍ وَّ عَبۡقَرِیٍّ حِسَانٍ ﴿۷۶﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۷۷﴾

الرحمٰن
۵۵

شانوں کو جھٹلاؤ گے! دونوں گھنے سر سبز و شاداب۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! دونوں میں دو چشمے ابلتے ہوئے۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! اُن میں پھل اور کھجوریں اور انار۔[۵۴] پھر تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! اُن میں خوب سیرت، خوب صورت بیویاں۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! خیموں میں ٹھیرائی ہوئی گوریاں۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! اُن سے پہلے جنھیں کسی انسان یا جن نے ہاتھ نہیں لگایا ہوگا۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! وہ سبز چاندنیوں اور خوب صورت نادر قالینوں[۵۵] پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔ پھر اے جن و انس، تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! ۶۲-۷۷

---

۵۴ پھل کے بعد کھجور اور انار کا ذکر عام کے بعد خاص کی حیثیت سے آیا ہے، اِس لیے کہ یہ دونوں پھل عرب کے محبوب پھلوں میں سے تھے۔

۵۵ اصل میں لفظ 'عَبْقَرِی' استعمال ہوا ہے۔ عرب جاہلیت کے افسانوں میں 'عبقر' کا لفظ پرستان کے لیے آتا ہے۔ اہل عرب اِسی کی نسبت سے ہر نفیس اور نادر و نایاب چیز کو 'عَبْقَرِی'

تَبٰرَكَ اسۡمُ رَبِّكَ ذِی الۡجَلٰلِ وَالۡاِکۡرَامِ ﴿۷۸﴾

بڑی برکت والا ہے تیرے جلیل و کریم پروردگار کا نام۔[۵۶] ۷۸

کہتے تھے۔

۵۶؎ اِس لیے مطمئن رہو، یہ تمام برکتیں اور نعمتیں لازماً ظاہر ہو جائیں گی۔

لاہور

۱۰رستمبر۲۰۰۹ء

الرحمٰن
۵۵

الواقعة

٥٦

الواقعة

یہ ایک منفرد سورہ ہے جس پر اِس باب کی مکی سورتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اِس میں اُس تمام بحث کا خلاصہ سامنے رکھ دیا ہے جو سورۂ ق سے سورۂ رحمٰن تک جزا و سزا سے متعلق ہوئی ہے۔ ق سے رحمٰن تک عقل و فطرت، انفس و آفاق اور انسانی تاریخ میں خدا کی دینونت کے ظہور سے ایک روز جزا کے واقع ہونے پر استدلال کیا گیا ہے۔ اِس سلسلے کی آخری سورہ سورۂ رحمٰن ہے، جس میں اِس کے ساتھ انذار و بشارت کا مضمون بھی پوری طرح نمایاں ہو گیا ہے۔ یہی مضمون اِس سورہ میں اِس کی تمام تفصیلات کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے۔ اِس لحاظ سے یہ پچھلی سورتوں کا تکملہ و تتمہ ہے۔

اِس کے مخاطب قریش کے متکبرین ہیں جنھیں خبردار کیا گیا ہے کہ قیامت ایک شدنی امر ہے۔ یہ ہر حال میں واقع ہو جائے گی۔ تمھیں لازماً ایک ایسی دنیا میں جینے کے لیے اٹھنا ہے، جہاں عزت و ذلت کے پیمانے بدل چکے ہوں گے۔ عزت اور سرفرازی وہاں سابقین اور اصحاب الیمین کے لیے ہو گی اور متکبرین اصحاب الشمال ہوں گے جن کے لیے دوزخ کا ابدی عذاب ہے۔

اِس کے مضمون سے واضح ہے کہ ام القریٰ مکہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ انذار عام میں نازل ہوئی ہے۔

سورة الواقعة

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اِذَا وَقَعَتِ الۡوَاقِعَةُ ۙ﴿۱﴾ لَيۡسَ لِوَقۡعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۘ﴿۲﴾ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۙ﴿۳﴾ اِذَا رُجَّتِ الۡاَرۡضُ رَجًّا ۙ﴿۴﴾ وَّبُسَّتِ الۡجِبَالُ بَسًّا ۙ﴿۵﴾ فَكَانَتۡ هَبَآءً مُّنۡۢبَثًّا ۙ﴿۶﴾ وَّكُنۡتُمۡ اَزۡوَاجًا ثَلٰثَةً ؕ﴿۷﴾

فَاَصۡحٰبُ الۡمَيۡمَنَةِ ۙ مَاۤ اَصۡحٰبُ الۡمَيۡمَنَةِ ﴿۸﴾ وَ اَصۡحٰبُ

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ اُس دن کو یاد رکھیں، جب واقع ہونے والی واقع ہو جائے گی[1]۔ اُس کے واقع ہو جانے میں کچھ جھوٹ نہیں ہے[2]۔ وہ گرانے والی اور اٹھانے والی ہوگی[3]۔ اُس دن جب زمین زور سے ہلا ڈالی جائے گی اور پہاڑ بالکل ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے، اِس طرح کہ پراگندہ غبار بن کر رہ جائیں گے اور تم اُس دن تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے۔ ۱-۷

پھر ایک گروہ دائیں والوں کا ہوگا، سو کیا کہنے ہیں دائیں والوں کے[4]! دوسرا بائیں

۱؎ یعنی قیامت، جس کے دلائل پچھلی سورتوں میں بیان ہو چکے ہیں۔

۲؎ اصل میں لفظ 'کَاذِبَةٌ' آیا ہے۔ یہ ہمارے نزدیک 'عاقبة' اور 'عافیة' کی طرح مصدر ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۳؎ یعنی جو آج سربلند ہیں، اُن میں سے بہت سے پست ہو جائیں گے اور جو پستی اور ذلت میں پڑے ہوئے ہیں، وہ اگر ایمان اور اعمال صالحہ کا سرمایہ رکھتے ہوں گے تو سربلند ہو جائیں گے۔ آگے اِسی بلندی اور پستی کی تفصیل ہے۔

الْمَشْـَٔمَةِ ۵ مَآ اَصْحٰبُ الْمَشْـَٔمَةِ ؕ ۹ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۱۰ لا ج
اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۱۱ ج فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ۱۲ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ ۱۳ لا وَقَلِیْلٌ

والوں کا، تو کیا بدبختی ہے بائیں والوں کی![5] اور آگے والے تو پھر آگے والے ہی ہیں[6]۔ وہی مقرب ہوں گے[7]۔ راحت کے باغوں میں رہیں گے۔ اگلوں میں بہت[8] اور پچھلوں

۴ اِس سے وہ لوگ مراد ہیں جن کے اعمال نامے اُن کے دائیں ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے۔ سورۂ حاقہ (۶۹) کی آیت ۱۹ میں قرآن نے اِس کی صراحت کردی ہے۔ 'مَآ اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ' کے جو الفاظ اِن لوگوں کے لیے اصل میں آئے ہیں، اُن میں استفہام اظہارِ شان و عظمت کے لیے ہے۔ یعنی اِن کی رفاہیت و خوش حالی، اِن کے عیش مدام اور اِن کی عالی مقامی کا کیا پوچھنا ہے! استاذ امام لکھتے ہیں:

''... یہ اسلوب کلام اُس صورت میں اختیار کیا جاتا ہے، جب صورت واقعہ الفاظ کے احاطہ اور قیاس و گمان کی رسائی سے مافوق ہو۔ قرآن میں اِس کی مثالیں بہت ہیں۔ ہماری زبان میں بھی یہ اسلوب معروف ہے۔'' (تدبرقرآن ۸/۱۶۰)

۵ قرآن کی تصریح کے مطابق اِس سے وہ لوگ مراد ہیں جن کے اعمال نامے اُن کے بائیں ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے۔ یہاں بھی وہی استفہام ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ یہ لوگ جس ذلت و مصیبت اور بدانجامی سے دوچار ہوں گے، اُس کی تصویر بھی الفاظ میں کھینچی نہیں جاسکتی۔ چنانچہ استفہام کا وہی اسلوب یہاں نفرت و کراہت ظاہر کرنے کے لیے اختیار فرمایا ہے۔

۶ یہ اُن لوگوں کا ذکر ہے جنھوں نے دعوت حق کے قبول کرنے میں سبقت کی، بھلائی کے ہر کام میں سب سے آگے رہے اور اُس زمانے میں اپنے جان و مال سے خدمت حق کی توفیق پائی، جب اِس خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنا جان جوکھم میں ڈالنے کے مترادف تھا۔

۷ یعنی خدا کی جنت میں اُس کے مقرب ہوں گے۔ اِن کا ٹھکانا بھی 'جَنّٰتُ النَّعِیْمِ' ہی بتایا

مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۴﴾ عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ ﴿۱۵﴾ مُّتَّكِـِٕيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ ﴿۱۶﴾
يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ﴿۱۷﴾ بِاَكْوَابٍ وَّاَبَارِيْقَ ۙ وَكَاْسٍ مِّنْ
مَّعِيْنٍ ﴿۱۸﴾ لَّا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ﴿۲۰﴾

میں کم۔[9] مرصع تختوں پر تکیے لگائے آمنے سامنے[10] بیٹھے ہوں گے۔ اُن کی خدمت میں لڑکے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے[11]، پیالے، صراحیاں اور شراب خالص[12] کے جام لیے ہوئے دوڑتے پھرتے ہوں گے جس سے نہ اُن کا سر چکرائے گا، نہ عقل میں کوئی فتور

گیا ہے۔ دربار الٰہی کے قسم کی کسی چیز کا تصور قرآن میں نہیں ہے۔

۸ اصل میں لفظ 'ثُلَّةٌ' آیا ہے۔ اِس کے معنی گروہ یا جماعت کے ہیں، لیکن یہاں چونکہ یہ 'قَلِیْلٌ' کے مقابل میں آیا ہے، اِس لیے گروہ کثیر کے معنی اِس میں پیدا ہو گئے ہیں۔

۹ اگلوں اور پچھلوں سے مراد اِسی امت کے اگلے اور پچھلے ہیں۔ بہ اعتبار اصول، البتہ کہہ سکتے ہیں کہ یہی بات ہر نبی اور رسول کی امت پر منطبق ہو گی۔ چنانچہ سورۂ فاطر (۳۵) کی آیت ۳۲ میں اِنھی تینوں گروہوں کا ذکر ایک عام کلیے کی حیثیت سے بھی ہوا ہے۔

۱۰ یعنی ایک دوسرے سے منہ پھیر کر نہیں، بلکہ محبت و اخلاص کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف رخ کر کے بیٹھے ہوں گے۔ حسد و کینہ اور باہمی رنج و رقابت سے اُن کے دل بالکل پاک کر دیے جائیں گے۔

۱۱ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ اہل جنت کی دائمی خدمت کے لیے وہ ہمیشہ موزوں، خوش آداب اور مستعد و سرگرم رہیں گے۔ وقت کے گزرنے اور عمر کے بڑھنے سے اُن میں کوئی اضمحلال نہ آئے گا۔

۱۲ اصل میں لفظ 'مَعِیْن' آیا ہے۔ قرآن میں یہ شراب خالص کے چشمے کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ یہاں اِسی مفہوم میں ہے۔

وَلَحۡمِ طَیۡرٍ مِّمَّا یَشۡتَہُوۡنَ ﴿۲۱﴾ وَحُوۡرٌ عِیۡنٌ ﴿۲۲﴾ کَاَمۡثَالِ اللُّؤۡلُوَٴ الۡمَکۡنُوۡنِ ﴿۲۳﴾ جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۴﴾ لَا یَسۡمَعُوۡنَ فِیۡہَا لَغۡوًا وَّلَا تَاۡثِیۡمًا ﴿۲۵﴾ اِلَّا قِیۡلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴿۲۶﴾

وَاَصۡحٰبُ الۡیَمِیۡنِ ۬ۙ مَاۤ اَصۡحٰبُ الۡیَمِیۡنِ ﴿۲۷﴾ فِیۡ سِدۡرٍ مَّخۡضُوۡدٍ ﴿۲۸﴾ وَّطَلۡحٍ مَّنۡضُوۡدٍ ﴿۲۹﴾ وَّظِلٍّ مَّمۡدُوۡدٍ ﴿۳۰﴾ وَّمَآءٍ مَّسۡکُوۡبٍ ﴿۳۱﴾ وَّفَاکِہَۃٍ

الواقعة ۵۶

آئے گا۔ اور اُن کے سامنے میوے پیش کریں گے جنھیں وہ پسند کریں اور پرندوں کے گوشت جن کی وہ خواہش کریں۔ اور اُن کے لیے آہو چشم گوریاں ہوں گی، چھپا کر رکھے ہوئے موتیوں کی طرح[۱۳]، اُن کے اعمال کا صلہ، جو وہ کرتے رہے۔ وہاں وہ کوئی بے ہودہ بات اور کوئی گناہ کی تہمت نہ سنیں گے۔ صرف مبارک سلامت کے چرچے ہوں گے[۱۴]۔ ۸-۲۶

اور دائیں والے، تو کیا کہنے ہیں دائیں والوں کے! بے خار بیریوں[۱۵]، تہ بہ تہ کیلوں

۱۳؎ عورت کے حسن ظاہری اور حسن باطنی کے تمام پہلو، اگر غور کیجیے تو اِن دو صفتوں میں جمع ہو گئے ہیں۔

۱۴؎ اِس میں نعمت کے کیا پہلو ہیں؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ اُن کے بے غل و غش عیش کی طرف اشارہ ہے کہ دشمنوں، معترضوں اور نکتہ چینوں کی جتنی ژاژخائیاں اور بکواسیں سننی ہیں، وہ دنیا میں سن چکے ہوں گے اور جتنے چرکے سہنے ہیں، وہ سہ چکیں گے۔ وہاں نہ کسی بکواس کرنے والے کی بکواس ہو گی اور نہ کوئی گناہ کی بات اُن کے کانوں میں پڑے گی۔ وہاں اُن کے لیے رحمت ہی رحمت اور سلام ہی سلام ہے۔ رب رحیم و غفور کی طرف سے بھی سلام، فرشتوں کی طرف سے بھی سلام اور ساتھیوں کی طرف سے بھی سلام۔ صبح بھی سلام اور شام بھی

كَثِيْرَةٍ ﴿٣٢﴾ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ ﴿٣٣﴾ وَّفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ﴿٣٤﴾ اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ﴿٣٥﴾ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ﴿٣٦﴾ عُرُبًا اَتْرَابًا ﴿٣٧﴾ لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿٣٨﴾ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٣٩﴾ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿٤٠﴾

وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۥ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ﴿٤١﴾ فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ ﴿٤٢﴾

اور پھیلے ہوئے سایوں میں، بہتے ہوئے پانی اور کبھی ختم نہ ہونے والے فراواں میووں میں، جن کے درخت کبھی پھلوں سے محروم نہ ہوں گے، اور اونچے بستروں میں، (جہاں اُن کی بیویاں ہوں گی)۔ ہم نے اُنھیں ایک خاص اٹھان پر اٹھایا ہو گا[16] اور اُنھیں کنواری، دل ربا اور ہم سن بنا دیا ہو گا[17]۔ یہ سب دائیں والوں کے لیے ہے۔ وہ اگلوں میں بھی ایک بڑا گروہ ہوں گے اور پچھلوں میں بھی ایک بڑا گروہ۔ ۲۷-۴۰

اور بائیں والے، تو کیا بدبختی ہے بائیں والوں کی! وہ لو کی لپٹ اور کھولتے پانی

سلام۔'' (تدبر قرآن ۸/۱۶۵)

۱۵؎ بیری کے پھل بعض علاقوں میں ایسے لذیذ، خوشبودار اور خوش رنگ ہوتے ہیں کہ ایک دفعہ منہ کو لگنے کے بعد اُنھیں چھوڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر یہ جنت کی بیری ہے۔ یہاں اِس کا ذکر تمثیل کے پیرایے میں ہوا ہے جس سے کچھ اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے کہ یہ کیا چیز ہو گی۔

۱۶؎ اصل الفاظ ہیں: 'اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً'۔ اِن میں ضمیر کا مرجع لفظوں میں مذکور نہیں ہے، مگر 'الشیء بالشیء یذکر' کے مصداق بستروں کے ذکر سے صاف سمجھا جا رہا ہے۔

۱۷؎ پیچھے جس اٹھان کا ذکر ہے، یہ اُس کی وضاحت کر دی ہے کہ وہ ہمیشہ کنواری رہیں گی۔ اُن کے مرد جب اُن سے ملاقات کریں گے تو یہی محسوس کریں گے کہ گویا پہلی ملاقات ہے۔ نہایت محبوب، طرح دار، خوش اطوار، دل ربا اور ایک ہی سن وسال کی ہوں گی۔ اِن میں سے کسی کو

وَّظِلٍّ مِّنۡ یَّحۡمُوۡمٍ ﴿۴۳﴾ لَّا بَارِدٍ وَّلَا کَرِیۡمٍ ﴿۴۴﴾ اِنَّہُمۡ کَانُوۡا قَبۡلَ ذٰلِکَ مُتۡرَفِیۡنَ ﴿۴۵﴾
وَ کَانُوۡا یُصِرُّوۡنَ عَلَی الۡحِنۡثِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۴۶﴾ وَ کَانُوۡا یَقُوۡلُوۡنَ ۬ۙ اَئِذَا مِتۡنَا وَ کُنَّا
تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَ اِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ ﴿۴۷﴾ اَوَ اٰبَآؤُنَا الۡاَوَّلُوۡنَ ﴿۴۸﴾

قُلۡ اِنَّ الۡاَوَّلِیۡنَ وَ الۡاٰخِرِیۡنَ ﴿۴۹﴾ لَمَجۡمُوۡعُوۡنَ ۬ۙ اِلٰی مِیۡقَاتِ یَوۡمٍ
مَّعۡلُوۡمٍ ﴿۵۰﴾ ثُمَّ اِنَّکُمۡ اَیُّہَا الضَّآلُّوۡنَ الۡمُکَذِّبُوۡنَ ﴿۵۱﴾ لَاٰکِلُوۡنَ مِنۡ شَجَرٍ مِّنۡ
زَقُّوۡمٍ ﴿۵۲﴾ فَمَالِـُٔوۡنَ مِنۡہَا الۡبُطُوۡنَ ﴿۵۳﴾ فَشٰرِبُوۡنَ عَلَیۡہِ مِنَ الۡحَمِیۡمِ ﴿۵۴﴾

الواقعة
۵٦

اور دھوئیں کے سایے میں ہوں گے جس میں نہ ٹھنڈک ہوگی، نہ وہ کوئی فائدہ پہنچائے گا ـــــ یہ اِس سے پہلے خوش حالوں میں تھے اور سب سے بڑے گناہ پر اصرار کرتے تھے۔[18] یہ کہتے تھے کہ کیا جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے اور ہڈیاں رہ جائیں گے تو کیا ازسرِنو اٹھائے جائیں گے؟[19] اور کیا ہمارے باپ دادا بھی جو پہلے گزر چکے ہیں؟ ۴۱-۴۸

اِن سے کہہ دو، یقیناً اگلے اور پچھلے، سب جمع کیے جا رہے ہیں، ایک مقرر دن کے مقرر وقت تک۔ پھر، اے گم راہو اور جھٹلانے والو،[20] تم زقوم کے درخت میں سے

کسی پر ترجیح دینا آسان نہ ہوگا۔

۱۸؎ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو خوش حالی اِنھیں عطا فرمائی تھی، اُس کا تقاضا تو یہ تھا کہ خدا کے شکر گزار ہوتے، لیکن اِن کی رفاہیت اور عیش و آرام نے اِن پر الٹا اثر کیا اور اِنھیں تکبر میں مبتلا کر دیا۔ چنانچہ پیغمبر کی طرف سے انذار کے باوجود یہ سب سے بڑے گناہ پر اصرار کرتے رہے۔ قرآن کی تصریحات سے واضح ہے کہ سب سے بڑے گناہ سے مراد شرک ہے۔

۱۹؎ یہ دوسرے بڑے گناہ کا ذکر ہے کہ اِنھیں جب شرک پر اصرار کے نتائج سے خبردار کیا جاتا تو اِس کا مذاق اڑاتے کہ اچھا، مٹی اور ہڈیاں ہو جانے کے بعد اب ہم اور ہمارے آبا و اجداد دوبارہ زندہ

فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ ﴿۵۵﴾ هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿۵۶﴾
نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ﴿۵۷﴾ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ﴿۵۸﴾
ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿۵۹﴾ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا
نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۶۰﴾ عَلٰۤى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا

ضرور کھاؤ گے اور اُسی سے پیٹ بھرو گے۔ پھر اُس پر کھولتا ہوا پانی پیو گے تو تونس لگے ہوئے اونٹوں کی طرح پیو گے ـــــــ روز جزا میں یہ اِن (بدبختوں) کی پہلی ضیافت ہو گی۔[۲۱] ۴۹-۵۶

ہم نے تمھیں پیدا کیا ہے تو قیامت کی تصدیق کیوں نہیں کرتے؟[۲۲] پھر کبھی سوچا ہے، یہ نطفہ جو تم ٹپکاتے ہو، اُس سے جو کچھ بنتا ہے، اُسے تم بناتے ہو یا ہم بنانے والے ہیں؟ ہم نے تمھارے درمیان موت مقدر کی ہے اور ہم عاجز نہیں ہیں، بلکہ پوری

بھی کیے جائیں گے! یہ تو انہونی سی بات ہے جو ہمیں بے وقوف بنانے کے لیے سنائی جا رہی ہے۔

۲۰۔ اصل الفاظ ہیں: 'اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ'۔ اِس سے پیچھے دو گناہوں کا ذکر ہوا ہے: ایک شرک اور دوسرے عقیدۂ آخرت کی تکذیب۔ یہ دو لفظ اِنھی کے لحاظ سے آئے ہیں۔ یعنی توحید کے معاملے میں گم راہی اختیار کرنے والے اور قیامت کے دن کو جھٹلانے والے۔

۲۱۔ اصل میں لفظ 'نُزُل' استعمال ہوا ہے۔ یہ اُس سامان ضیافت کو کہتے ہیں جو سواری سے اترنے کے بعد سب سے پہلے مہمان کو پیش کیا جاتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ جن کی اولین ضیافت یہ ہو گی، اُنھیں آگے کیا پیش آئے گا، اِس کا اندازہ کون کر سکتا ہے!

۲۲۔ مطلب یہ ہے کہ جب پہلی مرتبہ تمھیں پیدا کر دیا ہے تو دوبارہ پیدا کرنے میں کیا مشکل ہے؟ اپنی پیدایش کو بھی جانتے ہو اور اپنے جیسے انسانوں کی پیدایش کا منظر بھی شب و روز دیکھتے ہو۔ تعجب ہے کہ اِس کے بعد بھی قیامت کی تصدیق نہیں کرتے۔

تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۱﴾ وَلَقَدۡ عَلِمۡتُمُ النَّشۡاَۃَ الۡاُوۡلٰی فَلَوۡلَا تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۶۲﴾
اَفَرَءَیۡتُمۡ مَّا تَحۡرُثُوۡنَ ﴿ؕ۶۳﴾ ءَاَنۡتُمۡ تَزۡرَعُوۡنَہٗۤ اَمۡ نَحۡنُ الزّٰرِعُوۡنَ ﴿۶۴﴾
لَوۡ نَشَآءُ لَجَعَلۡنٰہُ حُطَامًا فَظَلۡتُمۡ تَفَکَّہُوۡنَ ﴿۶۵﴾ اِنَّا لَمُغۡرَمُوۡنَ ﴿ۙ۶۶﴾ بَلۡ
نَحۡنُ مَحۡرُوۡمُوۡنَ ﴿۶۷﴾

قدرت رکھتے ہیں کہ تمھاری جگہ تمھارے جیسے بنا دیں[۲۳] اور تمھیں اُس دنیا میں اٹھا کھڑا کریں جسے تم نہیں جانتے۔ اپنی پہلی پیدایش کو تو تم جانتے ہو، پھر کیوں یاددہانی حاصل نہیں کرتے؟ ۵۷-۶۲

پھر تم نے کبھی سوچا ہے، یہ جو کچھ تم بوتے ہو، اِسے تم اگاتے ہو یا ہم اگانے والے ہیں[۲۴]؟ ہم چاہیں تو اِسے ریزہ ریزہ کر دیں اور تم باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہم پر تو الٹی چٹی پڑ گئی، نہیں، بلکہ ہم تو بالکل ہی محروم رہ گئے۔ ۶۳-۶۷

۲۳؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَمَا نَحۡنُ بِمَسۡبُوۡقِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡ نُّبَدِّلَ اَمۡثَالَکُمۡ'۔ اِن میں 'عَلٰی' اِس بات کا قرینہ ہے کہ 'مَا نَحۡنُ بِمَسۡبُوۡقِیۡنَ' سے جو مثبت مفہوم پیدا ہوتا ہے، اُسے یہاں متضمن مانا جائے۔ ہم نے ترجمہ اُسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۲۴؎ انسان کی خلقت کے بعد اب یہ اُس کے وسائل رزق کی طرف توجہ دلائی ہے کہ وہ کس طرح میسر ہوتے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...تمھارا حصہ صرف اتنا ہی ہے کہ تم ہل چلا کر کچھ دانے زمین میں بکھیر دیتے ہو، اِس کے بعد کے سارے مراحل، تم دیکھتے ہو کہ براہ راست قدرت کے اہتمام میں طے ہوتے ہیں۔ اُسی نے زمین میں یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ اپنی آغوش میں دانے کی پرورش کرے۔ اُسی نے بیج میں یہ صلاحیت ودیعت فرمائی کہ وہ زمین کی حرارت اور رطوبت سے فیض یاب ہو کر اپنے اندر سے سوئیاں نکالے اور اُن نازک سوئیوں کے اندر یہ حوصلہ ودیعت فرمایا کہ وہ دھرتی کا سینہ

اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ﴿٦٨﴾ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ﴿٦٩﴾ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ﴿٧٠﴾ اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ﴿٧١﴾ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِــُٔوْنَ ﴿٧٢﴾ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ﴿٧٣﴾

پھر تم نے کبھی سوچا ہے، یہ پانی جو تم پیتے ہو، اِسے تم نے بادلوں سے اتارا ہے یا ہم اتارنے والے ہیں؟ ہم چاہیں تو اِسے سخت کھاری بنا دیں۔ پھر تم شکر کیوں نہیں کرتے؟ ۶۸-۷۰

پھر تم نے کبھی سوچا ہے، یہ آگ جو تم جلاتے ہو، اِس کا درخت تم نے پیدا کیا ہے یا اِسے ہم پیدا کرنے والے ہیں[۲۵]؟ ہم نے اِسے یاددہانی کا ذریعہ اور صحرا کے مسافروں کے لیے متاعِ عزیز بنا دیا ہے[۲۶]۔ ۷۱-۷۳

چیر کر باہر نکلیں اور کھلی فضا میں پروان چڑھیں۔ پھر اللہ ہی اِن نازک سوئیوں کو ڈنٹھلوں کا سہارا مہیا کرتا ہے۔ اِن کے اندر برگ و بار پیدا کرتا ہے، خوشے نکالتا ہے، پھول اور پھل پیدا کرتا ہے، پھر وہ پک کر کسان کی جھولی بھرتے ہیں۔ غور کرو کہ اِن میں سے کون سا کام ہے جو تمھارے کیے ہوتا ہے یا جس کو تم انجام دینے کی قابلیت رکھتے ہو؟'' (تدبر قرآن ۱۷۶/۸)

۲۵ یہ مرخ اور عفار کا ذکر ہے جن کی دو ٹہنیوں کو ایک دوسری سے رگڑ کر صحرا کے مسافر آگ پیدا کر لیتے تھے۔

۲۶ آیت ۵۷ سے یہاں تک جو کچھ فرمایا ہے، وہ محض استدلال نہیں ہے۔ اثبات قیامت کا استدلال تو پچھلی سورتوں میں ہر لحاظ سے واضح کر دیا گیا ہے۔ یہ زجر و ملامت ہے جو اتمام حجت کے لیے منکرین کو اُن کی ضد اور ہٹ دھرمی پر کی گئی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ پانی کی ایک بوند پر جو تم ٹپکا کر الگ ہو جاتے ہو، خدا کے تصرفات دیکھتے ہو؛ موت کے اُس جال کو دیکھتے ہو جو ہم نے

فَسَبِّحۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الۡعَظِیۡمِ ﴿۷۴﴾

فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوۡمِ ﴿۷۵﴾ وَ اِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوۡ تَعۡلَمُوۡنَ عَظِیۡمٌ ﴿۷۶﴾

اِس لیے (اِنھیں چھوڑو، اے پیغمبر اور) تم اپنے رب عظیم کی تسبیح کرو اُس کے نام کی مدد سے۔[۲۷] ۷۴

(یہ قرآن کو جھٹلاتے ہیں)۔ سو نہیں، (یہ کسی شیطان کا الہام نہیں ہے[۲۸])، میں اُن ٹھکانوں کی گواہی پیش کرتا ہوں جہاں ستارے گرتے ہیں،[۲۹] اور اگر تم سمجھو تو یقیناً یہ بہت

تمھارے اردگرد بکھار کھا ہے؛ اپنی پہلی پیدایش کو دیکھتے ہو؛ بیج کو زمین کا سینہ چیر کر نکلتے اور برگ و بار لاتے دیکھتے ہو؛ دنیا میں جو چیزیں تمھیں میسر ہیں، اُن پر خدا کے غیر معمولی کنٹرول کو دیکھتے ہو؛ تمھاری ضرورتوں کے لیے آگ اور پانی جیسی نعمتیں کس طرح اور کہاں کہاں میسر ہوتی ہیں، اُس کو دیکھتے ہو؛ تم یہ سب کچھ دیکھتے ہو اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار کر دیتے ہو۔ تم پر افسوس، تم یہ کس طرح کر دیتے ہو!

۲۷ اصل الفاظ ہیں: 'فَسَبِّحۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الۡعَظِیۡمِ'۔ اِن میں 'ب' کا صلہ قرینہ ہے کہ 'سَبِّحۡ' یہاں استعانت کے مفہوم پر متضمن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے پروردگار کو اِس بات سے پاک ٹھیراؤ کہ اپنے شکر گزار بندوں کو وہ اُن کی شکر گزاری کا صلہ نہیں دے گا اور جو ناشکرے ہیں، اُنھیں کیفر کردار کو نہیں پہنچائے گا۔ اِس طرح کی بات یہی احمق کہہ سکتے ہیں۔ تم اِنھیں چھوڑو اور اُس کے نام کی مدد سے اُس کی پاکی بیان کرو۔

۲۸ اصل الفاظ ہیں: 'فَلَاۤ، اُقۡسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوۡمِ'۔ 'اُقۡسِمُ' سے پہلے 'لَا' اُن باتوں کی تردید کے لیے ہے جو قرآن کے متعلق یہ لوگ بنا رہے تھے۔ ہم نے ترجمے میں اِسے کھول دیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... یہ اسلوب کلام ایک فطری اسلوب کلام ہے، اِس وجہ سے ہر زبان میں موجود ہے۔

إِنَّهُۥ لَقُرۡءَانٞ كَرِيمٞ ٧٧ فِي كِتَٰبٖ مَّكۡنُونٖ ٧٨ لَّا يَمَسُّهُۥٓ إِلَّا ٱلۡمُطَهَّرُونَ ٧٩ تَنزِيلٞ

بڑی گواہی ہے[30]۔ اِس میں شبہ نہیں کہ یہ ایک بلند پایہ قرآن ہے[31]، ایک محفوظ کتاب

ہماری زبان میں بھی یہ اسلوب معروف ہے۔ جب آپ کہتے ہیں: 'نہیں، خدا کی قسم، اصل حقیقت یوں ہے'، تو یہی اسلوب استعمال کرتے ہیں اور مقصود یہ ہوتا ہے کہ اصل حقیقت کے اثبات سے پہلے مخاطب یا معترض کے خیال یا اعتراض کی تردید کر دیں۔ اِس اسلوب کلام میں بلاغت یہ ہے کہ گویا معترض کا اعتراض اتنا لغو ہے کہ متکلم ایک لمحے کے لیے بھی اُس کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اُس کو اتنا توقف بھی گوارا نہیں ہے کہ صحیح پہلو کی وضاحت کرنے کے بعد اُس کی تردید کرے۔'' (تدبر قرآن ۱۸۲/۸)

۲۹۔ یہ اُن ٹھکانوں کا ذکر ہے جن پر، قرآن کی تصریح کے مطابق، شہاب ثاقب پھینکے جاتے ہیں تاکہ شیاطین اُن میں بیٹھ کر ملاء اعلیٰ سے آنے والوں کی باتیں سننے کی کوشش نہ کریں۔ یہاں اِن کے لیے 'مَوٰقِع' کا لفظ آیا ہے جس کے معنی کسی چیز کے واقع ہونے یا گرنے کی جگہ کے ہیں۔ اِس سے مقصود یہ ہے کہ شہابوں کے ہدف ہونے کا مفہوم نمایاں ہو۔ سورۂ جن (۷۲) کی آیت ۹ میں اِنھی ٹھکانوں کو 'مَقَاعِد' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، اِس لیے کہ وہاں اِن کے کمین گاہ ہونے کا مفہوم پیش نظر ہے۔ لفظ 'نُجُوم' شہابوں کے لیے ہے۔ سورۂ ملک (۶۷) کی آیت ۵ میں تصریح ہے کہ آسمان جن ستاروں سے روشن ہے، وہی 'رُجُومًا لِّلشَّیٰطِیْنِ' بھی ہو جاتے ہیں۔

۳۰۔ یہ ایک برمحل جملۂ معترضہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم سمجھنے کی کوشش کرو تو اللہ تعالیٰ نے تمھاری آگاہی کے لیے اپنی کائنات کے ایک اہم راز سے پردہ اٹھا دیا ہے تاکہ تم قرآن کے بارے میں وہ لغو باتیں نہ کرو جو اب تک کرتے رہے ہو اور سمجھ لو کہ یہ جہاں سے آتا ہے، شیاطین کو وہاں تک ہرگز کوئی رسائی حاصل نہیں ہے۔

۳۱۔ یہاں سے آگے آیت ۸۰ تک مقسم علیہ ہے جس پر نزول قرآن کے وقت اُس کی حفاظت

الواقعة ٥٦

مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٨٠﴾ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ﴿٨١﴾ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ﴿٨٢﴾

فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ﴿٨٣﴾ وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ﴿٨٤﴾ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ﴿٨٥﴾ فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ﴿٨٦﴾

میں[۳۲]۔ اُس کو صرف پاکیزہ (فرشتے) ہی ہاتھ لگاتے ہیں۔ یہ عالم کے پروردگار کا نازل کیا ہوا ہے۔ تو کیا اِس کلام سے بے اعتنائی برتتے ہو؟ اور جو تمھارے لیے (خدا کا) رزق ہے، اُسے جھٹلا رہے ہو[۳۳]؟ ۷۵-۸۲

پھر تم کسی کے محکوم نہیں ہو تو اُس وقت جب مرنے والے کی جان حلق میں پہنچ جاتی ہے[۳۴] اور تم اُس وقت دیکھ رہے ہوتے ہو، لیکن نہیں دیکھتے کہ اُس وقت تمھاری نسبت

کے انتظامات کی گواہی پیش کی گئی ہے۔

۳۲؎ اِس سے لوح محفوظ مراد ہے۔ اصل میں اِس کے لیے 'کِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن کے معنی ہیں ایسا نوشتہ جو چھپا کر رکھا گیا ہو۔

۳۳؎ یہاں قرآن کو خدا کا رزق قرار دیا ہے۔ وحی الٰہی کے لیے یہ تعبیر قدیم صحیفوں میں بھی آئی ہے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام نے فرمایا ہے: انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا، بلکہ اُس کلمے سے جیتا ہے جو خداوند کی طرف سے آتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ نے تو تمھارے لیے مائدۂ آسمانی اتارا کہ تم اُس سے حیات جاوداں حاصل کرو، لیکن تمھاری محرومی ہے کہ تم اُس کی ناقدری اور تحقیر کر رہے ہو۔“
>
> (تدبر قرآن ۸/۱۸۵)

۳۴؎ اصل الفاظ ہیں: 'فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ'۔ اِن میں 'بَلَغَت' کا فاعل حذف کر دیا

تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٨٧﴾

فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿٨٨﴾ فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ ۙ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ ﴿٨٩﴾ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿٩٠﴾ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿٩١﴾ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿٩٢﴾ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿٩٣﴾ وَّتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ﴿٩٤﴾

ہم اُس سے زیادہ قریب ہوتے ہیں، پھر تم محکوم نہیں ہو تو اُس (کی نکلتی ہوئی) جان کو لوٹا کیوں نہیں لیتے، اگر تم سچے ہو؟[۳۵] ۸۳-۸۷

سو (جان لو کہ) اگر وہ مرنے والا مقربین میں سے ہے تو اُس کے لیے راحت اور سرور[۳۶] اور آسایش کا باغ ہے۔ اور اگر اصحاب یمین میں سے ہے تو فرشتے کہتے ہیں: تیرے لیے سلامتی ہے، اے وہ جو اصحاب یمین میں سے ہے۔ اور اگر جھٹلانے والے گم راہوں میں سے ہے[۳۷] تو اُس کے لیے کھولتے ہوئے پانی کی ضیافت ہے اور جہنم میں جھونکنا ہے۔ ۸۸-۹۴

ہے۔ اِس میں بلاغت یہ ہے کہ ابہام کی وجہ سے واقعے کا ہول زیادہ موثر ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔

۳۵؎ مطلب یہ ہے کہ موت کی بے بسی بتا رہی ہے کہ تم محکوم محض ہو۔ خدا جب چاہے گا، تمھیں اپنے حضور میں پکڑ بلائے گا۔ تم شب و روز اپنی اِس بے بسی کا مشاہدہ کرتے ہو، لیکن اِس کے باوجود اپنے آپ کو مطلق العنان اور شتر بے مہار سمجھتے ہو۔ یہی بات ہے تو ذرا فرشتۂ اجل کا ہاتھ پکڑ کر اپنی کسی عزیز ہستی کو اُس کی گرفت سے نکال کر دکھاؤ۔

۳۶؎ اصل میں لفظ 'رَیْحَان' استعمال ہوا ہے۔ اِس کے معنی اصلاً تو پھول کے ہیں، لیکن یہ اپنے لوازم، یعنی خوشبو اور اِس کے نتیجے میں حاصل ہونے والے سرور کے لیے بھی آتا ہے۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الۡيَقِيۡنِ ﴿٩٥﴾ فَسَبِّحۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الۡعَظِيۡمِ ﴿٩٦﴾

یقیناً یہی قطعی حق ہے۔ سو (اے پیغمبر، اِنھیں چھوڑو اور) اپنے رب عظیم کی تسبیح کرو اُس کے نام کی مدد سے۔ ۹۵-۹۶

۳۷؎ اِن لوگوں کا ذکر اصحاب الشمال کے بجاے اِن کے جرم کے حوالے سے کیا ہے۔ اِس سے مقصود یہ ہے کہ کلام مخاطبین پر پوری طرح منطبق ہو جائے اور اُن کے جرم کی نوعیت بھی واضح رہے۔

لاہور

۱۰/ ستمبر ۲۰۰۹ء

الحدید - المجادلة

۵۷ ــــ ۵۸

الحدید - المجادلة

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ میں جس جہاد و انفاق کے لیے ابھارا ہے، دوسری میں اُسی کے خلاف پروپیگنڈا کرنے والے منافقین کو اُن کے رویے پر سخت تنبیہ کی گئی ہے۔ دونوں میں خطاب مسلمانوں سے ہے اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ مدینۂ طیبہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ تزکیہ وتطہیر میں نازل ہوئی ہیں۔

پہلی سورہ ــــ الحدید ــــ کا موضوع مسلمانوں کو سابقین اولین کے مرتبے تک پہنچنے کے لیے جہاد و انفاق کی ترغیب اور اُن لوگوں کو تنبیہ وتلقین ہے جو ایمان کے تقاضوں سے پوری طرح آشنا نہ ہونے کی وجہ سے اسلام کے اِن مطالبات کو پورا کرنے سے گریزاں تھے۔

دوسری سورہ ــــ المجادلة ــــ کا موضوع ایمان و اسلام کے تقاضوں کی وضاحت، منافقین کو تہدید و وعید اور اُن کے اُس پروپیگنڈے کا سد باب ہے جو وہ مسلمانوں کے عقائد کو متزلزل اور اُن کے جوش جہاد کو سرد کرنے کے لیے کر رہے تھے۔

سورة الحديد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۱﴾ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ ۚ وَ ہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۲﴾ ہُوَ الۡاَوَّلُ وَ الۡاٰخِرُ وَ الظَّاہِرُ وَ الۡبَاطِنُ ۚ وَ ہُوَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۳﴾

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

زمین اور آسمانوں کی ہر چیز نے اللہ کی تسبیح کی ہے اور وہ زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے۔[۱] زمین اور آسمانوں کی بادشاہی اُسی کی ہے۔ وہی زندہ کرتا اور وہی مارتا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ وہی اول بھی ہے اور آخر بھی، اور ظاہر بھی ہے اور باطن بھی، اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔[۲] ۱-۳

---

۱ یعنی کائنات کی ہر چیز نے ہمیشہ اپنے وجود سے اِس حقیقت کا اظہار و اعلان کیا ہے کہ اُس کے خالق نے دنیا محض کھیل تماشے کے لیے نہیں بنائی، وہ اِس سے پاک ہے کہ اِس طرح عبث کوئی کام کرے۔ چنانچہ انسان کو بھی یہی کرنا چاہیے۔ ورنہ وہ زبردست ہے، ایک دن پکڑ بلائے گا اور اُسے لازماً پکڑ بلانا چاہیے، اِس لیے کہ وہ حکیم بھی ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ظالموں اور نیکوکاروں کو وہ انجام کے لحاظ سے یکساں کر دے؟

۲ احاطۂ قدرت کے بعد اب یہ اللہ تعالیٰ کے احاطۂ علم کا بیان ہے کہ وہ زمان و مکان کی محدودیتوں سے بالاتر ہے۔ چنانچہ اول ہے، اُس سے پہلے کچھ نہیں ہے؛ آخر ہے، اُس کے بعد بھی کچھ نہیں ہے؛ ظاہر ہے، اُس کے اوپر کچھ نہیں ہے؛ باطن ہے، اُس کے نیچے بھی کچھ نہیں ہے۔ اُس

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ؕ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ؕ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۴ لَهٗ مُلْكُ

وہی ہے جس نے زمین اور آسمانوں کو چھ دن میں پیدا کیا اور پھر (اُن کی تدبیر امور کے لیے) عرش پر جلوہ فرما ہوا[۳]۔ وہ جانتا ہے جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اُس سے نکلتا ہے، اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اُس میں چڑھتا ہے، اور جہاں تم ہوتے ہو، وہ تمھارے ساتھ ہوتا ہے، اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے دیکھتا ہے[۴]۔

الحدید ۵۷

کا علم ابتدا، انتہا اور اندر باہر ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

۳؎ اوپر جس احاطۂ علم وقدرت کا بیان ہے، یہ اُس کی مزید تفصیل ہے کہ اللہ نے زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کیا اور اُن کو پیدا کر کے وہ اُن سے بے تعلق نہیں ہو گیا، بلکہ اب اُن کا نظم ونسق بھی وہی چلا رہا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''قرآن میں جہاں کہیں آسمانوں اور زمین کے چھ دنوں میں پیدا کیے جانے کا ذکر آیا ہے، اُس سے مقصود اُس اہتمام خاص کی طرف ہم کو متوجہ کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اُن کے پیدا کرنے میں ملحوظ رکھا ہے۔ اور پھر اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ نے اِس اہتمام سے پیدا کی ہے، کس طرح ممکن ہے کہ اُس کو پیدا کر کے وہ اُس سے بالکل بے تعلق ہو کے بیٹھ رہے؟ نہ اُس کے خیر سے اُسے کوئی دل چسپی رہے، نہ اُس کے شر سے اُسے کوئی تعلق، لوگ جو دھاندلی چاہیں، اُس میں مچاتے پھریں اور وہ خاموش تماشائی کی طرح تماشا دیکھتا رہے! اگر وہ ایسا کرے تو اِس کے معنی یہ ہوئے کہ اُس نے یہ ساری کائنات محض ایک کھیل کے طور پر بنائی ہے جس میں اہتمام تو اُس نے بہت صرف کیا، مگر اُس کا مقصد کچھ بھی نہیں۔'' (تدبر قرآن ۱۹۸/۸)

۴؎ یہ اُس بیدار مغزی اور جزرسی کی وضاحت ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنی مملکت کے انتظامات کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝۵ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ
وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ؕ وَهُوَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۶
اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ
فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝۷ وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ

زمین اور آسمانوں کی بادشاہی اُسی کی ہے اور تمام معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع کیے جاتے ہیں[۵]۔ وہی رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور وہ سینوں کے بھید تک جانتا ہے۔۴-۶

(اِس لیے تم بھی اللہ کی تسبیح کرو اور) اللہ اور اُس کے رسول پر فی الواقع ایمان لاؤ[۶] اور جن چیزوں کا اللہ نے تمھیں امین بنایا ہے، اُن میں سے خرچ کرو[۷]۔ چنانچہ تم میں سے جو اِس طرح ایمان لائے اور اُنھوں نے (اللہ کی راہ میں) خرچ کیا ہے، اُن کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ اور تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ پر فی الواقع ایمان نہیں لاتے

۵؎ یعنی کوئی معاملہ کسی دوسرے کی صواب دید پر نہیں ہے۔ تمام امور اُسی کے حکم سے جاری ہوتے اور مآل کار اُسی کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔

۶؎ اصل میں فعل 'اٰمِنُوْا' آیا ہے۔ آگے کے مضمون سے واضح ہے کہ یہ اپنے حقیقی اور کامل مفہوم میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان کا دعویٰ ہے تو ایمان لاؤ جس طرح کہ ایمان لانے کا حق ہے، اِس لیے کہ جب معاملہ اُس پروردگار سے ہے جس کی صفات اوپر بیان ہوئی ہیں تو محض ایمان کا دعویٰ کر لینے سے تو تم اُسے راضی نہیں کر سکتے۔

۷؎ یہ اُس خرچ کی ترغیب ہے جو زمانۂ رسالت میں جہاد و قتال کی ضرورتوں کے لیے مطلوب تھا۔ آگے کی آیات سے اِس کی وضاحت ہو جائے گی۔

الحدید ۵۷

وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۸﴾
هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖۤ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى
النُّوْرِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹﴾ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ

ہو، دراں حالیکہ رسول تمھیں تمھارے پروردگار پر ایمان لانے کی دعوت دے رہا ہے اور وہ تم سے (سمع وطاعت کا) مضبوط عہد بھی لے چکا ہے،[8] اگر تم واقعی مانتے ہو؟ ۷-۸
وہی ہے جو اپنے بندے پر یہ روشن آیتیں نازل کر رہا ہے تا کہ تمھیں تاریکیوں[9] سے نکال کر روشنی میں لے آئے،[10] اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تم پر نہایت شفیق اور بے حد مہربان ہے۔[11] تمھیں کیا ہوا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو، دراں حالیکہ زمین اور آسمانوں کی میراث، سب اللہ ہی کو لوٹنے والی ہے؟[12] (تم پر واضح ہونا چاہیے کہ) تم میں

۸۔ اِس سے مراد وہ عہد ہے جس کا ذکر سورۂ مائدہ (۵) کی آیت ۷ میں کیا گیا ہے۔

۹۔ اشارہ ہے خواہشات نفس اور حب دنیا کی اُن تاریکیوں کی طرف جو انسان کا احاطہ کیے رہتی ہیں۔

۱۰۔ چنانچہ یہی روشنی ہے جو دنیا میں راہ دکھاتی ہے اور آخرت میں انسان کو اُس کی منزل مقصود تک پہنچا دیتی ہے۔

۱۱۔ اصل میں 'رَءُوْفٌ' اور 'رَحِيْمٌ' کے الفاظ آئے ہیں۔ زبان کے اداشناس جانتے ہیں کہ 'رأفت' میں دفع شر اور 'رحمت' میں اثبات خیر کا پہلو زیادہ ملحوظ ہوتا ہے۔

۱۲۔ یعنی جب ہر چیز اللہ ہی کی طرف لوٹ جانے والی ہے اور انسان اِس چند روزہ زندگی میں محض امین کی حیثیت رکھتا ہے تو خدا کی امانت کو خود خدا سے روکنے کے کیا معنی!

وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۰﴾

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗۤ اَجْرٌ

سے جو لوگ فتح کے بعد[13] انفاق کریں گے اور (راہ حق میں) لڑیں گے، وہ کبھی اُن لوگوں کے برابر نہ ہوں گے جنھوں نے فتح سے پہلے انفاق کیا اور (راہ حق میں) لڑے۔ اُن کا درجہ یقیناً اُن لوگوں سے بڑا ہوگا جو اِس کے بعد انفاق کریں گے اور لڑیں گے[14]، اگرچہ اللہ کا وعدہ دونوں ہی سے اچھا ہے[15]۔ (یاد رکھو کہ) جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس سے خوب باخبر ہے۔ ۹-۱۰

اب کون ہے جو اللہ کو قرض دے[16]، اچھا قرض[17] تاکہ وہ اُس کے لیے اُسے (جس

۱۳؎ یہ فتح مکہ کا ذکر ہے۔ اُس وقت اگرچہ قریش کا اقتدار بہ دستور قائم تھا، مگر مسلمان جانتے تھے کہ سنت الٰہی کے مطابق یہ اُن کے لیے مقدر ہو چکی ہے۔

۱۴؎ یہ اُنھی سابقین کے زمرے میں شامل ہونے کی دعوت ہے جن کا ذکر اِس سے پہلے سورۂ واقعہ میں ہو چکا ہے۔

۱۵؎ یعنی فتح کے بعد بھی نیکوکاروں کی نیکیوں کا اجر اُنھیں ضرور ملے گا اور اُن کی خدمات کے لحاظ سے اُن کے درجے اور مرتبے بھی ہوں گے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...حسن نیت اور اخلاص کے ساتھ جو لوگ بھی اسلام کی خدمت کریں گے، وہ اپنی قربانیوں کا صلہ پائیں گے، بلکہ اُن میں سے ایسے لوگ بھی نکلیں گے جو اگلوں کی صف میں جگہ حاصل کریں گے۔ تاہم فتح مکہ سے پہلے کا دور اور ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو اِس دور کی قدر پہچانیں اور اُس سے صحیح فائدہ اٹھالیں۔“ (تدبر قرآن ۸/۲۰۶)

۱۶؎ قرآن میں یہ تعبیر اُس انفاق کے لیے اختیار کی گئی ہے جو اللہ کے کسی مشن کو پورا کرنے

كَرِيْمٌ ﴿١١﴾ يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿١٢﴾ يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ فَضُرِبَ

قدر چاہے) بڑھائے اور اُس کے لیے باعزت صلہ ہو، اُس دن، جب کہ تم مومن مردوں اور عورتوں کو دیکھو گے کہ اُن کی روشنی اُن کے آگے اور اُن کے دائیں چل رہی ہے[18] — آج تمھارے لیے خوش خبری ہے اِن باغوں کی جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں، اِن میں ہمیشہ رہو گے۔ یہی درحقیقت بڑی کامیابی ہے۔ جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں اہل ایمان کو پکاریں گے کہ ذرا دیکھو، ہم پر بھی عنایت فرماؤ کہ تمھاری روشنی سے ہم بھی

کے لیے کیا جاتا ہے۔ یہاں سیاق سے واضح ہے کہ یہ اپیل اُس جہاد کے لیے کی گئی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے کیا۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے:

"...اوپر واضح ہو چکا ہے کہ انسان کے پاس جو کچھ بھی ہے، وہ اللہ تعالیٰ ہی کی سپرد کردہ امانت ہے۔ اب یہ کتنا بڑا فضل ہے اُس رب کریم کا کہ وہ اپنا ہی عطا کیا ہوا مال اپنی راہ میں خرچ کرنے کی جب بندوں کو دعوت دیتا ہے تو اُس کو اپنے ذمے قرض ٹھیراتا ہے جس کی واپسی کا وہ گویا اُسی طرح ذمہ دار ہے، جس طرح ایک قرض دار اپنے مہاجن کی رقم کی واپسی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔" (تدبر قرآن ۸/۲۰۷)

۱۷۔ اصل میں 'قَرْضًا حَسَنًا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِس سے مراد وہ قرض ہے جو اچھے مال میں سے، پوری فراخی اور بلند حوصلگی کے ساتھ اور محض اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔

۱۸۔ یہ روشنی اُسی انفاق کا فیض ہوگی جس کی دعوت یہاں دی جا رہی ہے اور اُن کے آگے اور

بَيْنَهُم بِسُورٍ لَّهُ بَابٌ ؕ بَاطِنُهُ فِيهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهُ مِن قِبَلِهِ الْعَذَابُ ؕ ﴿١٣﴾ يُنَادُونَهُمْ أَلَمْ نَكُن مَّعَكُمْ ؕ قَالُوا بَلَىٰ وَلَٰكِنَّكُمْ فَتَنتُمْ أَنفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْأَمَانِيُّ حَتَّىٰ جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ وَغَرَّكُم بِاللَّهِ الْغَرُورُ ﴿١٤﴾ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنكُمْ فِدْيَةٌ وَلَا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ مَأْوَاكُمُ النَّارُ ۖ هِيَ مَوْلَاكُمْ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿١٥﴾

الحدید
۵۷

کچھ فائدہ اٹھالیں، مگر اُن سے کہا جائے گا: (نہیں)، تم پیچھے کی طرف لوٹ جاؤ اور (وہیں اپنے لیے) روشنی تلاش کرو۔ پھر اُن کے اور اہل ایمان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہو گا۔ اُس کے اندر رحمت ہو گی اور باہر کی طرف عذاب۔ یہ اُن سے فریاد کریں گے: کیا (دنیا میں) ہم تمھارے ساتھ نہ تھے؟ وہ جواب دیں گے کہ بے شک ساتھ تو تھے، مگر تم نے اپنے آپ کو فتنوں میں ڈالے رکھا، ہمارے لیے گردشوں کے منتظر رہے، شبہوں میں مبتلا رہے اور تمھاری آرزوئیں تمھیں فریب دیتی رہیں، یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ ظاہر ہو گیا اور وہ بڑا دغاباز[19] آخر وقت تک تمھیں اللہ کے معاملے میں فریب ہی دیتا رہا۔ اِس لیے آج نہ تم سے کوئی فدیہ قبول ہو گا اور نہ اُن لوگوں سے جنھوں نے کھلا کفر کیا تھا۔ تم سب کا ٹھکانا جہنم ہے، وہی تمھارا مرجع ہے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے! ۱۱-۱۵

دائیں پھیلے گی تاکہ اصحاب الشمال اِس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکیں۔

۱۹ اِس سے شیطان مراد ہے جو ہمیشہ انسان کو یہ سبق پڑھاتا ہے کہ خدا کے حضور میں پیشی اور آخرت کی جواب دہی، سب لوگوں کے افسانے ہیں۔ یہ نہ پہلے سچے ثابت ہوئے نہ اب ہوں گے۔ اِس لیے کوئی مشقت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ تمھارے لیے عیش ہی عیش ہے۔

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ⑯

کیا اِن لوگوں کے لیے جو ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں، ابھی وہ وقت نہیں آیا[20] کہ اِن کے دل اللہ کی یاددہانی کے آگے اور اُس حق کے آگے جھک جائیں جو (اُس کی طرف سے) نازل ہوا ہے[21] اور یہ اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو اِس سے پہلے کتاب دی گئی، پھر اُن پر لمبی مدت گزر گئی، یہاں تک کہ اُن کے دل سخت ہو گئے اور (آج) اُن میں سے بہتیرے نافرمان بنے ہوئے ہیں[22]؟ ۱۶

۲۰؎ یعنی دعوت حق کی صداقت کے اتنے آثار و شواہد نمایاں ہو جانے کے بعد بھی وقت نہیں آیا۔

۲۱؎ آیت میں دو لفظ استعمال ہوئے ہیں: ایک 'ذِکْرُ اللّٰہ' اور دوسرا 'حَقّ'۔ دونوں سے مراد قرآن مجید ہے۔ پہلا اُس کی تنبیہات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور دوسرا اُن حقائق کی طرف جو اُس نے باطل سے الگ کر کے ہر لحاظ سے واضح کر دیے۔

۲۲؎ مدعا یہ ہے کہ اگر اب بھی یہ لوگ شبہات ہی میں مبتلا رہے اور اِنھوں نے یاددہانی حاصل نہ کی تو اندیشہ ہے کہ اُسی انجام کو نہ پہنچ جائیں جس کو اِس سے پہلے یہود پہنچ چکے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"اِس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ کسی امر حق میں شبہ و تردد کا پیدا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اور نہ کچھ عرصے تک اُس کا باقی رہنا کوئی قابل ملامت چیز ہے۔ ایک نیک نیت آدمی کے اندر بھی یہ حالت پیدا ہو سکتی ہے، لیکن کوئی شخص اگر اِن شبہات کی آڑ لے کر اپنے اندر حق کی آواز کو برابر دباتا ہی رہے اور اُس کو باطل سے چمٹے رہنے کے لیے ایک بہانہ بنا لے تو سنت الٰہی

الحدید ۵۷

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿١٧﴾

اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴿١٨﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ڰ

(تم آگے بڑھو، کیا بعید ہے کہ اللہ تمھارے دل پگھلا دے)! جان رکھو کہ اللہ زمین کو اُس کے مردہ ہو جانے کے بعد بھی زندہ کر دیتا ہے۔ اپنی آیتیں ہم نے تمھارے لیے واضح کر دی ہیں تاکہ تم عقل سے کام لو۔ ۱۷

(جان رکھو کہ) اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے مرد اور عورتیں اور جنھوں نے اللہ کو قرض دیا ہے، اچھا قرض[۲۳]، اُن کا دیا ہوا اُن کے لیے کئی گنا بڑھایا جائے گا اور اُن کے لیے باعزت صلہ ہے اور جو اللہ اور اُس کے رسولوں پر پوری سچائی کے ساتھ ایمان

کے مطابق ایسا شخص قبول حق کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی شخص کی طرف سے حق کی ناقدری کو زیادہ عرصے تک گوارا نہیں فرماتا۔'' (تدبر قرآن ۲۱۶/۸)

۲۳؎ انفاق کے لیے یہاں دو لفظ استعمال ہوئے ہیں: ایک صدقہ، فاعل یا صفت کی صورت میں؛ دوسرا قرض، فعل کی صورت میں۔ دونوں میں کیا فرق ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''...ایک انفاق تو وہ ہے جس کا مطالبہ ہر ذی استطاعت مسلمان سے عام حالات میں ہے اور جو تزکیۂ نفس کے پروگرام کا ایک لازمی حصہ ہے۔ دوسرا وہ انفاق ہے جس کا مطالبہ کسی ناگہانی ضرورت کے موقع پر ملت کے تحفظ کے لیے کیا جاتا ہے۔ پہلے کو یہاں 'صدقہ' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے اور اُس کے لیے فاعل اور صفت کے صیغے استعمال ہوئے ہیں، اِس لیے کہ وہ دواماً مطلوب ہے۔ دوسرے کو قرض سے تعبیر فرمایا ہے جو عند الضرورت دیا جاتا ہے، اِس وجہ

وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۱۹﴾

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ

الحدید ۵۷

لائے ہیں[۲۴]، وہی اپنے پروردگار کے نزدیک صدیق[۲۵] اور شہید[۲۶] ہوں گے۔ اُن کے لیے اُن کا صلہ ہے اور اُن کی روشنی بھی۔ اور جو منکر ہیں اور اُنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلا دیا ہے، وہی دوزخ کے لوگ ہیں[۲۷]۔ ۱۸-۱۹

(تم اِس خرچ سے جی نہ چراؤ اور) جان رکھو کہ دنیا کی زندگی، یعنی لہو و لعب، زیب و زینت اور مال و اولاد کے معاملے میں باہم ایک دوسرے پر فخر جتانے اور ایک

سے اِس کے لیے فعل کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔'' (تدبر قرآن ۸/۲۱۸)

۲۴ لفظ 'ایمان' یہاں بھی اپنے کامل مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

۲۵ نبوت کے بعد یہ سب سے بڑا درجہ ہے جو خدا کے ہاں کسی شخص کو حاصل ہو سکتا ہے۔ اِس کی اصل روح قول و فعل اور ارادہ، تینوں کی مطابقت اور استواری ہے۔ آدمی کے منہ سے کوئی حرف صداقت کے خلاف نہ نکلے، اُس کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہ ہو اور وہ نیت اور ارادے کی سچائی کے ساتھ اپنی ہر بات کو نباہ دے تو قرآن کی اصطلاح میں 'صدیق' ہے۔ اِس وصف کے سب سے نمایاں مصداق سیدنا ابوبکر تھے۔ اُنھیں اِسی بنا پر 'الصدیق' کہا جاتا ہے۔

۲۶ یہ دوسرا بڑا درجہ ہے۔ یعنی وہ لوگ جو اپنے قول و فعل سے حق کی شہادت دیں، یہاں تک کہ اُس کے لیے جان بھی دینی پڑے تو دریغ نہ رکھیں۔

۲۷ یہی حکم اُن لوگوں کا بھی ہو گا جنھوں نے زبان سے تو نہیں جھٹلایا، مگر اُن کا عمل اُن کے دعوے کے برعکس ہی رہا۔

يَهِيجُ فَتَرٰىهُ مُصۡفَرًّا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا ؕ وَفِى الۡاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيۡدٌ ۙ وَّمَغۡفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضۡوَانٌ ؕ وَمَا الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الۡغُرُوۡرِ ﴿۲۰﴾ سَابِقُوۡۤا اِلٰى مَغۡفِرَةٍ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَجَنَّةٍ عَرۡضُهَا كَعَرۡضِ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ ۙ اُعِدَّتۡ لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ؕ ذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ

الحدید ۵۷

دوسرے سے آگے بڑھنے کی تگ ودو کرنے[۲۸] کی تمثیل اُس بارش کی ہے جس کی اگائی ہوئی فصل اِن منکروں کے دل لبھائے، پھر زور پر آئے اور تم دیکھو کہ وہ زرد ہو گئی ہے، پھر (کوئی آفت آئے اور) ریزہ ریزہ ہو جائے۔ (جان رکھو کہ) آخرت میں (اِس کے بعد) سخت عذاب ہے اور اللہ کی طرف سے مغفرت اور اُس کی خوشنودی بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی یہ زندگی تو متاع غرور کے سوا کچھ بھی نہیں ہے[۲۹]۔ ۲۰

(اِس لیے) دوڑو اور اپنے پروردگار کی مغفرت اور اُس جنت کی طرف ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو، جس کی وسعت زمین و آسمان جیسی ہے۔ اُن لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو اللہ اور اُس کے رسولوں پر سچا ایمان رکھتے ہیں۔ یہ اللہ

۲۸؎ 'اِنَّمَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا' کے بعد یہ الفاظ بطور بدل بیان آئے ہیں۔ یعنی دنیا کی زندگی کے یہ پہلو جن پر منکرین اور منافقین ریجھتے اور اپنی تمام مساعی کا حاصل اِنھی کو قرار دے کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اِس سے واضح ہے کہ دنیا کی زندگی پر یہ بحیثیت مجموعی کوئی تبصرہ نہیں ہے۔ چنانچہ آگے تمثیل میں 'اَعۡجَبَ الۡكُفَّارَ نَبَاتُهٗ' کے الفاظ سے اشارہ کر دیا ہے کہ یہ تبصرہ اُسی پہلو سے ہے جو منکرین آخرت کو لبھا لیتا ہے۔

۲۹؎ یعنی اِسے خدا اور آخرت پر صحیح ایمان کے ساتھ بسر کرو گے تو ابدی بادشاہی کی ضامن ہے اور آخرت سے بے پروا ہو کر اِسے ہی سب کچھ سمجھ لو گے تو دھوکے کی ٹٹی ہے۔ اِس کے سوا اِس کی

وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿٢١﴾

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿٢٢﴾ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِۨ ﴿٢٣﴾ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ

کا فضل ہے، جس کو چاہے گا عطا فرمائے گا، اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ ۲۱

(یہ اِس لیے خرچ نہیں کرتے کہ کوئی مصیبت آپڑی تو کیا بنے گا[۳۰]؟ یاد رکھو)، ایسی کوئی مصیبت نہیں جو تمھیں زمین میں اور تمھارے وجود میں لاحق ہوتی ہو اور ہم نے اُس کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب میں[۳۱] لکھ نہ دیا ہو۔ یہ اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔ یہ بات تمھیں اِس لیے سمجھا دی ہے کہ جو ہاتھ سے جاتا ہے، اُس پر غم نہ کرو اور جو خدا نے تم کو دیا ہے، اُس پر اتراؤ نہیں اور (یاد رکھو کہ) اللہ اُن لوگوں کو بالکل پسند نہیں کرتا[۳۲] جو اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے اور فخر جتاتے ہیں، جو خود بھی بخل کرتے اور دوسروں

کوئی حیثیت نہیں ہے۔

۳۰؎ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...قرآن کے دوسرے مقامات میں منافقوں اور بخیلوں کا یہ کردار بیان ہوا ہے کہ وہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے اِس اندیشے سے جی چراتے ہیں کہ کل کو اگر کوئی افتاد پیش آئی تو کیا بنے گا۔ گویا وہ اپنی بخالت کو آیندہ پیش آنے والی مشکلوں اور گردشوں کا علاج سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ جو کچھ پیش آنا ہے، وہ اٹل ہے۔ اُس کا علاج خدا سے بخالت نہیں، بلکہ اُس کی راہ میں انفاق اور اُسی پر توکل ہے۔“ (تدبر قرآن ۸/ ۲۲۳)

الحدید ۵۷

الْحَمِيْدُ ﴿۲۴﴾
لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ

کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہیں[۳۳]۔ اور جو (اِس تنبیہ کے بعد بھی) روگردانی کریں تو اللہ کو اُن کی کچھ پروا نہیں، اِس لیے کہ اللہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے[۳۴]۔ ۲۲-۲۴

(یہ جہاد پر معترض ہیں۔ اِنھیں بتاؤ کہ) ہم نے اپنے رسولوں کو صاف اور واضح دلائل کے ساتھ بھیجا ہے اور اُن کے ساتھ اپنی کتاب، یعنی میزان نازل کی ہے[۳۵] تاکہ لوگ

الحدید ۵۷

۳۱؎ یہ علم الٰہی کا بیان ہے۔ اِس کو لوح محفوظ سے بھی تعبیر کیا ہے۔

۳۲؎ یہ الفاظ بظاہر نرم ہیں، لیکن بہ اعتبار معنی بہت سخت ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِس طرح کے منفی اسلوب میں جو بات کہی جاتی ہے، اُس کو مثبت اسلوب میں کہیں تو وہ یوں ادا ہو گی کہ 'اِنَّ اللّٰهَ يُبْغِضُ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ'، لیکن متکلم صاف لفظوں میں بات کہنے کے بجائے اپنے تیور اور لب و لہجے سے اپنی شدت نفرت کا اظہار کر دیتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۸/ ۲۲۴)

۳۳؎ دوسروں کو اِس لیے ترغیب دیتے ہیں کہ خود اُن کی بخالت پر پردہ پڑا رہے۔

۳۴؎ یہ دونوں صفات کس لیے آئی ہیں؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

'''غَنِيٌّ' کے ساتھ صفت 'حَمِيْدٌ' اِس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں بالکل بے نیاز و بے پروا ہے۔ اُسے کسی کی حاجت نہیں۔ وہ لوگوں سے مانگتا ہے تو اِس لیے نہیں کہ وہ اُن کا محتاج ہے، بلکہ وہ 'حَمِيْدٌ' ہے، اِس وجہ سے وہ چاہتا ہے کہ اِس طرح وہ لوگوں کو اپنے افضال کا حق دار بنائے اور اُن کے دیے ہوئے خزف ریزوں کو ایک لازوال خزانے کی شکل میں تبدیل کر کے اُن کو واپس کرے۔'' (تدبر قرآن ۸/ ۲۲۵)

۳۵؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ'۔ اِن میں 'و' تفسیر کے لیے ہے۔ چنانچہ 'الْمِيْزَان' درحقیقت 'الْكِتٰب' ہی کا بیان ہے۔ مدعا یہ ہے کہ انبیا علیہم السلام کے

لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

(حق و باطل کے معاملے میں) ٹھیک انصاف پر قائم ہو جائیں۔[۳۶] اور لوہا اتارا[۳۷] جس میں بڑی قوت ہے اور لوگوں کے لیے دوسرے فوائد بھی ہیں، اِس لیے کہ وہ اُس سے نفع اٹھائیں اور اِس لیے کہ (رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اُن کے منکرین کو اِس کے ذریعے سے سزا دی جائے اور اِس طرح) اللہ اُن لوگوں کو الگ کر لے[۳۸] جو اُس کو دیکھے

ساتھ کتابیں اِس لیے نازل کی گئیں کہ دین و شریعت کے معاملے میں تمام اختلافات کا فیصلہ کر دیں اور لوگوں کو تول کر بتا دیں کہ اُن کے مذہبی تصورات، عقائد اور نظریات میں کتنا حق اور کتنا باطل ہے۔

۳۶۔ یعنی ٹھیک وہ راستہ اختیار کر لیں جس میں کوئی کج پیچ نہ ہو اور اپنے دینی تصورات کو تمام انحرافات، بدعات اور باطل نظریات سے پاک کر کے سیدھے اور صاف حق پر قائم ہو جائیں۔

۳۷۔ لوہا زمین سے نکلتا ہے، لیکن اُس کے لیے اصل میں 'اَنْزَلْنَا' (ہم نے نازل کیا) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...یہ اُسی طرح کا استعمال ہے، جس طرح چوپایوں کے پیدا کیے جانے کے لیے یہ لفظ قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ مقصود اِس سے ایک طرف تو اُس عنایت خاص کی طرف توجہ دلانا ہے جو اُس کے اندر انسانوں کی بہبود کے لیے مضمر ہے۔ دوسری طرف یہ لفظ ہر چیز کے اصل منبع و مصدر کا سراغ دیتا ہے کہ کوئی چیز کہیں سے حاصل ہو، لیکن حقیقت میں وہ نازل خدا ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ جب تک انسان کی نظر اِس پہلو پر نہ ہو، وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ نہیں کر سکتا۔" (تدبر قرآن ۸/ ۲۳۰)

۳۸۔ اصل الفاظ ہیں: 'وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ'۔ 'علم یعلم' جس طرح جاننے کے معنی میں آتا ہے، اُسی طرح ممیز کر لینے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ یہ فعل کا اُس کے نتیجے کے لحاظ سے استعمال ہے۔ اِس طرح کے سیاق میں یہ بالعموم اِسی مفہوم میں آیا ہے۔

وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿٢٥﴾
وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿٢٦﴾ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓي اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ڏ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ۭ وَرَهْبَانِيَّةَۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ

الحدید ۵۷

بغیر اُس کی اور اُس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں۔ (ورنہ) کچھ شک نہیں کہ اللہ بڑی قوت والا ہے، وہ بڑا زبردست ہے[۳۹]۔ ۲۵

اور نوح اور ابراہیم کو بھی ہم نے (اِسی مقصد سے) رسول بنا کر بھیجا تھا اور اِن دونوں کی اولاد میں نبوت جاری کی اور اُنھیں اہل کتاب بنایا تھا۔ سو اُن میں سے کچھ نے ہدایت اختیار کی اور زیادہ نافرمان بن گئے۔ پھر اُنھی کے نقش قدم پر ہم نے اپنے اور رسول بھی بھیجے اور عیسیٰ ابن مریم کو بھی اُنھی کے نقش قدم پر بھیجا اور اُسے انجیل عطا کی اور اُس کے پیرووں کے دلوں میں رأفت و رحمت ڈال دی، مگر رہبانیت اُنھوں نے خود

۳۹؎ اللہ کی حجت جب رسولوں کے ذریعے سے کسی قوم پر پوری ہو جاتی ہے تو اُن کے منکرین پر عذاب آجاتا ہے۔ یہ عذاب آسمان سے بھی آتا ہے اور بعض حالات میں اہل حق کی تلواروں کے ذریعے سے بھی۔ یہی دوسری صورت یہاں زیر بحث ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اِس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ ارضی و سماوی آفات کے بجائے تلواروں سے منکرین کے استیصال کا طریقہ کیوں اختیار کیا جاتا ہے؟ فرمایا ہے کہ اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے، اُس کے لشکروں سے کسی کو پناہ نہیں، وہ منکرین کو جب چاہے، ہلاک کر سکتا ہے، مگر یہ طریقہ اِس لیے اختیار کیا جاتا ہے کہ وہ ماننے والوں کا امتحان کرے کہ جو سرفرازی اِس عذاب کے نتیجے میں اُن کو ملنے والی ہے، وہ اُس کے مستحق بھی ہیں یا نہیں۔ چنانچہ جھوٹے اور سچے، اور مومنین و منافقین اِس امتحان کے نتیجے میں بالکل الگ ہو

رِضۡوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوۡهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيۡنَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡهُمۡ اَجۡرَهُمۡ ۚ وَكَثِيۡرٌ مِّنۡهُمۡ فٰسِقُوۡنَ ﴿۲۷﴾

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوۡا بِرَسُوۡلِهٖ يُؤۡتِكُمۡ كِفۡلَيۡنِ مِنۡ رَّحۡمَتِهٖ

ایجاد کرلی۔ ہم نے اُسے اُن پر فرض نہیں کیا تھا۔ یہ بات، البتہ ضرور فرض کی تھی کہ وہ اللہ کی خوشنودی چاہیں۔ سو اُنھوں نے اُس کے حدود، جس طرح کہ چاہیے تھا، ملحوظ نہیں رکھے۔ تاہم اُن میں سے جو لوگ ایمان پر قائم رہے، اُن کا اجر ہم نے اُنھیں عطا فرمایا، مگر اُن میں سے زیادہ نافرمان ہی نکلے۔[۴۰] ۲۶-۲۷

ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور اُس کے رسول کو مانو جس طرح کہ ماننے کا حق ہے،[۴۱]

جاتے ہیں اور خدا کی دینونت ٹھیک انصاف کے ساتھ ظاہر ہو جاتی ہے۔

۴۰؎ یعنی اللہ کے سارے رسول اِسی اتمام حجت اور اِس کے نتیجے میں جزا و سزا کے لیے آئے۔ مسیح علیہ السلام کی بعثت کا مقصد بھی یہی تھا۔ اُن کے ساتھی معتد بہ تعداد میں ہوتے اور اُنھیں کوئی دار الہجرت میسر ہو جاتا تو وہ بھی اِسی طرح جہاد کرتے۔ اِس کے لیے تورات کی مراجعت کرنی چاہیے اور اُس میں جہاد کے احکام دیکھنے چاہییں۔ اِس معاملے میں خدا کی نازل کردہ میزان وہی ہے۔ مسیح علیہ السلام اُسے منسوخ کرنے کے لیے نہیں، بلکہ اُس کو پورا کرنے کے لیے آئے تھے۔ رہبانیت کی تعلیم اُنھوں نے نہیں دی کہ اُسے جہاد کے خلاف اعتراضات کی بنیاد بنایا جا سکے۔ یہ اُن کے پیرووں کی ایجاد تھی۔ اِس کا محرک ایک تو رأفت و رحمت کا وہ جذبہ تھا جو دعوت کی جدوجہد کے لیے خود اللہ نے اُن کے دلوں میں رکھ دیا تھا، دوسرا رضاے الٰہی کی طلب جس کے حدود وہ بدقسمتی سے ملحوظ نہیں رکھ سکے۔ تاہم اللہ کسی ایسے کام کا اجر ضائع نہیں کرتا جو اُس کی خوشنودی کے لیے کیا جائے، اِس لیے اُن میں سے جو ایمان پر قائم رہے، اُن کا اجر اُنھیں مل جائے گا۔ مگر زیادہ نافرمان ہیں، اُنھوں نے مسیح علیہ السلام کی ساری تعلیم کو پس پشت ڈال کر پال کی مسیحیت اختیار کر لی ہے اور اللہ کی خوشنودی کے بجاے الٹا اُس کا غضب مول لے بیٹھے ہیں۔

وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۸﴾ لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۹﴾

الحدید
۵۷

اللہ تمھیں اپنی رحمت سے دہرا حصہ عطا فرمائے گا[۴۲] اور تمھارے لیے وہ روشنی مہیا کرے گا جس کو لے کر تم (قیامت میں) چلو گے اور تمھیں معاف فرمائے گا۔ اللہ بڑا معاف کرنے والا اور بڑا مہربان ہے۔ (اُس کی رحمت کے لیے سبقت کرو) تاکہ یہ اہل کتاب نہ جانیں کہ اللہ کے فضل پر اُن کا کوئی اجارہ نہیں ہے اور یہ کہ اللہ کا فضل اُس کے اپنے ہی ہاتھ میں ہے، وہ جس کو چاہتا ہے، عطا فرماتا ہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے[۴۳]۔ ۲۸-۲۹

۴۱ تمام اعتراضات کا جواب دینے کے بعد یہ سورہ کے مخاطبین کو آخر میں ایک مرتبہ پھر دعوت دی ہے کہ زبان کے مومن نہ بنیں، بلکہ سچے دل سے ایمان لائیں اور ایمان کے وہ تقاضے پورے کریں جو اِس وقت جہاد اور انفاق کی صورت میں اُن کے سامنے آ گئے ہیں۔

۴۲ یعنی ایک اجر اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ کر اسلام میں آنے کا، اور دوسرا پورے اخلاص اور ثابت قدمی کے ساتھ ایمان و اسلام کے تقاضے پورے کرنے کا۔

۴۳ مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب یہی سمجھتے رہیں کہ اللہ تعالیٰ کے تمام افضال و عنایات کے تنہا اجارہ دار وہی ہیں اور اِس طرح محض اپنی متعصّبانہ جہالت کی وجہ سے خدا کے آخری پیغمبر کی مخالفت کر کے خدا کی عنایتوں سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائیں۔ یہ انتہائی بے زاری کا جملہ ہے۔ اِس طرح کی بات اُس وقت کہی جاتی ہے جب کسی کے سنبھلنے کی کوئی توقع باقی نہ رہے اور طے ہو جائے کہ اب اُسے اپنی جہالت کے نتائج بھگتنا ہیں، اِس لیے بہتر یہی ہے کہ اِسی جہالت میں مبتلا رہے، اِس سے نکلنے کی کوئی صورت اِس کے لیے پیدا نہ ہو۔ یہ اِسی کا مستحق ہے، اب یہ کسی ہم دردی کا مستحق نہیں رہا۔

سورة المجادلة

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قَدۡ سَمِعَ اللّٰهُ قَوۡلَ الَّتِیۡ تُجَادِلُكَ فِیۡ زَوۡجِهَا وَ تَشۡتَكِیۡۤ اِلَى اللّٰهِ ٭ۖ وَ اللّٰهُ یَسۡمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیۡعٌۢ بَصِیۡرٌ ﴿۱﴾

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

اللہ نے اُس عورت کی بات سن لی ہے[۴۴] جو تم سے اپنے شوہر کے معاملے میں جھگڑ رہی تھی[۴۵] اور اللہ سے فریاد کیے جاتی تھی۔ اللہ تم دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ بے شک،

[۴۴] سننے سے مراد یہاں محض سن لینا نہیں ہے، بلکہ قبول کر لینا ہے۔ ہماری زبان میں بھی یہ لفظ قبول کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اِس خاتون کا نام روایتوں میں خولہ بنت ثعلبہ آیا ہے۔ اِن کے شوہر اوس بن صامت انصاری قبیلۂ اوس کے سردار حضرت عبادہ بن صامت کے بھائی تھے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے مزاج میں کچھ تیزی تھی، پھر بڑھاپے میں کچھ چڑچڑے بھی ہو گئے تھے۔ اِس حالت میں بیوی سے ظہار کر بیٹھے۔ یہ اِسی واقعے کا ذکر ہے*۔

سورہ کی ابتدا میں یہ واقعہ سورہ کے مخاطبین کو یہ بتانے کے لیے سنایا گیا ہے کہ دین کے معاملے میں اگر کوئی مشکل پیش آجائے تو بندۂ مومن کو اِس خاتون کی طرح اپنی مشکل اپنے پروردگار کے سامنے پیش کرنی چاہیے۔ اپنی مشکلات کو منافقوں کی طرح دین پر نکتہ چینی اور اللہ و رسول کے خلاف محاذ آرائی کا بہانہ نہیں بنا لینا چاہیے۔ اِس میں الحاح و اصرار بھی ممنوع نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اِسے نہایت توجہ اور شفقت سے سنتا ہے۔

[۴۵] اصل میں 'تُجَادِلُكَ' کا لفظ آیا ہے۔ اِس سے پہلے عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق

* احمد، رقم ۲۷۳۶۰۔

ٱلَّذِينَ يُظَٰهِرُونَ مِنكُم مِّن نِّسَآئِهِم مَّا هُنَّ أُمَّهَٰتِهِمْ ۖ إِنْ أُمَّهَٰتُهُمْ

اللہ سمیع و بصیر ہے[46]۔ ۱

تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کر بیٹھیں[47]، وہ اُن کی مائیں نہیں بن

ایک فعل ناقص حذف ہوگیا ہے۔ اِس سے یہ بات نکلتی ہے کہ جس خاتون کا یہ واقعہ ہے، اُنھوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ اور الحاح و اصرار کے ساتھ اپنا معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا۔ قرآن نے یہ لفظ 'مُجَادَلَة' اچھے اور بُرے، دونوں معنوں میں استعمال کیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...برے معنی اِس کے کٹ حجتی کرنے اور جھگڑنے کے ہیں اور اچھے معنی اِس کے کسی سے اپنی بات محبت، اعتماد، حسن گزارش، تذلل اور اصرار کے ساتھ منوانے کی کوشش کرنے کے ہیں۔ اِس میں جھگڑنا تو بظاہر ہوتا ہے، لیکن یہ جھگڑنا محبت اور اعتماد کے ساتھ ہوتا ہے، جس طرح چھوٹے اپنی کوئی بات اپنے کسی بڑے سے، اُس کی شفقت پر اعتماد کر کے منوانے کے لیے جھگڑتے ہیں۔ اِس مجادلۂ محبت کی بہترین مثال سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا وہ مجادلہ ہے جو اُنھوں نے قوم لوط کے باب میں اپنے رب سے کیا ہے اور جس کی اللہ تعالیٰ نے نہایت تعریف فرمائی ہے... یہاں اِن خاتون کے جس مجادلہ کی طرف اشارہ ہے، اُس کی نوعیت بالکل یہی ہے۔" (تدبر قرآن ۸/۲۴۷)

[46] اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی کو تباہی سے بچانے کے لیے بار بار فریاد کر رہی تھیں اور چاہتی تھیں کہ مسئلے کا کوئی حل نکل آئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اُس وقت وحی الٰہی کی کوئی واضح رہنمائی اِس معاملے میں موجود نہیں تھی۔ چنانچہ آپ متردد تھے کہ اُنھیں کیا جواب دیں، یہاں تک کہ اُن کی فریاد اُس پروردگار نے سن لی جو سمیع و بصیر ہے، یہ تمام گفتگو جس کے سامنے ہو رہی تھی اور جو خاص توجہ اور مہربانی سے اُسے سن رہا تھا۔

[47] ایلا کی طرح ظہار بھی عرب جاہلیت کی اصطلاح ہے۔ اِس کے معنی یہ تھے کہ شوہر نے بیوی کے لیے 'أنت علیّ کظھر أمی' (تجھے ہاتھ لگایا تو گویا اپنی ماں کی پیٹھ کو ہاتھ لگایا) کے الفاظ زبان

إِلَّا الّٰٓـِٔيْ وَلَدْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝ وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَاۗىِٕهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ

جاتی ہیں۔ اُن کی مائیں تو وہی ہیں جنھوں نے اُن کو جنا ہے[۴۸]۔ اِس طرح کے لوگ، البتہ بڑی ناگوار اور جھوٹی بات کہتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ (اِس کے باوجود) بڑا معاف کرنے والا اور مغفرت فرمانے والا ہے[۴۹]۔ (اِنھیں بتاؤ کہ) جو لوگ اپنی بیویوں

سے نکال دیے ہیں۔ زمانۂ جاہلیت میں بیوی کو اِس طرح کی بات کہہ دینے سے ایسی طلاق پڑ جاتی تھی جس کے بعد بیوی لازماً شوہر سے الگ ہو جاتی تھی۔ اہل عرب سمجھتے تھے کہ یہ الفاظ کہہ کر شوہر نہ صرف یہ کہ بیوی سے اپنا رشتہ توڑ رہا ہے، بلکہ اُسے ماں کی طرح اپنے اوپر حرام قرار دے رہا ہے۔ لہٰذا اُن کے نزدیک طلاق کے بعد تو رجوع کی گنجایش ہو سکتی تھی، لیکن ظہار کے بعد اِس کا کوئی امکان باقی نہ رہتا تھا۔

۴۸؎ یعنی اگر کوئی شخص منہ پھوڑ کر بیوی کو ماں سے یا اُس کے کسی عضو کو ماں کے کسی عضو سے تشبیہ دے دیتا ہے تو اِس سے بیوی ماں نہیں ہو جاتی اور نہ اُس کو وہ حرمت حاصل ہو سکتی ہے جو ماں کو حاصل ہے۔ ماں کا ماں ہونا ایک امر واقعی ہے، اِس لیے کہ اُس نے آدمی کو جنا ہے۔ اُس کو جو حرمت حاصل ہوتی ہے، وہ اِسی جننے کے تعلق سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ ایک ابدی اور فطری حرمت ہے جو کسی عورت کو محض منہ سے ماں کہہ دینے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اِس طرح کی تشبیہ سے نہ کسی کا نکاح ٹوٹتا ہے اور نہ اُس کی بیوی ماں کی طرح حرام ہو جاتی ہے۔

۴۹؎ مطلب یہ ہے کہ اِس طرح کا جملہ اگر کسی شخص کی زبان سے نکلا ہے تو اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ایک نہایت بیہودہ اور جھوٹی بات ہے جس کا تصور بھی کسی آدمی کو نہیں کرنا چاہیے، کجا یہ کہ وہ اِسے زبان سے نکالے۔ اِس پر سخت محاسبہ ہو سکتا تھا، لیکن اللہ بڑا معاف کرنے والا اور مغفرت فرمانے والا ہے۔ لہٰذا کوئی شخص اگر اشتعال میں آ کر اِس طرح کی خلاف حقیقت بات منہ سے نکال

رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ؕ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۳﴾
فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ۚ فَمَنْ لَّمْ

سے ظہار کر بیٹھیں، پھر اُسی بات کی طرف پلٹیں جو اُنھوں نے کہی تھی[۵۰] تو ایک دوسرے کو ہاتھ لگانے سے پہلے ایک غلام آزاد کیا جائے گا[۵۱]۔ یہ بات ہے جس کی تمھیں نصیحت کی جاتی ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس سے پوری طرح واقف ہے[۵۲]۔ پھر جس کے پاس غلام نہ ہو، اُسے پے درپے[۵۳] دو مہینے کے روزے رکھنا ہوں گے، اِس سے پہلے کہ

بیٹھے اور اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو تو اللہ اُس سے درگذر فرمائیں گے۔

۵۰۔ اِس جملے میں بہ تقاضاے ایجاز و بلاغت کچھ ابہام رکھا ہے جس کی وضاحت 'مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا' کے الفاظ سے ہو جاتی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِس ابہام کی وجہ یہ ہے کہ جس بات کی طرف اشارہ ہے، وہ بالبداہت بھی منکر ہے اور قرآن نے بھی اُس کو 'مُنْکَر' اور 'زُوْر' قرار دیا ہے۔ ایک منکر بات کا ذکر صراحت کے ساتھ موزوں نہیں تھا، اِس وجہ سے قرآن نے مبہم الفاظ میں اُس کی طرف اشارہ کر دیا۔ مطلب یہی ہے کہ ظہار کے بعد وہ پھر وہی کام کرنا چاہیں جس کو اُنھوں نے اپنی ماں کی حرمت کی طرح حرام ٹھیرایا تو اُن کے لیے ہاتھ لگانے سے پہلے ایک غلام آزاد کرنے کا حکم ہے۔''

(تدبر قرآن ۸/ ۲۵۰)

۵۱۔ اصل میں لفظ 'رَقَبَة' استعمال ہوا ہے جس کے معنی گردن کے ہیں۔ اِس سے یہ بات نکلتی ہے کہ لونڈی یا غلام کی کوئی تخصیص نہیں ہے، دونوں میں سے جو بھی میسر ہو، اُس سے کفارہ ادا ہو جائے گا۔ غلاموں کی آزادی کے لیے جو اقدامات اسلام نے کیے، یہ بھی اُنھی میں سے ہے۔ چنانچہ دیکھ لیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے اِسے بعد کی دونوں صورتوں پر مقدم رکھا ہے۔ غلامی ختم ہو جانے کے بعد اب ظاہر ہے کہ وہی دو صورتیں باقی رہ جائیں گی جن کا ذکر آگے ہوا ہے۔

۵۲۔ یعنی یہ اللہ کا حکم ہے اور اللہ کی طرف سے جو حکم بھی دیا جائے، اُس کی تعمیل لفظ اور معنی،

يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ؕ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۴

دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں۔ اور جس میں یہ ہمت نہ ہو، وہ (اِس سے پہلے) ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے گا[۵۴]۔ یہ اِس لیے ہے کہ تم اللہ اور اُس کے رسول کو مانو، جس طرح کہ ماننے کا حق ہے[۵۵]، اور (جان لو کہ) یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں۔ (انھیں منکرین ہی توڑتے ہیں)، اور منکروں کے لیے بڑی دردناک سزا ہے۔ ۲-۴

المجادلة
۵۸

دونوں کے لحاظ سے پورے اخلاص کے ساتھ ہونی چاہیے اور یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ ہر چیز سے واقف ہے، اُس سے کسی کی کوئی بات چھپی نہ رہے گی۔

۵۳؎ اصل میں لفظ 'مُتَتَابِعَيْن' آیا ہے۔ اِس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اگر دو مہینے کے روزے پورے ہونے سے پہلے کسی شخص نے بیوی سے ملاقات کر لی تو اُسے از سرِ نو پورے روزے رکھنا ہوں گے۔

۵۴؎ اوپر فرمایا ہے کہ اللہ معاف کرنے والا اور مغفرت فرمانے والا ہے۔ اِس کے بعد کفارے کا طریقہ بیان کیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اللہ معاف کرنے والا ہے، مگر اِس کے یہ معنی بہر حال نہیں ہیں کہ اِس طرح کی حرکت کرنے والوں کو بغیر کسی تنبیہ کے چھوڑ دیا جائے۔ انسان کی معاشرتی زندگی پر ایسی باتوں کے اثرات بڑے غیر معمولی ہوتے ہیں، اِس وجہ سے ضروری ہے کہ اُن کی تادیب کی جائے تاکہ آیندہ وہ بھی احتیاط کریں اور دوسروں کو بھی اِس سے سبق حاصل ہو۔

۵۵؎ اصل الفاظ ہیں: 'ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ'۔ اِن میں فعل اپنے کامل مفہوم میں ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اِس حکم کی تعمیل اگر اِس کی صحیح روح کے ساتھ کرو گے تو اِس سے اللہ اور رسول پر ایمان کا حق ادا ہو گا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اگر اپنی کسی غلطی کی تلافی اِس طرح کی کوئی مشقت اٹھا کر کرتا ہے تو اِس سے غلطی کی تلافی بھی ہو جاتی ہے اور اُسے اپنے ایمان و عقیدہ میں رسوخ بھی حاصل ہوتا

المجادلة ٥٨

إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ كُبِتُوا كَمَا كُبِتَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَقَدْ أَنزَلْنَا آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ ۚ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿٥﴾ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُهُم بِمَا عَمِلُوا ۚ أَحْصَاهُ اللَّهُ وَنَسُوهُ ۚ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿٦﴾ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۖ مَا يَكُونُ مِن نَّجْوَىٰ

(یہ خدا کی اِس بندی کا رویہ تھا۔ اِس کے برخلاف) جو لوگ اللہ اور اُس کے رسول کے خلاف محاذ آرائی کر رہے ہیں[۵۶] وہ ذلیل ہوں گے، جس طرح اُن کے پہلے ہم مشرب ذلیل ہوئے۔ (اِس کی) بہت واضح دلیلیں ہم نے (اِس قرآن میں) اتار دی ہیں، اور اِن منکروں کے لیے بڑی ذلت کی مار ہے[۵۷]۔ یہ اُس دن کو یاد رکھیں، جب اللہ اِن سب کو اٹھائے گا، پھر اِن کا ہر عمل اِن کو بتائے گا۔ اللہ نے اُسے گن رکھا ہے اور یہ اُسے بھلائے بیٹھے ہیں، اور اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔ ۵-۶

تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ زمین اور آسمانوں کی ہر چیز سے واقف ہے؟ کبھی ایسا نہیں ہے۔

۵۶؎ اشارہ ہے اُن منافقین کی طرف جن کی تمام ہم دردیاں اسلام کے دشمنوں، خاص کر یہود کے ساتھ تھیں۔ اسلام کی جس بات کو وہ اپنے مفادات اور خواہشات کے خلاف محسوس کرتے تھے، اُس کے بارے میں سرگوشیوں اور خفیہ پروپیگنڈے کی مہم شروع کر دیتے تھے تاکہ کم زور مسلمانوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کریں اور اپنی طرح اُن کو بھی ایمان و اسلام میں رسوخ سے محروم کر دیں۔

۵۷؎ یعنی اِن کا انجام وہی ہو گا جو رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اُن کے منکرین کا ہمیشہ ہوا ہے۔ یہ اللہ کی سنت ہے اور اللہ اپنی سنت میں کسی کے لیے تبدیلی نہیں کرتا۔ اُس کا قانون سب کے لیے ایک ہی ہے۔

ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ۚ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۷

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَيَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ ۡ وَاِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ ۙ وَيَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ۭ حَسْبُهُمْ

المجادلة
۵۸

ہوتا کہ تین سرگوشی کریں اور اُن میں چوتھا اللہ نہ ہو۔ اور پانچ سرگوشی کریں اور اُن میں چھٹا اللہ نہ ہو۔ وہ اِس سے کم ہوں یا زیادہ، جہاں بھی ہوں، اللہ اُن کے ساتھ ہوتا ہے۔ پھر قیامت کے دن وہ اِن کا سب کیا دھرا اِنھیں بتا دے گا۔ بے شک، اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔ ۷

تم نے دیکھا نہیں اُنھیں جو سرگوشیوں سے روکے گئے، پھر وہی کرتے ہیں جس سے روکے گئے؟[58] اور (سرگوشی بھی کرتے ہیں تو ہمیشہ) حق تلفی اور زیادتی اور پیغمبر کی نافرمانی کی سرگوشی کرتے ہیں[59]۔ اور (اے پیغمبر)، جب تمھارے پاس آتے ہیں تو تمھیں اُس طرح

۵۸۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اِس خفیہ پروپیگنڈے کی ابتدا ہوئی تو پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنھیں توجہ دلائی، مگر اُنھوں نے اِس کا کوئی اثر قبول نہیں کیا اور بدستور اِس میں مصروف رہے۔

۵۹۔ یہ اُس اصل ہدف کی طرف اشارہ ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے یہ سرگوشیاں کی جاتی تھیں۔ اُن کا مقصود یہ تھا کہ مسلمانوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف آمادۂ بغاوت کیا جائے تا کہ وہ بنیاد ہی ختم ہو جائے جس پر اِس نئے دین کی عمارت کھڑی کی جا رہی ہے۔

جَهَنَّمُ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿٨﴾
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ
وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ
اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿٩﴾
اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيْسَ بِضَاۗرِّهِمْ

سلام کرتے ہیں[60]، جس طرح اللہ نے تمھیں سلام نہیں کیا ہے[61] اور اپنے دل میں کہتے ہیں کہ (یہ پیغمبر ہیں تو) اللہ ہماری اِن باتوں پر ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا[62]؟ اِن کے لیے دوزخ ہی کافی ہے۔ یہ اُس میں پڑیں گے اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے۔ ۸

ایمان والو، جب آپس میں سرگوشی کرو تو حق تلفی، زیادتی اور پیغمبر کی نافرمانی کی سرگوشی نہ کرو، بلکہ خیر و تقویٰ کی سرگوشی کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو جس کے حضور میں تم سب جمع کیے جاؤ گے۔ ۹

اِس طرح کی سرگوشیاں تو شیطان کی طرف سے ہیں تاکہ وہ ایمان والوں کو غم زدہ

۶۰۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے الفاظ نقل کرنا پسند نہیں فرمایا۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ 'السلام علیك' کا تلفظ کچھ اِس انداز سے کرتے تھے کہ سننے والا سمجھے سلام کیا ہے، مگر دراصل وہ 'السام' کہتے تھے جس کے معنی موت کے ہیں*۔

۶۱۔ یہ اللہ اور اُس کے فرشتوں کی طرف سے اُس سلام و رحمت کا حوالہ ہے جس کا ذکر سورۂ احزاب (۳۳) میں ہوا ہے۔

۶۲۔ اُن کا مدعا یہ تھا کہ چونکہ ایسا نہیں ہوتا، اِس لیے اِن کا یہ دعویٰ بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتا

---

* بخاری، رقم ۵۶۷۸۔

شَيْـًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰﴾
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا
يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

کر دے،[۶۳] دراں حالیکہ خدا کی اجازت کے بغیر وہ اُن کو ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا اور ایمان والوں کو تو ہر حال میں اللہ ہی پر بھروسا کرنا چاہیے۔ ۱۰

ایمان والو، (یہ اِنھی سرگوشیوں کے لیے جتھے بنا کر بیٹھتے ہیں، اِس لیے) جب تم سے کہا جائے کہ پیغمبر کی مجلسوں میں کھل کر بیٹھو تو کھل کر بیٹھو،[۶۴] اللہ تمھارے لیے وسعت پیدا کرے گا۔[۶۵] اور جب کہا جائے کہ اٹھ جاؤ تو اٹھ جایا کرو،[۶۶] اللہ اُن لوگوں کے درجے

کہ یہ اللہ کے رسول ہیں۔

۶۳؎ شیطان جو کچھ کر سکتا ہے، وہ یہی ہے کہ ایمان والوں کو کچھ رنج و ملال پہنچا دے۔ اِس سے آگے اگر وہ کچھ کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا۔

۶۴؎ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسوں میں اپنی سرگوشیوں، اشاروں، کنایوں اور طنز و تعریض کے جملوں سے جو فتنے منافقین پیدا کر دیتے تھے، یہ اُن کے سد باب کے لیے فرمایا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہدایت کی جائے کہ لوگ اِس طرح جتھے بنا کر نہ بیٹھیں، بلکہ کھل کر بیٹھیں تو اِس حکم کی بے چون و چرا تعمیل ہونی چاہیے۔

۶۵؎ یعنی آگے جنت میں کشادگی پیدا کرے گا۔ تاہم اِس میں کچھ بشارت دنیا کے لیے بھی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... اگرچہ اِس کا ظاہر مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھارے لیے جنت میں کشادگی پیدا کرے گا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو انسان اپنا سینہ دوسروں کے لیے کشادہ رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ دوسروں کے سینے اُس کے لیے اِس دنیا میں بھی کشادہ کر دیتا ہے۔ آدمی کا ہر عمل، ظاہری ہو یا

المجادلة
۵۸

مِنكُمْ ۙ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَٰتٍ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿١١﴾
يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُوٓا إِذَا نَٰجَيْتُمُ الرَّسُولَ فَقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَىٰكُمْ
صَدَقَةً ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَأَطْهَرُ ۚ فَإِن لَّمْ تَجِدُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٢﴾

بلند فرمائے گا جو تم میں سے ایمان لائے اور جن کو علم عطا ہوا ہے[67]، اور (مطمئن رہو کہ) جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس سے باخبر ہے[68]۔ ۱۱

ایمان والو، (اب یہ پابندی ہے کہ) جب پیغمبر سے تخلیے میں بات کرو تو اپنی اِس

باطنی، نیک ہو یا بد، اپنا ایک قدرتی اثر رکھتا ہے جس کا حقیقی ظہور تو آخرت ہی میں ہوگا، لیکن اِس کے برگ و بار اِس دنیا میں بھی دیکھے جاتے ہیں، بشرطیکہ دیکھنے والی آنکھیں ہوں۔''

(تدبر قرآن ۸/۲۶۲)

٦٦ یعنی پوری مجلس برخاست کر دی جائے یا انفرادی طور پر کسی شخص کو ہدایت کی جائے کہ وہ اپنی جگہ تبدیل کر لے یا مجلس سے اٹھ جائے تو اُسے بغیر کسی نکیر کے اور خوش دلی کے ساتھ پیغمبر کے حکم کی تعمیل کرنی چاہیے۔

٦٧ یہ الفاظ بڑے معنی خیز ہیں۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''...مطلب یہ ہے کہ تمھارے اندر جو منافقین گھسے ہوئے ہیں، وہ تو اِس قسم کے حکم پر بہت ناک بھوں چڑھائیں گے کہ اُن کی توہین ہوئی کہ اُن کو اٹھا کر دوسروں کو اُن کی جگہ دی گئی۔ اُن میں سے بعض یہ بھی محسوس کریں گے کہ کیا وہ باعتبار علم و عمل فلاں اور فلاں سے فروتر تھے کہ اُن کو اُن کے اوپر ترجیح دی گئی، لیکن جو اہل ایمان واصحاب علم خوش دلی سے اِس حکم کی تعمیل کریں گے، اللہ تعالیٰ آخرت میں اُن کے مدارج پر مدارج بلند کرے گا۔'' (تدبر قرآن ۸/۲۶۳)

٦٨ یعنی باخبر ہے تو بھرپور صلہ بھی دے گا۔

ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ؕ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ

تخلیے کی بات سے پہلے کچھ صدقہ کرو[69]۔ یہ تمھارے لیے بہتر بھی ہے اور پاکیزہ تر بھی[70]۔ البتہ، استطاعت نہ ہو تو اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے[71]۔ ۱۲

کیا تم ڈر گئے کہ اپنی تخلیے کی گفتگو سے پہلے تمھیں صدقات پیش کرنا ہوں گے[72]؟ سو جب تم نے ایسا نہیں کیا اور اللہ نے تم پر رحم فرمایا کہ حکم اٹھا لیا[73] تو اب نماز کا اہتمام

المجادلة ۵۸

۶۹؎ یہ پابندی اِس لیے عائد کی گئی کہ اوپر جو گرفت ہوئی ہے، اُس کے بعد منافقین تنہائی میں آ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے مطمئن کرنے کی کوشش نہ کریں۔ مدعا یہ تھا کہ تنہائی میں ملاقات کا معاملہ ایک سنجیدہ معاملہ بن جائے اور جو شخص بھی آئے، وہ بارگاہ رسالت کے بارے میں متنبہ ہو کر اور کچھ محنت اٹھا کر آئے۔

۷۰؎ یہ حکم چونکہ تمام مسلمانوں کو دیا گیا تھا، اِس لیے مخلصین کو تسلی دی ہے کہ یہ منافقین کی حوصلہ شکنی کرے گا، اِس لیے خود تمھاری جماعت کے لیے بہتر ہے اور دلوں کو خدا اور رسول کی اطاعت پر راسخ کرے گا، اِس لیے پاکیزہ تر بھی ہے۔

۷۱؎ یعنی غریب اور نادار اِس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ اُن کے لیے پیغمبر سے تنہائی میں ملنے اور عرض معروض کرنے کی راہ بہ دستور کھلی ہوئی ہے۔

۷۲؎ یعنی اِس بات سے ڈر گئے کہ یقیناً کوئی خطا ہوئی ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ پابندی عائد کر دی ہے۔

۷۳؎ یعنی کسی نے تخلیے میں ملاقات کے لیے وقت لینے کی درخواست نہیں کی تو منافقین بھی جرأت نہیں کر سکے اور حکم کا منشا پورا ہو گیا، چنانچہ اُسے اٹھا دیا گیا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یہ پابندی اُسی وقت اٹھائی گئی ہو گی، جب یہ فتنہ یا تو دب گیا ہو گا یا لوگوں کے اندر اِس

وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿١٣﴾

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ ۙ وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿١٤﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٥﴾ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ

رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت پر قائم رہو، اور (یاد رکھو کہ) اللہ تمھارے ہر عمل سے واقف ہے[۴]۔ ۱۳

تم نے دیکھا نہیں اُنھیں جو اُن لوگوں سے دوستی رکھتے ہیں جن پر اللہ کا غضب ہوا ہے[۵]؟ وہ نہ تم میں سے ہیں، نہ اُن میں سے[۶]، اور جانتے بوجھتے اپنے اِس جھوٹ پر (کہ تمھارے ساتھ ہیں) قسمیں کھاتے ہیں۔ اللہ نے اُن کے لیے ایک سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔ بے شک، بہت برا ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں۔ اپنی قسموں کو اُنھوں نے

سے احتراز کا احساس پیدا ہو گیا ہو گا۔ یہ مقصد چند گھنٹوں میں پورا نہیں ہو سکتا۔ اِس میں لازماً کچھ وقت صرف ہوا ہو گا، اِس وجہ سے اِن دونوں آیتوں کے زمانۂ نزول میں اتنا بُعد لازماً ہو گا، جتنا اِس طرح کے کسی مقصد کے حاصل ہونے کے لیے ضروری ہے۔''

(تدبر قرآن ۸/۲۶۶)

۴؎ مطلب یہ ہے کہ اب اِن چیزوں کا خاص اہتمام ہونا چاہیے، اِس لیے کہ یہی وہ چیزیں ہیں جو منافقین کے اٹھائے ہوئے فتنوں کے مقابلے میں تمھیں پابرجا رکھ سکتی ہیں۔

۵؎ اشارہ ہے مدینے کے یہودیوں کی طرف جنھیں اِن لوگوں نے دوست بنا رکھا تھا۔

۶؎ یعنی مخلصانہ تعلق نہ تمھارے ساتھ ہے، نہ یہود کے ساتھ۔ دونوں سے اُن کی دوستی محض اپنے مفادات کے لیے ہے۔

سَبِيۡلِ اللّٰهِ فَلَهُمۡ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ ﴿۱۶﴾
لَنۡ تُغۡنِىَ عَنۡهُمۡ اَمۡوَالُهُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ شَيۡـًٔا ؕ اُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ؕ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۱۷﴾ يَوۡمَ يَبۡعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيۡعًا فَيَحۡلِفُوۡنَ لَهٗ كَمَا يَحۡلِفُوۡنَ لَـكُمۡ وَيَحۡسَبُوۡنَ اَنَّهُمۡ عَلٰى شَىۡءٍ ؕ اَلَاۤ اِنَّهُمۡ هُمُ الۡـكٰذِبُوۡنَ ﴿۱۸﴾ اِسۡتَحۡوَذَ عَلَيۡهِمُ الشَّيۡطٰنُ فَاَنۡسٰٮهُمۡ ذِكۡرَ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓـئِكَ حِزۡبُ الشَّيۡطٰنِ ؕ

ڈھال بنا لیا ہے۔ چنانچہ اللہ کی راہ سے رک گئے ہیں۔ سو اُن کے لیے بڑی ذلت کا عذاب ہے۔ ۱۴-۱۶

اللہ کے اِس عذاب سے[۷] اُن کو بچانے کے لیے نہ اُن کے مال کچھ کام آئیں گے، نہ اُن کی اولاد[۸]۔ وہ دوزخ کے لوگ ہیں، ہمیشہ اُس میں رہیں گے۔ اُس دن، جب اللہ اِن سب کو اٹھائے گا تو اُس کے سامنے بھی اِسی طرح قسمیں کھائیں گے، جس طرح تمھارے سامنے کھاتے ہیں[۹]، اور خیال کریں گے کہ اُن کی بھی کوئی بنیاد ہے۔ سنو، درحقیقت وہی جھوٹے ہیں۔ اُن پر شیطان نے غلبہ پا لیا ہے اور اللہ کی یاد اُنھیں بھلا

۷؎ اصل میں 'مِنَ اللّٰهِ' کا لفظ آیا ہے۔ اِس میں ایک مضاف حذف ہو گیا ہے، یعنی 'من عذاب اللّٰه'۔

۸؎ یہ اُن بیڑیوں کی طرف اشارہ ہے جو اُن کے پاؤں میں پڑی ہوئی تھیں۔ اللہ کی راہ میں اِسی مال و اولاد نے اُنھیں آگے بڑھنے سے روک رکھا تھا۔

۹؎ سورۂ انعام (۶) کی آیت ۲۳ میں بیان ہوا ہے کہ مشرکین جب عذاب دیکھیں گے تو قسم کھا کر اپنی بے گناہی واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ 'وَاللّٰهِ رَبِّنَا، مَا كُنَّا مُشۡرِكِيۡنَ' (اللہ، ہمارے پروردگار کی قسم، ہم مشرک نہیں تھے)۔

أَلَآ إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۹﴾
إِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ أُولٰٓئِكَ فِي الْأَذَلِّيْنَ ﴿۲۰﴾ كَتَبَ اللّٰهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِيْ ط إِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۱﴾

دی ہے۔ وہ شیطان کا جتھا ہیں۔ سنو، شیطان کا یہ جتھا ہی نامراد ہونے والا ہے۔[80] ۱۷-۱۹

(تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) جو اللہ اور اُس کے رسول سے دشمنی کریں گے، وہی سب سے بڑھ کر ذلیل ہونے والوں میں ہوں گے۔ اِس لیے کہ اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول غالب ہو کر رہیں گے۔[81] حقیقت یہ ہے کہ اللہ بڑے زور والا اور بڑا زبردست ہے۔[82] ۲۰-۲۱

۸۰۔ یعنی دنیا اور آخرت، دونوں میں نامراد ہونے والا ہے، اِس لیے کہ رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد بھی جو لوگ شیطان کے ساتھی بنے رہیں، وہ اِسی انجام کو پہنچتے ہیں۔

۸۱۔ یہ اُس سنت الٰہی کا بیان ہے جو ازل سے لکھ دی گئی ہے کہ رسولوں کی بعثت کے بعد جو کشمکش حق و باطل کے مابین برپا ہوتی ہے، اُس میں غلبہ اللہ اور اُس کے رسولوں کو حاصل ہوتا ہے، اور جو شیاطین اپنے جتھوں کے ساتھ اُن کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ لازماً شکست کھاتے اور ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔

۸۲۔ یہ اُس دعوے کی دلیل بیان ہوئی ہے جو اِس سے پہلے مذکور ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...فرمایا کہ اللہ کوئی کم زور ہستی نہیں ہے، بلکہ وہ قوی و عزیز ہے۔ وہ جب اپنے بندوں کے پاس اپنا رسول بھیجتا ہے تو وہ رسول اللہ کا سفیر ہوتا ہے جو لوگوں کے پاس اُن کے حقیقی بادشاہ کے احکام سے آگاہ کرنے کے لیے آتا ہے۔ اگر لوگ اپنے مالک حقیقی کے احکام کی بجا آوری کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو وہ زمین میں اُن کو اقتدار بخشتا اور اُن کو اپنے افضال و عنایات سے نوازتا ہے اور اگر وہ خود اللہ سے مقابلے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو وہ باغی قرار پاتے ہیں

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ

المجادلة
۵۸

تم کبھی نہ دیکھو گے کہ جو لوگ اللہ پر اور قیامت کے دن پر فی الواقع ایمان رکھتے ہیں، وہ اُن لوگوں سے دوستی رکھیں جو اللہ اور اُس کے رسول کے دشمن ہو گئے ہوں، اگرچہ وہ اُن کے باپ ہوں یا بیٹے یا اُن کے بھائی یا اہل خاندان[۸۳]۔ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور اپنے ایک فیض خاص سے اُن کی مدد کی ہے[۸۴]۔ اور (قیامت کے دن) وہ اُنھیں ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں

اور اتمام حجت کے بعد اللہ تعالیٰ اِن باغیوں کے وجود سے اپنی زمین کو پاک کر دیتا ہے۔''

(تدبر قرآن ۸/۲۷۳)

۸۳۔ مطلب یہ ہے کہ دین حق پر سچا ایمان اور دین کے دشمنوں کی محبت دو بالکل متضاد چیزیں ہیں جن کا ایک جگہ جمع ہونا ہرگز متصور نہیں ہوسکتا۔ کسی انسان کے سینے میں دو دل نہیں ہوتے کہ ایسی متضاد اور متحارب چیزوں کی محبت اپنے اندر جمع کر سکے۔

۸۴۔ یہی مدد ہے جس کی قوت سے انسان حق کی حمیت و حمایت میں تمام رشتہ و پیوند کاٹ دینے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے، دراں حالیکہ یہ بازی کوئی آسان بازی نہیں ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''یہ اِسی فیض روحانی کا کرشمہ تھا کہ ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے غزوۂ احد میں اپنے باپ عبداللہ الجراح پر تلوار چلائی، سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بدر میں اپنے فرزند کو للکارا، مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے احد میں اپنے بھائی عبید بن عمیر کو قتل کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ

اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۲۲﴾

بہتی ہوں گی۔ وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ اُن سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ وہ اللہ کی جماعت ہیں۔ سنو، اللہ کی جماعت ہی فلاح پانے والی ہے[۸۵]۔ ۲۲

نے اپنے ماموں عاص بن ہشام کو قتل کیا اور علی، حمزہ اور ابو عبیدہ رضی اللہ عنہم نے عتبہ، شیبہ اور ولید بن عتبہ کو لقمۂ اجل بنایا۔'' (تدبر قرآن ۸/ ۲۷۵)

۸۵؎ یہ اُن مخلصین کا ذکر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔ وہ چونکہ خدا کی طرف سے اور خاص جنود الٰہی کی حیثیت سے اُس عذاب کا ذریعہ بنے جو رسول کے منکرین پر لازماً آتا ہے، اِس لیے 'حِزْبُ الشَّيْطٰن' کے مقابلے میں اُنھیں 'حِزْبُ اللّٰه' کہا گیا ہے۔

لاہور

۱۵/ ستمبر ۲۰۰۹ء

الحشر - الممتحنة

٥٩ ـــــ ٦٠

البيان

الحشر - الممتحنة

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ میں منافقین کو اُن یہودیوں کے انجام سے سبق لینے کی تلقین فرمائی ہے جن کو وہ شہ دے رہے تھے، اور دوسری سورہ میں کم زور مسلمانوں کو اُن مشرکین کے ساتھ رشتہ و پیوند کے نتائج سے خبر دار کیا ہے جو اللہ و رسول کے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ دونوں میں خطاب ایمان کا دعویٰ رکھنے والوں سے ہے اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ مدینۂ طیبہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ تزکیہ و تطہیر میں نازل ہوئی ہیں۔

پہلی سورہ ــــ الحشر ــــ کا موضوع منافقین کو متنبہ کرنا ہے کہ وہ اگر آنکھیں رکھتے ہوں تو اُن لوگوں کے انجام سے عبرت حاصل کریں جن کو وہ ناقابل تسخیر سمجھے بیٹھے تھے، قرآن کی دعوت پر لبیک کہیں اور اللہ کی پاداش سے ڈریں۔

دوسری سورہ ــــ الممتحنة ــــ کا موضوع اُن مسلمانوں کو ایمان و اسلام کے تقاضے سمجھانا ہے جو ہجرت کر کے آ تو گئے تھے، مگر ہجرت کی حقیقت ابھی اُن پر واضح نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ امتحان کے موقعوں پر اُن سے ایسی کمزوریاں صادر ہو جاتی تھیں جو اُنھیں منافقین کے قریب لے جاتی تھیں۔

سورة الحشر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ۚ وَہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۱﴾ ہُوَ الَّذِیۡۤ اَخۡرَجَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ مِنۡ دِیَارِہِمۡ لِاَوَّلِ الۡحَشۡرِ ؕ مَا ظَنَنۡتُمۡ اَنۡ یَّخۡرُجُوۡا وَظَنُّوۡۤا اَنَّہُمۡ مَّانِعَتُہُمۡ حُصُوۡنُہُمۡ مِّنَ اللّٰہِ فَاَتٰىہُمُ

الحشر
۵۹

—— ۱ ——

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

زمین اور آسمانوں کی ہر چیز نے اللہ کی تسبیح کی ہے اور وہی غالب اور حکیم ہے[1]۔ وہی ہے جس نے اہل کتاب کے منکروں کو پہلے حشر کے لیے[2] اُن کے گھروں سے نکال باہر کیا ہے[3]۔ تمھیں گمان نہ تھا کہ وہ کبھی (اِس طرح) نکلیں گے[4] اور وہ بھی یہی سمجھتے تھے

[1] یعنی کائنات کی ہر چیز نے ہمیشہ اپنے وجود سے اِس حقیقت کا اظہار واعلان کیا ہے کہ اللہ اِس سے پاک ہے کہ ظالموں اور نیکو کاروں کو انجام کے لحاظ سے یکساں کر دے۔ چنانچہ وہ ظالموں کو پکڑے گا، اِس لیے کہ حکیم ہے اور کوئی ظالم اُس کی پکڑ سے بچ نہ سکے گا، اِس لیے کہ زبردست بھی ہے۔

[2] یعنی پہلے حشر کے طور پر۔ اِس میں یہ تنبیہ ہے کہ ابھی کچھ حشر اور بھی ہیں جن سے اُنھیں دوچار ہونا پڑے گا۔

[3] یہ یہود بنی نضیر کے اخراج کا ذکر ہے جو مدینۂ طیبہ کے قریب آباد تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اِن کا واقعہ یہ ہے کہ اِنھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اگرچہ صلح وامن کا معاہدہ کر رکھا تھا، لیکن بدر کے چھٹے مہینے معاہدے کے خلاف اِنھوں نے اسلام کے دشمنوں سے

اللّٰهُ مِنۡ حَيۡثُ لَمۡ يَحۡتَسِبُوۡا ۖ وَقَذَفَ فِيۡ قُلُوۡبِهِمُ الرُّعۡبَ يُخۡرِبُوۡنَ بُيُوۡتَهُمۡ بِاَيۡدِيۡهِمۡ وَاَيۡدِي الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۖ فَاعۡتَبِرُوۡا يٰۤاُولِي الۡاَبۡصَارِ ﴿۲﴾

کہ اُن کے قلعے اُنھیں اللہ کے عذاب سے بچالیں گے۔[5] مگر اللہ اُن پر وہاں سے آ پہنچا، جہاں سے اُنھوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا اور اُن کے دلوں میں ہیبت ڈال دی۔[6] وہ اپنے گھر اپنے ہاتھوں سے اجاڑ رہے تھے اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے بھی۔[7] سو عبرت حاصل کرو، اے آنکھیں رکھنے والو! ۱-۲

الحشر
۵۹

سازباز بھی کی اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی ایک ناکام سازش کے بھی مرتکب ہوئے۔ اِن کے اِس جرم کی پاداش میں آپ نے اِن کو مدینہ سے نکل جانے کا حکم دیا۔ پہلے تو وہ اِس حکم کی تعمیل پر آمادہ ہو گئے، لیکن بعد میں مشہور منافق عبد اللہ بن ابی نے اِنھیں اکسایا کہ میرے دو ہزار آدمی تمھارے ساتھ ہیں، نیز قریش اور غطفان بھی تمھاری حمایت کریں گے، تم نکلنے سے انکار کر دو۔ عبد اللہ بن ابی کی اِن باتوں سے وہ اُس کے چکمے میں آ گئے اور نکلنے سے انکار کر دیا۔ بالآخر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن پر فوج کشی کی۔ اُس وقت نہ بنو قریظہ نے اِن کا ساتھ دیا، نہ قریش اور غطفان نے۔ ناچار اِنھیں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔ آپ نے ازراہ عنایت یہ اجازت اِنھیں دے دی کہ جتنا سامان وہ اونٹوں پر لے جا سکتے ہیں، اتنا لے جائیں۔ چنانچہ وہ جتنا سامان لے جا سکے، لے کر خیبر اور اذرعات چلے گئے۔ اِن کی باقی املاک و جایداد پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبضہ کر لیا۔*" (تدبر قرآن ۸/ ۲۸۳)

[4] یہ خطاب اُنھی منافقین سے ہے جو اِس سورہ کے مخاطب ہیں۔

[5] اصل میں 'مِنَ اللّٰهِ' کا لفظ آیا ہے۔ اِس میں مضاف عربیت کے قاعدے کے مطابق حذف ہو گیا ہے۔ یعنی 'مِنۡ بَاۡسِ اللّٰهِ' یا 'مِنۡ عَذَابِ اللّٰهِ'۔

[6] یہ نشان دہی فرمائی ہے کہ اللہ کہاں سے آ پہنچا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

* بخاری، رقم ۳۸۰۴۔

وَلَوۡلَاۤ اَنۡ کَتَبَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمُ الۡجَلَآءَ لَعَذَّبَہُمۡ فِی الدُّنۡیَا ؕ وَ لَہُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ عَذَابُ النَّارِ ﴿۳﴾ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ شَآقُّوا اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ ۚ وَ مَنۡ یُّشَآقِّ اللّٰہَ فَاِنَّ اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۴﴾

مَا قَطَعۡتُمۡ مِّنۡ لِّیۡنَۃٍ اَوۡ تَرَکۡتُمُوۡہَا قَآئِمَۃً عَلٰۤی اُصُوۡلِہَا

اور اگر اللہ نے اُن کے لیے (اِسی طرح) جگہ جگہ سے اجڑنے کی سزا نہ لکھ دی ہوتی تو وہ اُنھیں دنیا ہی میں عذاب دے ڈالتا[8] اور قیامت میں تو اُن کے لیے دوزخ کا عذاب ہے ہی۔ یہ سب اِس لیے کہ اُنھوں نے اللہ اور اُس کے رسول کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی ہے اور جو اللہ کا مقابلہ کریں[9]، وہ اِسی انجام کو پہنچتے ہیں، اِس لیے کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔۳-۴

”...وہ اپنے اردگرد اینٹوں اور پتھروں کی دیواریں چن کر سمجھے کہ خدا کی پکڑ سے باہر ہو گئے، لیکن اللہ نے اُن کی دیواریں ہٹانے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی، بلکہ براہ راست اُن کے دلوں میں رعب ڈال دیا جس کا اثر یہ ہوا کہ وہ قلعے اور گڑھیاں رکھتے ہوئے ایسے مرعوب ہوئے کہ اپنے بنائے ہوئے گھروں کو اُنھوں نے خود اپنے ہاتھوں اجاڑا۔“ (تدبر قرآن ۸/ ۲۸۴)

۷ یعنی کچھ بربادی مسلمانوں کے حملے سے ہوئی اور کچھ اُنھوں نے خود اجاڑ دیے کہ اُن کے نکل جانے کے بعد مسلمان اُن سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکیں۔

۸ یعنی وہی عذاب دے ڈالتا جو عاد و ثمود اور فرعون کو دیا گیا اور اِن کا نام و نشان مٹ جاتا، مگر اللہ اِنھیں باقی رکھنا چاہتا ہے تاکہ قیامت تک کے لیے یہ اُس کی جزا و سزا کا نمونہ بن کر جئیں۔ چنانچہ اُس نے طے کر رکھا ہے کہ قومی حیثیت میں اِنھیں ہمیشہ جلاوطنی کی سزا دی جائے گی۔

۹ اصل الفاظ ہیں: ’مَنۡ یُّشَآقِّ اللّٰہَ‘۔ اِن کے بعد ’وَرَسُوۡلَہٗ‘ حذف کر دیا ہے، جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ رسول کی مخالفت درحقیقت اللہ کی مخالفت ہے۔

فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۵﴾

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ

(انھیں اعتراض ہے تو پروا نہ کرو، اِس لیے کہ) کھجوروں کے جو درخت (اِن پر حملے کے وقت) تم نے کاٹ دیے یا جن کو اُن کی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا تو یہ اللہ کے اذن سے ہوا، اور اِس لیے ہوا کہ وہ اِن نافرمانوں کو رسوا کر دے[۱۰]۔ ۵

اور (منافقین پوچھتے ہیں تو اُنھیں بتاؤ کہ) جو اموال اللہ نے اِن یہودیوں کی طرف سے اپنے رسول کی طرف پلٹا دیے[۱۱] تو اُن پر تم نے گھوڑے اور اونٹ نہیں

۱۰؎ یہ اعتراض یہود کی طرف سے ہوا۔ اُن کے خلاف جنگی اقدام کے لیے مسلمانوں کو اُن کے نخلستانوں سے درخت کاٹنا پڑے۔ یہ درخت کسی تخریب کے ارادے سے یا جذبۂ انتقام کے تحت نہیں، بلکہ جنگی ضرورت کے تحت اور اِن مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے کاٹے گئے تھے۔ اِسی طرح جو چھوڑے گئے تھے، وہ بھی اِس لیے نہیں چھوڑے گئے تھے کہ مسلمانوں کو اُنھیں اپنے لیے باقی رکھنا تھا، بلکہ اِس لیے چھوڑے گئے تھے کہ جنگ کے مقام پر نہ تھے اور اُنھیں کاٹنے کی ضرورت نہ تھی۔ مگر یہود نے اِسے اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کا ذریعہ بنالیا کہ مسلمان اپنے آپ کو اصلاح کا داعی سمجھتے ہیں، لیکن اِن کا حال یہ ہے کہ فاتحین کے عام طریقے کے مطابق اِنھوں نے پھل والے درخت کاٹے اور اِس طرح تباہی پھیلا دی ہے۔ قرآن نے اِس اعتراض کا جواب دیا ہے، لیکن معترضین چونکہ لائق خطاب نہ تھے، اِس لیے اُن کے بجاے مسلمانوں کو مخاطب کیا ہے کہ اِن کی پروا نہ کرو، تم نے جو کچھ کیا ہے، اللہ کے رسول کی موجودگی میں اور اُن کی ہدایت کے مطابق کیا ہے، لہٰذا اذن الٰہی کے تحت کیا ہے اور اللہ نے یہ اذن اِس لیے دیا کہ اپنی آنکھوں کے سامنے یہ اپنے ہرے بھرے باغوں کو اجڑتے اور مسلمانوں کے قبضے میں جاتے ہوئے دیکھیں اور قیامت سے پہلے اِسی دنیا میں رسوا ہو جائیں تاکہ خدا کی بات پوری ہو کہ جو خدا کی طرف سے

وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٦﴾ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ

دوڑائے (کہ اُن پر تمھارا کوئی حق قائم ہو)، بلکہ اللہ ہے جو اپنے رسولوں کو جن پر چاہتا ہے، غلبہ عطا فرماتا ہے، اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔[12] (اِس لیے) اِن بستیوں کے لوگوں سے اللہ جو کچھ اپنے رسول کی طرف پلٹائے، وہ اللہ اور رسول اور

اتمام حجت کے بعد بھی اُس کا مقابلہ کرنے کی جسارت کریں، اُن کا انجام بالآخر یہی ہوتا ہے۔

11؎ پلٹانے کا یہ لفظ بڑا معنی خیز استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ ہی کا مال تھا جسے اِن ظالموں نے غصب کر رکھا تھا۔ اللہ نے اِس کو واپس لے کر اِس کے حقیقی حق داروں کو دے دیا ہے۔

12؎ یہ اُسی غلبے کا ذکر ہے جو سنت الٰہی کے مطابق ہر رسول کو لازماً حاصل ہوتا ہے۔ زمانۂ رسالت کی جنگیں زیادہ تر اِسی سنت کا ظہور تھیں اور اُن میں لڑنے والوں کی حیثیت بھی اصلاً آلات و جوارح کی تھی۔ وہ اللہ کے حکم پر میدان میں اترے اور براہ راست اُس کے فرشتوں کی مدد سے فتح یاب ہوئے تھے۔ لہٰذا اِن جنگوں کے مال غنیمت پر کسی کا کوئی حق نہ تھا۔ تاہم بنی نضیر کے خلاف اِس اقدام سے پہلے جب مسلمان بدر کے معرکے میں اترے تھے تو اُنھیں باقاعدہ جنگ کرنا پڑی تھی۔ اُنھوں نے اِس کے لیے زادراہ کا بندوبست بھی خود کیا تھا اور اِس کی ضرورتوں کے لیے اسلحہ، گھوڑے اور اونٹ وغیرہ بھی خود مہیا کیے تھے۔ چنانچہ مال غنیمت کا پانچواں حصہ اجتماعی مقاصد کے لیے رکھ کر باقی مجاہدین میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ بنی نضیر کے خلاف اِس اقدام میں اِس طرح کی کوئی بات نہیں ہوئی، بلکہ اللہ و رسول کے دبدبے سے مرعوب ہو کر یہودیوں نے اپنا علاقہ خود خالی کر دیا۔ اِس لیے اب کوئی ضرورت نہ تھی کہ اِس کا ایک حصہ مجاہدین میں تقسیم کیا جائے۔ لیکن منافقین اپنی حرص مال کی وجہ سے اِس پر راضی نہیں ہوئے اور اُنھوں نے اعتراض کیا۔ یہ اُس

وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً

قرابت مندوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے خاص رہے گا[۱۴] تاکہ وہ

اعتراض کا جواب ہے۔

۱۴؎ اِن اموال کی صحیح نوعیت بتا دینے کے بعد یہ قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ اِنھیں دین و ملت کی اجتماعی ضرورتوں اور قوم کے غربا و مساکین کے لیے خاص کر دیا گیا ہے، اِن کا کوئی حصہ بھی مجاہدین میں تقسیم نہیں ہوگا۔ اِس کے بعد اِن مقاصد کی تفصیل کر دی ہے:

سب سے پہلے اللہ کا حق بیان ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ، ظاہر ہے کہ ہر چیز سے غنی اور بے نیاز ہے۔ اُس کے نام کا حصہ اُس کے دین ہی کی طرف لوٹتا ہے۔ لہٰذا اِس کا اصلی مصرف وہ کام ہوں گے جو دین کی نصرت اور حفاظت و مدافعت کے لیے مسلمانوں کا نظم اجتماعی اپنی دینی ذمہ داری کی حیثیت سے انجام دیتا ہے۔

دوسرا حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا گیا ہے۔ آپ کی شخصیت میں اُس وقت نبوت و رسالت کے ساتھ مسلمانوں کی حکومت کے سربراہ کی ذمہ داری بھی جمع ہو گئی تھی اور آپ کے اوقات کا لمحہ لمحہ اپنے یہ منصبی فرائض انجام دینے میں صرف ہو رہا تھا۔ اِس ذمہ داری کے ساتھ اپنی معاش کے لیے کوئی کام کرنا آپ کے لیے ممکن نہ تھا۔ اِس صورت حال میں ضروری ہوا کہ اِس مال میں آپ کا حق بھی رکھا جائے۔ اِس کی نوعیت کسی ذاتی ملکیت کی نہیں تھی کہ اِسے آپ کے وارثوں میں تقسیم کیا جاتا۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد یہ آپ سے آپ اُن کاموں کی طرف منتقل ہو گیا جو آپ کی نیابت میں مسلمانوں کے نظم اجتماعی کے لیے انجام دینا ضروری تھے۔

تیسرا حق 'ذِی الْقُرْبٰی' کا بیان کیا گیا ہے۔ اِس سے، ظاہر ہے کہ آپ کے وہ قرابت دار مراد ہیں جن کی کفالت آپ کے ذمہ تھی اور جن کی ضرورتیں پوری کرنا اخلاقی لحاظ سے آپ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ آپ کی حیثیت تمام مسلمانوں کے باپ کی تھی۔ چنانچہ آپ کے بعد یہ ذمہ داری عرفاً و

بَيۡنَ الۡاَغۡنِيَآءِ مِنۡكُمۡ ؕ وَمَاۤ اٰتٰٮكُمُ الرَّسُوۡلُ فَخُذُوۡهُ ۚ وَمَا نَهٰٮكُمۡ عَنۡهُ فَانۡتَهُوۡا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ ۘ ۝۷ لِلۡفُقَرَآءِ الۡمُهٰجِرِيۡنَ

تمھارے دولت مندوں ہی میں گردش نہ کرتا رہے۔[14] اور رسول (کا منصب یہی ہے کہ) جو تمھیں دے، وہ لے لو اور جس چیز سے روکے، اُس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ بڑی سخت سزا دینے والا ہے۔[15] پھر یہ خاص کر اُن

شرعاً مسلمانوں کے نظم اجتماعی کو منتقل ہوئی اور ذی القربیٰ کا حق بھی، جب تک وہ دنیا میں رہے، اِسی طرح قائم رہا۔

چوتھا حق یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا ہے۔ اُن کا حق بیان کرتے ہوئے 'اُس لِ' کا اعادہ نہیں فرمایا جو اوپر اللہ، رسول اور ذی القربیٰ، تینوں کے ساتھ آیا ہے، بلکہ اُن کا ذکر ذی القربیٰ کے ذیل ہی میں کر دیا ہے۔ اِس سے مقصود اِس طبقے کی عزت افزائی ہے کہ گویا یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقربا ہی کے تحت ہیں۔ یہ حق کسی وضاحت کا محتاج نہیں ہے۔ ہر وہ معاشرہ جو اِن طبقات کی ضرورتوں کے لیے حساس نہیں ہے، جس میں یتیم دھکے کھاتے، مسکین بھوکے سوتے اور مسافر اپنے لیے کوئی پرسان حال نہیں پاتے، اُسے اسلامی معاشرے کا پاکیزہ نام نہیں دیا جا سکتا۔

[14] یہ اِس حکم کی مصلحت بتائی ہے کہ اِن اموال کو مجاہدین میں تقسیم کرنے اور اِس طرح نجی ملکیت میں دینے کے بجائے دین و ملت کی اجتماعی ضرورتوں اور قوم کے غربا و مساکین کی مدد اور کفالت کے لیے کیوں وقف رکھا گیا ہے۔ فرمایا ہے: ''تاکہ یہ تمھارے دولت مندوں ہی میں گردش نہ کرتے رہیں''۔ اِس سے یہ رہنمائی قرآن نے مسلمانوں کے ہر نظم اجتماعی کو دی ہے کہ دولت غریب و امیر، جس کی بھی نجی ملکیت میں دی جائے گی، بالآخر دولت مندوں ہی میں گردش کرنا شروع کر دے گی، اِس لیے ضروری ہے کہ وہ تمام اموال و املاک جو کسی فرد کی ملکیت نہیں ہیں یا نہیں ہو سکتے، جیسے زمین اور اُس کے خزائن، اُنھیں قوم کی ملکیت میں رکھا جائے اور نظم اجتماعی سے متعلق بعض دوسری ذمہ داریوں کے ساتھ اُن لوگوں کی ضرورتیں بھی اُن سے پوری کی جائیں جو اپنی

الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۚ﴿۸﴾
وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ

غریب مہاجروں کے لیے ہے[16] جو اپنے گھروں اور جایدادوں سے نکال باہر کیے گئے ہیں۔ یہ اللہ کا فضل اور اُس کی خوشنودی چاہتے ہوئے اور اللہ اور اُس کے رسول کی حمایت کرتے ہوئے آئے ہیں[17]۔ یہی راست باز ہیں۔ ۶-۸

(اِن منافقوں کے برخلاف) جو لوگ اِس دیار کو اِن سے پہلے ٹھکانا بنائے ہوئے اور اپنا ایمان محکم کیے ہوئے ہیں[18]، وہ اُن لوگوں سے محبت رکھتے ہیں جو (اُن کے بعد اب)

خلقی کم زوریوں یا اسباب و وسائل سے محرومی کے باعث دوسروں کی مدد کے محتاج ہو جاتے ہیں۔

۱۵؎ یہ تہدید و وعید بتا رہی ہے کہ اوپر جو وضاحت کی گئی ہے، وہ منافقین کی طرف سے اٹھائے گئے اعتراض کے جواب میں کی گئی ہے، اِس لیے کہ سوال اگر محض تحقیق مسئلہ کے لیے اور مخلصین کی طرف سے ہوتا تو اِس تہدید کا کوئی موقع نہیں تھا۔

۱۶؎ یہ اِن اموال کا ایک خاص مصرف بتایا ہے جو اُس وقت کے حالات میں پیدا ہو گیا تھا اور تمام مسلمانوں کی یکساں توجہ کا مستحق تھا۔ یعنی اُن مہاجرین کی امداد جو ہجرت کر کے مدینہ آ رہے تھے اور اپنے گھروں اور اپنی املاک اور جایدادوں سے محض اللہ کے بھروسے پر اور اِس بات کی پروا کیے بغیر اٹھ کھڑے ہوئے تھے کہ کیا کھائیں گے اور کہاں سر چھپائیں گے۔

۱۷؎ یہ اِن مہاجرین کی تعریف میں فرمایا ہے کہ اِنھیں یہ ہجرت کسی دنیوی مقصد کے لیے نہیں، بلکہ خالص اللہ کی خوشنودی اور اُس کے پیغمبر کی نصرت کے لیے کرنا پڑی ہے۔

۱۸؎ یعنی انصار اور مہاجرین اولین جو ابتدا ہی میں ہجرت کر کے آ گئے تھے۔ اُن کے لیے اصل میں 'تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ کس طرح کی ترکیب ہے؟ استاذ امام امین

وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ جَاۗءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ

ہجرت کر کے اُن کی طرف آ رہے ہیں اور جو کچھ اِن مہاجروں کو دیا جا رہا ہے، اُس سے اپنے دلوں میں کوئی خلش محسوس نہیں کرتے اور اُنھیں اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں، خواہ اپنی جگہ خود ضرورت مند ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو خود غرضی سے بچا لیے جائیں، وہی فلاح پانے والے ہیں[19]۔ ۹

اور یہ جو اُن کے بعد آئے ہیں، وہ بھی یہی دعا کرتے ہیں کہ پروردگار، ہمیں اور

احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”...(یہ) اُسی طرح کی ترکیب ہے، جس طرح ’علفته تبنًا وماءً‘ (میں نے اُس کو چارہ کھلایا اور پانی پلایا) یا ’زجعن الحواجب والعیونا‘، یا ’قلدنی سیفًا ورمحًا‘ وغیرہ مختلف ترکیبیں عربی میں معروف ہیں۔ اِس طرح کی ترکیبوں میں ایک فعل جو دوسرے مفعول سے مناسبت رکھنے والا ہو، محذوف ہوتا ہے جو قرینے سے سمجھ لیا جاتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ تینوں مثالوں میں ایک ایک فعل محذوف ہے۔ اِسی طرح اِس آیت میں بھی ایک فعل ’الْاِیْمَان‘ سے مناسبت رکھنے والا محذوف ہے۔ اگر یہاں ’احکموا‘ یا اِس کے ہم معنی کوئی فعل محذوف مانیے تو پوری عبارت یوں ہوگی: ’تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَاَحْكَمُوا الْاِیْمَانَ‘، یعنی جنھوں نے پہلے سے گھر ٹھکانا بھی بنا رکھا ہے اور اپنے ایمان کو بھی مضبوط کر رکھا ہے۔“ (تدبر قرآن ۸/ ۲۹۴)

۱۹ یہ اُن منافقین کے سامنے گویا آئینہ رکھ دیا ہے جن کے اعتراض کا جواب اوپر دیا ہے کہ سچے اہل ایمان اِس طرح ایک دوسرے کے ہم درد، سیر چشم، فیاض اور ایثار کرنے والے ہوتے ہیں۔ اِس سے مقصود یہ ہے کہ اُنھیں بھی اپنی خود غرضی پر کچھ شرم آئے۔

الحشر
۵۹

سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۰﴾

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّاِنْ

ہمارے اُن بھائیوں کو بخش دے جو ایمان لانے میں ہم پر سبقت لے گئے اور اِن اہل ایمان کے لیے ہمارے دلوں میں کوئی بغض نہ پیدا ہونے دے۔ پروردگار، تو بڑا مہربان ہے، تیری شفقت ابدی ہے[20]۔ ۱۰

تم نے دیکھے نہیں وہ لوگ جو منافقت میں مبتلا ہیں[21]؟ وہ اپنے اُن اہل کتاب بھائیوں سے کہتے ہیں جو (پیغمبر کے) منکر ہیں (اور باقی رہ گئے ہیں[22]): تمھیں نکالا گیا تو ہم بھی

۲۰؎ یعنی انصار اور مہاجرین اولین اگر سراپا ایثار ہیں تو بعد میں ہجرت کر کے آنے والے بھی اُن کے اخلاص کی قدر کرتے اور اُن سے بڑی محبت رکھتے ہیں۔ اُن کو یہ حسد نہیں ہے کہ اِن لوگوں نے مدینہ کے وسائل پر ہم سے پہلے قبضہ جما رکھا ہے۔ چنانچہ وہ دعا کرتے ہیں کہ اُن کے دل اپنے بھائیوں کے لیے مہر و محبت سے معمور رہیں اور شیطان اُن کے اندر کسی مسلمان بھائی کے لیے بغض اور کینہ و حسد پیدا نہ کر دے۔

۲۱؎ یہ خطاب اظہار تعجب کے لیے ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...مطلب یہ ہے کہ ذرا اِن مدعیان ایمان کو تو دیکھو، ایک طرف ایمان کا دعویٰ ہے، دوسری طرف اُن اہل کتاب سے جنھوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت و رسالت کا انکار کیا ہے، محبت کی پینگیں بھی بڑھائی جا رہی ہیں۔" (تدبر قرآن ۸/ ۳۰۰)

۲۲؎ اِس سے بنو قریظہ مراد ہیں۔ مدینہ کے جوار میں یہود کے تین ہی بڑے قبیلے آباد تھے: بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ بنو قینقاع پہلے ہی نکالے جا چکے تھے۔ بنو نضیر کا حشر اوپر بیان ہو گیا

قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ⑪ لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ ۚ وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ ۚ وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ۫ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ⑫

لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ۗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا

لازماً تمھارے ساتھ نکلیں گے اور تمھارے معاملے میں ہم کسی کی بات کبھی نہ مانیں گے[۲۳] اور تم سے جنگ کی گئی تو ضرور تمھاری مدد کریں گے۔ مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ وہ نکالے گئے تو یہ ہرگز اُن کے ساتھ نہ نکلیں گے اور اُن سے جنگ کی گئی تو یہ ہرگز اُن کی مدد نہ کریں گے اور بالفرض کریں گے تو لازماً پیٹھ دکھائیں گے، پھر کہیں سے کوئی مدد نہ پائیں گے[۲۴]۔ ۱۱-۱۲

ہے۔ اِس کے بعد صرف بنو قریظہ باقی رہ گئے تھے۔ چنانچہ یہ منافقین جو یہود ہی سے آئے تھے، اب اپنے اِن بھائیوں کے ساتھ ساز باز کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ قرآن نے آگے اِسی سے پردہ اٹھایا ہے۔

۲۳؎ یعنی تمھارے معاملے میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کچھ کہیں یا مسلمان، کسی کی بات نہ مانیں گے۔ بنو قریظہ کو اِس تاکید و توثیق کے ساتھ اپنی مدد کا یقین دلانے کی ضرورت اِن منافقین کو غالباً اِس لیے پیش آئی کہ اِس سے پہلے بنو نضیر کے ساتھ بھی یہ اِسی طرح کے وعدے کرتے رہے تھے، لیکن وقت آیا تو صرف زبان کے غازی ثابت ہوئے تھے۔

۲۴؎ قرآن کی یہ بات حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ غزوۂ خندق کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کا محاصرہ کیا تو کوئی بھی اُن کے کام نہ آیا اور اُنھیں مجبور ہو کر اپنی قسمت کا فیصلہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں دینا پڑا۔ اُن کے اِس عبرت ناک انجام کا قصہ سورۂ احزاب میں بیان ہوا ہے۔

يَفْقَهُوْنَ ﴿١٣﴾ لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ۭ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ۭ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿١٤﴾ ۚ

كَمَثَلِ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ

اِن کے دلوں میں خدا سے بڑھ کر تمھاری دہشت ہے، اِس لیے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔[25] یہ کبھی اکٹھے ہو کر (میدان میں) تمھارا مقابلہ نہ کریں گے، بلکہ قلعہ بند بستیوں میں بیٹھ کر یا دیواروں کے پیچھے چھپ کر لڑیں گے۔ اِن کی آپس میں سخت مخالفت ہے۔ تم اِنھیں اکٹھا سمجھتے ہو، دراں حالیکہ اِن کے دل پھٹے ہوئے ہیں۔[26] اِن کا یہ حال اِس لیے ہے کہ یہ عقل سے کام نہیں لیتے۔[27] ۱۳-۱۴

(یہ جن کو شہ دے رہے ہیں)، اُن کے ساتھ بھی وہی ہو گا جو اُن کے اگلوں کے

۲۵؎ یہ ایک حقیقت کا بیان ہے، اِس لیے کہ اُس شخص سے زیادہ بے سمجھ کون ہو سکتا ہے جو بندوں سے ڈرے اور خدا سے نہ ڈرے۔

۲۶؎ یعنی اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت میں بظاہر متحد نظر آتے ہیں، لیکن اندر سے نہ ایک دوسرے کے ساتھ مخلص ہیں اور نہ قریش اور مشرکین کے دوسرے قبائل کے ساتھ اِن کا تعلق دلی دوستی کا ہے۔ یہ تمام اتحاد و اتفاق جو بظاہر نظر آتا ہے، بالکل بے ثبات اور محض نمایشی ہے۔

۲۷؎ یہ اِن کی بیماری کا اصلی سبب بتایا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...یعنی حقائق پر غور کرنے، سنجیدگی سے اُن کا موازنہ کرنے اور پھر پورے عزم و ثبات سے اُن کا مواجہہ کرنے کی جگہ اِنھوں نے اپنی باگ اپنی خواہشوں کے ہاتھ میں پکڑا دی ہے۔ اور جب کوئی قوم عقل کی جگہ اپنی خواہشوں کو امام بنا لیتی ہے تو وہ اِسی طرح کے انتشار فکر میں مبتلا ہو کر تباہ ہو جاتی ہے۔“ (تدبر قرآن ۸/ ۳۰۳)

اَلِيۡمٌ ﴿۱۵﴾ كَمَثَلِ الشَّيۡطٰنِ اِذۡ قَالَ لِلۡاِنۡسَانِ اكۡفُرۡ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّنۡكَ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۶﴾ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَاۤ اَنَّهُمَا فِی النَّارِ خَالِدَيۡنِ فِيۡهَا ؕ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۱۷﴾

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلۡتَنۡظُرۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۸﴾ وَلَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّذِيۡنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنۡسٰهُمۡ اَنۡفُسَهُمۡ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۱۹﴾

الحشر
۵۹

ساتھ ہوا ہے، جو ابھی کچھ پہلے اپنے کیے کا مزہ چکھ چکے ہیں،[۲۸] اور آگے اُن کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ یہ بالکل شیطان کی طرح ہیں کہ وہ انسان سے کہتا ہے کہ منکر ہو جاؤ اور جب وہ منکر ہو جاتا ہے تو کہتا ہے کہ میں تم سے بری ہوں، میں تو اللہ رب العلمین سے ڈرتا ہوں۔ سو دونوں کا انجام یہ ہے کہ دونوں جہنم میں جائیں کہ ہمیشہ اُسی میں رہیں، اور ظالموں کی یہی جزا ہے۔۱۵-۱۷

ایمان کا دعویٰ رکھنے والو، اللہ سے ڈرو اور (تم میں سے) ہر شخص دیکھے کہ اُس نے کل کے لیے کیا سامان کیا ہے۔[۲۹] (اِسے دیکھو) اور اللہ سے ڈرتے رہو۔[۳۰] اللہ یقیناً جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے اور اللہ نے خود اُن کو اُنھیں بھلا دیا۔[۳۱] حقیقت یہ ہے کہ یہی نافرمان ہیں۔۱۸-۱۹

۲۸؎ یعنی بنو نضیر کے ساتھ جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ 'قَرِیْبًا' کے لفظ سے قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ اِس سے وہی مراد ہیں۔

۲۹؎ یعنی قیامت کی حاضری کے لیے۔ اِسے 'کل' سے تعبیر فرمایا ہے۔ اِس سے مقصود یہ ہے کہ اِس کے قرب اور اِس کی قطعیت کی طرف توجہ دلائی جائے۔

لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ؕ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۲۰﴾

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ

(اِس بات کو سمجھو کہ) دوزخ میں جانے والے اور جنت میں جانے والے کبھی یکساں نہ ہوں گے۔ یہ صرف جنت میں جانے والے ہیں جو کام یاب ہوں گے۔۲۰

الحشر
۵۹

۳۰؎ اوپر 'اِتَّقُوا اللّٰهَ' کے بعد یہ وہی الفاظ ایک مرتبہ پھر اِس لیے دہرائے ہیں کہ معاملے کی اہمیت مخاطبین پر واضح ہو۔

۳۱؎ اشارہ ہے یہود کی طرف جن سے منافقین الہام پاتے، اور اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کے لیے در پردہ ساز باز رکھتے تھے۔ اُن کے لیے 'فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ' کے جو الفاظ اصل میں آئے ہیں، اُن میں ایک بڑی حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اُس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"...جو لوگ خدا کو بھلا دیتے ہیں، اُس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے خیر و شر اور اپنی عاقبت سے بالکل بے پروا ہو جاتے ہیں۔ زندگی کی ساری قدر و قیمت اور اُس کا سارا شرف و جمال اِس حقیقت کے سمجھنے پر منحصر ہے کہ خالق نے اُس کو محض چند روزہ عیش دنیا کے لیے نہیں بنایا ہے، بلکہ اِس لیے بنایا ہے کہ انسان اُس کو خدا کے احکام کے تحت گزار کر اپنے کو ابدی بادشاہی کا سزاوار بنائے۔ یہ معراج، ظاہر ہے کہ اُسی کو حاصل ہو گی جو ہمیشہ اِس حقیقت کو یاد رکھے کہ یہ زندگی اُس کو اتفاقیہ نہیں مل گئی ہے، بلکہ ایک بخشنے والے کی بخشی ہوئی ہے اور اُس نے ایک خاص مقصد سے یہ اُس کو بخشی ہے۔ اگر اِس مقصد کے تحت میں اِس کو گزاروں گا، تب تو یہ عظیم ابدی نعمت ہے اور اگر اِس مقصد کو بھلا بیٹھا تو یہ آپ سے آپ ایک ابدی لعنت بن جائے گی۔"

(تدبر قرآن ۸/۳۰۸)

خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢١﴾

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿٢٢﴾

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٢٣﴾

(اِن کے دل پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ) اگر اِس قرآن کو ہم کسی پہاڑ پر اتار دیتے تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کی خشیت سے دب جاتا، پھٹ جاتا۔ یہ مثالیں ہم لوگوں کو اِس لیے سناتے ہیں کہ وہ غور کریں[٣٢]۔ ٢١

(وہ[٣٣] ہمیشہ یاد رکھیں کہ) وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، غائب و حاضر کا جاننے والا، وہ سراسر رحمت ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ٢٢

وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، بادشاہ، وہ منزہ ہستی، سراسر سلامتی، امن دینے والا، نگہبان، غالب، بڑے زور والا، بڑائی کا مالک۔ پاک ہے اللہ اُن سے جو یہ شریک بتاتے ہیں۔ ٢٣

٣٢۔ یہ تمثیل ایک نہایت اعلیٰ اور بلیغ تمثیل ہے جس سے استاذ امام کے الفاظ میں ایک معنوی حقیقت مادی پیرایۂ بیان میں بالکل ممثل ہو کر سامنے آ گئی ہے۔

٣٣۔ اوپر اللہ تعالیٰ کی جس خشیت کا ذکر ہے، وہ صفات الٰہی کے استحضار سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ خاتمۂ کلام میں آگے وہ صفات یاد دلائی ہیں جن پر تمام دین و شریعت کی بنیاد قائم ہے اور جن کو مستحضر رکھنے ہی سے انسان اُن لوگوں کے انجام سے بچ سکتا ہے جن کا ذکر اوپر اِن الفاظ میں ہوا ہے کہ وہ خدا کو بھول گئے تو خدا نے خود اُن کو اُنھیں بھلا دیا۔

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ؕ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۴﴾

سورة الممتحنة

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّىْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ

الممتحنة ۶۰

وہی اللہ ہے نقشہ بنانے والا، وجود میں لانے والا، صورت دینے والا۔ سب اچھے نام اُسی کے ہیں۔ زمین اور آسمانوں کی سب چیزیں اُس کی تسبیح کرتی ہیں اور وہ زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے۔ ۲۴

—— ۲ ——

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

ایمان والو، میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔[۳۴] تم اُن سے محبت کی پینگیں بڑھاتے ہو،[۳۵] دراں حالیکہ جو حق تمھارے پاس آیا ہے، وہ اُس کا انکار کر چکے ہیں۔ وہ

۳۴۔ یہ خطاب اگرچہ عام ہے، لیکن روے سخن اُنھی مسلمانوں کی طرف ہے جو ہجرت کر کے مدینہ آ گئے تھے، مگر اپنی طبعی کم زوریوں اور مصلحت پرستی کے باعث مشرکین مکہ سے اپنے سابق خاندانی اور عزیزانہ تعلقات ختم نہیں کر سکے تھے۔ قرآن نے اِسے ایمان کے منافی قرار دیا اور فرمایا کہ ایمان کا دعویٰ رکھتے ہو تو یہ تعلقات اب ختم کر دو، اِس لیے کہ یہ لوگ صرف منکر نہیں ہیں، بلکہ اِس سے آگے بڑھ کر میرے اور تمھارے دشمن بن چکے ہیں اور تمھارے خلاف برسر جنگ ہیں۔

اَنۡ تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰہِ رَبِّکُمۡ ؕ اِنۡ کُنۡتُمۡ خَرَجۡتُمۡ جِہَادًا فِیۡ سَبِیۡلِیۡ وَ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِیۡ ٭ۖ تُسِرُّوۡنَ اِلَیۡہِمۡ بِالۡمَوَدَّۃِ ٭ۖ وَ اَنَا اَعۡلَمُ بِمَاۤ اَخۡفَیۡتُمۡ وَ مَاۤ اَعۡلَنۡتُمۡ ؕ وَ مَنۡ یَّفۡعَلۡہُ مِنۡکُمۡ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیۡلِ ①

خدا کے رسول کو اور تمھیں محض اِس لیے وطن سے نکال دیتے ہیں[36] کہ تم اپنے رب، اللہ پر ایمان لائے ہو[37]۔ تم اُنھیں رازدارانہ دوستی کے پیغام بھیجتے ہوئے اگر میری راہ میں جہاد کے لیے اور میری رضا کی طلب میں نکلتے ہو، دراں حالیکہ میں جانتا ہوں جو تم چھپاتے اور جو کچھ ظاہر کرتے ہو، تو سوچو کہ کیا کرتے ہو؟ اور حقیقت یہ ہے کہ تم میں سے جو یہ کرتے ہیں، وہ سیدھی راہ سے بھٹک گئے ہیں[38]۔ ۱

۳۵ اصل الفاظ ہیں: 'تُلۡقُوۡنَ اِلَیۡہِمۡ بِالۡمَوَدَّۃِ'۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...(یہ) اُسی طرح کا اسلوب بیان ہے، جس طرح 'وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡکُمۡ اِلَی التَّہۡلُکَۃِ'* ہے۔ اِس طرح کے کام نامہ و پیام اور وسائل و وسائط سے انجام پاتے ہیں، اِس وجہ سے تعبیر مطلب کے لیے یہ اسلوب نہایت موزوں ہے۔" (تدبر قرآن ۸/ ۳۲۴)

۳۶ یہ حال کا صیغہ اِس لیے اختیار فرمایا ہے کہ صورت حال بالکل نگاہوں کے سامنے آجائے۔ چنانچہ حال یہاں تصویر حال کا فائدہ دے رہا ہے۔

۳۷ یعنی جو تمھارا رب ہے، تم نے اُسی کا حق پہچانا ہے، لیکن تمھاری یہ حق شناسی تمھارے ساتھ اُن کی دشمنی کا باعث بن گئی ہے۔

۳۸ اِس جملے میں 'اِنۡ کُنۡتُمۡ' کا جواب محذوف ہے۔ یہ آگے 'وَمَنۡ یَّفۡعَلۡہُ' سے واضح ہو جاتا ہے جو اِسی پر عطف کیا گیا ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کی رضا کے لیے اور اُس کی راہ میں جہاد کی غرض سے نکلنا ہے تو خدا کے اِن دشمنوں سے موالات کی خواہش دلوں

* البقرہ ۲: ۱۹۵۔ "اور اپنے ہی ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔"

اِنۡ يَّثۡقَفُوۡكُمۡ يَكُوۡنُوۡا لَـكُمۡ اَعۡدَآءً وَّيَبۡسُطُوۡۤا اِلَيۡكُمۡ اَيۡدِيَهُمۡ وَاَلۡسِنَتَهُمۡ بِالسُّوۡٓءِ وَوَدُّوۡا لَوۡ تَكۡفُرُوۡنَ ؕ‏ ﴿۲﴾

لَنۡ تَنۡفَعَكُمۡ اَرۡحَامُكُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُكُمۡ ‌ۛۚ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ‌ ۛۚ يَفۡصِلُ بَيۡنَكُمۡ‌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ‏ ﴿۳﴾

قَدۡ كَانَتۡ لَـكُمۡ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ فِىۡۤ اِبۡرٰهِيۡمَ وَالَّذِيۡنَ مَعَهٗ‌ ۚ اِذۡ قَالُوۡا

(اُن کا رویہ تو یہ ہے کہ) اگر تمھیں پا جائیں تو تمھارے ساتھ دشمنی کریں گے اور تم پر اپنے ہاتھ چلائیں گے اور اپنی زبانیں بھی کہ تمھیں آزار پہنچائیں، اور یہی چاہیں گے کہ تم بھی کافر ہو جاؤ[۳۹]۔ ۲

(اِن سے بچو، اِس لیے کہ) تمھاری یہ قرابتیں اور تمھارے آل و اولاد ہرگز تمھارے کام نہ آئیں گے، قیامت کے دن[۴۰]، اللہ تمھارے درمیان جدائی ڈال دے گا، اور جو کچھ تم کر رہے ہو، اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔ ۳

(تم سمجھنا چاہو تو) حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم اور اُس کے ساتھیوں میں تمھارے لیے

میں لیے ہوئے اور اِن سے نامہ و پیام کرتے ہوئے نہیں نکل سکتے۔ یہ موقع موالات کا نہیں، دشمنی کے اظہار کا ہے۔ اللہ کی راہ میں جہاد اور اُس کی رضا طلبی اور اللہ و رسول کے دشمنوں کے ساتھ دوستی دو بالکل متضاد چیزیں ہیں، اِس لیے یک سو ہو جاؤ اور اُن کے ساتھ دوستی کے خیالات ذہن سے نکال دو۔ تمھارا رویہ یہی رہا تو اِس کے معنی یہ ہوں گے کہ تم خدا کا راستہ چھوڑ کر شیطان کے راستے پر چل پڑے ہو۔

۳۹؎ یعنی تمھارے ساتھ اپنی دشمنی میں ایسے سخت ہیں کہ تم پر قابو پالیں تو کسی رشتہ و قرابت اور عہد و پیمان کا لحاظ نہ کریں گے اور جو آزار ممکن ہوگا، تمھیں لازماً پہنچائیں گے۔

۴۰؎ یہ لفظ اِس خوب صورتی کے ساتھ بیچ میں آیا ہے کہ آگے اور پیچھے آنے والے، دونوں فعلوں کا

لِقَوۡمِهِمۡ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنۡكُمۡ وَمِمَّا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ۫ كَفَرۡنَا بِكُمۡ وَبَدَا بَيۡنَنَا وَبَيۡنَكُمُ الۡعَدَاوَةُ وَالۡبَغۡضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَحۡدَهٗۤ اِلَّا قَوۡلَ اِبۡرٰهِيۡمَ لِاَبِيۡهِ لَاَسۡتَغۡفِرَنَّ لَكَ وَمَاۤ اَمۡلِكُ لَكَ مِنَ

بہترین نمونہ ہے،[۴۱] جب اُنھوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا کہ ہم تم سے اور تمھارے اِن معبودوں سے، جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، بالکل بری ہیں۔ ہم تمھارے منکر ہیں[۴۲] اور ہمارے اور تمھارے درمیان اب ہمیشہ کے لیے عداوت اور بے زاری ظاہر ہوگئی ہے، یہاں تک کہ تم اللہ واحد پر ایمان لے آؤ[۴۳] ـــــ اتنی بات کے سوا جو ابراہیم نے اپنے

ظرف بن گیا ہے۔

۴۱؎ اصل الفاظ ہیں: 'قَدۡ كَانَتۡ لَكُمۡ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ فِيۡۤ اِبۡرٰهِيۡمَ'۔ یہ اسلوب بتاتا ہے کہ جو بات سنائی جارہی ہے، وہ پہلے سے لوگوں کے سامنے ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اہل عرب کو اِس بات پر ناز تھا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ اُنھیں اُن کی ہجرت اور قربانی کی روایات کا بھی علم تھا۔ اگرچہ امتدادِ زمانہ سے اُن پر گردوغبار کی تہیں بھی جم گئی تھیں اور بدعات نے اُن کے بعض پہلوؤں کو مسخ بھی کر دیا تھا۔ تاہم یہ بات نہیں تھی کہ وہ اُن سے بالکل ہی ناآشنا ہوں۔" (تدبرقرآن ۸/۳۲۸)

اِس کے بعد 'وَالَّذِيۡنَ مَعَهٗ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضرت ابراہیم نے ہجرت فرمائی تو اُن کے ساتھ وہ لوگ بھی تھے جو اُن کی قوم میں سے اُن پر ایمان لے آئے تھے۔

۴۲؎ یعنی جو کچھ تم مانتے ہو، اُس کے منکر ہیں۔

۴۳؎ اتمام حجت کے بعد یہ اعلان براءت ہر پیغمبر نے اپنی قوم سے کیا ہے۔ اِس کے بعد دعوت و تذکیر کا تعلق اصلاً ختم ہو جاتا ہے اور رسول کے منکرین کو صاف بتا دیا جاتا ہے کہ اُن کے اور رسول

اللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ ط رَبَّنَا عَلَیْکَ تَوَکَّلْنَا وَ اِلَیْکَ اَنَبْنَا وَ اِلَیْکَ الْمَصِیْرُ ﴿۴﴾

باپ سے کہی تھی کہ میں آپ کے لیے مغفرت کی دعا ضرور کروں گا[۴۴]، اگرچہ اللہ کی طرف سے میں آپ کے لیے کسی چیز پر زور نہیں رکھتا[۴۵] ـــــــ (پھر اُس نے اور اُس کے ساتھیوں نے دعا کی تھی کہ) پروردگار، ہم نے تجھ پر بھروسا کیا ہے اور تیری طرف

کے ساتھیوں کے درمیان موالات اور محبت کا کوئی تعلق اب قائم نہیں رہ سکتا۔ وہ خدا اور خدا کے دین کے دشمن ہیں تو اِدھر سے بھی اُن کے لیے عداوت اور بے زاری کا اعلان ہے، یہاں تک کہ شرک سے توبہ کر کے وہ توحید کی دعوت قبول کر لیں۔

۴۴ یہ اعلان براءت سے استثنا ہے۔ یعنی اِس کھلم کھلا اعلان براءت میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اُن کے ساتھ اگر کوئی رعایت برتی تو صرف یہ کہ اپنے باپ سے مغفرت کی دعا کا وعدہ کر لیا۔ اِس رعایت کی وجہ کیا تھی؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”اِس رعایت کی وجہ، جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات میں تصریح ہے، یہ تھی کہ وہ نہایت دردمند اور بردبار تھے، اُنھوں نے خیال فرمایا کہ اگر وہ اپنے باپ کے لیے مغفرت کی دعا کرتے ہیں تو یہ چیز اُس اعلان براءت کے منافی نہیں ہو گی جو وہ اپنی پوری قوم سے کر رہے ہیں، بلکہ یہ اُس بر واحسان کا مقتضیٰ ہے جو ہر بیٹے پر اُس کے والدین کا ایک واجبی حق ہے۔ اُس وقت تک اُن کو یہ اندازہ بھی پورا پورا نہیں تھا کہ دین کے ساتھ باپ کی دشمنی کس درجے کی ہے۔ اُنھوں نے خیال فرمایا کہ باپ کا سارا غصہ اِس وجہ سے ہے کہ وہ اپنے زعم کے مطابق اپنے بیٹے کو ایک گم راہی سے بچانا چاہتا ہے، لیکن جب اُن پر یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی کہ اُن کا باپ اللہ کے دین کا کٹر دشمن ہے تو اُنھوں نے اُس سے کلیتاً اعلان براءت کر دیا۔“ (تدبرقرآن ۸/۳۲۹)

۴۵ یعنی میرے پاس بھی اِس سے زیادہ کوئی اختیار نہیں ہے کہ آپ کے لیے مغفرت کی دعا کروں۔ اِسے قبول کرنا یا نہ کرنا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ میں اُس میں کوئی مداخلت نہیں کر سکتا۔

رَبَّنَا لَا تَجۡعَلۡنَا فِتۡنَةً لِّلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَاغۡفِرۡ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۵﴾

لَقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِيۡهِمۡ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنۡ كَانَ يَرۡجُوا اللّٰهَ وَالۡيَوۡمَ الۡاٰخِرَ ؕ وَمَنۡ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡغَنِىُّ الۡحَمِيۡدُ ﴿۶﴾

رجوع ہوئے ہیں اور ہم کو تیرے ہی حضور میں پلٹ کر آنا ہے۔ پروردگار، ہمیں اِن منکروں کے لیے تختۂ مشق نہ بننے دے[۴۶] اور ہم سے درگذر فرما، اے ہمارے پروردگار۔ بے شک، تو ہی زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے[۴۷]۔ ۴-۵

اِن لوگوں میں یقیناً تمھارے لیے بہترین نمونہ ہے، (تم میں سے) ہر اُس شخص کے لیے جو خدا اور آخرت کی امید رکھتا ہے[۴۸]۔ (اِس نمونے کی پیروی کرو) اور (یاد رکھو کہ) جو اعراض کریں گے، اللہ کو اُن کی کچھ پروا نہیں، اِس لیے کہ اللہ بے نیاز ہے، وہ اپنی ذات میں ستودہ صفات ہے۔ ۶

۴۶؎ اصل میں 'لَا تَجۡعَلۡنَا فِتۡنَةً' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'فِتۡنَة' ہدف فتنہ کے معنی میں ہے اور اِس سے مراد وہ اذیتیں ہیں جو منکرین حق مسلمانوں کو پہنچا سکتے تھے۔

۴۷؎ اِس طرح کی دعا ہجرت و براءت کے موقع پر ہر پیغمبر نے کی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...یہ دعا اِس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ بندے کا نیک سے نیک ارادہ بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق ہی سے انجام پاتا ہے، اِس وجہ سے ہر قدم اُسی کی مدد کے بھروسے پر اٹھانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی آزمایشوں میں وہی سرخ رو ہوتے ہیں جن کے دل ہر وقت اُس کی طرف جھکے رہتے ہیں اور جن کے اندر یہ یقین راسخ ہوتا ہے کہ بالآخر اُن کو ایک دن اپنے رب ہی کی طرف پلٹنا ہے۔"
(تدبر قرآن ۸/۳۳۰)

۴۸؎ یہ 'قَدۡ كَانَتۡ لَكُمۡ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ' سے بدل ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

الممتحنة
۶۰

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ؕ وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۷﴾

(تم ایمان پر قائم رہے تو) بعید نہیں کہ اللہ تمھارے اور اِن منکروں میں سے اُن لوگوں کے درمیان دوستی پیدا کر دے (اور اُنھیں بھی ایمان کی توفیق دے)، جن سے (آج) تم نے عداوت مول لی ہے[۴۹]۔ اللہ بڑی قدرت والا ہے، اور اللہ غفور و رحیم ہے[۵۰]۔ ۷

''... مطلب یہ ہے کہ تمھارے لیے ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے ساتھیوں کے اِس اعلان براءت و عداوت میں نمونہ تو بے شک، نہایت بہترین ہے، لیکن اُن کے اِس اسوہ کی پیروی کرنا ہر بوالہوس کا کام نہیں ہے۔ اِس کا حوصلہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اللہ کی نصرت کی امید بھی رکھتے ہوں اور آخرت کے ظہور کے بھی متوقع ہوں۔ جن کے اندر یہ دونوں باتیں راسخ نہ ہوں، وہ یہ بازی نہیں کھیل سکتے۔'' (تدبر قرآن ۸/ ۳۳۰)

۴۹؎ یہ اِس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ایمان پر استقامت بسا اوقات خود ایک ذریعۂ دعوت بن جاتی ہے۔ لوگ جب دیکھتے ہیں کہ کوئی شخص محض دین کی خاطر اپنے بھائی بہن، اعزہ و اقربا، دوست احباب، بلکہ اپنے اہل و عیال کو بھی چھوڑنے کے لیے تیار ہو گیا ہے تو سوچنے لگتے ہیں کہ اِس دعوت میں کیا چیز ہے جو اِس درجہ استقامت کا باعث بن گئی ہے۔ چنانچہ بات کو سننے اور اُس پر غور کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں، اور یہی چیز اُن کی دشمنی کو دوستی میں بدل دیتی ہے۔

۵۰؎ یعنی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، اِس لیے چاہے تو جانی دشمنوں کو جگری دوست بنا دے۔ اِس کے ساتھ غفور و رحیم بھی ہے، لہٰذا ہر وقت منتظر رہتا ہے کہ لوگ آگے بڑھیں تو اُنھیں اپنی مغفرت کے دامن میں سمیٹ لے، اُن کی کم زوریوں کو معاف کرے اور آگے اُن کے لیے توفیق خیر کی راہیں کھول دے۔

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ

اللہ تمھیں اِس بات سے نہیں روکتا کہ تم اُن لوگوں کے ساتھ بھلائی[۵۱] اور انصاف کا برتاؤ کرو جنھوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی اور تمھیں تمھارے گھروں سے نہیں نکالا ہے[۵۲]۔ بے شک، اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے[۵۳]۔ ۸

اللہ جس بات سے تم کو روکتا ہے، وہ یہ ہے کہ تم اُن لوگوں سے دوستی کرو[۵۴] جنھوں

المـمتحنة ٦٠

۵۱۔ اصل میں لفظ 'اَلْبِرّ' آیا ہے۔ عربی زبان میں یہ صلۂ رحم، عدل و احسان اور ادائے حقوق کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

۵۲۔ یعنی اگر کسی دنیوی معاملے میں تمھارا اُن سے کوئی خاندانی، قبائلی یا قومی جھگڑا ہے تو وہ الگ بات ہے۔ دین و اخلاق کے عام اصولوں کی روشنی میں تم اُس کے بارے میں جو فیصلہ چاہے، کر سکتے ہو، لیکن دین کا جھگڑا نہیں ہے تو اللہ کسی بات سے نہیں روکتا۔

۵۳۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ بھلائی کرنے والوں کو بھی پسند کرتا ہے، لیکن اِس کے محرکات چونکہ انسانی فطرت میں ہیں، لہٰذا انسان محتاج کی مدد کرنے، کم زور کو سہارا دینے اور اعزہ و اقربا سے صلۂ رحمی کے لیے آسانی کے ساتھ آمادہ ہو جاتا ہے۔ انصاف کا معاملہ، البتہ مشکل ہے۔ اپنے دشمنوں کے ساتھ انصاف کرنا کوئی آسان بازی نہیں ہے، اِس لیے بطور خاص فرمایا ہے کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

۵۴۔ آیت میں جو حصر ہے، اُس کا سارا زور اِسی لفظ پر ہے۔ یعنی ممنوع صرف دوستی ہے جو ذاتی مفادات اور خاندانی، قبائلی اور قومی تعصبات کو دین و ملت پر ترجیح دینے کا باعث بن جاتی

دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝٩

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ۭ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ۭ

نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ کی ہے اور تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا ہے اور تمھارے نکالنے میں دوسروں کی مدد کی ہے۔ (وہ اِس سے روکتا ہے اور تمھیں متنبہ کرتا ہے کہ) جو اِس طرح کے لوگوں سے دوستی کریں گے، وہی ظالم ہیں[55]۔ ۹

ایمان والو، (اِسی رویے کا تقاضا ہے[56] کہ) مسلمان عورتیں جب ہجرت کر کے تمھارے پاس آئیں تو اُن کی تحقیق کرو[57] ـــــ اللہ تو اُن کے ایمان سے اچھی طرح واقف ہی ہے[58]

ہے۔ نیکی اور انصاف ممنوع نہیں ہے۔ اِس کا اہتمام تو ہر حالت میں ہو گا۔ اِس میں دوست، دشمن اور کافر و مومن کے امتیاز کا کوئی سوال نہیں ہے۔ بر و تقویٰ اور قیام بالقسط ایمان کا تقاضا ہے۔ اِسے کوئی بندۂ مومن کسی حال میں بھی پس پشت نہیں ڈال سکتا۔

۵۵؎ لفظ 'اَلظّٰلِمُوْنَ' یہاں 'اَلظّٰلِمُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ' کے معنی میں ہے۔ یعنی وہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہوں گے۔

۵۶؎ یعنی جس رویے کی تلقین اوپر کی گئی ہے، اُس کا تقاضا ہے۔

۵۷؎ یعنی اِس بات کی تحقیق کرو کہ وہ اسلام قبول کر کے اور اسلام ہی کے لیے آئی ہیں یا کوئی اور دنیوی غرض، مثلاً شوہر سے بے زاری یا کسی سے محبت یا محض جگہ کی تبدیلی کا شوق اِس اقدام کا باعث بن گیا ہے۔

۵۸؎ مطلب یہ ہے کہ اللہ کو کوئی دھوکا نہیں دے سکتا اور اُسے کسی تحقیق کی ضرورت بھی نہیں

لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ؕ وَاٰتُوْهُمْ مَّاۤ اَنْفَقُوْا ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ؕ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ

___ (لیکن تم تحقیق کرو)، پھر اگر معلوم ہو جائے کہ وہ مومنہ ہیں تو اُنھیں اِن کافروں کی طرف واپس نہ کرو۔[59] نہ یہ اُن کے لیے جائز ہیں اور نہ یہ کافر اِن عورتوں کے لیے جائز ہیں۔[60] اِن پر جو کچھ وہ خرچ کر چکے ہیں، وہ اُنھیں ادا کر دو اور تم پر کوئی گناہ نہیں کہ اِن سے نکاح کر لو،[61] بشرطیکہ اِن کے مہر اِنھیں ادا کرو۔[62] اور کافر عورتوں کے ناموس تم خود بھی

الممتحنة
۶۰

ہے۔ یہ اگر جھوٹ بولیں گی تو اللہ کی گرفت سے بچ نہیں سکیں گی، لیکن تمھارے لیے یہی کافی ہے کہ قسم اور دوسرے قرائن و حالات سے جو تحقیق کر سکتے ہو، کر لو۔ اِس کے بعد تم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

۵۹ یعنی اگر تحقیق سے معلوم ہو جائے کہ ایمان و اسلام نہیں، بلکہ کوئی دنیوی غرض اُن کے آنے کا محرک ہوئی ہے تو اُنھیں واپس کر دیا جائے۔ تزکیہ و تطہیر کے اِس مرحلے میں صرف سچے اہل ایمان ہی مدینے کے معاشرے میں قبول کیے جا سکتے ہیں، منکرین کے لیے یہاں کوئی گنجایش نہیں ہے۔

۶۰ یہ اُسی حکم کی فرع ہے جو اوپر بیان ہوا ہے کہ دین کے دشمنوں سے دوستی کا کوئی تعلق باقی نہیں رہنا چاہیے۔ میاں بیوی کا رشتہ اِسی تعلق سے وجود میں آتا اور اِسی بنا پر قائم رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب اِن کافروں سے دوستی کے تمام رشتے منقطع کرنے کی ہدایت فرمائی تو اِس کے لازمی نتیجے کے طور پر اُن عورتوں کے نکاح بھی ختم کر دیے جو اپنے ایمان کی حفاظت کے لیے ہجرت کر کے مدینہ آ گئی تھیں۔ اِس سے واضح ہے کہ یہ حکم اُنھی کافروں سے متعلق ہے جو معاندین ہوں اور دین کے دشمن بن کر اُس کی مخالفت پر اتر آئیں۔

۶۱ یہ مزید وضاحت ہے کہ جو عورتیں مسلمان ہو کر مدینہ آ جائیں، اُن کے نکاح اُن کے سابق

وَسۡـَٔلُوۡا مَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ وَلۡيَسۡـَٔلُوۡا مَاۤ اَنۡفَقُوۡا ؕ ذٰلِكُمۡ حُكۡمُ اللّٰهِ ؕ يَحۡكُمُ بَيۡنَكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ﴿۱۰﴾

اپنے قبضے میں نہ رکھو اور جو مہر تم نے اُنھیں دیے تھے، واپس مانگ لو اور جو اُنھوں نے دیے تھے، وہ بھی واپس مانگ لیں۔[۶۳] یہ اللہ کا فیصلہ ہے جو وہ تمھارے درمیان کر رہا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔[۶۴] ۱۰

شوہروں کے ساتھ آپ سے آپ ختم ہو جائیں گے۔ اُنھیں کسی طلاق کی یا اولیا سے اجازت کی ضرورت نہ ہو گی۔ لہٰذا وہ اگر چاہیں تو اُن کے مہر واپس کر کے بغیر کسی تردد کے تم اُن کے ساتھ نکاح کر سکتے ہو۔

۶۲؎ یعنی جو مہر اُن کے سابق شوہروں نے دیا تھا، وہ بھی واپس کیا جائے گا اور نکاح کرنے والا عورت کو بھی اُس کے نکاح کا مہر ادا کرے گا۔

۶۳؎ یعنی جو عورتیں تمھارے نکاح میں تھیں، لیکن مکہ ہی میں رہ گئیں اور ابھی تک مسلمان نہیں ہوئیں، اُن کے نکاح بھی تمھارے ساتھ کالعدم ہیں۔ اُن کے عصمتوں کے مالک نہ بنے رہو، بلکہ اُنھیں اپنے نکاح کی قید سے آزاد کر دو۔ رہا اُن کے مہروں کا معاملہ تو اُن کا مبادلہ کر سکتے ہو۔ یہی انصاف کا تقاضا ہے۔ اِس سے مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور کسی کا کوئی نقصان بھی نہ ہو گا۔

۶۴؎ یہ پورا حکم اُس قضیے کا فیصلہ بھی ہے جو معاہدۂ حدیبیہ کی ایک دفعہ کے بارے میں پیدا ہو گیا تھا۔ اِس دفعہ کا مضمون یہ تھا کہ قریش میں سے کوئی شخص مسلمانوں سے جا ملے گا تو اگرچہ وہ اسلام لا چکا ہو، لیکن مسلمان اُس کو واپس کرنے کے پابند ہوں گے۔ اِس کے برخلاف کوئی مسلمان اگر قریش سے آ ملے گا تو وہ اُس کو واپس کرنے کے پابند نہ ہوں گے۔*

مسلمانوں نے مردوں کی حد تک تو اِس دفعہ کو قبول کر لیا، مگر عورتوں کے معاملے میں اِسے صریح

---

* بخاری، رقم ۲۵۸۱۔

وَاِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿١١﴾

اور اگر (وہ راضی نہ ہوں اور) تمھاری بیویوں کے مہر میں سے تمھارا کچھ کافروں کی طرف رہ جائے، پھر تمھاری باری آئے تو جن کی بیویاں جاتی رہی ہیں، اُن کو اتنا دے دو، جتنا اُنھوں نے خرچ کیا ہے اور (اِن دشمنوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں بھی) اللہ سے ڈرتے رہو، جس پر ایمان لائے ہو[65]۔ ۱۱

المتحنة
۶۰

تسلیم نہیں کیا اور صاف کہہ دیا کہ شرط مردوں کے بارے میں تھی نہ کہ عورتوں کے بارے میں*۔ اِس چیز نے قریش اور مسلمانوں کے درمیان ایک قضیے کی صورت اختیار کر لی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ صادر فرمایا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ فیصلہ نہایت ہی منصفانہ ہے۔ اگر قرآن کا فیصلہ یہ بھی ہوتا کہ از روے معاہدہ کسی عورت کی بھی واپسی کے مسلمان پابند نہیں ہیں تو یہ بھی بے جا نہ ہوتا، لیکن یہ محض الفاظ سے فائدہ اٹھانے والی بات ہوتی۔ قرآن نے صرف الفاظ سے فائدہ نہیں اٹھایا، بلکہ ایک ایسا فیصلہ کیا جس کی ایک نہایت محکم عقلی و اخلاقی بنیاد ہے۔ یعنی اُن عورتوں کو تو واپس کر دینے کی ہدایت فرمائی جن کی ہجرت اللہ و رسول کے لیے نہیں، بلکہ کسی حقیر دنیوی مقصد کے لیے ہو۔ البتہ جن کا مومنہ ہونا ثابت ہو جائے، اُن کو واپس کرنے کی اجازت نہیں دی۔ یہ ایک ایسی اصولی بات ہے جس کا کوئی عاقل انکار نہیں کر سکتا۔ انسان اپنی ایک عقلی و اخلاقی ہستی رکھتا ہے، اِس وجہ سے یہ اُس کے اوپر صریح ظلم ہے کہ اُس کو کسی ایسے معاشرے کے ساتھ بندھے رہنے پر مجبور کیا جائے جس کے اندر اُس کا یہ اخلاقی و عقلی تشخص محفوظ نہ رہ سکے۔ بالخصوص عورتیں جنس ضعیف ہونے کے سبب سے اور بھی حق دار ہیں کہ اُن کا تحفظ کیا جائے۔“ (تدبر قرآن ۸/ ۳۴۰)

* احکام القرآن، ابن العربی ۴/ ۲۲۹۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾

اِسی طرح، اے پیغمبر، جب مسلمان عورتیں بیعت کے لیے تمھارے پاس آئیں (اور عہد کریں) کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی اور چوری نہ کریں گی اور زنا نہ کریں گی اور اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی اور اپنے ہاتھ اور پاؤں کے درمیان کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی[۶۶] اور بھلائی کے کسی معاملے میں[۶۷] تمھاری نافرمانی نہ کریں گی تو اُن سے بیعت لے لو[۶۸] اور اُن کے لیے اللہ سے مغفرت کی دعا کرو۔[۶۹] بے شک، اللہ غفور و رحیم ہے۔ ۱۲

۶۵؎ یعنی کفار اِس مبادلے پر راضی نہ ہوں تو مبنی بر انصاف طریقہ یہ ہوگا کہ عورت کا مہر اُنھیں ادا کرنے کے بجاے اپنے کسی بھائی کو ادا کر دیا جائے جس کی بیوی اُدھر رہ گئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...یہ گویا بدلہ لینے کی ایک منصفانہ اور مبنی بر عدل کارروائی ہوئی جس کی اجازت اِس لیے دی گئی کہ ایک فریق نے ناانصافی کی راہ اختیار کی۔'' (تدبر قرآن ۸/ ۳۴۲)

۶۶؎ یہ جنسی اعضا کی طرف اشارے کے لیے ایک شایستہ اسلوب ہے، اِس لیے کہ یہ اعضا ہاتھ اور پاؤں کے درمیان ہی ہوتے ہیں۔ اِس اسلوب کا فائدہ یہ ہے کہ پردہ پوشی کے ساتھ تمام اعضا کا احاطہ بھی ہو گیا ہے اور وہ سب تہمتیں بھی اِس کے ذیل میں آ گئی ہیں جو جنسی نوعیت کی ہو سکتی ہیں، مثلاً زنا، تقبیل اور ملامست وغیرہ۔

۶۷؎ اصل میں لفظ 'مَعْرُوْف' آیا ہے۔ یعنی بھلائی کے وہ کام جن سے ہر سلیم الفطرت انسان واقف ہے۔ بیعت کے الفاظ میں اِن کا ذکر بالاجمال اور منکرات کا ذکر تفصیل کے ساتھ اِس لیے ہوا ہے کہ عورتوں کے جو ہجوم بیعت کے لیے آ رہے تھے، اُن میں سے زیادہ تر اُن طبقات سے

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ ﴿١٣﴾

ایمان والو، اِسی طرح اُن لوگوں سے بھی دوستی نہ کرو جن پر اللہ کا غضب ہوا ہے[70]۔ وہ بھی آخرت سے اُسی طرح مایوس ہو چکے ہیں[71]، جس طرح یہ منکرین اُن لوگوں کے جی اٹھنے سے مایوس ہیں جو قبروں میں پڑے ہیں۔ ۱۳

تعلق رکھنے والی تھیں جن میں یہ منکرات زمانۂ جاہلیت میں پائے جاتے تھے۔

۶۸؎ مطلب یہ ہے کہ جانچ پڑتال کے بعد بھی اُن کو اسلام میں اُس وقت داخل کرو، جب وہ اِن باتوں کا عہد کریں۔ عورتوں سے یہ عہد لینے کے مختلف طریقے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمائے، لیکن اتنی بات مسلم ہے کہ اُن کا ہاتھ ہاتھ میں لے کر کبھی بیعت نہیں لی*۔

۶۹؎ یعنی اِس بات کی دعا کہ اسلام لانے سے پہلے جو غلطیاں اُن سے صادر ہوئی ہیں، اللہ تعالیٰ اُن سے درگذر فرمائے۔

۷۰؎ یعنی یہود کے ساتھ۔ یہ تعبیر قرآن میں اُنھی کے لیے اختیار کی گئی ہے۔

۷۱؎ یعنی زبان سے آخرت کا اقرار کرنے کے باوجود اپنی حرکتوں کی وجہ سے اُس کے متوقع نہیں رہے۔ اِن میں اور قریش کے منکرین میں کوئی فرق نہیں ہے، آخرت کے معاملے میں دونوں ایک ہی سطح پر ہیں، اِس لیے دونوں سے برتاؤ بھی ایک جیسا ہونا چاہیے۔

لاہور

۱۰/ اکتوبر ۲۰۰۹ء

---

* بخاری، رقم ۴۶۰۹،۲۵۶۴۔

الصف - الجمعة

٦١ ـــــ ٦٢

الصف - الجمعة

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ میں رسول پر ایمان کے بعد اُس کی نصرت کے لیے جہاد سے گریز کرنے والوں اور دوسری میں اُس کی قدرشناسی اور اتباع و اطاعت میں کوتاہی کرنے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے۔ دونوں میں خطاب ایمان کا دعویٰ رکھنے والوں سے ہے اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ مدینۂ طیبہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ تزکیہ و تطہیر میں نازل ہوئی ہیں۔

پہلی سورہ ـــــ الصف ـــــ کا موضوع کم زور مسلمانوں کو اِس بات پر متنبہ کرنا ہے کہ رسول پر ایمان کے بعد اُس کی نصرت کے لیے جہاد سے گریز کرو گے تو تمھارا حال بھی وہی ہو گا جو یہود کا ہوا ہے۔ اِس معاملے میں صحیح رویہ یہود کا نہیں، سیدنا مسیح کے حواریوں کا تھا، اِس لیے پیروی کرنی ہے تو اُن کی کرو، یہ تو ہمیشہ کے لیے خدا کی ہدایت سے محروم ہو چکے ہیں۔

دوسری سورہ ـــــ الجمعة ـــــ کا موضوع اِنھی مسلمانوں کو توجہ دلانا ہے کہ رسول کی حیثیت اُن کے لیے ایک نعمت عظمیٰ کی ہے۔ وہ اُس کی قدر پہچانیں اور یہود کے حاسدانہ پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر اپنے آپ کو اِس نعمت سے محروم نہ کر بیٹھیں۔ رسول کی موعظت اور اُس کی لائی ہوئی شریعت کا احترام اُنھیں دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہونا چاہیے۔ وہ متنبہ رہیں کہ اِس میں کوتاہی ہوئی تو اُن کا انجام بھی وہی ہو گا جو اِس سے پہلے یہود کا ہو چکا ہے۔

سورة الصف

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الۡاَرۡضِ ۚ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۱﴾
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لِمَ تَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴿۲﴾ كَبُرَ مَقۡتًا عِنۡدَ اللّٰهِ

— ۱ —

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

زمین اور آسمانوں کی ہر چیز نے اللہ کی تسبیح کی ہے اور وہ زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے[۱]۔ ۱

ایمان والو، تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں[۲]؟ اللہ کے نزدیک بہت ناراضی

۱۔ یہ تمہید کا جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی راہ میں جہاد کے لیے خدا تمھارا محتاج نہیں ہے۔ زمین و آسمان کی ہر چیز اُس کی تسبیح میں سرگرم ہے۔ اُس نے تم سے جہاد کا تقاضا کیا ہے تو اِس میں تمھارا ہی بھلا ہے۔ کیا تم اُس پر بھروسا نہیں رکھتے کہ اُس کی راہ میں جہاد سے جی چراتے ہو؟ اگر یہی بات ہے تو تم سے بڑھ کر بدقسمت کون ہوگا جو ایسی زبردست اور صاحب حکمت ہستی پر بھروسا نہ کرے۔

آیت کی ابتدا میں فعل 'سَبَّحَ' ماضی کے صیغے میں ہے۔ بیان واقعہ اور بیان حقیقت کے لیے یہ اسلوب قرآن مجید میں کئی جگہوں پر اختیار کیا گیا ہے۔

۲۔ اِس سے واضح ہے کہ مخاطب وہی منافقین ہیں جو اسلام کے لیے سرفروشی اور جاں بازی کے لمبے چوڑے دعوے کرتے تھے، مگر جب آزمایش کا وقت آتا تو بالکل بزدل ثابت ہوتے اور راہ فرار اختیار کر لیتے تھے۔

اَنۡ تَقُوۡلُوۡا مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴿۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِهٖ صَفًّا کَاَنَّهُمۡ بُنۡیَانٌ مَّرۡصُوۡصٌ ﴿۴﴾

وَ اِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِهٖ یٰقَوۡمِ لِمَ تُؤۡذُوۡنَنِیۡ وَ قَدۡ تَّعۡلَمُوۡنَ اَنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَیۡکُمۡ ؕ فَلَمَّا زَاغُوۡۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوۡبَهُمۡ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۵﴾

کی بات ہے کہ تم وہ بات کہو جو کرتے نہیں ہو۔[۳] اللہ تو اُنھی لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اُس کی راہ میں صف بستہ ہو کر اِس طرح لڑتے ہیں، گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔ ۲-۴

(یہود کا رویہ بھی یہی تھا)۔ یاد کرو، جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: میری قوم کے لوگو، (بار بار کی نافرمانیوں سے) تم مجھے کیوں اذیت دیتے ہو،[۴] دراں حالیکہ تم خوب جانتے ہو کہ میں تمھارے پاس خدا کا رسول ہو کر آیا ہوں؟ لیکن (اِس تنبیہ کے باوجود) جب اُنھوں نے ٹیڑھ اختیار کی تو اللہ نے اُن کے دل ٹیڑھے کر دیے۔ اللہ ایسے نافرمان لوگوں کو کبھی راہ یاب نہیں کرتا۔[۵] ۵

۳؎ یعنی قول و فعل میں تضادیوں تو ہر حال میں ایک ناپسندیدہ چیز ہے، لیکن اِس کی سنگینی اُس وقت بہت بڑھ جاتی ہے، جب خدا سے کوئی وعدہ کر کے اور اُس کے ایفا کے بڑے بڑے دعووں کے بعد اُس کی خلاف ورزی کی جائے۔ چنانچہ تمھارا یہ رویہ خدا کی ناراضی میں بہت زیادہ اضافے کا باعث بن گیا ہے۔

۴؎ اِس کی تفصیلات بائیبل میں بھی ہیں اور قرآن میں بھی۔ اِن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کسی موقع پر بھی خوش دلی کے ساتھ پیغمبر کی اطاعت اور اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے بار بار نہایت دل سوزی کے ساتھ اِس رویے پر اپنے غم و غصہ کا اظہار فرمایا،

وَاِذۡ قَالَ عِيۡسَى ابۡنُ مَرۡيَمَ يٰبَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اِنِّىۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَيۡكُمۡ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَىَّ مِنَ التَّوۡرٰٮةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوۡلٍ يَّاۡتِىۡ مِنۡۢ بَعۡدِى اسۡمُهٗۤ اَحۡمَدُ‌ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ قَالُوۡا هٰذَا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ ﴿۶﴾

(اُن کی یہ ٹیڑھ اِسی طرح قائم رہی)۔ یاد کرو، جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا: اے بنی اسرائیل، میں تمھاری طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں، تورات کی اُن پیشین گوئیوں کا مصداق ہوں جو مجھ سے پہلے موجود ہیں[۶]، اور ایک رسول کی بشارت دینے والا ہوں، جو میرے بعد آئے گا، جس کا نام احمد ہوگا[۷]۔ مگر اُن کے پاس جب وہ کھلی کھلی نشانیاں لے کر آ گیا تو اُنھوں نے کہا: یہ تو کھلا ہوا جادو ہے[۸]۔ ۶

لیکن اِس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، بلکہ اِن کے دلوں کی سختی اور بڑھ گئی۔

۵ یہ وہ سزا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق اُن کو دی۔ قرآن نے بتایا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے اعراض کا فیصلہ کر لے اور جانتے بوجھتے حق سے انحراف کرے تو یہ ظلم اور فسق ہے اور خدا کسی ظالم اور فاسق کو ہدایت نہیں دیتا، بلکہ اُسے گم راہی کے اندھیروں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے، یہاں تک کہ کج روی سے اُس کا دل اور اُس کی فکر بھی کج ہو جاتی ہے اور وہ ہمیشہ کے لیے خدا کی ہدایت سے محروم ہو جاتا ہے۔

۶ تورات کی یہی پیشین گوئیاں تھیں جن کی یاد دہانی سیدنا مسیح کی بعثت سے پہلے حضرت یحییٰ نے کرائی اور بنی اسرائیل کے شہروں میں اُن کی منادی اِس شان کے ساتھ کی کہ در و دیوار گونج اٹھے۔

۷ یعنی تورات کو اپنی نبوت و رسالت کی دلیل کے طور پر پیش کرنے کے بعد اُنھوں نے اپنے بعد آنے والے رسول کی بشارت دی۔ یہ بشارت اگرچہ اکثر انبیا نے دی ہے، لیکن آں جناب کی بشارت بعض پہلوؤں سے بالکل مختلف ہے:

ایک یہ کہ اِس بشارت کو اُنھوں نے اپنی بعثت کا خاص مقصد بتایا ہے، یہ اُن کا کوئی ضمنی کام نہیں تھا۔ چنانچہ اُن پر جو صحیفہ نازل ہوا، اُس کا نام ہی انجیل ہے جس کے معنی یونانی میں بشارت کے ہیں۔ اِس نام سے موسوم ہونے کی کوئی وجہ اگر سمجھ میں آتی ہے تو وہ یہی ہے کہ اُن کا امتیازی وصف اور خاص مشن یہی تھا کہ اپنے بعد آنے والے آخری رسول کی بشارت دیں۔ آسمانی بادشاہت سے وہ اِسی رسول کے عہد مبارک کو تعبیر کرتے اور اپنی تمثیلات میں اُس کے ظہور اور ارتقا کی پوری تصویر کھینچ دیتے ہیں۔

دوسرا یہ کہ 'یَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی' کے الفاظ سے اُنھوں نے اِس رسول کے ظہور کا زمانہ بھی پوری قطعیت کے ساتھ متعین کر دیا ہے۔ چنانچہ کوئی انصاف پسند شخص اِس بات کا انکار نہیں کر سکتا کہ سیدنا مسیح علیہ السلام کے بعد تنہا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی شخصیت ہے جس پر وہ تمام صفات اور تمثیلات پوری طرح منطبق ہوتی ہیں جو آں جناب نے بیان فرمائی ہیں۔

تیسرا یہ کہ اُنھوں نے یہ بشارت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کی صراحت کے ساتھ دی ہے۔ اِس کے شواہد انجیلوں میں جگہ جگہ دیکھ لیے جا سکتے ہیں۔ سیدنا مسیح فرماتے ہیں:

''اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمھیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمھارے ساتھ رہے، یعنی روح حق۔'' (یوحنا ۱۴: ۱۶-۱۷)

''...لیکن مددگار، یعنی روح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا، وہی تمھیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے، وہ سب تمھیں یاد دلائے گا۔'' (یوحنا ۱۴: ۲۶)

''اِس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا، کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اُس کا کچھ نہیں۔'' (یوحنا ۱۴: ۳۰)

''...لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمھارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا، یعنی روح حق جو باپ سے صادر ہوتا ہے، تو وہ میری گواہی دے گا۔'' (یوحنا ۱۵: ۲۶)

''...لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمھارے لیے فائدہ مند ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمھارے پاس نہ آئے گا۔'' (یوحنا ۱۶: ۷)

وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ الۡکَذِبَ وَھُوَ یُدۡعٰۤی اِلَی

(یہی ٹیڑھ اب بھی قائم ہے۔ ذرا بتاؤ کہ) اُس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹے بہتان باندھے،[9] دراں حالیکہ اُسے اسلام کی طرف بلایا جا رہا ہو۔

"مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہیں، مگر اب تم اُن کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ، یعنی روح حق آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا، اِس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا، لیکن جو کچھ سنے گا، وہی کہے گا اور تمھیں آیندہ کی خبریں دے گا۔" (یوحنا ۱۶: ۱۲-۱۳)

اِن حوالوں سے واضح ہے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت ایسی واضح صفات کے ساتھ دی ہے جو آپ کے سوا کسی اور پر منطبق نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً:

"وہ تمھیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمھارے ساتھ رہے۔"

"وہی تمھیں سب باتیں سکھائے گا۔"

"دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اُس کا کچھ نہیں۔"

اِن ارشادات میں لفظ 'مددگار'، ظاہر ہے کہ آرامی یا سریانی کے کسی لفظ کا ترجمہ ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ یہ اصل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام احمد کے ہم معنی کوئی لفظ تھا جسے انجیل کے مترجمین نے کچھ سے کچھ بنا دیا ہے اور پیش و عقب میں ایسے بے جوڑ فقرے اور الفاظ داخل کر دیے ہیں کہ اِس کا مطلب خبط ہو کر رہ جائے۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو نام آپ کی والدۂ محترمہ نے رکھا، وہ یہی احمد تھا۔ محمد آپ کا لقب ہے جو آپ کے دادا عبدالمطلب نے آپ کو دیا۔ چنانچہ آپ کا پورا نام ابوالقاسم محمد احمد ہے۔ عربوں کی روایت ہے کہ کسی شخصیت کا ذکر کرنا ہو تو اُس کی کنیت یا لقب سے کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے تذکروں میں، خواہ وہ قرآن و حدیث میں ہوں یا تاریخ میں، آپ کا یہ نام بہت کم استعمال ہوا ہے۔

۸۔ انجیل میں تصریح ہے کہ سیدنا مسیح نے جو غیر معمولی معجزات دکھائے، یہود نے اُنھیں یہی کہا

الْاِسْلَامِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِــــُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝

حقیقت یہ ہے کہ اِس طرح کے ظالم لوگوں کو اللہ ہدایت نہیں دیتا[۱۰]۔ خدا کے اِس نور کو وہ اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھا دینا چاہتے ہیں، اور اللہ کا فیصلہ ہے کہ وہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا، خواہ اِن منکروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ (اِس سرزمین کے) تمام ادیان پر اُس کو غالب کر دے، خواہ یہ مشرکین بھی اِسے کتنا ہی ناپسند کریں[۱۱]۔ ۷-۹

الصف ۶۱

اور ایک بھوت، بعلز بول کی مدد کا کرشمہ قرار دیا۔

۹۔ یہ اُن خرافات کا حوالہ ہے جو یہود نے اپنی بزرگی اور برتری ثابت کرنے کے لیے بالکل جھوٹ گھڑ رکھی تھیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...مثلاً یہ کہ ہم ایک برگزیدہ اور خدا کی منظور نظر امت ہیں، ہم کسی ایسے نبی کی ہدایت کے محتاج کس طرح ہو سکتے ہیں جو امیوں کے اندر پیدا ہوا ہو؟ نبوت و رسالت کے لیے تو ہمیشہ سے اسرائیل کا گھرانا مخصوص رہا ہے، اُس سے باہر کوئی نبی کس طرح پیدا ہو سکتا ہے؟ اِسی ضمن میں یہ بات بھی اُنھوں نے گھڑ رکھی تھی کہ ہمیں تو یہ ہدایت ہے کہ ہم کسی ایسے شخص کے دعویٰ نبوت کی تصدیق ہی نہ کریں جس کی پیش کی ہوئی قربانی کو کھانے کے لیے آسمان سے آگ نہ اترے۔"

(تدبر قرآن ۸/ ۳۶۳)

۱۰۔ یہ اُسی سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اِس سے پہلے آیت ۵ میں ہوا ہے۔

۱۱۔ یہ ایک صریح پیشین گوئی ہے جو حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی اور دین حق کا غلبہ پورے جزیرہ نماے عرب پر قائم ہو گیا۔ یہود کے منکرین اور قریش کے مشرکین، دونوں کی خواہشات کے

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا هَلۡ اَدُلُّكُمۡ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنۡجِيۡكُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ اَلِيۡمٍ ﴿۱۰﴾ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَتُجَاهِدُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ بِاَمۡوَالِكُمۡ وَاَنۡفُسِكُمۡ ؕ ذٰلِكُمۡ خَيۡرٌ لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۱﴾ يَغۡفِرۡ لَكُمۡ ذُنُوۡبَكُمۡ

ایمان والو، میں تم کو وہ تجارت بتاؤں جو تمھیں دردناک عذاب سے نجات دے؟ (یہود نے جو رویہ اختیار کیا ہے، اُس کے برخلاف)، تم اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لاؤ گے، جس طرح کہ ایمان لانے کا حق ہے[۱۲]، اور اپنے جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو گے۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم سمجھو[۱۳]۔ اِس کے بدلے میں

الصف ۶۱

علی الرغم یہ غلبہ قائم ہوا اور جس روشنی کو وہ اپنے مونھوں کی پھونک سے بجھا دینا چاہتے تھے، وہ ہر لحاظ سے کامل ہوگئی۔ یہ ایک سنت الٰہی کا ظہور تھا جو رسولوں کے باب میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ اُن کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اللہ تعالیٰ اُنھیں غلبہ عطا فرماتے اور اُن کے منکرین پر اپنا عذاب نازل کر دیتے ہیں۔ اِس کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ آخرت کا تصور بھی اُسی معیار پر ثابت کر دیا جائے جس معیار پر سائنسی حقائق معمل (laboratory) کے تجربات سے ثابت کیے جاتے ہیں۔ اِس کا انقلاب کی کسی جدوجہد سے کوئی تعلق نہیں ہے، جس طرح کہ دور حاضر کے بعض مفکرین نے سمجھا ہے۔

یہاں اِس پیشین گوئی کا ذکر مخاطبین کو یہ بتانے کے لیے ہوا ہے کہ یہ اللہ کا فیصلہ ہے اور اللہ کا فیصلہ ہر حال میں نافذ ہو جائے گا، اب تمھیں دیکھنا ہے کہ تم کیا کرتے ہو۔ اِس میں شرکت کی سعادت حاصل کرتے ہو یا یہود کی طرح یہ کہہ کر بیٹھ جاتے ہو کہ جاؤ تم اور تمھارا خداوند جا کر لڑے، ہم تو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔

۱۲۔ اصل الفاظ ہیں: 'تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ'۔ سیاق و سباق سے واضح ہے کہ اِن میں فعل اپنے حقیقی اور کامل مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

وَ يُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۲﴾ وَ اُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳﴾

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ

اللہ تمھارے گناہ بخش دے گا اور تمھیں ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی اور بہترین گھر عطا فرمائے گا جو ابد کے باغوں میں ہوں گے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور ایک دوسری چیز بھی عطا فرمائے گا جو تم چاہتے ہو،[۱۴] یعنی اللہ کی مدد اور فتح جو عنقریب حاصل ہو جائے گی۔[۱۵] ایمان والوں کو اِس کی بشارت دو، (اے پیغمبر)۔ ۱۰-۱۳

ایمان والو، اللہ کے مددگار بنو، جس طرح عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں[۱۶] سے کہا تھا:

---

[۱۳] یہ وہی جہاد ہے جو رسولوں کے ساتھی اُن کے منکرین کے خلاف کرتے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...یعنی بظاہر تو یہ سودا تمھیں خسارے کا سودا معلوم ہوگا، اِس لیے کہ تمھیں نسیہ کی خاطر اپنے نقد کی قربانی کرنی پڑے گی، لیکن اصل حقیقت تک تمھاری نظر پہنچ جائے تو تم یہ دیکھو گے کہ اپنے چند خزف ریزوں اور عمر فانی کے چند مستعار لمحات کے بدلے میں تم نے دولت کونین حاصل کی ہے جس کے لیے کبھی زوال نہیں ہے۔'' (تدبر قرآن ۸/۳۶۷)

[۱۴] اوپر صرف عذاب سے نجات کا ذکر تھا۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی سب کامیابیاں عارضی ہیں۔ بندۂ مومن کا اصلی مطلوب یہی ہونا چاہیے کہ وہ اللہ کے عذاب سے محفوظ رہے۔ یہ چیز حاصل ہو گئی تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ سب کچھ حاصل ہو گیا۔

[۱۵] یعنی فتح مکہ جس کی تمنا ہجرت کے بعد ہر مسلمان کے دل میں جاگزیں تھی۔

[۱۶] عربی زبان میں یہ لفظ اہل کتاب سے آیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اِس کے معنی ہیں: سرگرم و

لِلۡحَوَارِيّٖنَ مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ قَالَ الۡحَوَارِیُّوۡنَ نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰہِ فَاٰمَنَتۡ طَّآئِفَۃٌ مِّنۡۢ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ وَ کَفَرَتۡ طَّآئِفَۃٌ ۚ فَاَیَّدۡنَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا عَلٰی عَدُوِّہِمۡ فَاَصۡبَحُوۡا ظٰہِرِیۡنَ ﴿۱۴﴾

کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار بنتا ہے[۱۷]؟ حواریوں نے جواب دیا: ہم اللہ کے مددگار ہیں[۱۸]۔ چنانچہ بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ ایمان لایا اور ایک بڑا گروہ اپنے کفر پر جما رہا[۱۹]۔ پھر ہم نے ایمان والوں کی اُن کے دشمنوں کے مقابلے میں مدد کی تو وہی غالب ہو کر رہے[۲۰]۔ ۱۴

پرجوش حامی اور خالص دوست۔

[۱۷] سورۂ آل عمران (۳) کی آیت ۵۲ میں تصریح ہے کہ مسیح علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں کو آیندہ کی جدوجہد کے لیے یہ دعوت اُس وقت دی، جب وہ یہود کے علما و فقہا کے رویے سے بالکل مایوس ہو گئے۔ اِس کے لیے جو الفاظ اصل میں آئے ہیں، اُن سے یہ بات نکلتی ہے کہ مسیح علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تو خدا کی راہ میں نکل پڑا ہوں، اب جس میں حوصلہ ہو، وہ اٹھے اور میرا ساتھ دے۔

[۱۸] یعنی ہم اُس کام میں حصہ لینے کے لیے تیار ہیں جو اللہ تعالیٰ اپنی قوت قاہرہ کے ذریعے سے کرنے کے بجاے اپنے بندوں کے ذریعے سے کرنا چاہتا ہے۔ سیدنا مسیح کے ساتھ حواریوں کے اِس مکالمے کا حوالہ مسلمانوں کی ترغیب کے لیے ہے کہ اپنے سے پہلے کے کسی گروہ کی پیروی کرنی ہے تو حواریوں کے نقش قدم پر چلو جنھوں نے یہود کی طرح پیغمبر کی اطاعت سے انحراف کے طریقے اختیار نہیں کیے، بلکہ اُس کے اعوان و انصار بن کر کھڑے ہو گئے۔

[۱۹] یعنی ایک مختصر سا گروہ ایمان لایا اور ایک بڑا گروہ اپنے کفر پر جما رہا۔ قرینہ دلیل ہے کہ اصل میں جو لفظ 'طَآئِفَۃٌ' آیا ہے، اُس کی تنکیر ایک جگہ تقلیل کے لیے، اور دوسری جگہ تکثیر کے مفہوم میں ہے۔

سورة الجمعة

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ الۡمَلِکِ الۡقُدُّوۡسِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَکِیۡمِ ۝۱ ہُوَ الَّذِیۡ بَعَثَ فِی الۡاُمِّیّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡہُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

زمین اور آسمانوں کی سب چیزیں اللہ کی تسبیح کرتی ہیں۔ (اللہ)، جو بادشاہ ہے، قدوس ہے، زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے[۲۱]۔ اُسی نے امیوں کے اندر[۲۲] ایک رسول اُنھی

۲۰؎ یہ بھی ٹھیک اُسی سنت کا ظہور تھا جس کا ذکر اوپر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں ہوا ہے۔ یہود چونکہ قیامت تک کے لیے خدا کی دینونت کا نمونہ بنائے گئے ہیں، اِس لیے عذاب استیصال کے بجائے مسیح علیہ السلام کے ماننے والوں کا غلبہ اُن پر قیامت تک کے لیے قائم کر دیا گیا ہے۔ سورۂ آل عمران (۳) کی آیت ۵۵ میں قرآن نے اِس کی صراحت فرمائی ہے۔

۲۱؎ یہ تمہید کا جملہ ہے۔ اِس میں فعل مضارع 'یُسَبِّحُ' دوام واستمرار پر دلالت کرتا اور تصویر حال کا فائدہ دے رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ بادشاہ ہے، اِس لیے جب چاہتا ہے، اپنا فرمان واجب الاذعان بندوں کے لیے نازل کر دیتا ہے؛ قدوس ہے، اِس لیے بندوں کے خیر وشر سے بے نیاز نہیں ہو سکتا؛ زبردست ہے، اِس لیے اپنے فیصلوں میں کسی سے مرعوب نہیں ہوتا؛ اور حکیم ہے، اِس لیے جو کام کرتا ہے، ایک خاص مقصد سے اور اپنی اسکیم کے مطابق کرتا ہے، اُس کا کوئی فیصلہ الل ٹپ نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہود اگر امیوں میں پیغمبر کی بعثت پر معترض ہیں تو اُنھیں غور کرنا چاہیے کہ وہ کس ہستی کے فیصلے پر اعتراض کر رہے ہیں۔ زمین و آسمان کی سب چیزیں اُس کی تسبیح کرتی ہیں۔ وہ اِس سے پاک ہے کہ کسی کی جانب داری کرے۔ یہ نہیں مانتے تو نہ مانیں۔ اِن کی خواہشات

اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ ق وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ

میں سے اٹھایا ہے[۲۳] جو اُس کی آیتیں اُنھیں سناتا اور اُن کا تزکیہ کرتا ہے[۲۴]، اور اِس کے لیے اُنھیں قانون اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے[۲۵]۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس سے پہلے یہ لوگ

کے علی الرغم اُس کا فیصلہ ہر حال میں نافذ ہو جائے گا۔

۲۲۔ یعنی اُن لوگوں کے اندر جو صدیوں سے خدا کی کتاب اور نبوت سے بہرہ یاب نہیں ہوئے تھے۔ اِس سے بنی اسمٰعیل مراد ہیں۔ یہود اِسی بنا پر اُن کو امی کہتے تھے، لیکن بنی اسمٰعیل نے اِس میں چھپے ہوئے مذہبی پندار اور جذبۂ تحقیر کے باوجود اِس پر کبھی اعتراض نہیں کیا، بلکہ اِسے ایک حقیقت کے طور پر قبول کر لیا تھا۔ قرآن نازل ہوا تو اُس نے بھی یہ لفظ اِسی طریقے سے استعمال فرمایا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...قرآن نے اُن کے لیے اور اُن کی طرف مبعوث ہونے والے رسول کے لیے اِس لفظ کو بطور ایک وصف امتیازی کے ذکر فرمایا تو اِس کا رتبہ اتنا بلند ہو گیا کہ اہل عرب کے لیے اِس نے گویا ایک تشریف آسمانی کی حیثیت حاصل کر لی جس سے قدرت کی یہ شان ظاہر ہوئی کہ جن کو ان پڑھ اور گنوار کہہ کر حقیر ٹھیرایا گیا، وہ تمام عالم کی تعلیم و تہذیب پر مامور ہوئے اور جن کو اپنے حامل کتاب و شریعت ہونے پر ناز تھا، وہ 'کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا' 'چارپائے برو کتابے چند' کے مصداق قرار پائے۔“ (تدبر قرآن ۸/ ۳۷۸)

۲۳۔ بنی اسمٰعیل میں سے جو لوگ ایمان لا چکے تھے، مگر رسول کی قدر شناسی اور اتباع و اطاعت میں جن سے کوتاہیاں ہو جاتی تھیں، وہی سورہ کے مخاطبین ہیں۔ اُنھیں توجہ دلائی ہے کہ اللہ نے یہ رسول اُنھی کے اندر سے اٹھایا ہے تاکہ وہ جاہلیت کی اُس تاریکی سے نکلیں جو اب تک اُن پر چھائی رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن کو یہ نعمت ملی ہے، وہ اِس پر خدا کا شکر ادا کریں، اِسے حرز جاں بنائیں اور دوسروں کو بھی دعوت دیں کہ وہ اِس کی قدر کریں۔

۲۴۔ یہ اُنھی مسلمانوں پر امتنان اور اظہار فضل و احسان کے لیے مزید وضاحت ہے کہ اِس

ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ۙ﴿۲﴾ وَّاٰخَرِيۡنَ مِنۡهُمۡ لَمَّا يَلۡحَقُوۡا بِهِمۡ ؕ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۳﴾
ذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِيۡمِ ﴿۴﴾

کھلی گم راہی میں تھے[۲۶] ـــــ اور امیوں میں سے اُن دوسروں میں بھی جو (ایمان لاکر) ابھی اُن میں شامل نہیں ہوئے ہیں[۲۷]۔ اللہ زبردست اور حکیم ہے[۲۸]۔ یہ اللہ کا فضل ہے، جس کو چاہتا ہے، عطا فرماتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے[۲۹]۔ ۱-۴

رسول کے ذریعے سے جو دعوت پیش کی جا رہی ہے، وہ اُن کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو پاکیزہ بنانے کی دعوت ہے۔ پھر اس سے بڑھ کر اُن کے حق میں نصح و خیر خواہی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ اِس مفہوم کے لیے عربی زبان کا جو لفظ اختیار کیا گیا ہے، وہ تزکیہ ہے۔ اِس کے معنی کسی چیز کو آلایشوں سے پاک کرنے کے بھی ہیں اور نشو و نما دینے کے بھی۔ انبیا علیہم السلام انسانوں کو جس قانون و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں، اُس سے یہ دونوں ہی چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔

۲۵؎ اصل میں 'يُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ 'الۡكِتٰب' قرآن کی زبان میں جس طرح خط اور کتاب کے معنی میں آتا ہے، اُسی طرح قانون کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ قرآن کے نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اور 'الۡحِكۡمَة' جب عطف ہو کر آتے ہیں تو 'الۡكِتٰب' سے شریعت اور 'الۡحِكۡمَة' سے دین کی حقیقت اور ایمان و اخلاق کے مباحث مراد ہوتے ہیں۔

۲۶؎ یہ مخاطبین کے جذبۂ شکر و سپاس کو ابھارنے کے لیے اُس تاریکی کی طرف توجہ دلائی ہے جس میں وہ گھرے ہوئے تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> "...مطلب یہ ہے کہ اگر وہ جاہلیت کی اُس گھٹاٹوپ تاریکی کا خیال کریں جس میں وہ گرفتار رہ چکے ہیں، تب اُنھیں اپنے رب کے فضل و احسان کا کچھ اندازہ ہوگا کہ اُس نے اُن کو کس چاہِ ظلمت سے نکالا اور کس آسمان رفعت و عزت پر پہنچایا!" (تدبر قرآن ۸/۳۷۹)

۲۷؎ اِس سے پیچھے اُن لوگوں کا ذکر ہے جو بنی اسمٰعیل میں سے ایمان لا چکے تھے۔ اب فرمایا

الجمعة
۶۲

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٥﴾ قُلْ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْۤا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ

(یہود کیا حق رکھتے ہیں کہ اِس پر اعتراض کریں)؟ جن لوگوں پر تورات لادی گئی، پھر اُنھوں نے اُس کو نہیں اٹھایا[30]، اُن کی مثال تو اُس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں۔ کیا ہی بُری مثال ہے اُس قوم کی جس نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلا دیا ہے[31]! (یہ ظالم ہیں) اور ایسے ظالم لوگوں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا[32]۔ اِن سے کہو: اے لوگو، جو یہودی

الجمعة
۶۲

ہے کہ یہ نعمت اُن کے لیے بھی ہے جنھوں نے اُن میں سے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا۔ اِس میں، اگر غور کیجیے تو دعوت بھی ہے اور بشارت بھی۔ یعنی ابھی تک قبول نہیں کیا، لیکن توقع یہی ہے کہ عنقریب کرلیں گے، لہٰذا آگے بڑھیں اور اِس سعادت سے بہرہ یاب ہوں۔

۲۸؎ یعنی زبردست ہے، اِس لیے چاہے تو ساری خلق کو ہدایت بخش دے، لیکن چونکہ حکیم بھی ہے، اِس لیے اُنھی کو بخشے گا جو اُس کی حکمت کے تحت اِس کے سزاوار ہوں گے۔

۲۹؎ یعنی نبوت و رسالت اللہ کا فضل ہے۔ اِس کا فیصلہ وہی کرتا ہے کہ یہ نعمت کسے عطا فرمائے گا، کوئی دوسرا اِس میں مداخلت نہیں کرسکتا۔

۳۰؎ مطلب یہ ہے کہ لینے کے لیے تیار نہیں تھے، طوعاً و کرہاً قبول کیا، گویا زبردستی وہ اُن پر لادی گئی۔ چنانچہ عملاً اُنھوں نے اُس کی تکذیب ہی کی ہے، یہ بارگراں خوش دلی کے ساتھ اُنھوں نے کبھی نہیں اٹھایا۔

۳۱؎ اوپر فرمایا ہے کہ تورات کو نہیں اٹھایا۔ یہ اُس کی وضاحت کر دی ہے کہ زبان سے تو دعویٰ ہے کہ حامل کتاب ہیں، لیکن اپنے عمل سے مسلسل جھٹلا رہے ہیں۔

۳۲؎ یہ اُسی سنت الٰہی کا بیان ہے جس کا حوالہ اِس سے پہلے سورۂ صف (۶۱) کی آیت ۷ میں

مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٦﴾ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗۤ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿٧﴾ قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ

بن گئے ہو، اگر تمھارا گمان ہے کہ دوسروں[۳۳] کے مقابل میں تمھی اللہ کے محبوب ہو تو موت کی تمنا کرو، اگر تم سچے ہو[۳۴]۔ لیکن یہ اپنے اُن اعمال کی وجہ سے جو آگے بھیج چکے ہیں[۳۵]، اُس کی ہرگز کبھی تمنا نہ کریں گے، اللہ اِن ظالموں سے خوب واقف ہے۔ اِنھیں بتا دو کہ جس

گزر چکا ہے۔

۳۳؎ الفاظ اگرچہ عام ہیں، لیکن سیاق و سباق سے واضح ہے کہ اشارہ خاص طور پر بنی اسمٰعیل کی طرف ہے۔

۳۴؎ یعنی اپنے اِس دعوے میں سچے ہو تو دنیا کی طلب اور آخرت سے فرار کیوں؟ تمھیں تو ہر معرکے میں شہادت کی تمنا کرنی چاہیے، اِس لیے کہ محبّ تو یہی چاہے گا کہ جلد سے جلد اپنے محبوب سے ملاقات کرے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''قرآن نے یہاں یہود کی جس بزدلی پر طنز کیا ہے، اگرچہ وہ اُس کے جواب میں بے حیائی سے کہہ سکتے تھے کہ ہم موت سے ڈرنے والے لوگ نہیں ہیں، لیکن آدمی سے اپنا باطن مخفی نہیں ہوتا۔ اُنھیں محسوس ہوا کہ قرآن نے اُن کی نہایت دکھتی رگ پکڑی ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے خاموشی ہی میں سلامتی دیکھی۔ وہ ایک ایسی بات کی تردید کس طرح کر سکتے تھے جس کی شہادت اُن کی ماضی کی تاریخ بھی دے رہی تھی اور حاضر کے واقعات بھی جس کے گواہ تھے۔''
>
> (تدبر قرآن ۸/۳۸۲)

۳۵؎ اشارہ ہے یہود کے اُن اعمال کی طرف جن کی تفصیلات بقرہ سے مائدہ تک قرآن کے پہلے باب میں گزر چکی ہیں۔

الجمعة ۶۲

فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝٨

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝٩ فَاِذَا قُضِيَتِ

الجمعة
٦٢

موت سے تم بھاگ رہے ہو، وہ تمھیں آ کر رہے گی، پھر تم اُس کے سامنے پیش کیے جاؤ گے جو غائب و حاضر کا جاننے والا ہے اور وہ تمھیں بتا دے گا جو تم کرتے رہے ہو۔[٣٦] ٥-٨

ایمان والو،[٣٧] (پیغمبر کی قدر پہچانو اور) جمعہ کے دن جب (اُس کی طرف سے) نماز کے لیے اذان دی جائے[٣٨] تو اللہ کے ذکر[٣٩] کی طرف مستعدی سے چل کھڑے ہو اور

٣٦؎ 'وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ' میں جو تہدید اور پر مضمر تھی، وہ قرآن نے اِس آیت میں کھول دی ہے۔

٣٧؎ یہ خطاب اگرچہ عام ہے، لیکن روے سخن اُنھی کم زور مسلمانوں کی طرف ہے جن سے کوتاہیاں ہوئی ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...عام خطاب کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ زیادہ رسوائی کا احساس نہیں کرتے جن کا رویہ زیر بحث ہوتا ہے، بلکہ اُن کے اندر سلامت روی ہوتی ہے تو وہ اِس پردہ پوشی کو متکلم کی کریم النفسی پر محمول کرتے اور نصیحت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اگر تعین کے ساتھ نام لے کر اُن کو سرزنش کی جائے تو اندیشہ ہوتا ہے کہ اُن کے اندر ضد اور انانیت کا جذبہ ابھرے۔" (تدبر قرآن ٨/٣٨٥)

٣٨؎ جمعہ کی اذان ایک ہی ہے جو خطبے سے پہلے دی جاتی ہے، یہ اُسی کا ذکر ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری اذان کا اضافہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کیا گیا تاکہ اذان کی آواز دور تک پہنچائی جا سکے۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ مدینہ کی آبادی اُس وقت تک کافی بڑھ گئی تھی*۔ اذان کا مقصد نماز کے لیے بلانا ہے، اِس لیے ضرورت ہو تو یہ ایک سے زیادہ مرتبہ بھی دی جا

* بخاری، رقم ٨٧٣۔

الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿١٠﴾ وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا ؕ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ؕ

خرید و فروخت[40] چھوڑ دو۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانو۔ پھر جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو[41] اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ[42]۔ اِن لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب کوئی تجارت یا کھیل تماشے کی

الجمعة
۶۲

سکتی ہے۔

۳۹؎ اللہ کے ذکر سے یہاں خطبہ اور نماز، دونوں مراد ہیں۔ نماز میں اللہ کو یاد کیا جاتا ہے اور خطبے میں امام اللہ کی یاد دہانی کرتا ہے۔ اِس نماز کے بارے میں سنت یہ ہے کہ اِس کا خطاب اور اِس کی امامت مسلمانوں کے ارباب حل وعقد کرتے ہیں اور یہ صرف اُنھی مقامات پر ادا کی جاتی ہے جو اُن کی طرف سے اِس نماز کے لیے مقرر کیے جائیں اور جہاں وہ خود یا اُن کا کوئی نمائندہ اِس کی امامت کے لیے موجود ہو۔ دعوت کی جو ذمہ داری قرآن نے ارباب حل وعقد پر عائد کی ہے، اُس کو ادا کرنے کی یہی صورت دین میں متعین کی گئی ہے۔

۴۰؎ اصل میں لفظ 'الْبَيْع' آیا ہے۔ اِس کے اصل معنی تو بیچنے کے ہیں، لیکن اپنے عام استعمال میں یہ خرید و فروخت، دونوں کے لیے آ جاتا ہے۔ اِس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ ہر کام کو چھوڑ کر پیغمبر کا خطبہ سننے اور اُن کے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے آؤ۔ بیع کا ذکر صرف اِس لیے ہوا ہے کہ اُس وقت یہی چیز آزمایش کا سبب ہوئی تھی۔

۴۱؎ یعنی پابندی صرف خطبہ اور نماز کے لیے ہے۔ اِس کے بعد تم جہاں چاہو اور جس صورت میں چاہو، اپنی معاش کے لیے جد و جہد کر سکتے ہو۔

۴۲؎ یعنی صرف نماز ہی میں نہیں، بلکہ اٹھتے بیٹھتے، ہمہ وقت دل و دماغ کو خدا کی یاد سے معمور

وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱﴾

چیز دیکھتے ہیں تو اُس کی طرف ٹوٹ پڑتے ہیں اور تمھیں کھڑا چھوڑ دیتے ہیں[۴۳]۔ اِن سے کہو: جو اللہ کے پاس ہے، وہ کھیل تماشے اور تجارت سے کہیں بہتر ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ بہترین رزق دینے والا ہے۔ ۹-۱۱

اور زبان کو اُس سے تر رکھو۔ یہی فلاح کا راستہ ہے۔

۴۳؎ اِن الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فعل ایک سے زیادہ مرتبہ صادر ہوا، لیکن روایتوں میں ایک ہی واقعے کا ذکر ہے*۔ اِس کی وجہ غالباً یہ ہوئی ہے کہ کچھ ناتربیت یافتہ لوگ وقتاً فوقتاً یہ حرکت کرتے رہے، مگر کسی نے توجہ نہیں دی، یہاں تک کہ ایک موقع پر اُن کی ایک بڑی تعداد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطبہ دیتے ہوئے چھوڑ کر چلی گئی۔ یہ چونکہ آخری درجے میں سوءِ ادب اور دین و شریعت کی ناقدری تھی، اِس لیے قرآن نے بھی توجہ دلائی اور لوگوں نے بھی اِسی واقعے کو نقل کیا ہے۔

لاہور

۱۴؍ اکتوبر ۲۰۰۹ء

* بخاری، رقم ۸۹۴۔ مسلم، رقم ۸۶۳۔

الجمعة ۶۲

المنافقون - التغابن

٦٣ ـــــــ ٦٤

المنافقون - التغابن

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ میں اہل ایمان کو منافقین سے، جو اب سرکش ہو رہے تھے اور دوسری میں اپنے اہل وعیال سے جو راہ حق میں مزاحم ہو سکتے تھے، بچ کر رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ پھر دونوں میں نصیحت کی گئی ہے کہ لوگ آخرت ہی کو اصل حقیقت سمجھ کر اللہ کی راہ میں انفاق کریں اور اللہ و رسول کی رضا جوئی کے راستے میں ہر قربانی کے لیے تیار رہیں۔

دونوں میں خطاب اصلاً مسلمانوں سے ہے اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ مدینۂ طیبہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ تزکیہ وتطہیر میں نازل ہوئی ہیں۔

پہلی سورہ ـــــ المنافقون ـــــ کا موضوع مسلمانوں کو یہ بتانا ہے کہ منافقین بالکل جھوٹے ہیں۔ وہ اُن کی باتوں اور بات بات پر قسمیں کھانے سے متاثر نہ ہوں، اِس لیے کہ وہ اُنھیں انفاق سے روکنا اور اِس طرح اللہ و رسول سے برگشتہ کر دینا چاہتے ہیں۔

دوسری سورہ ـــــ التغابن ـــــ کا موضوع اُنھیں یہ بتانا ہے کہ تمھارے دشمن تمھارے گھر میں بھی ہو سکتے ہیں، اِس لیے متنبہ رہو کہ اصلی چیز یہ بیوی بچے اور اہل و

عیاں نہیں ہیں۔ دنیا کی مصیبتوں سے ڈرا کر یہ آخرت کے بارے میں تمھیں شبہات
میں مبتلا کر رہے ہیں، دراں حالیکہ اصلی چیز آخرت ہے، ہار جیت کا دن درحقیقت وہی
ہے، اُس میں کامیابی چاہتے ہو تو اللہ و رسول کی رضا طلبی کے راستے میں ایثار و قربانی
کے لیے تیار رہو اور اِس معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت اور کسی ناصح
کی نصیحت کی پروانہ کرو۔

سورۃ المنافقون

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِذَا جَآءَکَ الۡمُنٰفِقُوۡنَ قَالُوۡا نَشۡہَدُ اِنَّکَ لَرَسُوۡلُ اللّٰہِ ۘ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوۡلُہٗ ؕ وَ اللّٰہُ یَشۡہَدُ اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ لَکٰذِبُوۡنَ ۚ﴿۱﴾ اِتَّخَذُوۡۤا اَیۡمَانَہُمۡ جُنَّۃً فَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ اِنَّہُمۡ سَآءَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲﴾ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ

المنافقون
۶۳

— ۱ —

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ منافق جب تمھارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم گواہی دیتے ہیں کہ یقیناً آپ اللہ کے رسول ہیں[۱]۔ ہاں، اللہ جانتا ہے کہ ضرور تم اُس کے رسول ہو، مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق بالکل جھوٹے ہیں۔ اِنھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور اللہ کی راہ سے رک گئے ہیں[۲]۔ حقیقت یہ ہے کہ نہایت ہی برا ہے جو یہ کر رہے ہیں[۳]۔ یہ اِس

---

۱ یعنی قسمیں کھا کھا کر آپ کو اپنے مومن و مسلم ہونے کا یقین دلاتے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اِن کو قسمیں کھانے کی ضرورت اِس وجہ سے پیش آتی کہ اِن کی پیہم غلطیوں نے اِن کو اِس قدر ساقط الاعتبار بنا دیا تھا کہ وہ خود بھی محسوس کرنے لگے تھے کہ جب تک قسم کھا کے وہ بات نہیں کہیں گے، کوئی اُس کو باور نہیں کرے گا۔ جس آدمی کو اپنے عمل پر اعتماد ہوتا ہے، وہ بے ضرورت قسم نہیں کھاتا، لیکن جس کو اپنے عمل پر بھروسا نہ ہو، اُس کا واحد سہارا قسم ہی ہوتی ہے۔“
>
> (تدبر قرآن ۸/ ۳۹۸)

۲ یعنی جس اسلام کی طرف بڑھے تھے، اُس کو چھوڑ کر واپس جا چکے ہیں، لیکن قسموں کی آڑ میں

اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿٣﴾

وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ؕ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ؕ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۫ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿٤﴾

لیے ہے کہ اِنھوں نے پہلے ایمان کا دعویٰ کیا، پھر کفر اختیار کر لیا تو اِن کے دلوں پر مہر کر دی گئی۔ سو اب یہ کچھ نہیں سمجھتے[4]۔ ۱-۳

اِنھیں جب دیکھو تو اِن کی خوش اندامی تمھیں بھائے اور اگر بولیں تو اِن کی باتیں تم سنتے رہ جاؤ[5]۔ اِن کی مثال ایسی ہے گویا لکڑی کے کندے ہیں جنھیں (لباس پہنا کر) دیوار سے ٹکا دیا گیا ہے[6]۔ ہر خطرے کو اپنے ہی اوپر ٹوٹتا خیال کرتے ہیں[7]۔ یہی دشمن ہیں، سو

مسلمانوں کو دھوکا دیتے اور باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ سچے مسلمان ہیں۔

۳؎ مطلب یہ ہے کہ اِنھیں احساس نہیں ہے کہ جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اُس کے نتائج اِن کے لیے کتنے مہلک ہوں گے۔ یہ اِس کو بڑی دانش مندی سمجھتے ہیں، لیکن نہیں جانتے کہ اِس سے بڑی کوئی حماقت نہیں ہو سکتی جس میں یہ مبتلا ہو گئے ہیں۔

۴؎ یہ اُس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کے تحت کسی فرد یا گروہ کو ہدایت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"...اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جن کو وہ ایک مرتبہ اسلام کی روشنی دکھا دیتا ہے، اگر وہ اُس کی قدر کرتے ہیں تو اُن کی روشنی میں اضافہ کرتا ہے، اور اگر قدر نہیں کرتے، بلکہ مڑ مڑ کر پیچھے ہی کی طرف دیکھتے ہیں تو اُن کی وہ روشنی بھی سلب ہو جاتی ہے اور اُن کے دل پر مہر بھی کر دی جاتی ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ پھر وہ صحیح سوچنے کی صلاحیت کھو بیٹھتے ہیں۔" (تدبر قرآن ۳۹۹/۸)

۵؎ یہ اُن کے ظاہر کی تصویر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ اِس کا اثر چہروں پر بھی

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا يَسۡتَغۡفِرۡ لَكُمۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ لَوَّوۡا رُءُوۡسَهُمۡ وَرَاَيۡتَهُمۡ يَصُدُّوۡنَ وَهُمۡ مُّسۡتَكۡبِرُوۡنَ ﴿۵﴾ سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ اَسۡتَغۡفَرۡتَ لَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ ؕ لَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِيۡنَ ﴿۶﴾

اِن سے بچ کر رہو۔ اللہ اِنھیں غارت کرے، اِن کی عقل کس طرح الٹ گئی ہے! ۴

(ایسے بدقسمت ہیں کہ) جب اِن سے کہا جاتا ہے کہ آؤ، اللہ کا رسول تمھارے لیے مغفرت کی دعا کرے تو سر مٹکاتے ہیں اور تم اِن کو دیکھتے ہو کہ بڑے غرور کے ساتھ اعراض کر لیتے ہیں[8]۔ تم اِن کی مغفرت چاہو یا نہ چاہو، اِن کے لیے یکساں ہے۔ اللہ اِنھیں ہرگز معاف نہ کرے گا، اِس لیے کہ اللہ اِس طرح کے نافرمان لوگوں کو کبھی ہدایت نہیں دیتا[9]۔ ۵-۶

ہے اور زبانیں بھی تیز ہیں۔ بات کرتے ہیں تو اپنی چرب زبانی سے مخاطبین کے دل موہ لیتے ہیں۔

۶ یعنی ہر چند صورتیں دل کش ہیں، مگر اندر کچھ بھی نہیں۔ اِن کے دل مردہ ہو چکے ہیں اور جسم روح سے خالی ہیں۔

۷ اصل میں لفظ 'صَيۡحَة' آیا ہے۔ اِس کے لغوی معنی تو چیخ کے ہیں، لیکن یہ خطرہ کے معنی میں بھی آتا ہے۔ یہاں اِسی معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ باتیں بہت کرتے ہیں، لیکن پرلے درجے کے بزدل ہیں۔ دور و نزدیک، کہیں سے کوئی خطرہ نمودار ہو تو یہی سمجھتے ہیں کہ یہ بجلی اِنھی پر گرنے والی ہے۔

۸ اصل الفاظ ہیں: 'لَوَّوۡا رُءُوۡسَهُمۡ وَرَاَيۡتَهُمۡ يَصُدُّوۡنَ وَهُمۡ مُّسۡتَكۡبِرُوۡنَ'۔ سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۲۰۶ میں یہی بات 'اَخَذَتۡهُ الۡعِزَّةُ بِالۡاِثۡمِ' کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''اِن کے مغرورانہ اعراض کا اظہار اِن کے جوارح سے جس طرح ہوتا ہے، اُس کی تعبیر 'لَوَّوۡا

المنافقون ۶۳

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ

یہی ہیں جو کہتے ہیں کہ اُن لوگوں پر کچھ خرچ نہ کرو جو رسول اللہ کے پاس آ جمع ہوئے

رُءُ وْسَهُمْ' کے الفاظ سے کی گئی ہے اور یہ بلیغ ترین تعبیر ہے۔ باطن میں اِس کا جو اثر مترتب ہوتا ہے، اُس کو 'يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ' کے الفاظ سے بیان فرمایا گیا ہے۔ گویا اِن کا ظاہر و باطن، دونوں سامنے کر دیا گیا ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ جن لوگوں کے اندر اخلاقی جرأت نہیں ہوتی، وہ اپنے گناہوں کے ظاہر ہو جانے کے بعد بھی اُن کا اعتراف یا اُن پر اظہار ندامت نہیں کرتے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ اگر ایک بار اعتراف جرم کر لیا تو ہمیشہ کے لیے بھرم ختم ہو جائے گا۔ اُن کی یہ کم زوری اُن کو اُن کے گناہوں کے ساتھ باندھے رکھتی ہے۔'' (تدبر قرآن ۴۰۲/۸)

۹۔ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کس درجے کے متمردین تھے اور اپنے نفاق میں کہاں تک پہنچے ہوئے تھے۔ اِسی طرح کے لوگ تھے جن کے متعلق سورۂ توبہ (۹) کی آیت ۸۰ میں فرمایا ہے کہ آپ اِن کے لیے ستر مرتبہ بھی مغفرت چاہیں گے تو اللہ اِن کو معاف کرنے والا نہیں ہے۔

۱۰۔ اوپر جس غضب کا اظہار ہوا ہے، آگے کی آیتوں میں اُس کا سبب بیان کر دیا ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گفتگو غزوۂ بنی مصطلق کے موقع پر ہوئی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''روایات میں آتا ہے کہ ۶ ھ میں غزوۂ بنی مصطلق کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چشمے پر پڑاؤ ڈالا، وہاں پانی کے بارے میں ایک غریب مہاجر اور ایک انصاری میں جھگڑا ہو گیا۔ مہاجر نے انصاری کے تھپڑ مار دی۔ انصاری نے انصار کی دہائی دی اور مہاجر نے مہاجرین کی۔ دونوں طرف کے آدمی تلواریں سونت سونت کر اکٹھے ہو گئے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے بات زیادہ بڑھنے نہ پائی، لیکن عبد اللہ بن ابی نے، جو اِس طرح کے مواقع کی ہمیشہ گھات میں رہتا، موقع سے فائدہ اٹھا کر مہاجرین کے خلاف انصار کے جذبات بھڑکانے کے لیے نہایت زہر آلود فقرے کہے۔ اُس نے کہا کہ ''یہ ہمارے گھر میں پناہ پا کر اب ہمیں پر غرانے لگے ہیں۔ سچ کہا ہے، جس نے کہا ہے کہ کتے کو موٹا کرو، بالآخر تمھی کو کاٹے گا۔ خدا کی

وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۞ يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ۭ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۞

ہیں تاکہ وہ منتشر ہو جائیں، اور حقیقت یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں کے خزانے اللہ ہی کے ہیں[11]، مگر یہ منافق سمجھتے نہیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم مدینہ واپس پہنچ گئے تو زور والے اِن بے حیثیت لوگوں کو وہاں سے نکال باہر کریں گے، دراں حالیکہ زور و غلبہ تو حقیقت میں اللہ اور اُس کے رسول اور اُن کے ماننے والوں کے لیے ہے، مگر یہ منافق جانتے نہیں ہیں[12]۔ ۷-۸

المنافقون ۶۳

قسم، اب ہم پلٹے تو جو باعزت ہیں، وہ رذیلوں کو وہاں سے نکال کے رہیں گے۔"

انصار کے جو آدمی اِس دوران میں اُس کے اردگرد جمع ہو گئے تھے، اُن کو مخاطب کر کے اُس نے کہا: "یہ تمھاری اپنی غلطی کا خمیازہ ہے جو تمھیں بھگتنا پڑ رہا ہے۔ تم نے اپنے گھر میں اِن کو اتارا اور اپنے مال میں اِن کو حصہ دار بنایا۔ خدا کی قسم! اگر تم اِن کی امداد سے ہاتھ کھینچ لیتے تو یہ کب کے یہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے ہوتے۔*" (تدبر قرآن ۸/ ۴۰۳)

۱۱۔ یہ عبداللہ بن ابی کی بات کا جواب ہے کہ خدا نے یہ سعادت مدینہ والوں کو بخشی ہے تو یہ اُس کی عنایت ہے، ورنہ زمین و آسمان کے خزانے اللہ ہی کے ہیں، وہ جب چاہے اور جس کو چاہے، اُن سے مالا مال کر سکتا ہے۔

۱۲۔ یہ بھی اُسی کے جواب میں فرمایا ہے کہ عزت تو اللہ و رسول اور اُن کے ماننے والوں کے لیے ہے، اور سنت الٰہی کے مطابق اب اُس کے ظہور کا وقت بھی آ گیا ہے۔ یہ ذرا انتظار کریں، ہم نے لکھ رکھا ہے کہ رسول کے مخالفین لازماً ذلیل ہوں گے، اور رسول اور اُس کے ساتھیوں کو اُن کا پروردگار اِس سر زمین میں غلبہ عطا فرمائے گا۔ یہ اللہ کا فیصلہ ہے جو ہر حال میں نافذ ہو کر رہے گا۔

* السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۳/ ۲۲۸۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٩﴾ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١٠﴾ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿١١﴾

المنافقون
۶۳

ایمان والو، تمھارے مال اور تمھاری اولادیں تمھیں بھی (اِن منافقوں کی طرح) اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں اور (یادرکھو کہ) جو ایسا کریں گے، وہی خسارے میں پڑنے والے ہوں گے۔ ہم نے جو کچھ تمھیں عطا فرمایا ہے، اُس میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو، اِس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جائے، پھر وہ (حسرت سے) کہے کہ پروردگار، تو نے مجھے کچھ اور مہلت کیوں نہ دی کہ میں تیری راہ میں خرچ کرتا اور ایسا کرتا تو آج صالحین کے زمرے میں ہوتا؟[۱۳] دراں حالیکہ جب کسی کا وقت آ پہنچے گا تو اللہ ہرگز اُس کو ڈھیل نہ دے گا اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس سے خوب واقف ہے۔ ۹-۱۱

سورۂ مجادلہ (۵۸) کی آیات ۲۰-۲۱ میں یہ بات اِنھی الفاظ میں بیان ہو چکی ہے۔

۱۳؎ اِس جملے میں تالیف کی ایک مشکل ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اِس آیت میں 'اَكُنْ'، جو مضارع کی ساکن شکل ہے، کا عطف بظاہر 'فَاَصَّدَّقَ' پر ہے جو منصوب ہے، لیکن ہمارے نزدیک اصل میں 'اَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ' شرط محذوف کا جواب ہے۔ اِس کو کھول دیجیے تو مطلب یہ ہو گا کہ اگر میں یہ صدقہ کر سکتا تو نیکوکاروں میں سے بنتا۔

سورة التغابن

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ۚ لَہُ الۡمُلۡکُ وَ لَہُ الۡحَمۡدُ ۫ وَ ہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۱﴾

ہُوَ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ فَمِنۡکُمۡ کَافِرٌ وَّ مِنۡکُمۡ مُّؤۡمِنٌ ؕ وَ اللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۲﴾ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ وَ صَوَّرَکُمۡ فَاَحۡسَنَ صُوَرَکُمۡ ۚ

التغابن
۶۴

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

زمین اور آسمانوں کی ہر چیز اللہ کی تسبیح کرتی ہے، بادشاہی اُسی کی ہے، وہی سزاوار شکر ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے[14]۔ ۱

وہی ہے جس نے تمھیں پیدا کیا، پھر تم میں سے کوئی کافر ہے اور کوئی مومن، اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے دیکھ رہا ہے[15]۔ زمین اور آسمانوں کو اُس نے برحق پیدا کیا ہے

'فَاَصَّدَّقَ' کی صورت میں چونکہ اِس شرط کا قرینہ واضح تھا، اِس وجہ سے اِسے حذف کر دیا گیا۔" (تدبر قرآن ۸/۴۰۶)

۱۴؎ یعنی ہر چیز اللہ کی تسبیح کرتی ہے اور اِس طرح اپنے عمل سے شہادت دیتی ہے کہ اِس کائنات کی بادشاہی تنہا اُسی کی ہے اور جب وہی بادشاہ ہے تو وہی سزاوار شکر ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، اپنے کسی کام میں کسی کی مدد کا محتاج نہیں ہے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ کسی کو اُس کا شریک و سہیم ٹھیرایا جائے یا بندوں کے شکر و سپاس کا حق دار سمجھا جائے۔

۱۵؎ مطلب یہ ہے کہ تمھارا خالق بھی وہی ہے جو کائنات کا خالق ہے، اِس لیے حق تو یہ تھا کہ تم

وَ اِلَيۡهِ الۡمَصِيۡرُ ﴿۳﴾ يَعۡلَمُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَ يَعۡلَمُ مَا تُسِرُّوۡنَ وَمَا تُعۡلِنُوۡنَ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۴﴾
اَلَمۡ يَاۡتِكُمۡ نَبَؤُا الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ قَبۡلُ ۫ فَذَاقُوۡا وَبَالَ اَمۡرِهِمۡ وَلَهُمۡ

اور تمھاری صورتیں بنائیں تو نہایت اچھی صورتیں بنائی ہیں، اور (آخر کار) اُسی کی طرف پلٹنا ہے[16]۔ وہ زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کو جانتا ہے۔ وہ جانتا ہے جو تم چھپاتے اور جو کچھ ظاہر کرتے ہو، اور اللہ سینوں کے بھید تک جانتا ہے[17]۔ ۲-۴

بھی اُسی طرح اپنے خداوند کی تسبیح کرتے، جس طرح تمام کائنات کر رہی ہے، لیکن اُس نے تمھیں ارادہ و اختیار بخشا ہے تو اب اُس کا نتیجہ یہ ہے اور یہی ہونا تھا کہ تم میں ماننے والے بھی ہیں اور نہ ماننے والے بھی۔ تاہم اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اُس نے تمھیں شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دیا ہے کہ جو چاہے کرتے پھرو اور تم سے بے تعلق ہو کر بیٹھ گیا ہے۔ نہیں، جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔

۱۶؎ اوپر جو بات بیان ہوئی ہے، یہ اُس کی دلیل ہے کہ دنیا ایک مقصد حق کے ساتھ پیدا ہوئی ہے، یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں ہے۔ اِسی طرح انسان کی پیدایش میں بھی غیر معمولی اہتمام کیا گیا ہے۔ اِس مقصدیت اور اہتمام کا تقاضا ہے کہ بدلے کا ایک دن آئے اور انسان کو جزا و سزا کے لیے اُسی پروردگار کی طرف لوٹایا جائے جس نے اُسے پیدا کیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اِس اہتمام کے کوئی معنی نہیں ہیں، اِس لیے متنبہ ہو جاؤ کہ آخر کار اُسی کی طرف پلٹنا ہے۔

۱۷؎ یہ اُس مغالطے کو دور کیا ہے جو آخرت کی جزا و سزا کے معاملے میں بالعموم لوگوں کو ہوتا رہا ہے کہ خفیہ اور علانیہ جو کچھ ہم کرتے ہیں اور جس نیت اور ارادے سے کرتے ہیں، اُس کا علم آخر کہاں محفوظ ہوگا کہ ایک ایک چیز سامنے آجائے اور انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جا سکے۔ فرمایا ہے کہ اللہ اِن میں سے ہر چیز سے واقف ہے، بلکہ وہ تو دلوں کے بھید تک جانتا ہے۔

عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ۝۵ ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتۡ تَّاۡتِيۡهِمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ فَقَالُوۡۤا اَبَشَرٌ يَّهۡدُوۡنَنَا فَكَفَرُوۡا وَتَوَلَّوۡا وَّاسۡتَغۡنَى اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ غَنِىٌّ حَمِيۡدٌ ۝۶

زَعَمَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَنۡ لَّنۡ يُّبۡعَثُوۡا ؕ قُلۡ بَلٰى وَرَبِّىۡ لَتُبۡعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ

تمھیں اُن لوگوں کے حالات نہیں پہنچے جنھوں نے اِس سے پہلے (اِن حقائق کا) انکار کیا تو اپنے کیے کا وبال (اِسی دنیا میں) چکھ لیا، اور آگے اُن کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔[18] یہ اِس لیے ہوا کہ اُن کے رسول اُن کے پاس کھلی نشانیوں کے ساتھ آتے رہے، مگر اُنھوں نے کہا: کیا انسان ہماری رہنمائی کریں گے؟[19] اِس طرح اُنھوں نے ماننے سے انکار کر دیا اور منہ پھیر لیا اور اِس کے نتیجے میں اللہ بھی، (اپنی سنت کے مطابق)، اُن سے بے پروا ہو گیا اور اللہ تو (ہر چیز سے) بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔۵-۶

۱۸؎ اللہ تعالیٰ کی دینونت کا ظہور جن قوموں میں ہوا، یہ اُن کے انجام کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اہل عرب عاد و ثمود، قوم لوط اور مدین والوں سے واقف تھے اور اِن میں سے بعض قوموں کے آثار اُن کی گزرگاہوں میں بھی پڑتے تھے۔ پچھلی سورتوں میں اِن کی سرگذشتیں تفصیل کے ساتھ سنائی گئی ہیں۔

۱۹؎ اُن کا مطلب یہ تھا کہ کیا ہم ایسے ہی حقیر ہو گئے ہیں کہ ہمارے جیسے انسان اب ہمارے ہادی بنا کر بھیج دیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو اگر کوئی رسول بھیجنا تھا تو ہم سے برتر کسی مخلوق کو اِس منصب پر سرفراز کیا ہوتا۔ اپنی ہدایت کے لیے ہم خود ہی کافی ہیں۔ ہم اِن کا احسان کیوں اٹھائیں؟ یہ، ظاہر ہے کہ آخری درجے کی سرکشی اور استکبار تھا۔ لہٰذا آگے فرمایا ہے کہ پھر اللہ کو بھی اِس کی کچھ پروا نہیں رہی کہ یہ کس گڑھے میں گرتے ہیں۔

بِمَا عَمِلْتُمْ ؕ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ⑦ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ⑧

يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ؕ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا

(تمھارے) اِن منکروں نے بھی بڑے دعوے سے کہا ہے کہ وہ مرنے کے بعد ہرگز نہ اٹھائے جائیں گے۔ اِن سے کہو: کیوں نہیں، میرے پروردگار کی قسم، تم ضرور اٹھائے جاؤ گے، پھر تمھیں ضرور بتایا جائے گا جو کچھ تم نے (دنیا میں) کیا اور یہ اللہ کے لیے بہت آسان ہے[20]۔ اِس لیے اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اُس نور پر جو ہم نے نازل کیا ہے اور (خبردار ہو جاؤ کہ) جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس سے باخبر ہے۔ ۷-۸

اُس دن کو یاد رکھو، جب وہ روز محشر کی پیشی کے لیے تمھیں اکٹھا کرے گا[21]۔ وہی درحقیقت ہار جیت کا دن ہوگا[22] اور جو اللہ پر ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے ہیں، اُن کے گناہ وہ اُس دن اُن سے جھاڑ دے گا اور اُنھیں ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن

۲۰؎ یہ بظاہر دعوے کا جواب دعوے سے دیا ہے، لیکن غور کیجیے تو اِس جملے میں قسم کا جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے، وہ اپنے اندر دلیل کا بھی ایک لطیف پہلو رکھتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، جس کی شانیں اِس کائنات کے ہر گوشے میں نمایاں ہیں، اِس بات کو واجب کرتی ہے کہ وہ نیکوکار اور بدکار، دونوں کے ساتھ ایک ہی طرح کا معاملہ نہیں کرے گا، بلکہ لازماً وہ نیکوں کو اُن کی نیکی کا صلہ دے گا اور بدوں کو اُن کی بدی کی سزا۔ اِس سے یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ وہ مرنے کے بعد لوگوں کو اٹھائے، اُن کا حساب کرے اور اُن کے اعمال کے مطابق اُن کو جزا یا سزا دے۔“ (تدبر قرآن ۸/ ۴۱۸)

۲۱؎ یہ مخاطبین کو اُن مغالطوں سے نکالنے کے لیے جن میں وہ مبتلا تھے اور اُن کے اِس استبعاد

الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ۝٩ وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَكَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ؕ وَبِئۡسَ الۡمَصِيۡرُ ۝١٠

مَاۤ اَصَابَ مِنۡ مُّصِيۡبَةٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنۡ يُّؤۡمِنۡۢ بِاللّٰهِ يَهۡدِ قَلۡبَهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ۝١١ وَاَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ ۚ فَاِنۡ

کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ اُن میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ بڑی کامیابی یہی ہے اور جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلا دیا، وہ دوزخ کے لوگ ہوں گے، اُس میں ہمیشہ رہیں گے اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے۔ ۹-۱۰

(ذرا[۲۳] کوئی مصیبت آتی ہے تو ایمان والو، اِن کے زیر اثر تم اپنے آپ کو شبہات میں مبتلا کر لیتے ہو؟ یاد رکھو کہ) جو مصیبت بھی آتی ہے، اللہ کے اذن سے آتی ہے اور جو اللہ کو مانتے ہیں، (اِس طرح کے موقعوں پر) اللہ اُن کے دل کی رہنمائی فرماتا ہے[۲۴] اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ (اِس حقیقت کو سمجھو) اور اللہ کی اطاعت کرو اور اُس کے رسول

کو رفع کرنے کے لیے کہ اتنی بے شمار مخلوقات کہاں سے اٹھا کر جمع کر دی جائیں گی، اُنھیں توجہ دلائی ہے کہ شبہات میں رہنے کے بجائے اِس دن کی تیاری کرو۔

۲۲؎ مطلب یہ ہے کہ تم اِس دنیا کو ہار جیت کا میدان سمجھتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہار جیت کا اصلی دن وہ ہوگا، جس دن انسانوں کے ابدی نعمت اور ابدی نقمت کے فیصلے ہوں گے۔

۲۳؎ یہاں سے کلام کا رخ براہ راست مسلمانوں کی طرف ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب یہ حقیقت ہے کہ کوئی مصیبت اللہ کے اذن کے بغیر نہیں آتی تو بندۂ مومن کو آخرت کے متعلق شبہات میں مبتلا ہونے کے بجائے یہ بات سمجھنی چاہیے کہ جو کام وہ اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی تعمیل میں کرے گا، اُس میں کوئی ایسی آزمایش پیش نہیں آ سکتی جس کا تحمل اُس کے لیے ممکن نہ ہو۔ اللہ اپنے

تَوَلَّيۡتُمۡ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوۡلِنَا الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ ﴿۱۲﴾ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَؕ وَعَلَی اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۳﴾

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ مِنۡ اَزۡوَاجِكُمۡ وَاَوۡلَادِكُمۡ عَدُوًّا لَّكُمۡ فَاحۡذَرُوۡهُمۡ ۚ وَاِنۡ تَعۡفُوۡا وَتَصۡفَحُوۡا وَتَغۡفِرُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۴﴾ اِنَّمَاۤ اَمۡوَالُكُمۡ

التغابن
۶۴

کی اطاعت کرو۔ پھر اگر منہ موڑتے ہو تو ہمارے پیغمبر پر تو یہی ذمہ داری ہے کہ صاف صاف پہنچا دے۔ (یاد رکھو)، اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں[۲۵]، اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر بھروسا کرنا چاہیے۔ ۱۱-۱۳

ایمان والو، تمھاری بیویوں اور تمھاری اولاد میں سے بعض تمھارے دشمن ہیں۔ سو اِن سے ہوشیار رہو[۲۶]۔ تاہم (سختی کی ضرورت نہیں ہے، اِس لیے کہ) عفو و درگذر اور چشم پوشی سے کام لو گے اور معاف کرو گے تو یہی بہتر ہے، اِس لیے کہ اللہ غفور و رحیم

بندوں پر اُن کی طاقت سے زیادہ کوئی بوجھ نہیں ڈالتا۔

۲۴؎ یعنی اُن کو صبر و تسلیم، رضا بالقضا، عزم و ہمت اور ثبات و استقامت عطا فرماتا اور روح القدس کے ذریعے سے اُن کی مدد کرتا ہے۔

۲۵؎ لہٰذا نفع و نقصان کی سب توقعات اور اندیشے بھی اُسی سے وابستہ رہنے چاہییں، کسی دوسرے کی ہستی نہیں ہے کہ اُس کی اجازت کے بغیر وہ کسی کو نفع یا نقصان پہنچا سکے۔

۲۶؎ یہ قرآن نے اوپر کی پوری تقریر کا نظم واضح کر دیا ہے کہ اُس میں مخاطب اگرچہ منکرین کو بھی کیا گیا ہے، لیکن روے سخن اُنھی مسلمانوں کی طرف ہے، جن کے بیوی بچے اسلام لا چکے تھے، لیکن اُن میں سے بعض کے دلوں میں ایمان ابھی داخل نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ وہ جب دیکھتے کہ اُن کے شوہر یا باپ آخرت کی امید میں اپنی دنیا کھو رہے ہیں، اپنے مفادات کی قربانی دے رہے ہیں

وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿١٥﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ
وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ

ہے۔[27] تمھارے مال اور تمھاری اولاد بس ایک امتحان ہیں اور اجرعظیم تو اللہ ہی کے پاس ہے۔[28] سو جہاں تک ہو سکے، اللہ سے ڈرتے رہو، اور سنو اور اطاعت کرو اور اپنی بھلائی

اور اپنا کمایا ہوا مال بے دریغ اللہ کی راہ میں خرچ کر رہے ہیں تو اُن کی راہ میں مزاحم ہوتے اور آخرت کے بارے میں بھی اُسی طرح کے اعتراضات اٹھا کر جو اِس سے پہلے منکرین اٹھاتے رہے تھے، اُنھیں متذبذب کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ قرآن نے اُن کے دل و دماغ کو یک سو رکھنے کے لیے پہلے آخرت اور اُس کے دلائل کی تذکیر فرمائی، پھر تھوڑی دیر کے لیے منکرین کو مخاطب کر کے آخرت سے متعلق اُن کے پیدا کردہ مغالطوں کو دور کیا، اور اِس کے بعد اُنھیں تنبیہ فرمائی کہ مسلمانو، تمھارے دین و ایمان کے دشمن تمھارے گھروں ہی میں موجود ہیں، اُن سے ہوشیار رہو۔

۲۷ یعنی اللہ غفور و رحیم ہے، جس طرح وہ بندوں کی کوتاہیوں سے درگذر فرماتا ہے، اُسی طرح بندوں سے بھی چاہتا ہے کہ جس حد تک گنجایش ہو، عفو و درگذر اور چشم پوشی سے کام لیں۔ اِس تنبیہ سے مقصود تمھیں ہوشیار کرنا ہے، تمھارے گھروں میں کوئی بدمزگی پیدا کرنا نہیں ہے۔ تمھیں اپنے اہل و عیال کے دل و دماغ کو بدلنے کی کوشش کرنی چاہیے، سختی کر کے اُن کی اصلاح کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند نہیں کر لینے چاہییں۔

۲۸ مطلب یہ ہے کہ بیوی بچے اور مال و منال، سب امتحان کے لیے ہیں۔ اِنھیں امتحان سمجھ کر معاملہ کرو گے تو فوز و فلاح سے ہم کنار ہو گے۔ مطمئن رہو کہ اِس راہ میں جو نقصان بھی اٹھاؤ گے، اُس کی تلافی آخرت میں ہو جائے گی، اِس لیے کہ اجر عظیم تو اللہ ہی کے پاس ہے۔

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۶﴾ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾

کے لیے خرچ کرو، اور (یاد رکھو کہ) جو دل کی تنگی سے محفوظ رہے[۲۹]، وہی فلاح پانے والے ہوں گے۔ اگر تم اللہ کو قرض دو، اچھا قرض[۳۰] تو وہ اُس کو تمھارے لیے کئی گنا بڑھا دے گا اور تمھاری مغفرت فرمائے گا۔ اللہ بڑا قدر دان اور بڑا بردبار ہے[۳۱]، حاضر و غائب کا

۲۹؎ اصل میں لفظ 'شُحّ' استعمال ہوا ہے۔ اِس کے معنی بخل اور حرص کے ہیں۔ آیت میں اِس کی اضافت 'نفس' کی طرف ہوئی ہے، اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بھی اُنھی داعیات میں سے ہے جن سے نفس انسانی نے ترکیب پائی ہے۔ لہٰذا غضب اور شہوت کی طرح اِس کو بھی دبا کر رکھنا پڑتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِس کا طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ جب یہ جذبہ غالب ہونے لگے تو انسان اِس کے علی الرغم انفاق کر کے اِس کو دباتا رہے، یہاں تک کہ یہ اتنا کم زور ہو جائے کہ نیکی کے اقدامات میں مزاحم نہ ہو سکے۔ قرآن کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ جو لوگ اپنے اِس جذبے کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اِس کوشش میں وہ کامیاب ہوتے ہیں، اور جو اِس کوشش میں کامیاب ہوئے، آخرت کی فلاح کے حق دار وہی ہوتے ہیں۔ اِس لیے کہ اللہ کی رضا جوئی کے اعمال میں انفاق کا درجہ سب سے اونچا ہے، بالخصوص وہ انفاق جو آدمی اپنی ذاتی ضروریات کو نظر انداز کر کے کرتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۸/ ۴۲۴)

۳۰؎ اوپر جس انفاق کا ذکر ہے، وہ عام ہے۔ یہ اُس کے بعد بطور خاص اُس انفاق کی ترغیب دی ہے جو اللہ کے دین کی خدمت اور اُس کی راہ میں جہاد کے لیے کیا جاتا ہے۔ اُس کے لیے لفظ 'قرض' کے استعمال میں جو اپیل اور بلاغت ہے، وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ اچھے قرض سے مراد وہ قرض ہے جو اچھے مال میں سے اور خوش دلی اور فیاضی کے ساتھ دیا جائے۔

۳۱؎ یعنی تمھارے ایثار کا قدر دان اور تمھاری کوتاہیوں کے معاملے میں بڑا بردبار ہے۔

جاننے والا ہے،[۳۲] زبردست اور حکیم ہے۔[۳۳] ۱۴-۱۸

۳۲؎ اِس لیے تم جو ایثار بھی کرو گے، وہ اُس سے چھپا نہ رہے گا۔

۳۳؎ لہٰذا اُس کا ساتھ دو گے تو کبھی نامراد نہ ہو گے۔

لاہور

۲۰/ اکتوبر ۲۰۰۹ء

الطلاق - التحريم

٦٥ ـــــ ٦٦

الطلاق - التحریم

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ میں بیویوں سے مفارقت اور دوسری میں اُن سے محبت کے موقعوں پر جو حدود و قیود ایک بندۂ مومن کو ملحوظ رکھنے چاہییں، اُن کی وضاحت فرمائی ہے۔ دونوں میں خطاب مسلمانوں سے ہے اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ مدینۂ طیبہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ تزکیہ و تطہیر میں نازل ہوئی ہیں۔

پہلی سورہ ــــ الطلاق ــــ کا موضوع مسلمانوں کو یہ بتانا ہے کہ اگر بیوی سے مفارقت کی نوبت آجائے تو اُس کے معاملے میں کس طرح اور کس درجے میں حدود الٰہی کی پابندی کا اہتمام ہونا چاہیے۔

دوسری سورہ ــــ التحریم ــــ کا موضوع اُنھیں یہ بتانا ہے کہ التفات و محبت کے موقعوں پر اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو کس طرح حدود الٰہی کا پابند رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ نیز ہر شخص کو کس درجہ متنبہ رہنا چاہیے کہ اللہ کے ہاں کام آنے والی چیز آدمی کا اپنا عمل ہے۔ یہ نہ ہو تو کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی نسبت بھی اُسے کچھ نفع پہنچانے والی نہیں بن سکتی۔

سورة الطلاق

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوۡهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَ اَحۡصُوا الۡعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمۡ ۚ لَا تُخۡرِجُوۡهُنَّ مِنۡۢ بُیُوۡتِهِنَّ وَلَا یَخۡرُجۡنَ اِلَّاۤ

الطلاق
۶۵

— ۱ —

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

اے نبی[۱]، تم لوگ اپنی بیویوں کو طلاق دو تو اُن کی عدت کے حساب سے طلاق دو[۲]، اور عدت کا زمانہ ٹھیک ٹھیک شمار کرو[۳] اور اللہ سے ڈرتے رہو جو تمھارا پروردگار ہے[۴]۔

۱؎ یہ خطاب اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن اگلے ہی لفظ میں ضمیر خطاب سے واضح کر دیا ہے کہ مخاطب تمام مسلمان ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے احکام دینے سے مقصود یہ ہے کہ جب خدا کا پیغمبر بھی اِن کا پابند ہے تو دوسروں کو تو اِن کے معاملے میں اور بھی محتاط ہونا چاہیے۔

۲؎ اِس کے معنی یہ ہیں کہ بیوی کو فوراً علیحدہ کر دینے کے لیے طلاق دینا جائز نہیں ہے۔ یہ جب دی جائے گی، ایک متعین مدت کے پورا ہو جانے پر مفارقت کے ارادے سے دی جائے گی۔ عدت کا لفظ اصطلاح میں اُس مدت کے لیے استعمال ہوتا ہے جس میں بیوی شوہر کی طرف سے طلاق یا اُس کی وفات کے بعد کسی دوسرے شخص سے نکاح نہیں کر سکتی۔ یہ مدت چونکہ مقرر ہی اِس لیے کی گئی ہے کہ عورت کے پیٹ کی صورت حال پوری طرح واضح ہو جائے، اِس لیے ضروری ہے کہ بیوی کو حیض سے فراغت کے بعد اور اُس سے زن و شو کا تعلق قائم کیے بغیر طلاق دی جائے۔ ہر مسلمان کو اِس معاملے میں اُس غصے کے باوجود جو اِس طرح کے موقعوں پر بیوی کے خلاف پیدا ہو جاتا ہے، اللہ اپنے پروردگار سے ڈرنا چاہیے۔

اَنۡ يَّاۡتِيۡنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ؕ وَتِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنۡ يَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهٗ ؕ لَا تَدۡرِىۡ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحۡدِثُ بَعۡدَ ذٰلِكَ اَمۡرًا ①

(زمانۂ عدت میں) نہ تم اُنھیں اُن کے گھروں سے نکالو، نہ وہ خود نکلیں[5]، الا یہ کہ وہ کسی صریح بے حیائی کی مرتکب ہوں[6]۔ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں اور جو اللہ کی حدوں سے تجاوز کریں گے، وہ یاد رکھیں کہ اُنھوں نے اپنی ہی جان پر ظلم ڈھایا ہے[7]۔ تم نہیں جانتے، شاید اللہ اِس کے بعد کوئی اور صورت پیدا کر دے[8]۔ ۱

الطلاق ۶۵

۳؎ طلاق کا معاملہ چونکہ نہایت نازک ہے۔ اِس سے عورت اور مرد اور اُن کی اولاد اور اُن کے خاندان کے لیے بہت سے قانونی مسائل پیدا ہوتے ہیں، اِس لیے ضروری ہے کہ جب طلاق دی جائے تو اُس کے وقت اور تاریخ کو یاد رکھا جائے اور یہ بھی یاد رکھا جائے کہ طلاق کے وقت عورت کی حالت کیا تھی۔ عدت کی ابتدا کس وقت ہوئی، یہ کب تک باقی رہے گی اور کب ختم ہو جائے گی۔ معاملہ گھر میں رہے یا خدانخواستہ کسی مقدمے کی صورت میں عدالت تک پہنچے، دونوں صورتوں میں اِسی سے متعین کیا جائے گا کہ شوہر کو رجوع کا حق کب تک ہے، اُسے عورت کو گھر میں کب تک رکھنا ہے، نفقہ کب تک دینا ہے، وراثت کا فیصلہ کس وقت کے لحاظ سے کیا جائے گا، عورت اُس سے کب جدا ہو گی اور کب اُسے دوسرا نکاح کر لینے کا حق حاصل ہو جائے گا۔

۴؎ یعنی اُس کے حدود کی پابندی کرتے رہو۔

۵؎ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ اِس طرح اکٹھا رہنے کے نتیجے میں توقع ہے کہ دلوں میں تبدیلی پیدا ہو جائے، دونوں اپنے رویے کا جائزہ لیں اور اُن کا اجڑتا ہوا گھر ایک مرتبہ پھر آباد ہو جائے۔

۶؎ یعنی اِس ہدایت سے مستثنیٰ صرف یہ صورت ہے کہ مرد نے عورت کو طلاق ہی کسی 'فَاحِشَةٌ مُّبَيِّنَةٌ' کے ارتکاب پر دی ہو۔ عربی زبان میں یہ تعبیر زنا اور اُس کے لوازم و مقدمات کے لیے معروف ہے۔ اِس صورت میں، ظاہر ہے کہ نہ شوہر سے یہ مطالبہ کرنا جائز ہے کہ وہ ایسی عورت کو گھر

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ

(اِسی طرح طلاق دو)، پھر جب وہ اپنی عدت کے خاتمے پر پہنچ جائیں تو اُنھیں بھلے طریقے سے نکاح میں رکھو یا بھلے طریقے سے رخصت کر دو۔[9] اور (نباہ کا ارادہ ہو یا جدائی کا، دونوں صورتوں میں) دو ثقہ آدمیوں کو اپنے میں سے گواہ بنا لو، اور (گواہوں

میں رہنے دے، اور نہ اِس سے وہ فائدہ ہی حاصل ہو سکتا ہے جس کے لیے یہ ہدایت کی گئی ہے۔

۷ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے قائم کردہ اِن حدود سے جو شخص بھی آگے بڑھنے کی کوشش کرے گا، وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا، بلکہ اپنے ہی مصالح برباد کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ حدود اپنے کسی فائدے کے لیے قائم نہیں کیے، بندوں کی بہبود کے لیے قائم کیے ہیں۔ لہٰذا اِنھیں کوئی شخص اگر توڑتا ہے تو اپنی ہی جان پر ظلم ڈھاتا ہے۔

۸ یعنی کوئی ایسی صورت پیدا کر دے کہ میاں بیوی اختلاف کے بعد دوبارہ ملاپ کے لیے تیار ہو جائیں۔ یہ اُس مصلحت کی طرف اشارہ ہے جس کے لیے 'لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ' (نہ تم اُنھیں گھروں سے نکالو، نہ وہ خود نکلیں) کی ہدایت فرمائی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اگر ایسا ہو تو اللہ تعالیٰ کو یہ بات بہت پسند ہے۔ وہ دلوں کو جڑا ہوا اور گھروں کو آباد دیکھنا پسند کرتا ہے۔ یہ پسند نہیں کرتا کہ میاں بیوی میں ایسی ناچاقی پیدا ہو کہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں اور صرف وہی جدا نہ ہوں، بلکہ اُن کے بچے ہوں تو وہ بھی اپنی ماں سے اور ماں بھی اپنے بچوں سے جدا ہو جائے۔" (تدبر قرآن ۸/۴۳۸)

۹ اِس سے واضح ہے کہ عدت کے پورا ہونے تک شوہر کو رجوع کا حق ہے۔ چنانچہ ہدایت کی گئی ہے کہ یہ خاتمے کو پہنچ رہی ہو تو شوہر کو فیصلہ کر لینا چاہیے کہ اُسے بیوی کو روکنا ہے یا رخصت کر

كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۬ ۚ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ﴿۲﴾ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا ﴿۳﴾

کے لیے اللہ کا حکم ہے کہ گواہی دینے والو)، تم اِس گواہی کو اللہ کے لیے قائم رکھو۔[۱۰] یہ بات ہے جس کی نصیحت (تم میں سے) اُن لوگوں کو کی جاتی ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور جو لوگ اللہ سے ڈریں گے، اُنھیں کوئی مشکل پیش آئی تو اللہ اُن کے لیے نکلنے کا راستہ پیدا کرے گا اور اُنھیں وہاں سے رزق دے گا، جدھر اُن کا گمان بھی نہ جاتا ہو۔[۱۱] اور جو اللہ پر بھروسا کریں گے، وہ اُن (کی دست گیری) کے لیے کافی ہے۔ بے شک، اللہ اپنے ارادے پورے کر کے رہتا ہے۔ (ہاں، یہ ضرور ہے کہ) اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک تقدیر مقرر کر رکھی ہے۔[۱۲] ۲-۳

دینا ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں اللہ کا حکم ہے کہ معاملہ معروف کے مطابق، یعنی بھلے طریقے سے کیا جائے۔ سورۂ بقرہ میں مزید وضاحت ہے کہ روکنا مقصود ہو تو یہ ہرگز ہرگز دست ستم دراز کرنے کے لیے نہیں ہونا چاہیے، بلکہ محبت اور سازگاری کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے کے لیے ہونا چاہیے، ورنہ یہ محض ظلم ہوگا جو قیامت میں اللہ کی شدید ناراضی کا باعث بن جائے گا۔

۱۰؎ اِس سے مقصود یہ ہے کہ فریقین میں سے کوئی بعد میں کسی بات کا انکار نہ کرے اور اگر کوئی نزاع پیدا ہو تو اُس کا فیصلہ آسانی کے ساتھ ہو جائے۔ مزید یہ کہ اِس معاملے میں کسی قسم کے شکوک و شبہات پیدا نہ ہوں اور لوگوں کے لیے ہر چیز بالکل واضح اور متعین رہے۔

۱۱؎ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ کوئی شخص طلاق دے کر محض اِس لیے بیوی کو نکال باہر نہ کرے کہ طلاق دے دی ہے تو اب اِس کے نان و نفقہ کی ذمہ داری مفت میں کیوں اٹھائی جائے۔

وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُھُنَّ ثَلٰثَۃُ اَشْھُرٍ وَّالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ ط وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُھُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَھُنَّ ط وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مِنْ اَمْرِہٖ یُسْرًا ۝۴ ذٰلِکَ اَمْرُ اللّٰہِ

تمھاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں، اور وہ بھی جنھیں (حیض کی عمر کو پہنچنے کے باوجود) حیض نہیں آیا[۱۳]، اُن کے بارے میں اگر کوئی شک ہے تو اُن کی عدت تین مہینے ہو گی[۱۴]۔ اور حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ وہ حمل سے فارغ ہو جائیں۔ (یہ اللہ کی ہدایات ہیں، اِن کی پیروی کرو) اور (یاد رکھو کہ) جو اللہ سے ڈرے

الطلاق
۶۵

۱۲؎ چنانچہ اُس کی نصرت کے ظہور کے لیے بھی ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اِس کے ظہور میں اگر کچھ دیر ہوتی ہے تو اِس سے مقصود بندوں کے صبر کا امتحان ہوتا ہے۔ بندے کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ اللہ نے جو وعدہ کر رکھا ہے، وہ ضرور پورا کرے گا۔ اگر اُس میں دیر ہو گی تو اتنی ہی ہو گی، جتنی اُس کے صبر کے امتحان کے لیے ضروری ہے اور یہ امتحان اُسی کی بھلائی کے لیے ہے۔“ (تدبر قرآن ۸/ ۴۴۰)

۱۳؎ اصل میں 'وَالّٰئِیْ لَمْ یَحِضْنَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'لَمْ' عربی زبان میں نفی جحد کے لیے آتا ہے۔ لہٰذا اِس سے وہ بچیاں مراد نہیں ہو سکتیں جنھیں ابھی حیض آنا شروع نہیں ہوا، بلکہ وہی عورتیں مراد ہوں گی جنھیں حیض کی عمر کو پہنچنے کے باوجود حیض نہیں آیا۔

۱۴؎ اِس حکم کے ساتھ 'اِنِ ارْتَبْتُمْ' (اگر کوئی شک ہے) کی جو شرط لگی ہوئی ہے، اُس سے کیا مراد ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”...میرا ذہن اِس طرف جاتا ہے کہ 'اِنِ ارْتَبْتُمْ' کی شرط یہاں آئسہ غیر مدخولہ اور آئسہ مدخولہ کے درمیان امتیاز کے لیے آئی ہے۔ یعنی آئسہ اگر مدخولہ ہے تو آئسہ ہونے کے باوجود اِس کا امکان ہے کہ شاید یاس کی حالت عارضی ہو، پھر امید کی شکل پیدا ہو گئی ہو اور اُس کے رحم میں

اَنۡزَلَهٗۤ اِلَيۡكُمۡ‌ؕ وَمَنۡ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرۡ عَنۡهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعۡظِمۡ لَهٗۤ اَجۡرًا‏ ﴿۵﴾
اَسۡكِنُوۡهُنَّ مِنۡ حَيۡثُ سَكَنۡتُمۡ مِّنۡ وُّجۡدِكُمۡ وَلَا تُضَآرُّوۡهُنَّ لِتُضَيِّقُوۡا
عَلَيۡهِنَّ‌ؕ وَاِنۡ كُنَّ اُولَاتِ حَمۡلٍ فَاَنۡفِقُوۡا عَلَيۡهِنَّ حَتّٰى يَضَعۡنَ حَمۡلَهُنَّ‌ ۚ

گا، اللہ اُس کے لیے اُس کے معاملے میں سہولت پیدا کر دے گا۔[15] یہ اللہ کا حکم ہے جو اُس نے تمھاری طرف نازل کیا ہے اور جو اللہ سے ڈرے گا، اللہ اُس کے گناہ اُس سے دور کرے گا اور اُس (کی نیکیوں) کا اجر بڑھا دے گا۔۴-۵

(زمانۂ عدت میں) اِن عورتوں کو وہیں رکھو، جہاں اپنی حیثیت کے مطابق تم رہتے ہو[16] اور اُن کو تنگ کرنے کے لیے ستاؤ نہیں۔[17] اور اگر وہ حاملہ ہوں تو اُن پر اُس وقت تک

کچھ ہو۔ یہی صورت اُس کو بھی پیش آسکتی ہے جس کو ابھی اگرچہ حیض نہیں آیا ہے، لیکن وہ مدخولہ ہے... ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اگر بات یہی کہنی تھی تو صاف صاف یوں کیوں نہ کہہ دی کہ اگر آئسہ مدخولہ ہو تو اُس کی عدت تین مہینے ہے؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ اگر بات یوں کہی جاتی تو اُس سے عدت کی اصل علت واضح نہ ہوتی، جب کہ اُس کا واضح ہونا ضروری تھا۔ اِس عدت کی اصل علت عورت کا مجرد مدخولہ ہونا نہیں، بلکہ یہ اشتباہ ہے کہ ممکن ہے اُس کے رحم میں کچھ ہو۔'' (تدبر قرآن ۴۴۲/۸)

۱۵؎ یعنی مطلقہ عورتوں کے زمانۂ عدت کے قیام اور دوسرے مصارف کا بوجھ اٹھانے میں اللہ سے ڈرے گا، اللہ اُس کے لیے آسانی پیدا کر دے گا۔

۱۶؎ مطلب یہ ہے کہ عورت کو ساتھ رکھنے کا طریقہ ایسا نہیں ہونا چاہیے جس سے اُس کی خودداری مجروح ہو، بلکہ تمام معاملات شوہر کی آمدنی کے لحاظ سے اور اُس کے معیار زندگی کے مطابق ہونے چاہییں۔ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ طلاق دے دینے کے بعد مرد اِس معاملے میں بہت کچھ خست کا رویہ اختیار کر سکتا ہے۔

فَاِنۡ اَرۡضَعۡنَ لَكُمۡ فَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ ۚ وَاۡتَمِرُوۡا بَيۡنَكُمۡ بِمَعۡرُوۡفٍ ۚ وَاِنۡ تَعَاسَرۡتُمۡ فَسَتُرۡضِعُ لَهٗۤ اُخۡرٰى ؕ ۝٦ لِيُنۡفِقۡ ذُوۡ سَعَةٍ مِّنۡ سَعَتِهٖ ؕ وَمَنۡ قُدِرَ عَلَيۡهِ رِزۡقُهٗ فَلۡيُنۡفِقۡ مِمَّاۤ اٰتٰٮهُ اللّٰهُ ؕ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا مَاۤ اٰتٰٮهَا ؕ سَيَجۡعَلُ اللّٰهُ بَعۡدَ عُسۡرٍ يُّسۡرًا ۝٧

خرچ کرتے رہو، جب تک وہ حمل سے فارغ نہ ہو جائیں۔ پھر اگر وہ (تمھارے بچے کو) تمھارے لیے دودھ پلائیں تو اُن کا معاوضہ اُنھیں دو اور یہ معاملہ دستور کے مطابق باہمی مشورے سے طے کر لو۔ اور اگر تم کوئی زحمت محسوس کرو تو بچے کو کوئی دوسری عورت دودھ پلا لے گی۔[18] (تم میں سے) جو خوش حال ہو، وہ اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کرے اور جس کو نپا تلا ہی ملا ہے، وہ اُسی میں سے خرچ کرے جو اللہ نے اُسے دیا ہے۔ اللہ نے جس کو جتنا دیا ہے، اُس سے زیادہ کا وہ اُس پر بوجھ نہیں ڈالتا۔ (تم مطمئن رہو)، اللہ تنگ دستی کے بعد جلد کشادگی بھی عطا فرمائے گا۔[19] ۶-۷

۱۷؎ یعنی اِس عرصے میں عورت کو کسی پہلو سے تنگ کرنے کی تدبیریں اختیار نہ کی جائیں کہ چند ہی دنوں میں پریشان ہو کر وہ شوہر کا گھر چھوڑنے کے لیے مجبور ہو جائے۔

۱۸؎ مطلب یہ ہے کہ کسی کو اُس کی مرضی کے خلاف مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اِس طرح کے تمام معاملات باہمی رضامندی کے ساتھ اور مفاہمت کے جذبے سے طے ہونے چاہییں۔ ایسا نہ ہو سکے تو بہتر یہی ہے کہ کوئی دوسرا بندوبست کر لیا جائے۔

۱۹؎ یہ بڑی بشارت ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ غربت اور احتیاج کے باوجود اللہ کی خوشنودی کے لیے ایثار کرتے ہیں، اللہ اُن کے رزق میں برکت دیتا اور تنگ دستی کے بعد فراخی بھی عطا فرماتا ہے۔ تاہم اِس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی صبر سے کام لے اور ہر حال میں خدا کے

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ﴿۸﴾ فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا ﴿۹﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ ۛۚ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۛؕ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ﴿۱۰﴾ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ

(یہ اللہ کے حدود ہیں۔ اِن سے روگردانی کرو گے تو یاد رکھو کہ تم سے پہلے) کتنی ہی بستیاں ایسی ہوئی ہیں جنھوں نے اپنے پروردگار اور اُس کے رسولوں کے حکم سے سرتابی کی[۲۰] تو ہم نے اُن سے سخت محاسبہ کیا اور اُنھیں بڑی ہول ناک سزا دی۔ سو اُنھوں نے اپنے کیے کا مزہ چکھ لیا اور اُن کا انجام کار محرومی ہوا۔[۲۱] اللہ نے (آخرت میں) اُن کے لیے ایک سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اِس لیے اللہ سے ڈرو، عقل والو جو ایمان لائے ہو۔[۲۲] اللہ نے تمھاری طرف ایک یاددہانی نازل کر دی ہے، ایک ایسا پیغمبر[۲۳] جو

حدود کو قائم رکھنے کا اہتمام کرے۔

۲۰؎ اصل الفاظ ہیں: 'عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا'۔ اِن میں 'عَنْ' اِس امر کا قرینہ ہے کہ 'عَتَتْ' یہاں اعراض کے مفہوم پر متضمن ہے، یعنی سرتابی کی اور منہ موڑا۔

۲۱؎ یہ اُن قوموں کی طرف اشارہ ہے جن کے لیے دنیا ہی میں دینونت کا ظہور ہوا۔ قرآن میں اُن کی سرگذشتیں کئی مقامات پر سنائی گئی ہیں۔

۲۲؎ اِس سے معلوم ہوا کہ عقل اور ایمان میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے۔ آدمی عاقل ہے تو لازماً ایمان لائے گا اور ایمان نہیں رکھتا تو اُس کی عقل میں ضرور کوئی فتور ہے اور وہ جذبات، خواہشات اور تعصّبات سے مغلوب ہو چکی ہے۔

۲۳؎ یہ یاددہانی سے بدل ہے اور یاددہانی سے قرآن مراد ہے۔ گویا قرآن اور پیغمبر ایک ہی

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ﴿۱۱﴾

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ

تمھیں اللہ کی آیتیں سناتا ہے جو ہر چیز کو واضح کر دینے والی ہیں تاکہ اُن لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے آئے جو ایمان لائے اور اُنھوں نے اچھے عمل کیے ہیں۔ اور جو اللہ پر ایمان لائیں اور اچھے عمل کریں، (اُن سے اللہ کا وعدہ ہے کہ) اُنھیں وہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ اُن میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ نے اُن کے لیے بہترین روزی کا اہتمام کر رکھا ہے۔ ۸-۱۱

اللہ وہی ہے جس نے سات آسمان بنائے اور اُنھی کے مانند زمینیں بھی[۲۴]۔ اُس کے

حقیقت کے دو نام ہیں۔ یہ اسلوب اِس لیے اختیار کیا ہے کہ پیغمبر قرآن کے ذریعے سے یاددہانی کرتے تھے اور قرآن پیغمبر ہی کی زبان فیض ترجمان سے لوگوں تک پہنچتا تھا۔ اِسے یاددہانی کے لفظ سے کیوں تعبیر کیا ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”...یہ انسانی فطرت کے تمام مضمرات کی یاددہانی کرتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے خلق کی رہنمائی کے لیے جو ہدایات بھیجیں اور جن کو قومیں فراموش کرتی رہیں، اُن کی بھی یاددہانی کرتا ہے، رسولوں کی تکذیب کرنے والوں اور اُن پر ایمان لانے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جو معاملہ کیا، اُس کی بھی یاددہانی کرتا ہے، اور سب سے بڑھ کر اُس جزا اور سزا کی یاددہانی کرتا ہے جس کا ایک معین دن اِس زندگی کے بعد لازماً ظہور میں آنے والا ہے جو اِس دنیا کی غایت و نہایت ہے۔“ (تدبر قرآن ۸/۴۴۶)

۲۴۔ یعنی یہ آسمان جو تمھیں نظر آتا ہے، اِس جیسے چھ اور بنائے ہیں اور اِسی طرح ہر آسمان

يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿۱۲﴾

سورة التحریم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱﴾ قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ۚ

احکام اُن کے درمیان نازل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ اِس لیے بتادیا ہے کہ تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اور جان لو کہ اللہ کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔[25] ۱۲

—— ۲ ——

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

اے نبی، تم اپنی بیویوں کی دل داری میں وہ چیز کیوں حرام ٹھیراتے ہو، جو اللہ نے تمھارے لیے جائز رکھی ہے؟[26] خیر جو ہوا سو ہوا، اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت

کے ساتھ الگ الگ زمینیں بھی بنائی ہیں جن کے لیے، ظاہر ہے کہ اپنے نوامیس وقوانین اور اپنی مخلوقات ہوں گی۔

۲۵ یہ آخر میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت قدرت اور صفت علم کی یاددہانی کر دی ہے تاکہ لوگوں پر واضح رہے کہ اوپر جو تہدید وتنبیہ اور تسکین وتسلی ہے، وہ کس ہستی کی طرف سے ہے۔

۲۶ بیویوں کی دل داری انسانی معاشرت کا حسن اور اپنی جگہ ایک نہایت پسندیدہ چیز ہے، لیکن پیغمبر کا معاملہ الگ ہے۔ اُس کے ہر قول وفعل کی دین میں بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگر کسی چیز کو استعمال نہ کرنے کی قسم کھالیتے تو شدید اندیشہ تھا کہ کوئی متقی مسلمان اُس چیز کو

وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۲﴾

ابدی ہے[۲۷]۔ اپنی اِس طرح کی قسموں کو توڑ دینا اللہ نے تمھارے لیے ٹھیرا دیا ہے[۲۸] اور اللہ ہی تمھارا مولیٰ ہے اور وہ علیم و حکیم ہے[۲۹]۔ ۱-۲

ہاتھ نہ لگاتا اور وہی صورت پیدا ہو جاتی جو حضرت یعقوب کے معاملے میں ہوئی کہ اُنھوں نے کسی وجہ سے اونٹ کا گوشت کھانا پسند نہیں کیا تو یہود نے اُسے ہمیشہ کے لیے حرام ٹھیرا لیا۔

۲۷؎ اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی کے اعلان میں یہ مبادرت اِس لیے ہے کہ معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ آپ نے محض جذبۂ رأفت و محبت اور جنس ضعیف کی دل داری کے لیے اپنے اوپر ایک پابندی عائد کر لی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اُس پر گرفت فرمائی، لیکن ساتھ ہی معافی کا اعلان بھی فرما دیا کہ یہ گرفت آپ کے لیے گراں باری خاطر کا باعث نہ بنے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...بیویوں کی دل داری کوئی بری بات نہیں ہے، بلکہ یہ شرافت، مروت، فتوت کا تقاضا اور فطرت و شریعت کا مطالبہ ہے جس کی قرآن نے تاکید فرمائی ہے، بشرطیکہ یہ شریعت کے حدود کے اندر رہے۔ اگر یہ اُس سے متجاوز ہونے لگے تو یہ فتنہ بن جاتی ہے جس سے بچنا اور بچانا ضروری ہے۔ لیکن جب کسی فروگزاشت کا محرک نیک ہو تو اُس پر گرفت اِس طرح ہونی چاہیے کہ عفوو درگذر اُس کے ہم رکاب رہے۔'' (تدبر قرآن ۸/۴۵۹)

۲۸؎ اِس میں خطاب کا رخ مسلمانوں کی طرف ہو گیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ قسم توڑنے کا یہ قانون نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ پھر حضور کو ٹوکنے سے مقصود بھی یہی تھا کہ حلال و حرام کے معاملے میں عام مسلمان کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ چنانچہ سب کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص کسی جائز چیز کو اپنے اوپر حرام کر لینے کی قسم کھا بیٹھے تو اُس کو اپنی یہ قسم اللہ کے ٹھیرائے ہوئے طریقے کے مطابق توڑ دینی چاہیے۔

۲۹؎ یعنی اللہ ہی مولیٰ ہے، اِس لیے اُسی کو حق حاصل ہے کہ حلال و حرام کے فیصلے کرے اور

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ

(اِسی طرح کا معاملہ اُس وقت بھی ہوا)، جب پیغمبر نے اپنی ایک بیوی سے راز کی ایک بات کہی[۳۰]۔ پھر اُنھوں نے یہ بات جب (کسی دوسری بیوی کو) بتا دی[۳۱] اور اللہ نے پیغمبر کو اُس سے آگاہ کر دیا[۳۲] تو آپ نے کچھ بات جتائی اور کچھ ٹال دی[۳۳]۔ پھر جب بیوی

اُسی کا علم و حکمت ہے جس کی بنا پر یہ فیصلے ہو سکتے ہیں۔

۳۰۔ یہ بات کیا تھی؟ اللہ تعالیٰ نے اِس کو پردے میں رکھا ہے۔ اِس وجہ سے ہمارے لیے بھی جائز نہیں ہے کہ ہم اِس راز کے درپے ہوں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...حضور کی ازواج رضی اللہ عنھن ہمارے لیے ماؤں کی منزلت میں ہیں۔ بیٹوں کے لیے یہ بات کسی طرح پسندیدہ نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنی ماؤں اور باپوں کے درمیان کے رازوں کے کھوج میں لگیں، بالخصوص جب کہ اِس راز کے انکشاف سے اِس آیت کے فہم میں کوئی مدد بھی نہ مل رہی ہو۔ یہاں راز کے افشا ہی پر تنبیہ فرمائی گئی ہے تو اگر ہم اُس کے درپے ہوں گے تو اِس کے معنی یہ ہوئے کہ جس چیز سے روکا گیا ہے، ہم نے اُس کا ارتکاب کیا۔" (تدبر قرآن ۸/۴۶۰)

۳۱۔ آگے کی آیات سے واضح ہے کہ ایک بیوی نے دوسری بیوی کو بات بتائی اور معاملہ ازواج مطہرات کے درمیان ہی رہا، کسی غیر کے سامنے کوئی افشائے راز نہیں ہوا۔

۳۲۔ یہ اِس لیے ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک شوہر ہی نہیں، بلکہ اللہ کے رسول تھے۔ یہ کسی طرح مناسب نہیں تھا کہ جس بات کو آپ راز کہیں، اُسے گھر ہی میں سہی، لیکن کسی دوسرے کے سامنے افشا کر دیا جائے۔ اِس سے اندیشہ تھا کہ یہ کم زوری باقی رہی تو ایسا نہ ہو کہ کوئی ایسی بات کسی وقت کھول دی جائے جس سے اُس کار عظیم کو نقصان پہنچ سکتا ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انجام دے رہے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے براہ راست توجہ دلائی اور لوگوں پر واضح کر دیا کہ حدود الٰہی

مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ ۝۳ اِنْ تَتُوْبَاۤ اِلَی اللّٰهِ فَقَدْ

کو وہی بتایا تو وہ بولیں: آپ کو کس نے اِس کی خبر دی؟[۳۴] پیغمبر نے کہا: مجھے اُس (پروردگار) نے خبر دی ہے جو علیم و خبیر ہے۔[۳۵] (نبی کی بیویو، اپنے رویے کی اصلاح کرو)، اگر تم دونوں اللہ کی طرف رجوع کرو گی تو یہی تمھارے لیے زیبا ہے، تمھارے دل تو اِس کے لیے

کے معاملے میں کوئی بھی احتساب سے بالاتر نہیں ہے۔

۳۳۔ یعنی آپ نے احتساب تو فرمایا، اِس لیے کہ یہ دین کا تقاضا تھا، لیکن اتنا ہی جس سے تنبیہ ہو جائے۔ چنانچہ کچھ بات آپ نے ظاہر فرمائی اور کچھ نظر انداز کر دی تاکہ یہ تنبیہ اُن کے دل پر زیادہ شاق نہ گزرے۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ غلطی تو یقیناً ہوئی تھی، مگر اِس میں کسی قسم کے فساد نیت کو دخل نہیں تھا۔ یہ محض اِس وجہ سے ہوگئی کہ اُنھوں نے گھر کی بات اپنے ہی گھر میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک محبوب بیوی کے سامنے ظاہر کر دینے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی۔

۳۴۔ اِس سوال کے انداز سے واضح ہے کہ اپنی فروگزاشت کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے اُنھیں فکر یہ ہوگئی کہ یہ بات حضور کو بتائی کس نے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اُن کا ذہن اِسی طرف گیا ہوگا کہ جن بیوی کو اُنھوں نے راز دار بنایا تھا، اُنھی نے یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دی۔ اِس طرف ذہن جانے کے لیے قرینہ موجود تھا، کیونکہ اُن کے سوا اُنھوں نے کسی اور پر یہ بات ظاہر نہیں کی تھی۔ ہو سکتا ہے اُنھیں کچھ غصہ بھی آیا ہو، جیسا کہ اُن کے انداز سوال 'مَنْ اَنْۢبَاَكَ' سے اشارہ ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہوا ہو تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ کسی سے اپنے اعتماد کو ٹھیس پہنچے تو اُس سے رنج ہونا ایک قدرتی بات ہے۔“
>
> (تدبر قرآن ۸/ ۴۶۲)

۳۵۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بتانے سے کہ مجھے خدائے علیم و خبیر نے خبر دی ہے، اُن کی غلط فہمی تو دور ہوگئی، لیکن یہ گرفت دونوں بیویوں پر گراں گزری اور وہ حضور سے کچھ روٹھ سی گئیں۔ ایک اِس لیے کہ افشائے راز اگر ہوا تو دوسری بیوی ہی کے سامنے ہوا، اِس پر محاسبہ کیوں؟ اور دوسری اِس

صَغَتۡ قُلُوۡبُکُمَا ۚ وَ اِنۡ تَظٰهَرَا عَلَیۡهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوۡلٰىهُ وَ جِبۡرِیۡلُ وَ صَالِحُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۚ وَ الۡمَلٰٓئِکَةُ بَعۡدَ ذٰلِكَ ظَهِیۡرٌ ﴿۴﴾ عَسٰی رَبُّهٗۤ اِنۡ طَلَّقَکُنَّ اَنۡ یُّبۡدِلَهٗۤ اَزۡوَاجًا خَیۡرًا مِّنۡکُنَّ مُسۡلِمٰتٍ مُّؤۡمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ

مائل ہی ہیں[۳۶]۔ لیکن اگر نبی کے خلاف ایکا کرو گی تو اُس کا کچھ نقصان نہ ہوگا، اِس لیے کہ اُس کا حامی اللہ ہے، اور جبریل اور تمام صالح مسلمان اور مزید براں فرشتے بھی اُس کے حامی اور مددگار ہیں[۳۷]۔ بعید نہیں کہ اگر وہ تمھیں طلاق دے دے تو اُس کا پروردگار تمھارے بدلے میں اُسے تم سے بہتر بیویاں عطا فرما دے ــــــ مسلمان، مومنہ، فرماں بردار،

لیے کہ بات میرے ہی سامنے کی گئی تھی، کسی غیر کے سامنے نہیں، پھر عتاب کی کیا وجہ ہے؟ اِس کے معنی تو یہ ہوئے کہ مجھے غیر خیال کیا گیا ہے۔ اِس سے حضور کے خلاف دونوں میں ایک طرح کا ایکا بھی ہو گیا۔ آگے اِسی پر گرفت فرمائی ہے۔

۳۶؎ اصل الفاظ ہیں: 'اِنۡ تَتُوۡبَآ اِلَی اللّٰهِ، فَقَدۡ صَغَتۡ قُلُوۡبُکُمَا'۔ مطلب یہ ہے کہ دونوں بیویاں اگرچہ روٹھی ہوئی تھیں، مگر یہ روٹھنا ازراہ تدلل اور اُس اعتماد کی بنا پر تھا جو بیوی کو شوہر کی محبت پر ہوتا ہے۔ اِس طرح کے روٹھنے میں خفگی محض ظاہر کا پردہ ہوتی ہے۔ اِس کے پیچھے یہ خواہش موجود ہوتی ہے کہ دوسری طرف سے ذرا ملاطفت کا اظہار ہو تو اندر سخت بے قراری ہے کہ جلد سے جلد ملاپ ہو جائے۔ یہ مدعا اُس ترجمے سے واضح ہو جاتا ہے جو ہم نے اوپر کیا ہے۔ ہمارے مفسرین سے اِس آیت کی تاویل میں سخت لغزش ہوئی ہے۔ ہم نے جو ترجمہ کیا ہے، اُس کے دلائل کوئی شخص اگر دیکھنا چاہے تو امام حمید الدین فراہی کی تفسیر سورۂ تحریم میں دیکھ لے سکتا ہے۔

۳۷؎ مطلب یہ ہے کہ تمھارا معاملہ کسی عام شخص سے نہیں ہے، خدا کے پیغمبر سے ہے۔ یہ عظیم فرق ہر حال میں ملحوظ رہنا چاہیے۔ اِس ہستی کے خلاف ایکا کرو گی تو اپنا ہی نقصان کرو گی۔ جس کا مولیٰ اللہ ہے، اور جبریل اور ملائکہ اور تمام صالح مسلمان جس کے ساتھ ہیں، اُس کے خلاف کوئی

عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّ اَبْكَارًا ﴿٥﴾
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ

توبہ کرنے والیاں، عبادت گزار اور درویشی کی زندگی بسر کرنے والیاں[۳۸]، خواہ شوہر دیدہ ہوں یا کنواریاں[۳۹]۔ ۳-۵

ایمان والو، (جب پیغمبر اور اُس کی بیویاں بھی احتساب سے بالا نہیں تو) تم بھی

ایکا آخر کس طرح کامیاب ہو سکتا ہے؟

۳۸۔ اصل میں لفظ 'سٰٓئِحٰت' آیا ہے۔ یہ سیاحت سے ہے۔ ایک دینی اصطلاح کے طور پر یہ لفظ اُس سیر و سیاحت کے لیے مستعمل رہا ہے جو علم و معرفت کی جستجو اور تزکیہ و تطہیر کے لیے کی جائے۔ قرآن کے استعمالات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے زمانوں میں اِس کے معنی محض درویشی اور ریاضت کی زندگی بسر کرنے کے رہ گئے۔ لفظ کے معنی میں اس نوعیت کی تجرید عربی زبان کے کئی لفظوں میں ہوئی ہے۔

۳۹۔ یعنی اصلی مقصود یہ اوصاف ہیں۔ اِس سے فرق نہیں پڑتا کہ وہ شوہر دیدہ ہیں یا کنواریاں ہیں۔ احتساب کے تقاضے سے اِس آیت کا مضمون کسی قدر تیز ہو گیا ہے۔ تاہم مدعا یہی ہے کہ وہ بے جا خودداری سے دست بردار ہوں اور آگے بڑھیں۔ اُن سے فروگزاشت ہوتی ہے تو دوسروں سے زیادہ وہ سزاوار ہیں کہ ضد سے کام نہ لیں، بلکہ اپنی اصلاح کر لیں۔ ایسا نہ ہوا اور اُنھوں نے اِسی طرح ایکا کیے رکھا تو اللہ اپنے پیغمبر کی رفاقت کے لیے اُن سے بہتر بیویاں منتخب فرما دے گا، جن کے اندر وہ تمام اوصاف ہوں گے جو ہونے چاہییں۔ بیوی اور شوہر کا رشتہ پیغمبر کی شخصیت اور اُس کے مشن سے بڑھ کر نہیں ہے۔ وہ اِس حقیقت کو سمجھیں اور جلد سے جلد پیغمبر کو راضی کر لیں۔

اِس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ دین کے معاملے میں ازواج مطہرات بھی احتساب سے بالاتر نہیں ہیں تو تا بہ دیگراں چہ رسد۔ ہر شخص کی ذمہ داری ہے کہ باہمی اعتماد و محبت کے جذبات کو

عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴿٦﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ؕ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٧﴾

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ

اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اُس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن لوگ[40] اور پتھر ہوں گے، (جنھیں وہ پوجتے رہے)۔ جس پر تند خو اور سخت گیر فرشتے مقرر ہوں گے۔ اللہ جو بات اُنھیں فرمائے گا، اُس کی تعمیل میں نافرمانی نہ کریں گے اور وہی کریں گے جس کا حکم اُنھیں دیا جائے گا[41]۔ اُس وقت کہا جائے گا: اے کافرو، آج معذرتیں پیش نہ کرو، تمھیں وہی بدلے میں دیا جا رہا ہے جو تم کرتے رہے ہو۔ ۶-۷

ایمان والو، اللہ کی طرف مخلصانہ رجوع کرو[42]۔ امید ہے[43] کہ تمھارا پروردگار تمھارے

حدود الٰہی کا پابند رکھے اور اپنے دائرۂ اختیار میں دین و شریعت کی ترجیحات قائم رکھنے کی کوشش کرے۔

[40] یعنی وہ لوگ جنھوں نے دنیا کی زندگی میں اپنا تزکیہ نہیں کیا اور اُنھی غلاظتوں میں لتھڑے ہوئے خدا کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے جن سے پاک کرنے کے لیے اُس نے اپنی شریعت نازل کی ہے۔

[41] مطلب یہ ہے کہ آج احتساب کے لیے کہا جاتا ہے تو یہ بات تمھیں شاق گزرتی ہے اور اِسے اہل و عیال کی محبت کے منافی سمجھتے ہو، مگر دوزخ کے داروغوں کو یہ ہرگز شاق نہ گزرے گی اور خدا کے حکم کی تعمیل میں کسی کی محبت بھی مانع نہ ہو گی کہ لوگ اُن کی گرفت سے نکلنے کی کوئی راہ پیدا کر لیں۔

التحریم ۶۶

يُكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝٨

گناہ تم سے دور کر دے اور تمھیں ایسے باغوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں، اُس دن جب اللہ اپنے نبی کو اور اُن لوگوں کو جو اُس کے ساتھ ایمان لائے ہیں، رسوا نہ کرے گا۔ اُن کی روشنی اُن کے آگے اور اُن کے دہنے چل رہی ہوگی۔ وہ دعا کر رہے ہوں گے: پروردگار، ہماری اِس روشنی کو تو ہمارے لیے مکمل کر دے[44] اور ہم سے درگذر فرما۔ حقیقت یہ ہے کہ تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے[45]۔ ۸

---

[42] اصل میں 'تَوْبَةً نَّصُوْحًا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن سے مراد وہ توبہ ہے جو سچے عزم اور پوری انابت کے ساتھ کی جائے، جس کے بعد گناہ کی طرف جانے کی کوئی خواہش باقی نہ رہے۔

[43] اصل میں 'عَسٰى' ہے۔ یہ خدا کی طرف سے بندوں کو خطاب کر کے آئے تو اِس کی نوعیت وعدے اور بشارت کی ہوتی ہے۔

[44] اصل الفاظ ہیں: 'اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا'۔ اِن سے کیا مراد ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''...یہ روشنی اُن لوگوں کو جنت میں داخل ہونے سے پہلے جنت کے راستے کو طے کرنے کے لیے دکھائی جائے گی، جب کہ اُن کے دہنے اور آگے کے سوا ہر طرف اندھیرا گھپ ہوگا۔ اِس وجہ سے یہ لوگ گہرے جذبۂ شکر کے ساتھ یہ دعا کریں گے کہ اے رب، تو اِس روشنی کو کامل کر اور ہماری مغفرت فرما۔ ظاہر ہے کہ جب راستہ طے کرنے کے لیے یہ روشنی عطا ہوگی تو اِس سے قدرتی طور پر یہ توقع بھی پیدا ہوگی کہ اللہ تعالیٰ اُن کو اپنی مغفرت سے نوازنے والا ہے اور وہ

التحریم ۶۶

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۹

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا

اے نبی، (تمھارے مخاطبین میں سے اب کوئی بھی رعایت کا مستحق نہیں رہا، اِس لیے) منکرین اور منافقین، سب سے جہاد کرو اور اِن پر سخت ہو جاؤ[46]، اور (اِنھیں بتا دو کہ) اِن کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے! ۹

(اِنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہر شخص اپنے عمل کے لیے جواب دہ ہے)۔ اللہ منکروں کے لیے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی مثال پیش کرتا ہے۔ دونوں ہمارے بندوں میں سے دو صالح بندوں کے گھر میں تھیں، مگر اُنھوں نے اپنے شوہروں سے بے وفائی کی[47] تو اللہ

وقت لازماً اِس روشنی کے کامل ظہور کا ہوگا۔ چنانچہ وہ اپنی اِسی توقع کے پورے کیے جانے کے لیے دعا کریں گے۔'' (تدبر قرآن ۸/ ۴۷۲)

۴۵۔ یعنی پہلے تو عقیدہ تھا، آج یہ حقیقت آنکھوں سے بھی دیکھ لی کہ تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

۴۶۔ جہاد کا لفظ زبان اور تلوار، دونوں سے جہاد کے لیے آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تزکیہ وتطہیر کا مرحلہ اب پایۂ تکمیل کو پہنچ رہا ہے، اِس لیے نرمی سے سمجھانے کا طریقہ چھوڑ دیجیے۔ عذاب سے پہلے واضح ہو جانا چاہیے کہ کون کہاں کھڑا ہے۔ اِس کے لیے ضروری ہے کہ سختی کے ساتھ احتساب کیا جائے اور جو جس رویے کا مستحق ہے، اُس کے ساتھ وہی معاملہ کر کے اُسے کیفر کردار تک پہنچا دیا جائے تاکہ خدا کی دینونت پورے انصاف کے ساتھ برپا ہو۔

۴۷۔ یعنی دین کے معاملے میں بے وفائی کی۔ اصل میں لفظ 'خَانَتَا' استعمال ہوا ہے۔ اِس

مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّ قِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ۞

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَ نَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۞ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ

کے مقابلے میں وہ اُن کے کچھ کام نہ آسکے اور دونوں عورتوں کو حکم ہوا کہ جاؤ آگ میں جانے والوں کے ساتھ تم بھی آگ میں چلی جاؤ۔ ۱۰

اللہ ماننے والوں کے لیے فرعون کی بیوی کی مثال پیش کرتا ہے، جب اُس نے دعا کی: پروردگار، میرے لیے جنت میں اپنے ہاں ایک گھر بنادے اور مجھے فرعون اور اُس کے عمل سے نجات دے اور اِس ظالم قوم سے نجات عطا فرما۔[۴۸] اور عمران کی بیٹی مریم کی مثال پیش کرتا ہے جس نے اپنا دامن پاک رکھا۔[۴۹] پھر ہم نے اُس کے اندر اپنی طرف سے روح پھونک دی، اور اُس نے اپنے پروردگار کے ارشادات اور اُس کی کتابوں کی

سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ وہ بدکاری کی مرتکب ہوئی تھیں۔

۴۸؎ مطلب یہ ہے کہ قصر شاہی کی عشرت گاہوں میں بھی اُن کا ایمان زندہ رہا۔ وہ اِس ماحول سے بالکل متاثر نہیں ہوئیں اور برابر دعا کرتی رہیں کہ اُن کا پروردگار اُنھیں اِس دار العذاب سے نجات دلا دے۔

۴۹؎ اصل الفاظ ہیں: 'اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا'۔ لفظ 'فَرْج' عربی زبان میں اندیشے کی جگہ کے لیے آتا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے وجود کے اُن تمام حصوں پر پہرا لگائے رکھا، جہاں سے کوئی بدی راہ پا سکتی تھی۔ آگے اِسی کا صلہ بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُنھیں اپنی ایک عظیم

وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ﴿١٢﴾

تصدیق کی اور وہ فرماں بردار لوگوں میں سے تھی۔[۵۰] ۱۱-۱۲

نشانی کے ظہور کے لیے منتخب فرمایا اور اُن کے لیے اپنی وہ شان ظاہر فرمائی جو استاذ امام کے الفاظ میں اِس آسمان کے نیچے کسی کے لیے بھی ظاہر نہیں فرمائی۔

۵۰۔ یعنی فرعون کی بیوی کی طرح عمران بن ماتان کی بیٹی سیدہ مریم نے بھی بنی اسرائیل کے نہایت برے ماحول میں اور اُس زمانے میں پرورش پائی، جب بنی اسرائیل کا مذہبی اور اخلاقی زوال اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا، لیکن اُن کی توجہ، محنت اور انابت و عبادت نے اُنھیں ایک ایسے مقام پر پہنچا دیا جو فرشتوں کے لیے بھی قابل رشک تھا۔

یہ چاروں مثالیں عورتوں کی ہیں۔ برائی اور بھلائی، دونوں کی مثال کے لیے اللہ تعالیٰ نے اُنھی کا انتخاب کیا ہے۔ اِس سے کیا مقصود ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اِس سے مقصود اِس عام غلط فہمی کو رفع کرنا ہے کہ تمام برائی کا سرچشمہ عورت ہی ہے۔ اپنی خلقت کے اعتبار سے عورت بھی خیر و شر، دونوں صلاحیتوں کی حامل ہے۔ اگر وہ اپنے اختیار و ارادہ کو صحیح طور پر استعمال نہ کرے تو بہتر سے بہتر رفیق کی بدترین ساتھی بن سکتی ہے، اور اگر وہ ایمان و قنوت کی حلاوت سے آشنا ہو جائے تو بدتر سے بدتر ماحول کے اندر بھی وہ حور جنت ہے۔“ (تدبر قرآن ۸/۴۷۶)

لاہور

۲۶/ اکتوبر ۲۰۰۹ء

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمین

باب ہفتم

الملک ـ الناس

قریش کے سرداروں کو انذار قیامت،
اُن پر اتمام حجت، اِس کے نتیجے میں اُنھیں عذاب کی وعید
اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سرزمین عرب میں
غلبۂ حق کی بشارت

باب ہفتم

الملک ۔ الناس

۶۷ —— ۱۱۴

یہ قرآن مجید کا ساتواں باب ہے۔ اِس میں 'الملک' (۶۷) سے 'الناس' (۱۱۴) تک اڑتالیس سورتیں ہیں۔ اِن سورتوں کے مضامین اور باب میں اِن کی ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن میں سے پہلی چھیالیس سورتیں ام القریٰ مکہ میں اور آخری دو —— 'الفلق' اور 'الناس' —— ہجرت کے فوراً بعد مدینہ میں نازل ہوئی ہیں۔

قرآن مجید کے دوسرے تمام ابواب کی طرح یہ چیز اِس باب میں بھی ملحوظ ہے کہ یہ مکی سورتوں سے شروع ہوتا اور مدنیات پر ختم ہو جاتا ہے۔

اِس میں خطاب اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہوا ہے، لیکن تسلی اور بشارت کی چند سورتوں کے سوا اِس کی نوعیت محض التفات کی ہے۔ اِس باب کے اصل مخاطب ابولہب کی قیادت میں قریش مکہ ہیں۔ چنانچہ مضمون کے تدریجی ارتقا سے یہ بات اِس کی آخری سورتوں میں اِس قدر واضح ہو جاتی ہے کہ کسی دوسری رائے کے لیے کوئی گنجایش باقی نہیں رہتی۔

اِس کا موضوع قریش کے سرداروں کو انذار قیامت، اُن پر اتمام حجت، اِس کے

نتیجے میں اُنھیں عذاب کی وعید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سرزمین عرب میں غلبۂ حق کی بشارت ہے۔

یہ موضوع ابتدا سے انتہا تک پورے باب میں اِس خوبی کے ساتھ زیر بحث آیا ہے کہ دعوت وانذار سے ہجرت و براءت تک رسولوں کی دعوت کے سب مراحل اِس سے بالکل نمایاں ہو کر سامنے آ جاتے ہیں۔

اِس ترتیب کو سمجھنے کے لیے اِس کے مباحث کا خلاصہ ہم ذیل میں بیان کیے دیتے ہیں:

۱۔ مرحلۂ انذار

الملک ۶۷ - الجن ۷۲

قیامت کا اثبات اور اُس کے بارے میں قریش کو انذار ـــــ نذیر کی حیثیت سے رسول کو جھٹلانے کا نتیجہ ۶۷-۶۸

جزا و سزا کا اثبات، اُس کی تصویر اور نذیر کی حیثیت سے قرآن کی حقانیت پر 'مَا تُبۡصِرُوۡنَ' اور 'مَا لَا تُبۡصِرُوۡنَ' کی شہادت ـــــ اِس انذار کا مذاق اڑانے والوں کو عذاب کی وعید اور پیغمبر کو اُن کے مقابلے میں صبر کی تلقین ۶۹-۷۰

'مَا تُبۡصِرُوۡنَ' اور 'مَا لَا تُبۡصِرُوۡنَ' کے اجمال کی تفصیل اور اُس کے حوالے سے قریش کو اُن کے رویے پر تنبیہ ۷۱-۷۲

۲۔ مرحلۂ انذار عام

المزمل ۷۳ - الم نشرح ۹۴

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو انذار عام کے لیے تیاری کی ہدایت ـــــ اِس انذار کا حکم، اِس کے حدود، تقاضے اور اِس کی ابتدا ۷۳-۷۴

قیامت کا اثبات اور اُس کے حوالے سے قریش کو انذار ۷۵-۷۶

قیامت کا اثبات اور اُس کے حوالے سے قریش کو انذار ۷۷-۷۸

قیامت کا اثبات، اُس کے حوالے سے قریش کو انذار اور اُس کے بارے میں اُن کے رویے پر اُنھیں تنبیہ ۷۹-۸۰

قیامت کی ہلچل اور اُس میں جزا و سزا کے حوالے سے قریش کو تنبیہ ۸۱-۸۲

قیامت کی جزا و سزا کے حوالے سے تنبیہ ۸۳-۸۴

قیامت سے متعلق قریش کے شبہات کی تردید اور اہل ایمان پر اُن کے ظلم و ستم اور پیغمبر اور اُس کی دعوت کے مقابلے میں اُن کی چالوں پر اُنھیں عذاب کی وعید ۸۵-۸۶

انذار قیامت اور نذیر کی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ۸۷-۸۸

انذار قیامت اور قریش کے سرداروں کو اُن کی سرکشی اور طغیان پر تنبیہ ۸۹-۹۰

انذار قیامت، سرکشی پر تنبیہ اور خاتمۂ کلام کے طور پر اُن کے لیے فلاح اور خسران کے راستوں کی وضاحت ۹۱-۹۲

نذیر کی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور آیندہ ایک بڑی کامیابی کی بشارت ۹۳-۹۴

۳۔ مرحلۂ اتمام حجت

التین ۹۵ - قریش ۱۰۶

اتمام حجت کے اسلوب میں قیامت کا اثبات، اُس کے بارے میں قریش کے رویے پر اُن کو تنبیہ، اُن کے بڑے سردار کو تہدید جو قرآن جیسی کتاب کے ذریعے سے تعلیم کے بعد بھی اپنی سرکشی پر قائم رہا ۹۵-۹۶

نذیر کی حیثیت سے قرآن کی عظمت کا بیان ـــــ قریش کو اور اُن کی پشت پر کھڑے

ہوئے اہل کتاب کو اُن کے اِس مطالبے کی لغویت پر تنبیہ کہ قرآن کے بجائے اُن پر ایک ایسی کتاب اتاری جائے جسے خدا کا کوئی فرستادہ آسمان سے اُن کے لیے پڑھتا ہوا لے کر اترے ۹۷-۹۸

اِسی اسلوب میں قیامت کے متعلق قریش کو نصیحت کہ اُس کے بارے میں وہ کسی غلط فہمی میں نہ رہیں۔ وہاں چھوٹی بڑی ہر نیکی اور برائی پوری قطعیت کے ساتھ اُن کے سامنے آجائے گی ـــــ اُنھیں تنبیہ کہ لوٹ مار اور بدامنی کے ماحول میں محض حرم سے اپنے تعلق کی بنا پر جس امن سے وہ رہ رہے ہیں اور خدا کی جو نعمتیں اِس گھر کے طفیل اُنھیں حاصل ہیں، اُن پر خدا کا شکر ادا کریں اور اُس کے دیے ہوئے رزق میں سے اُس کی راہ میں خرچ کریں۔ اِس کے بجائے جو کچھ وہ کر رہے ہیں، اُس کے ساتھ اُنھیں سوچنا چاہیے کہ اُن کا انجام کیا ہوگا ۹۹-۱۰۰

قیامت کی تصویر اور اُس سے اُن کی غفلت پر انتہائی موثر اسلوب میں تنبیہ ۱۰۱-۱۰۲

خدا کے قانون مجازات کا اثبات اور اُس کے حوالے سے اُن کے سرداروں کو تہدید کہ اُن کا ٹھکانا اب وہ آگ ہوگی جو دلوں تک پہنچے گی ۱۰۳-۱۰۴

واقعۂ فیل کے حوالے سے تنبیہ و تہدید اور بیت اللہ کی تولیت کے طفیل جو نعمتیں اُنھیں حاصل تھیں، اُن کے حوالے سے تلقین کہ اُن کا حق اب اُنھیں ادا کرنا چاہیے ۱۰۵-۱۰۶

۴۔ مرحلۂ ہجرت و براءت

الماعون ۱۰۷ - الاخلاص ۱۱۲

قریش کے سرداروں کی فرد قرارداد جرم، اُنھیں عذاب کی وعید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بشارت کہ حرم کی تولیت اب اُن کی جگہ آپ کو حاصل ہوگی اور آپ کے دشمنوں کی جڑ سرزمین عرب سے ہمیشہ کے لیے کٹ جائے گی ۱۰۷-۱۰۸

ام القریٰ کے ائمۂ کفر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلان براءت اور سرزمین عرب میں غلبۂ حق کی بشارت ۱۰۹-۱۱۰

قریش کی قیادت، خاص کر ابولہب کا نام لے کر اُس کی ہلاکت کی پیشین گوئی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے عقیدۂ توحید کا فیصلہ کن اعلان ۱۱۱-۱۱۲

۵۔خاتمہ

الفلق ۱۱۳ - الناس ۱۱۴

خاتمۂ باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین کہ آپ اپنی اور اپنے مشن کی حفاظت کے لیے دنیا کی تمام آفتوں سے اپنے پروردگار کی پناہ مانگتے رہیں، یہود و قریش اور ذریت ابلیس کے شیاطین جن و انس اگلے مراحل میں پوری قوت کے ساتھ آپ پر حملہ کرنے والے ہیں ۱۱۳-۱۱۴

مرحلۂ انذار

الملک - الجن

۶۷ —— ۷۲

الملک ۶۷ - الجن ۷۲

قیامت کا اثبات اور اُس کے بارے میں قریش کو انذار ـــــ نذیر کی حیثیت سے رسول کو جھٹلانے کا نتیجہ ۶۷-۶۸

جزا و سزا کا اثبات، اُس کی تصویر اور نذیر کی حیثیت سے قرآن کی حقانیت پر 'مَا تُبۡصِرُوۡنَ' اور 'مَا لَا تُبۡصِرُوۡنَ' کی شہادت ـــــ اِس انذار کا مذاق اڑانے والوں کو عذاب کی وعید اور پیغمبر کو اُن کے مقابلے میں صبر کی تلقین ۶۹-۷۰

'مَا تُبۡصِرُوۡنَ' اور 'مَا لَا تُبۡصِرُوۡنَ' کے اجمال کی تفصیل اور اُس کے حوالے سے قریش کو اُن کے رویے پر تنبیہ ۷۱-۷۲

الملك - القلم

٦٧ ـــــ ٦٨

الملک - القلم

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ میں قیامت اور دوسری میں اُس عذاب سے خبردار کیا گیا ہے جو رسول کی تکذیب کے نتیجے میں اُس کی قوم پر لازماً آتا ہے۔ دونوں میں خطاب اگرچہ جگہ جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہے، لیکن روے سخن ہر جگہ قریش کے سرداروں کی طرف ہے۔ اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ ام القریٰ مکہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ انذار میں نازل ہوئی ہیں۔

پہلی سورہ ـــــ الملك ـــــ کا موضوع قریش پر یہ واضح کرنا ہے کہ دنیا جس طرح اور جس غایت کے لیے وجود میں آئی ہے، قیامت اُس کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ لہٰذا اُس سے بے خوف ہو کر اپنے آپ کو اُس انجام تک نہ پہنچاؤ، جہاں اعتراف جرم کے سوا کوئی چارہ اور اِس اعتراف کے نتائج کو بھگتنے کے سوا کوئی راستہ باقی نہ رہے۔ اُس پروردگار سے ڈرو جو آج بھی، جس وقت اور جس طرح چاہے، تمھیں اپنی گرفت میں لے سکتا ہے۔

سورہ میں استدلال خدا کی رحمت، قدرت اور ربوبیت کی اُن نشانیوں سے ہے جو انسان ہر لحظہ اپنے گرد و پیش دیکھتا ہے۔

دوسری سورہ ـــــ القلم ـــــ کا موضوع نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کردہ کتاب اور آپ کی سیرت سے قریش کے سرداروں کی سیرت و کردار اور اُن کے مزعومات کا موازنہ کر کے اُنھیں اِس حقیقت پر متنبہ کرنا ہے کہ خدا کی کتاب اور اُس کے پیغمبر کے مقابلے میں وہ سرکشی اور تمرد کا رویہ اختیار نہ کریں۔ اُن کے سب باغ و بہار اور اُن کا تمام سرمایۂ فخر و مباہات عذاب کی زد میں ہے۔ وہ عقل سے کام لیں، اُن کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ وہ صرف اِس لیے باتیں بنا رہے ہیں کہ اُنھیں ڈھیل دی جا رہی ہے۔ خدا کا فیصلہ عنقریب اُن کے بارے میں صادر ہو جائے گا۔

سورہ کے آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کے ساتھ اِس فیصلے کا انتظار کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

سورۃ الملک

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تَبٰرَکَ الَّذِیۡ بِیَدِہِ الۡمُلۡکُ ۫ وَ ہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرُۨ ۙ﴿۱﴾ الَّذِیۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَ الۡحَیٰوۃَ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡغَفُوۡرُ ۙ﴿۲﴾

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

بہت بزرگ، بہت فیض رساں ہے، وہ (پروردگار) جس کے ہاتھ میں (عالم کی) پادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے[۱]۔ (وہی) جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے[۲]۔ اور وہ زبردست بھی ہے اور درگذر فرمانے والا بھی[۳]۔ ۱-۲

۱۔ یہ اُس مشاہدے کا بیان ہے جو اِس کائنات کی نشانیوں پر غور کیا جائے تو ہر عاقل اور صاحب فکر انسان کے سامنے آجاتا ہے اور وہ یہ ماننے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے کہ کائنات کا خالق نہ کھلنڈرا ہے، نہ غیر ذمہ دار اور نہ محض محرک اول اور ایک خاموش علۃ العلل، جیسا کہ بعض فلاسفہ اور سائنس دانوں نے سمجھا ہے، بلکہ بڑا ہی بزرگ، بہت فیض رساں اور اِس کے ساتھ بے پناہ قدرت والا بھی ہے۔ چنانچہ عالم کے خیر و شر سے وہ نہ غیر متعلق ہو سکتا ہے اور نہ اُس کو کسی انجام تک پہنچانا اُس کے لیے کچھ مشکل ہے۔

۲۔ یہ اوپر والی بات ہی دوسرے اسلوب میں بیان فرمائی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”عدم کے بعد زندگی اور زندگی کے بعد پھر موت اِس بات کی شہادت ہے کہ اِس دنیا کا کارخانہ بے غایت و بے مقصد نہیں ہے کہ یوں ہی چلتا رہے یا یوں ہی ایک دن ختم ہو جائے۔

الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۝۳ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ کَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْکَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ ۝۴

وَلَقَدْ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّیٰطِیْنِ

(وہی) جس نے سات آسمان بنائے، تہ برتہ۔ رحمٰن کی تخلیق میں تم کوئی خلل نہ پاؤ گے۔ پھر پلٹ کر دیکھو، کیا کوئی نقص کہیں پاتے ہو؟ پھر بار بار نگاہ دوڑاؤ، تمھاری نگاہ تھک کر تمھارے پاس نامراد لوٹ آئے گی۔[۴] ۳-۴

(تم دیکھتے نہیں کہ) چرخ زیریں کو ہم نے چراغوں سے رونق دی ہے[۵] اور اِنھی

اگر ایسا ہو تو یہ ایک کارِ عبث ہوگا جو ایک حکیم و قدیر اور بافیض ہستی کی شان کے خلاف ہے، بلکہ یہ اِس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اِس دنیا میں جس کو زندگی بخشتا ہے، اِس امتحان کے لیے بخشتا ہے کہ دیکھے کون اُس کی پسند کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اور کون اپنی من مانی کرتا ہے۔ اِس امتحان کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ ایک ایسا دن بھی لائے جس میں لوگوں کو از سرِ نو زندہ کرے، ہر شخص کی نیکی اور بدی کا حساب ہو اور وہ اپنے عمل کے مطابق جزا یا سزا پائے۔''

(تدبرقرآن ۴۹۱/۸)

۳؎ یعنی وہ زبردست ہے، لہٰذا آزمایش کی یہ مدت گزرنے کے بعد جو سزا کے مستحق ہوں گے، وہ اُس کی پکڑ سے بچ نہ سکیں گے اور درگذر فرمانے والا بھی ہے، لہٰذا جو اُس کی مغفرت کے سزاوار ہوں گے، وہ اُس سے محروم نہ رہیں گے۔

۴؎ یہ اُس قدرت و عظمت اور فیض بخشی و ربوبیت کا مشاہدہ کرنے کی دعوت دی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس پروردگار کی یہ نشانیاں تم جب چاہے، اوپر نگاہ اٹھا کر دیکھ سکتے ہو، اُس کے لیے وہ کون سا کام ہے جو دشوار ہو سکتا ہے؟

وَاَعۡتَدۡنَا لَهُمۡ عَذَابَ السَّعِيۡرِ ۝۵ وَلِلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِرَبِّهِمۡ عَذَابُ جَهَنَّمَ ؕ وَبِئۡسَ الۡمَصِيۡرُ ۝۶

چراغوں کو شیطانوں کے لیے ہم نے سنگ ساری بنا دیا ہے، اور اُن کے لیے دہکتی ہوئی آگ کا عذاب بھی ہم نے مہیا کر رکھا ہے۔[6] جن لوگوں نے اپنے پروردگار کا کفر کیا ہے،[7] اُن کے لیے (اِسی طرح) جہنم کی سزا ہے، اور وہ کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے![8] ۵-۶

۵؎ یعنی کائنات کا خالق صرف قدرت والا ہی نہیں، اِس کے ساتھ عظیم رحمت والا بھی ہے کہ اُس نے آسمان کی چھت کو ایسے قمقموں سے سجا دیا ہے جن کی حسن افروزی اور فیض بخشی ہر اندازے اور خیال سے باہر ہے۔

۶؎ یہ اُس سنگ ساری کا بیان ہے جو شہابوں کی صورت میں اُن شیطانوں پر عالم بالا میں ہر وقت ہوتی رہتی ہے جو سن گن لینے کے لیے اوپر جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اِس سے مقصود اِس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِس اہتمام کے ساتھ دنیا کو پیدا کر کے اُسے چھوڑ نہیں دیا ہے، بلکہ وہ برابر اُس کی نگرانی کر رہا ہے۔

۷؎ پروردگار کے کفر سے مراد یہاں قیامت اور جزا و سزا کا انکار ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اِس کی وجہ... یہ ہے کہ قیامت کے انکار سے اللہ تعالیٰ کی تمام بنیادی صفات ــــ قدرت، عدل، رحمت اور ربوبیت ــــ کی نفی ہو جاتی ہے۔ اِن صفات کی نفی کر کے خدا کو ماننا اور نہ ماننا، دونوں یکساں ہے۔ چنانچہ قرآن نے اِسی بنیاد پر مشرکین کو جگہ جگہ کفار سے تعبیر کیا ہے، حالاں کہ وہ خدا کے منکر نہیں تھے۔“ (تدبر قرآن ۸/ ۴۹۳)

۸؎ اوپر شیطانوں کے ساتھ جس معاملے کا ذکر ہوا ہے، یہ اُس سے اُن انسانوں کے انجام کی طرف گریز ہے جو اپنے پروردگار کی قدرت اور رحمت کی یہ نشانیاں دیکھنے کے باوجود قیامت کا انکار کرتے ہیں اور اِس طرح گویا اپنے پروردگار کا انکار کرتے ہیں۔

اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّهِيَ تَفُوْرُ ⑦ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ؕ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ⑧ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ ۙ۬ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۚۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ⑨ وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ⑩ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ⑪ اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ⑫

یہ جب اُس میں ڈالے جائیں گے تو اُس کا دھاڑنا سنیں گے اور وہ ابل رہی ہو گی۔ لگے گا کہ غضب سے پھٹی پڑ رہی ہے۔ ہر مرتبہ جب کوئی بھیڑ اُس میں ڈالی جائے گی تو اُس کے نگران اُن سے پوچھیں گے: کیا تمھارے پاس کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا؟ وہ جواب دیں گے: ہاں، ایک خبردار کرنے والا تو یقیناً ہمارے پاس آیا تھا، مگر ہم نے اُسے جھٹلا دیا اور کہہ دیا کہ اللہ نے کوئی چیز نہیں اتاری۔ (ہم نے کہہ دیا کہ) تم لوگ تو بس ایک بڑی گم راہی میں پڑے ہوئے ہو[9]۔ اور وہ کہیں گے: اگر ہم سنتے یا سمجھتے تو آج اِن دوزخ والوں میں نہ ہوتے۔ اِس طرح وہ اپنے گناہ کا اعتراف کرلیں گے، تو اب لعنت ہو اِن دوزخ والوں پر۔ ۷-۱۱

اِس کے برخلاف جو بن دیکھے اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں[10]، اُن کے لیے

۹ اصل الفاظ ہیں: 'اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ کَبِیْرٍ'۔ اِن میں 'اَنْتُمْ' ضمیر جمع ہے۔ یہ اِس بات پر دلیل ہے کہ یہی جواب اُنھوں نے ہر اُس شخص کو دیا جس نے اُنھیں خبردار کرنا چاہا۔

۱۰ یعنی عقل و بصیرت سے اپنے پروردگار کو پہچانتے اور اِسی بنا پر اُس سے ڈرتے ہیں۔ اُسے

وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِاجْهَرُوْا بِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۳﴾ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۴﴾

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ

مغفرت بھی ہے اور بہت بڑا اجر بھی۔ (لوگو)، تم اپنی کوئی بات چھپا کر کہو یا علانیہ، وہ دلوں کے بھید تک جانتا ہے[۱۱]۔ کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے؟ دراں حالیکہ وہ بڑا دقیقہ رس اور بڑا ہی خبر دار ہے۔ ۱۲-۱۴

الملک ۶۷

(بہت بزرگ، بہت فیض رساں)، وہی جس نے زمین[۱۲] کو تمھارے لیے ایک فرماں بردار ناقہ[۱۳] بنا دیا ہے، تو اب تم اُس کے مونڈھوں میں چلو پھرو اور اپنے

کھلم کھلا دیکھنے اور اِس کے بعد ماننے پر اصرار نہیں کرتے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اِس دنیا میں انسان کا اصلی امتحان یہی ہے کہ وہ اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر اُن حقائق پر ایمان لائے جن کی خبر اللہ کے رسولوں نے دی ہے۔ جس نے یہ امتحان پاس کر لیا، وہ اللہ تعالیٰ کے ہر انعام کا حق دار ہے اور جو اِس میں نا کام رہا، وہ جانور، بلکہ جانوروں سے بھی بدتر ہے، اگرچہ وہ کتنا ہی بڑا فلسفی اور سائنس دان مانا گیا ہو۔“ (تدبر قرآن ۸/۴۹۵)

۱۱؎ یہ تہدید بھی ہے اور تسلی بھی۔ یعنی مجرموں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اُن کی کوئی چیز خدا سے چھپی ہوئی نہیں ہے اور اُس کے فرماں بردار بندوں کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ دنیا اور آخرت، دونوں میں وہ اُنھیں تنہا نہ چھوڑے گا۔

۱۲؎ یہ آسمان کے بعد اب زمین کے آثار کی طرف توجہ دلائی ہے۔

۱۳؎ اصل میں لفظ 'ذَلُوْل' استعمال ہوا ہے، لیکن اِس میں ایک تمثیل چھپی ہوئی ہے جس کو ہم نے ترجمے میں کھول دیا ہے۔ لفظ 'ذَلُوْل' اور 'مَنَاكِب'، دونوں اِس پر دلالت کرتے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

رِّزْقِهٖ ؕ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ ﴿۱۵﴾

ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ ﴿۱۶﴾

اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ؕ فَسَتَعْلَمُوْنَ

پروردگار کے رزق میں سے کھاؤ اور (یاد رکھو کہ ایک دن) اُسی کے حضور میں جی اٹھنا ہے۔[۱۴] ۱۵

کیا تم اُس سے بے خوف ہو گئے جو آسمان میں ہے کہ وہ تم کو زمین میں دھنسا دے، پھر یکایک تم دیکھو کہ وہ بگ ٹٹ چل پڑی ہے؟[۱۵] یا تم اُس سے بے خوف ہو گئے جو آسمان میں ہے کہ وہ تم پر پتھر برسانے والی ہوا بھیج دے؟ سو اب تم جانو گے

الملک ٦٧

"...یعنی اِس زمین کی مثال ایک فرماں بردار ناقہ سے دی گئی ہے۔ اِس کے اندر جو درے اور راستے اور جو وادی و کہسار ہیں، اُن کو ناقہ کے 'مَنَاکِب'، یعنی مونڈھوں اور کندھوں سے تشبیہ دی گئی ہے اور انسانوں کو اِس ناقہ کے جسم پر اِس طرح فرض کیا گیا ہے گویا وہ اِس کے مونڈھوں اور کندھوں میں جوئیں ہوں جن کی پرورش کا سارا سامان ناقہ کے مونڈھوں اور شانوں ہی میں موجود ہوتا ہے۔ وہ اُنھی کے اندر چلتی پھرتی بھی ہیں اور وہیں سے اپنی غذا بھی حاصل کر لیتی ہیں۔" (تدبر قرآن ۸/۴۹۶)

۱۴؎ یعنی کھاؤ اور پیو، لیکن بھول نہ جاؤ کہ ایک دن تمھیں مرنا ہے اور مرنے کے بعد اپنے پروردگار کے سامنے جواب دہی کے لیے پیش ہو جانا ہے۔ یاد رکھو کہ جس خدا نے بغیر کسی استحقاق کے تمھارے لیے یہ سب اہتمام کیا ہے، وہ تمھیں غیر مسؤل نہ چھوڑے گا۔

۱۵؎ اصل میں لفظ 'مَوْر' استعمال ہوا ہے۔ اِس کے معنی تیزی کے ساتھ حرکت کرنے کے ہیں۔ ترجمے میں اِس کے لیے 'بگ ٹٹ چل پڑی ہے' کی تعبیر موقع کلام کی مناسبت سے اختیار کی گئی ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"...اِس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ 'مَوْر' کے اصل معنی حرکت سریع ہی کے ہیں اور دوسری وجہ یہ

كَيۡفَ نَذِيۡرِ ﴿۱۷﴾ وَ لَقَدۡ كَذَّبَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَكَيۡفَ كَانَ نَكِيۡرِ ﴿۱۸﴾
اَوَ لَمۡ يَرَوۡا اِلَى الطَّيۡرِ فَوۡقَهُمۡ صٰٓفّٰتٍ وَّ يَقۡبِضۡنَ ؔۘ مَا يُمۡسِكُهُنَّ
اِلَّا الرَّحۡمٰنُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیۡءٍۭ بَصِيۡرٌ ﴿۱۹﴾
اَمَّنۡ هٰذَا الَّذِيۡ هُوَ جُنۡدٌ لَّكُمۡ يَنۡصُرُكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ الرَّحۡمٰنِ ؕ اِنِ

المُلک
۶۷

کہ کیسی ہے میری تنبیہ[16]! جو اِن سے پہلے گزرے ہیں، اُنھوں نے بھی اِسی طرح جھٹلایا تھا تو (دیکھ لو کہ) کیسی تھی میری پھٹکار[17]! ۱۶-۱۸

(یہ نہیں سوچتے)۔ کیا اِن لوگوں نے اپنے اوپر (اڑتے ہوئے) پرندے نہیں دیکھے؟ پر پھیلائے ہوئے، اور وہ (اِسی طرح) اُن کو سمیٹ بھی لیتے ہیں۔ رحمٰن کے سوا کوئی نہیں جو اُنھیں تھامے ہوئے ہو۔ بے شک، وہی ہر چیز پر نگران ہے[18]۔ ۱۹

یا بتاؤ، (تم عذاب کا مطالبہ کرتے ہو تو) تمھارے پاس وہ کون سا لشکر ہے جو رحمٰن کے

ہے کہ اوپر اِس زمین کو ناقۂ ذلول (فرماں بردار اونٹنی) سے تشبیہ دی ہے۔ اِس تعلق سے دیکھیے تو یہ معنی یہاں زیادہ موزوں معلوم ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تو خدا کی عنایت ہے کہ اُس نے زمین کو تمھارے لیے مسخر کر رکھا ہے اور وہ تمھاری خدمت کے لیے ایک فرماں بردار اونٹنی بنی ہوئی ہے، لیکن خدا اُس کی باگ ذرا ڈھیلی کر دے تو پھر دیکھو وہ کس طرح بھاگ کھڑی ہوتی ہے کہ کسی کے سنبھالے نہ سنبھلے۔'' (تدبر قرآن ۸/۴۹۷)

۱۶؎ اصل میں لفظ 'نَذِيۡرِ' آیا ہے اور یہ یہاں مصدر کے معنی میں ہے۔

۱۷؎ یہ قریش کو تاریخ سے سبق لینے کی تلقین ہے۔

۱۸؎ یہ ایک مثال سے سمجھایا ہے کہ فضاے لامتناہی کے نجوم و کواکب کو بھی خدا نے اِسی طرح سنبھال رکھا ہے۔

الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ ۚ ﴿٢٠﴾ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ يَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ۚ بَلْ لَّجُّوْا فِيْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ ﴿٢١﴾

اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٢٢﴾ قُلْ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿٢٣﴾ قُلْ هُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿٢٤﴾

مقابلے میں تمھاری مدد کرے گا؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ منکر نرے فریب میں مبتلا ہیں۔ یا پھر بتاؤ، وہ کون ہے جو تمھیں روزی[19] دے گا، اگر وہ اپنی روزی روک لے؟ نہیں، (یہ جانتے ہیں کہ کوئی نہیں)، بلکہ یہ سرکشی اور حق بے زاری پر اڑے ہوئے ہیں۔ ۲۰-۲۱

پھر کیا جو اپنے منہ پر اوندھا چلے[20]، وہ زیادہ سیدھی راہ پانے والا ہے یا وہ جو سیدھا ایک سیدھی راہ پر چل رہا ہے؟ (اِن پر افسوس)، اِن سے کہو: وہی ہے جس نے تمھیں (انسان کی حیثیت سے) اٹھایا اور تمھارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے (تاکہ تم حقیقت کو سمجھو)، پر تم کم ہی شکر ادا کرتے ہو۔ اِن سے کہہ دو: وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں بویا۔ (وہ اپنی فصل ضرور کاٹے گا) اور (اِس کے لیے) تم اُسی کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے۔ ۲۲-۲۴

۱۹۔ اصل میں لفظ 'رِزق' استعمال ہوا ہے۔ موقع کلام سے واضح ہے کہ اِس سے یہاں بارش کو تعبیر کیا گیا ہے جو رزق کا ذریعہ بنتی ہے۔

۲۰۔ یعنی سر اٹھا کر اور دائیں بائیں اور آگے پیچھے کا جائزہ لیتے ہوئے چلنے کے بجائے جانوروں

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٢٥﴾ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۖ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٢٦﴾ فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقِيْلَ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ ﴿٢٧﴾
قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمَنَا ۙ فَمَنْ يُّجِيْرُ

یہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟ اِن سے کہہ دو: اِس کا علم تو اللہ کے پاس ہے، میں تو بس ایک صاف خبردار کر دینے والا ہوں۔[۲۱] (اِس وقت یہی کہتے ہیں)، مگر جب اُس کو دیکھیں گے کہ پاس آ لگا ہے تو اِن منکروں کے چہرے بگڑ جائیں گے اور اِن سے کہا جائے گا: یہی ہے جس کا تم تقاضا کر رہے تھے۔ ۲۵-۲۷
(یہ اِس سے کیا ڈرتے؟ یہ تو تمھارے لیے گردشِ زمانہ کے منتظر ہیں، اے پیغمبر)۔

کی طرح منہ اوندھائے چلتا رہے اور کبھی غور نہ کرے کہ اُس کے گرد و پیش کی یہ عظیم کائنات کن حقائق کی گواہی دے رہی ہے۔

۲۱؎ یعنی سب کچھ سننے کے بعد اگر کوئی بات کہتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ اچھا قیامت آنی ہے تو بتاؤ کب آئے گی؟ قرآن نے یہاں اِس معارضے کا جواب تفصیل کے ساتھ نہیں دیا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”یہ معارضہ چونکہ ایک بالکل ہی لغو معارضہ ہے، اِس وجہ سے یہاں اِس کے جواب کی زیادہ تفصیل نہیں کی ہے۔ لیکن دوسرے مقامات میں اِس کی تفصیل بھی فرمائی ہے کہ کسی حقیقت کو مجرد اِس بات پر جھٹلانا کہ اِس کے ظہور کا صحیح وقت نہیں بتایا جا سکتا، کھلی ہوئی سفاہت ہے۔ اِس دنیا کے کتنے واقعات کا تجربہ ہم اپنی روز مرہ زندگی میں کرتے ہیں جن کے ظہور کا صحیح وقت اگرچہ کوئی نہیں بتا سکتا، لیکن اُن کے وقوع کو سب مانتے ہیں۔“ (تدبر قرآن ۸/۵۰۱)

الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٢٨﴾
قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ
ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢٩﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ
بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ﴿٣٠﴾

سورة القلم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ﴿١﴾ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۚ ﴿٢﴾

اِن سے پوچھو کہ تم نے کبھی سوچا ہے کہ اللہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو ہلاک کردے یا ہم پر رحم فرمائے تو (اِس سے تمھیں کیا حاصل ہوگا؟ تم یہ بتاؤ کہ پھر) کون ہے جو منکروں کو دردناک عذاب سے بچالے گا؟ ۲۸

کہہ دو: (ہم اپنے بارے میں کوئی دعویٰ نہیں کرتے۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ) وہ سراسر رحمت ہے۔ ہم اُس پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے اُسی پر بھروسا کیا ہے۔ سو عنقریب تم جان لوگے کہ کون کھلی گم راہی میں پڑا ہوا ہے۔ اِن سے کہو: کبھی تم نے سوچا ہے کہ اگر تمھارا یہ پانی زمین میں اُتر جائے[۲۲] تو پھر کون ہے جو پانی کی نتھری ہوئی سوتیں تمھیں نکال کر لادے گا؟ ۲۹-۳۰

——— ۲ ———

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورۂ نون[۲۳] ہے۔ قلم گواہی دیتا ہے اور جو کچھ (لکھنے والے اُس سے) لکھ رہے ہیں[۲۴]

۲۲۔ آیت میں 'مَآءٍ مَّعِیۡنٍ' کا لفظ تقابل کے لیے آیا ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پانی کے زمین میں اتر جانے کی جس صورت کا ذکر ہے، وہ غالباً یہ ہے کہ بارش نہ ہونے یا کم ہونے کے باعث نہروں اور چشموں کا پانی کم ہو کر گدلا ہو جائے۔

۲۳۔ نون کے معنی مچھلی کے ہیں۔ سورۂ بقرہ کی ابتدا میں ہم نے بیان کیا ہے کہ ابتداءً یہ حروف معانی پر دلیل ہوتے تھے۔ اِن میں سے بعض اب بھی اپنے اُسی قدیم معنی میں مستعمل ہیں۔ یہ حرف نون بھی اُنھی میں سے ہے۔ اِس سورہ کا نام نون اِس لیے رکھا گیا ہے کہ اِس میں یونس علیہ السلام کا واقعہ مذکور ہے جنھیں مچھلی نے نگل لیا تھا۔

۲۴۔ یعنی اِس وقت لکھ رہے ہیں۔ اِس سے، ظاہر ہے کہ قرآن مجید مراد ہے۔ یہ بھی قلم سے لکھا گیا اور اِس سے پہلے کے صحیفے بھی قلم ہی کے ذریعے سے محفوظ کیے گئے۔ اِس لحاظ سے دیکھیے تو یہ درحقیقت تعلیمات الٰہیہ کے اُس پورے مدون سرمایے کی گواہی ہے جو تورات، انجیل، زبور اور قرآن کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا گیا ہے۔ اِن کے مضامین، پیشین گوئیاں اور تعلیمات، سب گواہی دیتی ہیں کہ جس طرح تورات و انجیل اور زبور کے پیش کرنے والے کوئی دیوانے نہیں تھے، اُسی طرح قرآن بھی اپنے مضامین کی عظمت، بزرگی اور برتری، اپنے اسلوب کی غیر معمولی قدرت اور بے مثل بلاغت سے گواہی دے رہا ہے کہ اِس کا پیش کرنے والا بھی کوئی کاہن یا شاعر یا دیوانہ نہیں ہو سکتا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...قریش کے لیڈروں کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی تھی کہ آپ جس عذاب سے اُن کو اِس شدومد اور اِس جزم و یقین کے ساتھ ڈرا رہے ہیں کہ گویا اُس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں، آخر وہ کدھر سے آ جائے گا؟ اُن کو یہ پریشانی لاحق تھی کہ آپ کے لب و لہجہ میں جو غیر معمولی جزم و یقین، آپ کے انداز دعوت میں جو مافوق العادت بے چینی و بے قراری اور آپ کی تذکیر میں دلوں کو ہلا دینے والی جو دردمندی و شفقت ہے، اُس سے اُن کے عوام متاثر ہو رہے ہیں۔ اِس اثر کو زائل کرنے کے لیے اُنھوں نے لوگوں کو یہ باور کرانا چاہا کہ اِس شخص کی یہ ساری بے چینی و بے قراری اِس وجہ سے نہیں ہے کہ فی الواقع کوئی عذاب آنے والا ہے جس سے آگاہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اِس کو بھیجا ہے، بلکہ بعض اشخاص کو جس طرح

وَ اِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ③ وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ④ فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ⑤ بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ ⑥ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۠ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ⑦

القلم ٦٨

کہ اپنے پروردگار کی عنایت سے تم کوئی دیوانے نہیں ہو اور تمھارے لیے یقیناً وہ صلہ ہے جس پر کبھی زوال نہ آئے گا اور تم بڑے اعلیٰ اخلاق پر ہو۔[۲۵] اِس لیے عنقریب تم بھی دیکھ لوگے اور وہ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے کس گروہ میں ہے، جو فتنے میں پڑا ہوا ہے۔[۲۶] تمھارا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اُس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور وہی بہتر جانتا ہے کہ کون راہ راست پر ہیں۔[۲۷] ۱-۷

کسی چیز کا مالیخولیا ہو جاتا ہے اور وہ اٹھتے بیٹھتے اُسی کی رٹ لگائے رکھتے ہیں، اُسی طرح اِس شخص کو بھی عذاب کا مالیخولیا ہو گیا ہے جو اِس کو ہر طرف سے آتا دکھائی دے رہا ہے۔ اِس بات کو تقویت دینے کے لیے اِس پر وہ یہ اضافہ بھی کر دیتے کہ کسی نے اِس پر جادو کر دیا ہے جس کے سبب سے اِس کی دماغی حالت ٹھیک نہیں رہی ہے اور بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے۔'' (تدبر قرآن ۸/۵۱۴)

۲۵ یعنی جس طرح تمھاری پیش کردہ کتاب اُنھی تعلیمات کا بیان ہے جو پہلے پیغمبروں نے پیش کی ہیں، اُسی طرح تم بھی اُس اعلیٰ کردار کی نہایت شان دار مثال ہو جس کے نمونے انبیا علیہم السلام اِس سے پہلے پیش کر چکے ہیں۔

۲۶ اصل الفاظ ہیں: 'بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ'۔ اِن میں 'ب' ظرفیت کی ہے اور اِس کے معنی 'في أي طائفة منكم المفتون' کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بہت جلد تم سب دیکھ لوگے کہ فتنے میں پڑا ہوا شخص کس گروہ کی قیادت کر رہا ہے؟ ایمان والوں کی، جن کی قیادت تم کر رہے ہو یا قریش کی، جن کے رہنما ابوجہل اور ابولہب جیسے ہیں؟ چنانچہ سب کو معلوم ہو جائے گا کہ مجنون تم ہو کہ شیطان کے ہر فتنے سے مامون ہو اور اپنے ماننے والوں کو دنیا اور آخرت میں کامیابی کی راہ دکھا رہے ہو یا قریش کے یہ رہنما مجنون ہیں جنھوں نے شیطان کے فتنوں میں پھنس کر اپنی قوم کو تباہی کے کنارے پر پہنچا دیا ہے؟

فَلَا تُطِعِ الۡمُكَذِّبِيۡنَ ﴿۸﴾ وَدُّوۡا لَوۡ تُدۡهِنُ فَيُدۡهِنُوۡنَ ﴿۹﴾ وَلَا تُطِعۡ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيۡنٍ ﴿۱۰﴾ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيۡمٍ ﴿۱۱﴾ مَّنَّاعٍ لِّلۡخَيۡرِ مُعۡتَدٍ اَثِيۡمٍ ﴿۱۲﴾

اِس لیے تم اِن جھٹلانے والوں کی کسی بات پر کان نہ دھرو[۲۸]۔ یہ تو چاہتے ہیں کہ تم ذرا نرم پڑو، پھر یہ بھی نرم پڑ جائیں گے[۲۹]۔ ہرگز کان نہ دھرو کسی ایسے شخص کی بات[۳۰] پر جو بہت قسمیں کھانے والا ہے[۳۱]، بے وقعت ہے، اشارہ باز ہے[۳۲]، چغلی لیے پھرتا ہے، بھلائی

اِس سے واضح ہے کہ آیت میں 'مَجْنُوْن' کے بجائے 'مَفْتُوْن' کا لفظ کس قدر بلیغ استعمال ہوا ہے۔ گویا قرآن نے بتا دیا ہے کہ جو لوگ دنیا اور شیطان کے فتنوں میں پھنسے ہوئے ہوں، وہی اصلی مجنون ہوتے ہیں۔

۲۷۔ لہٰذا مطمئن رہو۔ وہ اِن میں سے ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا، جس کا وہ مستحق ہے۔

۲۸۔ یعنی عذاب اور قیامت کو جھٹلانے والوں کی کسی بات کا اثر نہ لو۔ اصل میں لفظ 'اِطَاعَة' استعمال ہوا ہے۔ یہ اِس مفہوم میں عام استعمال ہوتا ہے۔ اِس کے نظائر کلام عرب میں بھی ہیں اور قرآن مجید میں بھی۔

۲۹۔ اصل الفاظ ہیں: 'وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ'۔ عربیت کے عام قاعدے سے یہاں 'فیدھنوا' ہونا تھا، لیکن قرآن نے اسلوب تبدیل کر دیا ہے۔ چنانچہ 'فَيُدْهِنُوْنَ' اصل میں 'فَهُمْ يُدْهِنُوْنَ' ہے۔ اِس میں مبتدا محذوف کر دیا گیا ہے۔ اِس اسلوب کی مثالیں قرآن میں دوسرے مقامات پر بھی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اِن کی مخالفت کسی اصول پر نہیں ہے۔ یہ کچھ لو اور کچھ دو کے طریقے پر معاملہ کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا اُس وقت تک کوشش کریں گے، جب تک توقع باقی رہے گی۔ جب یہ ختم ہو جائے گی تو اِن کا حوصلہ بھی پست ہو جائے گا۔

۳۰۔ یہ صاحب خلق عظیم کے مقابلے میں کسی خاص شخص کا نہیں، بلکہ قریش کی پوری قیادت کا کردار بیان ہوا ہے جس کا مظاہرہ اسلام اور پیغمبر کی مخالفت میں وہ شب و روز کر رہے تھے۔ اِس

عُتُلٍّۢ بَعۡدَ ذٰلِكَ زَنِیۡمٍ ﴿۱۳﴾ اَنۡ كَانَ ذَا مَالٍ وَّ بَنِیۡنَ ﴿۱۴﴾ اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡهِ اٰیٰتُنَا

سے روکتا ہے[۳۳]، حد سے بڑھ جانے والا ہے، حق مارتا ہے، پتھر دل ہے، اور اِس پر مزید یہ کہ بے اصل بھی ہے[۳۴]۔ یہ اِس بنا پر ہے کہ اُس کے پاس بہت مال ہے اور بیٹے ہیں[۳۵]۔ ہماری

کے قرائن بالکل واضح ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''اول یہ کہ اِس کا عطف 'فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِیْنَ' پر ہے اور مکذبین سے مراد، ظاہر ہے کہ کوئی معین شخص نہیں، بلکہ موقع و محل دلیل ہے کہ قریش کی پوری قیادت ہے۔

دوسرا یہ کہ لفظ 'كُلّ' بھی اِس بات کی دلیل ہے کہ یہاں زیر بحث کسی معین شخص کا کردار نہیں، بلکہ جماعت کا کردار ہے۔

تیسرا یہ کہ آگے 'اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ' کے الفاظ آئے ہیں جس میں جمع کی ضمیر 'هُمْ' اِس بات کی دلیل ہے کہ اِس کا مرجع کوئی فرد نہیں، بلکہ جماعت ہے۔

چوتھا یہ کہ یہاں جو کردار بیان ہوا ہے، وہ قریش کی پوری قیادت پر تو ٹھیک ٹھیک منطبق ہو جاتا ہے، لیکن ہر بات کسی ایک معین شخص پر اگر منطبق کرنے کی کوشش کی جائے تو تکلف کرنا پڑے گا۔'' (تدبر قرآن ۸/۵۱۷)

۳۱؎ زیادہ قسمیں وہی لوگ کھاتے ہیں جنھیں اپنی عزت نفس کا خیال نہیں ہوتا اور اپنے کردار کی پستی کے باعث وہ ہمیشہ اِس شک میں مبتلا رہتے ہیں کہ مخاطبین اُن کی بات اُس وقت تک باور نہیں کریں گے، جب تک وہ قسم کھا کر اُنھیں اطمینان نہ دلائیں۔

۳۲؎ یہ اشارہ بازی حرکات اور چشم و ابرو سے بھی ہوتی ہے، اور الفاظ اور فقروں سے بھی۔ جن لوگوں کے پاس دلیل کی قوت نہیں ہوتی، وہ اِسی قسم کی حرکتوں سے کسی کو دوسروں کی نگاہوں میں گرانے کی کوشش کرتے ہیں۔

۳۳؎ اصل میں 'مَنَّاعٍ لِّلْخَیْرِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ اگرچہ عام ہیں، لیکن یہاں خاص اشارہ اِن مستکبرین کی بخالت کی طرف ہے جس کا ذکر قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات پر ہوا ہے کہ نہ

قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۵﴾ سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ ﴿۱۶﴾
اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۚ اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا
مُصْبِحِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ

آیتیں اُسے سنائیے تو کہتا ہے: یہ تو اگلوں کے افسانے ہیں۔ (سمجھتا ہے کہ وہ بڑی ناک والا ہے)، اِس کی یہ سونڈ ہم عنقریب داغ دیں گے۔[۳۶] ۸-۱۶

ہم نے اِن[۳۷] کو اُسی طرح امتحان میں ڈالا ہے، جس طرح باغ والوں کو امتحان میں ڈالا تھا،[۳۸] جب اُنھوں نے قسم کھائی کہ وہ اپنے باغ کے پھل صبح سویرے لازماً توڑ لیں گے

صرف یہ کہ خود غریبوں کی مدد نہیں کرتے، بلکہ دوسروں کو بھی اِس کی ترغیب دیتے ہیں کہ وہ بھی اپنا مال اُن پر نہ لگائیں۔

۳۴؎ یعنی اصلاً قوم میں سے نہیں ہے۔ اِس سے جس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے، وہ یہ ہے کہ اِن میں کچھ احساس کہتری کے مریض اور خود اعتمادی سے محروم طفیلی بھی ہیں جو اگرچہ قوم میں سے نہیں ہیں، لیکن اِس کے مدعی بنے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اپنی اِس کم زوری کی وجہ سے یہ اہل قوم سے زیادہ قوم کے وفادار بننے کی کوشش کرتے ہیں اور حق کی مخالفت میں وہاں پہنچ جاتے ہیں، جہاں اہل قوم بھی نہیں پہنچتے۔

۳۵؎ یہ اِس بات کا سبب بیان ہوا ہے کہ اِن کے اندر یہ کردار کیوں پیدا ہوا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...یہ فقرہ نہایت بلیغ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ نے اِن کو مال واولاد والا بنایا تو ہونا تو یہ تھا کہ یہ اپنے رب کے شکر گزار، فرماں بردار اور اُس کے نازل کیے ہوئے حق کے علم بردار بن کر اٹھتے، لیکن یہ اِس کے برعکس بالکل ناشکرے اور ناہنجار بن کر اٹھے۔“

(تدبر قرآن ۸/۵۲۰)

۳۶؎ تکبر اور اُس کی سزا کے لیے جو تعبیر اِس آیت میں اختیار کی گئی ہے، اُس کی بلاغت احاطۂ بیان سے باہر ہے۔

وَهُمْ نَآئِمُوْنَ ﴿١٩﴾ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ﴿٢٠﴾ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ﴿٢١﴾ اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ ﴿٢٢﴾ فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ﴿٢٣﴾

اور (کسی غریب اور مسکین کے لیے) کچھ بھی نہ چھوڑیں گے۔[39] پھر وہ سوئے پڑے تھے کہ تمھارے پروردگار کی طرف سے ایک پھرنے والا اُس پر پھر گیا[40] اور اُن کا وہ لہلہاتا ہوا باغ اِس طرح ہو کر رہ گیا جیسے کٹی ہوئی فصل ہو۔ چنانچہ صبح ہوئی تو ایک دوسرے کو پکارنے لگے کہ پھل توڑنے ہیں تو چلو سویرے اپنے کھیت پر پہنچو۔[41] پھر چل

القلم
٦٨

۳۷۔ یعنی قریش کے لیڈروں کو۔

۳۸۔ یہ کسی واقعے کا ذکر نہیں ہے، بلکہ تمثیل ہے۔ عربی زبان میں تمثیلیں اِسی طرح بیان ہوتی ہیں اور اِن میں لام تعریف اور 'الذی' یا 'التی' وغیرہ محض صورت حال کی تصویر و تشخیص کے لیے آتے ہیں، اِس لیے تاریخ کی کتابوں میں یہاں کوئی خاص باغ اور اُس کے مالکوں کا قصہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۳۹۔ یعنی اِس روایت سے انحراف کی قسم کھائی جو فیاض لوگوں میں ہمیشہ سے قائم رہی ہے کہ جب باغ کے پھل توڑے جائیں یا فصل کاٹی جائے تو کچھ حصہ غریبوں اور مسکینوں کے لیے چھوڑ دیا جائے۔

۴۰۔ یعنی کوئی ایسی گردش آئی جس نے پورے باغ کا ستھراؤ کر دیا۔ اِس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...(یہ) دو حقیقتوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے: ایک اِس حقیقت کی طرف کہ یہ بالکل بے سان و گمان نمودار ہوئی، دوسری اِس کی بے پناہی کی طرف کہ اِس نے چشم زدن میں وہ کرشمہ کر دکھایا کہ ہرا بھرا باغ بے نشان ہو کر رہ گیا۔'' (تدبر قرآن ۸/۵۲۲)

۴۱۔ اِس سے مراد وہی باغ ہے جس کا ذکر اوپر سے آرہا ہے۔ باغ میں درختوں کے نیچے بالعموم

اَنۡ لَّا یَدۡخُلَنَّہَا الۡیَوۡمَ عَلَیۡکُمۡ مِّسۡکِیۡنٌ ﴿۲۴﴾ وَّ غَدَوۡا عَلٰی حَرۡدٍ قٰدِرِیۡنَ ﴿۲۵﴾
فَلَمَّا رَاَوۡہَا قَالُوۡۤا اِنَّا لَضَآلُّوۡنَ ﴿۲۶﴾ بَلۡ نَحۡنُ مَحۡرُوۡمُوۡنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ
اَوۡسَطُہُمۡ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّکُمۡ لَوۡلَا تُسَبِّحُوۡنَ ﴿۲۸﴾ قَالُوۡا سُبۡحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنَّا کُنَّا
ظٰلِمِیۡنَ ﴿۲۹﴾ فَاَقۡبَلَ بَعۡضُہُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ یَّتَلَاوَمُوۡنَ ﴿۳۰﴾ قَالُوۡا یٰوَیۡلَنَاۤ
اِنَّا کُنَّا طٰغِیۡنَ ﴿۳۱﴾ عَسٰی رَبُّنَاۤ اَنۡ یُّبۡدِلَنَا خَیۡرًا مِّنۡہَاۤ اِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا رٰغِبُوۡنَ ﴿۳۲﴾
کَذٰلِکَ الۡعَذَابُ ؕ وَ لَعَذَابُ الۡاٰخِرَۃِ اَکۡبَرُ ۘ لَوۡ کَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۳﴾

القلم
۶۸

پڑے اور آپس میں چپکے چپکے کہتے تھے کہ دیکھنا آج کوئی مسکین تمھارے پاس باغ میں آنے نہ پائے۔ وہ بڑے جوش میں نکلے، اِس خیال میں کہ سب اُن کی دسترس میں ہے۔ مگر جب باغ کو دیکھا تو بولے: ہم ضرور راستہ بھول گئے! نہیں، بلکہ محروم ہو کر رہ گئے۔ اُن میں جو سب سے بہتر آدمی تھا، اُس نے کہا: میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم اپنے پروردگار کی تسبیح کیوں نہیں کرتے؟ وہ پکار اٹھے کہ پاک ہے ہمارا پروردگار، بے شک ہم ہی ظالم تھے۔ پھر وہ آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔ بولے: ہائے، ہماری بدبختی، ہم ہی سرکشی میں مبتلا رہے۔ بعید نہیں کہ ہمارا رب اِس کی جگہ اِس سے بہتر باغ ہمیں عطا فرما دے، ہم اپنے رب ہی کی طرف لوٹتے ہیں[۴۲]۔ (لوگو)، اِس طرح آئے گا عذاب[۴۳] اور آخرت کا عذاب تو اِس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ کاش، یہ لوگ اِس کو جانتے! ۱۷-۳۳

فصلیں بھی کاشت کر لی جاتی تھیں، اِس لیے عربی زبان میں باغ کے لیے 'الجنة' اور 'الحرث'، دونوں لفظ آجاتے ہیں۔

۴۲ یہ اُسی طرح کی توبہ ہے جو فرعون نے موجوں کی لپیٹ میں آنے کے بعد کی۔ قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ اِس طرح کی توبہ اللہ تعالیٰ کے ہاں درخورِ اعتنا نہیں ٹھیرتی۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿٣٤﴾ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ﴿٣٥﴾ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿٣٦﴾ اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ﴿٣٧﴾ اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ﴿٣٨﴾ اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ﴿٣٩﴾ سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ﴿٤٠﴾ اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴿٤١﴾

القلم
٦٨

اُن کے لیے جو اِس عذاب سے ڈرنے والے ہیں، اُن کے پروردگار کے پاس البتہ، راحت کے باغ ہیں۔[۴۴] (تم سمجھتے ہو کہ یہ نہیں ہوگا) تو کیا ہم اپنے فرماں بردار بندوں کو مجرموں کے برابر کر دیں گے؟ تمھیں کیا ہوا ہے، تم کیسا حکم لگاتے ہو؟ کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم پڑھتے ہو کہ وہاں تمھارے لیے وہی کچھ ہے جو تم پسند کرو گے؟[۴۵] کیا تمھارے لیے ہم پر کوئی قسمیں ہیں جو قیامت تک چلی جائیں گی کہ تمھارے لیے وہی کچھ ہے جو تم حکم لگاؤ گے؟ اِن سے پوچھو کہ اِن میں سے کون اِس کا ذمہ لیتا ہے؟ کیا اِن کے (ٹھیرائے ہوئے) کوئی شریک ہیں (جو اِس کا ذمہ لیں گے)؟ تو لائیں اپنے اِن شریکوں کو، اگر یہ سچے ہیں۔۳۴-۴۱

۴۳؎ یعنی وہ عذاب جو رسول کو جھٹلانے کے نتیجے میں اُس کی قوم پر لازماً آتا ہے۔

۴۴؎ یعنی اُن کے لیے جو مستکبرین کی طرح، جن کا انجام اوپر بیان ہوا ہے، خدا کی پکڑ اور آخرت کی جواب دہی سے نچنت ہو کر زندگی بسر نہیں کرتے۔

۴۵؎ یہ اُن کے اِس زعم باطل کی تردید ہے کہ آخرت اول تو ہوگی نہیں، اور اگر ہوئی بھی تو جس طرح دنیا میں عزت و سیادت کا مقام ہمیں حاصل ہے، اُسی طرح وہاں بھی حاصل ہو جائے گا۔

يَوۡمَ يُكۡشَفُ عَنۡ سَاقٍ وَّيُدۡعَوۡنَ اِلَى السُّجُوۡدِ فَلَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ ﴿۴۲﴾ خَاشِعَةً اَبۡصَارُهُمۡ تَرۡهَقُهُمۡ ذِلَّةٌ ؕ وَقَدۡ كَانُوۡا يُدۡعَوۡنَ اِلَى السُّجُوۡدِ وَهُمۡ سٰلِمُوۡنَ ﴿۴۳﴾

فَذَرۡنِىۡ وَمَنۡ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الۡحَدِيۡثِ ؕ سَنَسۡتَدۡرِجُهُمۡ مِّنۡ حَيۡثُ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۴﴾ وَاُمۡلِىۡ لَهُمۡ ؕ اِنَّ كَيۡدِىۡ مَتِيۡنٌ ﴿۴۵﴾

القلم
۶۸

یہ اُس دن کو یاد رکھیں، جب بڑی ہلچل پڑے گی[۴۶] اور یہ سجدے کے لیے بلائے جائیں گے تو سجدہ نہ کر سکیں گے۔[۴۷] اِن کی آنکھیں جھکی ہوں گی، اِن پر ذلت چھا رہی ہو گی۔ (یہ ظالم، اِن کی کمر تختہ ہو گئی)، یہ اُس وقت بھی سجدے کے لیے بلائے جاتے تھے، جب یہ بھلے چنگے تھے۔ ۴۲-۴۳

سو اب مجھے اور اِن کو، جو اِس کلام کو جھٹلا رہے ہیں، چھوڑ دو۔[۴۸] ہم اِن کو وہاں سے بتدریج (تباہی کی طرف) لا رہے ہیں، جہاں سے یہ نہیں جانتے۔ اور میں اِن کو ڈھیل دے رہا ہوں کہ اپنا زور لگا لیں، اِس لیے کہ میری تدبیر بڑی محکم ہے۔ ۴۴-۴۵

۴۶؎ اصل الفاظ ہیں: 'يَوۡمَ يُكۡشَفُ عَنۡ سَاقٍ' (جس دن پنڈلی کھولی جائے گی)۔ یہ عربی زبان کا محاورہ ہے جس کے معنی سخت وقت آ پڑنے کے ہیں۔ اِس کے وجود میں آنے کی وجہ یہ ہوئی ہے کہ جب کوئی بڑی ہلچل پڑتی ہے تو شریف زادیاں بھی پائنچے اٹھا کر اِس طرح بھاگنے پر مجبور ہو جاتی ہیں کہ اُن کی پنڈلیاں کھل جاتی ہیں۔

۴۷؎ سجدہ کا یہ حکم اُنھیں اتمام حجت اور فضیحت کے لیے دیا جائے گا تا کہ اُن کی محرومی پر خود اُن کے وجود کی گواہی اِس طرح ثبت ہو جائے کہ وہ اِس کا انکار نہ کر سکیں۔

اَمۡ تَسۡـَٔلُهُمۡ اَجۡرًا فَهُمۡ مِّنۡ مَّغۡرَمٍ مُّثۡقَلُوۡنَ ﴿۴۶﴾ اَمۡ عِنۡدَهُمُ الۡغَيۡبُ فَهُمۡ يَكۡتُبُوۡنَ ﴿۴۷﴾ فَاصۡبِرۡ لِحُكۡمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنۡ كَصَاحِبِ الۡحُوۡتِ ۘ اِذۡ نَادٰى وَهُوَ مَكۡظُوۡمٌ ﴿۴۸﴾ لَوۡلَاۤ اَنۡ تَدٰرَكَهٗ نِعۡمَةٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالۡعَرَآءِ وَهُوَ مَذۡمُوۡمٌ ﴿۴۹﴾ فَاجۡتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ﴿۵۰﴾

(یہ سنتے کیوں نہیں)؟ کیا تم اِن سے کوئی معاوضہ چاہتے ہو کہ یہ اُس کے تاوان سے دبے جاتے ہیں؟ یا اِن کے پاس غیب کا علم ہے (کہ آخرت میں بھی یہی سرخ رو ہوں گے)[۴۹] اور یہ اُس کو لکھ رہے ہیں؟ (نہیں، کچھ نہیں)۔ اِس لیے (اے پیغمبر) تم اپنے پروردگار کے حکم کے انتظار میں صبر کیے رہو[۵۰] اور (اپنی قوم کے معاملے میں) مچھلی والے (یونس) کی طرح نہ ہو جاؤ، جب اُس نے (مچھلی کے پیٹ میں) پکارا اور وہ غم سے بھرا ہوا تھا۔ اُس وقت اگر اُس کے پروردگار کی عنایت اُس کے شامل حال نہ ہو جاتی تو (اپنی اِس عجلت کے نتیجے میں) مذموم ہو کر وہ اُسی چٹیل میدان میں پڑا رہتا، (جہاں مچھلی نے اُسے اگل دیا تھا۔ لیکن وہ پلٹا) تو اُس کے پروردگار نے (از سر نو) اُس کو برگزیدہ کیا اور اُس کو اپنے صالح بندوں میں شامل کر لیا۔ ۴۶-۵۰

---

۴۸ جھٹلانے والوں کو تہدید کے ساتھ اِس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بہت بڑی تسلی بھی ہے کہ دعوت و تبلیغ کی جو ذمہ داری آپ پر عائد کی گئی تھی، وہ آپ نے بدرجۂ اتم پوری کر دی۔ اب آپ بیچ سے ہٹ جائیں اور خدا کو تنہا اِن سے نمٹنے دیں۔

۴۹ سورۂ نجم (۵۳) کی آیات ۳۵-۳۹ سے واضح ہو جاتا ہے کہ اِس جملے میں یہی مضمون مقدر ہے۔

۵۰ اصل الفاظ ہیں: 'فَاصۡبِرۡ لِحُكۡمِ رَبِّكَ'۔ 'صَبۡر' کا صلہ اِس جملے میں 'ل' آیا ہے۔ یہ

وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ﴿٥١﴾ وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٥٢﴾

(اِس لیے صبر کیے رہو)۔ یہ منکرین جب (تم سے) یہ یاددہانی سنتے ہیں تو لگتا ہے کہ اپنی نگاہوں کے زور سے تمھیں پھسلا دیں گے اور کہتے ہیں کہ یہ ضرور دیوانہ ہے[۵۱]، دراں حالیکہ یہ تو سارے جہان والوں کے لیے ایک یاددہانی ہے۔۵۱-۵۲

دلیل ہے کہ 'صبر' یہاں 'انتظر' کے مفہوم پر متضمن ہے۔

۵۱؎ یہ آخر میں منکرین کی وہ بات نقل کر دی ہے جس کے جواب سے سورہ شروع ہوئی ہے۔

کوالالمپور

۳۱/ جنوری ۲۰۱۰ء

القلم ۶۸

الحاقة - المعارج

٦٩ ـــــ ٧٠

الحاقة - المعارج

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ دنیا اور آخرت میں جس عذاب سے قریش کو متنبہ کرتی ہے، دوسری میں اُسی کا مذاق اڑانے اور اُس کے لیے جلدی مچانے والوں کو اُن کے انجام سے خبردار کیا گیا ہے۔ دونوں میں روے سخن قریش کے سرداروں کی طرف ہے اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ پچھلی سورتوں کی طرح یہ بھی ام القریٰ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ انذار میں نازل ہوئی ہیں۔

پہلی سورہ ـــــ الحاقة ـــــ کا موضوع قیامت میں جزا و سزا کا اثبات، اُس کے حقائق کا بیان اور اُس کے بارے میں قرآن کے انذار کو جھٹلانے کے نتائج سے اپنے مخاطبین کو متنبہ کرنا ہے۔

دوسری سورہ ـــــ المعارج ـــــ کا موضوع اِنھی نتائج کو استہزا کا نشانہ بنانے اور اِن کے لیے جلدی مچانے والوں کو اُن کے انجام سے خبردار کرنا، پیغمبر کو اُن کے مقابلے میں صبر کی تلقین کرنا اور اُنھیں یہ بتانا ہے کہ جنت حسن عمل کی جزا ہے۔ اِس سے محروم کوئی شخص، خواہ عرب و عجم کے صنادید میں سے کیوں نہ ہو، خدا کی اِس ابدی بادشاہی میں ہرگز داخل نہیں ہو سکتا۔

سورة الحاقة

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَآقَّةُ ۙ﴿۱﴾ مَا الۡحَآقَّةُ ۚ﴿۲﴾ وَ مَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡحَآقَّةُ ؕ﴿۳﴾ كَذَّبَتۡ ثَمُوۡدُ وَ عَادٌۢ بِالۡقَارِعَةِ ﴿۴﴾ فَاَمَّا ثَمُوۡدُ فَاُهۡلِكُوۡا

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

ہونی شدنی[۱]! کیا ہے ہونی شدنی[۲]! اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ ہونی شدنی! ۱-۳

ثمود اور عاد نے اِس کھڑکھڑانے والی[۳] کو جھٹلایا تو ثمود اُس آفت[۴] سے ہلاک ہوئے

۱؎ اصل میں لفظ 'اَلۡحَآقَّةُ' آیا ہے۔ یہ قیامت کے ناموں میں سے ہے۔ اِس کے معنی ہیں: وہ چیز جو ہو کر رہے، جس کا واقع ہونا عقلی اور اخلاقی لحاظ سے لازم ہو، جو بالکل اٹل اور قطعی ہو۔ یہ ایک ہی لفظ یہاں جملہ کے قائم مقام ہو کر آیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...یہ اسلوب بیان اُس وقت اختیار کیا جاتا ہے، جب مخاطب، خاص طور پر غافل مخاطب کو ہڑبڑا دینا مقصود ہو۔ ایسی صورت میں صرف مبتدا کا ذکر کافی ہوتا ہے، خبر کی ضرورت نہیں ہوتی تاکہ مخاطب کی پوری توجہ مبتدا ہی پر مرکوز ہو جائے۔ اِس طرح جملے میں جو ابہام پیدا ہوتا ہے، وہ مخاطب کی توجہ جذب کرنے کا باعث بنتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۸/۵۴۱)

۲؎ یہ سوال قیامت کے ہول، دہشت اور بے پناہی کی تعبیر کے لیے ہے۔

۳؎ یہ تعبیر بھی قیامت کے لیے ہے اور اِس لیے لائی گئی ہے کہ اِس کے آنے کا وقت کسی کو معلوم نہیں، یہ دفعتاً آ دھمکے گی اور استاذ امام کے الفاظ میں جس طرح کوئی اچانک آ کر دروازے کو کھٹکھٹاتا اور نچنت سونے والوں کو ہڑبڑا دیتا ہے، اُسی طرح یہ بھی ایک ہلچل برپا کر دے گی۔

۴؎ یہ آفت کیا تھی؟ قرآن کے اشارات سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ سرما کے دھاریوں والے

بِالطَّاغِيَةِ ﴿٥﴾ وَاَمَّا عَادٌ فَاُهۡلِكُوۡا بِرِيۡحٍ صَرۡصَرٍ عَاتِيَةٍ ﴿٦﴾ سَخَّرَهَا عَلَيۡهِمۡ سَبۡعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوۡمًا فَتَرَى الۡقَوۡمَ فِيۡهَا صَرۡعٰى كَاَنَّهُمۡ اَعۡجَازُ نَخۡلٍ خَاوِيَةٍ ﴿٧﴾ فَهَلۡ تَرٰى لَهُمۡ مِّنۡۢ بَاقِيَةٍ ﴿٨﴾

وَجَآءَ فِرۡعَوۡنُ وَمَنۡ قَبۡلَهٗ وَالۡمُؤۡتَفِكٰتُ بِالۡخَاطِئَةِ ﴿٩﴾ فَعَصَوۡا رَسُوۡلَ رَبِّهِمۡ فَاَخَذَهُمۡ اَخۡذَةً رَّابِيَةً ﴿١٠﴾

جو حد سے باہر تھی اور عاد اُس تند و تیز آندھی سے برباد ہوئے جو سرکش اور بے قابو ہوگئی۔[۵] اللہ نے یہ آندھی اُنھیں جڑ پیڑ سے اُکھاڑنے کے لیے سات رات اور آٹھ دن اُن پر ٹھیرا دی۔ پھر تم اُن لوگوں کو دیکھتے کہ اِس طرح اُس میں پچھڑے پڑے ہیں، جیسے وہ کھجور کے کھوکھلے تنے ہوں۔ تو اب کیا اِن میں سے کسی کو باقی دیکھتے ہو؟ ۴-۸

اور یہی جرم فرعون اور اُس سے پہلے کے لوگوں نے کیا اور اُن بستیوں نے بھی جو تلپٹ ہو گئیں۔[۶] اِس طرح کہ اُن سب نے اپنے پروردگار کے رسول کی نافرمانی کی۔[۷] چنانچہ اُس نے اُنھیں ایسی پکڑ پکڑا جو اپنی شدت میں بڑھتی چلی گئی۔ ۹-۱۰

بادلوں سے یہ ایک صاعقہ کی صورت میں نمودار ہوئی اور اِس نے پوری قوم کو تباہ و برباد کر دیا۔

۵۔ یعنی جب اُنھوں نے سرکشی کی تو اللہ پروردگار عالم نے ہوا کی باگ چھوڑ دی اور وہ سرکش اور بے قابو ہو کر اُنھیں جڑ پیڑ سے اکھاڑنے لگی۔

۶۔ اِس سے قوم لوط اور اِس طرح کی بعض دوسری قوموں کی بستیاں مراد ہیں جن سے قریش واقف تھے۔

۷۔ اِن الفاظ سے اُن کے جرم کی سنگینی واضح ہوتی ہے کہ اُنھوں نے جب خدا کے سفیر کی نافرمانی کی تو گویا خدا کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔

إِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ﴿١١﴾ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَآ أُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ﴿١٢﴾

فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿١٣﴾ وَّحُمِلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ﴿١٤﴾ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿١٥﴾ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ﴿١٦﴾ وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى أَرْجَآئِهَا ۚ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ﴿١٧﴾ يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ

(اِسی طرح نوح کو جھٹلانے کے نتیجے میں) جب (طوفان اٹھا اور) پانی حد سے گزر گیا تو ہم ہی تھے کہ ہم نے تمھیں کشتی میں اٹھا لیا، اِس لیے کہ اِس سرگذشت کو تمھارے لیے نصیحت بنا دیں اور یاد رکھنے والے کان اِس کو سنیں اور یاد رکھیں[8]۔ ۱۱-۱۲

سو اِسی طرح جب صور میں ایک ہی مرتبہ پھونک ماری جائے گی اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ایک ہی چوٹ میں پاش پاش کر دیا جائے گا تو اُس دن ہونے والی ہو جائے گی[9] اور آسمان پھٹ جائے گا، پھر (تم دیکھو گے کہ) اُس دن وہ بہت ہی بودا ہوگا، اور فرشتے اُس کے کناروں پر (سمٹے ہوئے) ہوں گے[10] اور تمھارے پروردگار کا

۸۔ اور کبھی نہ بھولیں کہ ہمارے اجداد پر یہ خدا نے احسان فرمایا اور اُن کے مقابلے میں مجرموں کا انجام یہ ہوا تھا۔ مگر افسوس کہ تم نے اِسے بھلا دیا اور اب ایک مرتبہ پھر رسول کی نافرمانی کر کے اپنی شامت بلا رہے ہو۔

۹۔ عذاب کے اُن تاریخی واقعات سے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے، یہ اب قیامت کا اثبات فرمایا ہے کہ جس طرح عاد و ثمود، فرعون اور قوم نوح کو تباہ کرنے کے لیے ہمیں کوئی تیاری نہیں کرنی پڑی، اُسی طرح قیامت بھی بغیر کسی تردد کے، چشم زدن میں برپا ہو جائے گی۔

لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ﴿۱۸﴾

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ﴿۱۹﴾ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ﴿۲۰﴾ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ﴿۲۱﴾ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿۲۲﴾ قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ ﴿۲۳﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓئًا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ

تخت اُس دن آٹھ فرشتے اپنے اوپر اُٹھائے ہوں گے۔[11] اُس دن تم پیش کیے جاؤ گے، اِس طرح کہ تمھاری کوئی چھپی ہوئی بات بھی چھپی نہ رہے گی۔۱۳-۱۸

پھر جس کا نامۂ اعمال اُس کے دہنے ہاتھ میں دیا جائے گا، وہ کہے گا: لو پڑھو، میرا نامۂ اعمال، مجھے یہ خیال رہا[12] کہ (ایک دن) مجھے اپنے اِس حساب سے دوچار ہونا ہے۔ چنانچہ وہ ایک دل پسند عیش میں ہو گا، بہشت بریں میں، جس کے میوے جھک رہے

۱۰؎ یعنی جنھیں تم دیویاں بنا کر پوجتے اور خدا کے حضور میں جن سے سفارش کی توقع رکھتے ہو، وہ اِس حادثے سے سراسیمہ ہو کر آسمان کے کناروں پر اِس طرح سمٹے ہوئے ہوں گے۔

۱۱؎ یہ امور متشابہات میں سے ہے جن کی حقیقت ہم دنیا میں نہیں سمجھ سکتے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...یہ احوال ایک نادیدہ عالم کے ہیں، اِن کا تصور دینے کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اِن کی اصل حقیقت کا جاننا اِس عالم میں ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن نے اِن کے متعلق یہ ہدایت دی ہے کہ وہ جس طرح بیان ہوئے ہیں، اُسی طرح اِن پر اجمالی ایمان رکھا جائے۔ اِن کی اصل حقیقت کے درپے نہ ہوا جائے، ورنہ اندیشہ ہے کہ آدمی کسی فتنے میں پڑ جائے۔" (تدبر قرآن ۸/ ۵۴۶)

۱۲؎ اصل میں لفظ 'ظَنّ' استعمال ہوا ہے۔ یہ ظن غالب کے مفہوم میں ہے۔ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جزا و سزا کو ماننے کے لیے یہی کافی ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت

فِى الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ﴿٢٤﴾

ہوں گے[۱۳] ـــــ اب کھاؤ اور پیو مزے سے[۱۴] اپنے اُن اعمال کے صلے میں جو تم نے گزرے ہوئے دنوں میں کیے ہیں۔ ۱۹-۲۴

فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''...آفاق و انفس اور انبیا و حکما کی تعلیم میں جزا و سزا کے لیے ایسے دلائل موجود ہیں کہ آدمی بالکل ہی بلید اور لاابالی نہ ہو تو اُس کا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ زندگی یوں ہی نہیں تمام ہو جائے گی، بلکہ ایک دن جزا اور سزا سے سابقہ پیش آنا بھی لازمی ہے۔ اگرچہ اِس بات پر اُس کو اِس طرح کا یقین تو نہیں ہوتا جو آنکھوں دیکھی چیز پر ہوا کرتا ہے، لیکن ایسا ظن غالب ضرور ہوتا ہے جس کے بعد وہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ اُس کو نظر انداز کر کے زندگی گزارے اور عاقبت کی کوئی پروا نہ کرے۔ اِس ظن غالب سے آخرت پر جو ایمان پیدا ہوتا ہے، وہ بالتدریج ایمانی تجربات سے مضبوط ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ درجہ بہ درجہ یقین کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ اگر آدمی اِس ظن غالب کو نظر انداز کر کے اِس انتظار میں رہے کہ جب اُس کو آخرت کا یقین ہو جائے گا، تب اُس کو مانے گا تو یہ انتظار اُسی دن ختم ہو گا، جس دن وہ سب کچھ آنکھوں سے دیکھ لے گا اور اُس دن کا ایمان اُس کے لیے بالکل بے سود ہو گا۔''

(تدبر قرآن ۸/۵۴۷)

۱۳؎ یہ ایک خوب صورت تقابل ہے۔ بہشت کے لیے 'عَالِيَة' اور اُس کے پھلوں اور خوشوں کے لیے 'دَانِيَة' کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی باغ تو بلند ہوں گے، لیکن اُن کے پھل اور خوشے کھانے والوں کے لیے جھک رہے ہوں گے، اُن تک پہنچنے میں کسی کو کوئی دقت پیش نہ آئے گی۔

۱۴؎ اصل میں لفظ 'هَنِيْٓئًا' استعمال ہوا ہے۔ یہ مصدر محذوف کی صفت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کھانا پینا تمھارے لیے رچتا پچتا اور راس آنے والا ہے۔ نہ اِس میں احتیاط کی ضرورت ہے اور نہ یہ کسی امتحان کے لیے دیا گیا ہے کہ اِس کا حق ادا نہ کرو گے تو دنیا کی نعمتوں کی طرح وبال بن جائے

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ۬ فَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِیَهْ ﴿۲۵﴾ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِیَهْ ﴿۲۶﴾ یٰلَیْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِیَةَ ﴿۲۷﴾ مَاۤ اَغْنٰی عَنِّیْ مَالِیَهْ ﴿۲۸﴾ هَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَهْ ﴿۲۹﴾ خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ الْجَحِیْمَ صَلُّوْهُ ﴿۳۱﴾ ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ﴿۳۲﴾ اِنَّهٗ كَانَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِیْمِ ﴿۳۳﴾ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ ﴿۳۴﴾ فَلَیْسَ لَهُ الْیَوْمَ هٰهُنَا حَمِیْمٌ ﴿۳۵﴾ وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا

اور جس کا نامۂ اعمال اُس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، وہ کہے گا: اے کاش، میرا یہ نامۂ اعمال مجھے نہ ملتا اور میرا حساب کیا ہے، میں اُس سے بے خبر ہی رہتا! اے کاش، وہی موت فیصلہ کن ہو جاتی! میرا مال میرے کیا کام آیا؟ میری سب بادشاہی مجھ سے لٹ گئی[۱۵] —— اِس کو پکڑو اور اِس کی گردن میں طوق ڈال دو۔ پھر اِس کو دوزخ میں جھونک دو۔ پھر ایک زنجیر میں ڈال دو جس کی ناپ گزوں میں ستر گز ہے —— یہ نہ اللہ بزرگ و برتر کو مانتا تھا اور نہ فقیروں کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتا تھا[۱۶]۔ اِس لیے آج یہاں اِس کا کوئی غم خوار نہیں ہے اور دھوون[۱۷] کے سوا اِس کے لیے کوئی کھانا گا۔

۱۵؎ اصل الفاظ ہیں: 'هَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَهْ'۔ اِن میں 'هَلَكَ' کے ساتھ 'عَنْ' اِس لیے موزوں ہوا کہ یہاں یہ 'ذهب' یا 'بعد' کے مفہوم پر متضمن ہے۔

۱۶؎ یعنی دولت رکھتے ہوئے یہ جب غریبوں اور مسکینوں سے بے پروا رہا تو حقیقت یہ ہے کہ اِس نے خدا کو بھی نہیں مانا، اگرچہ یہ اُس پر ایمان کا مدعی رہا ہو۔

۱۷؎ اصل میں لفظ 'غِسْلِیْن' آیا ہے۔ عربی زبان میں یہ ناپاک اور گندی چیزوں کے دھوون

مِنۡ غِسۡلِیۡنٍ ﴿۳۶﴾ لَّا یَاۡکُلُہٗۤ اِلَّا الۡخَاطِـُٔوۡنَ ﴿۳۷﴾
فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِمَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۳۸﴾ وَ مَا لَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّہٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ
کَرِیۡمٍ ﴿۴۰﴾ وَّ مَا ہُوَ بِقَوۡلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۴۱﴾
وَ لَا بِقَوۡلِ کَاہِنٍ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۴۲﴾ تَنۡزِیۡلٌ مِّنۡ

نہیں ہے۔ اِس کو یہ گنہ گار ہی کھائیں گے۔[18] ۲۵-۳۷

سو نہیں، (یہ کسی شیطان کا الہام نہیں ہے)۔ میں اُس کی شہادت پیش کرتا ہوں جسے تم دیکھتے ہو[19] اور اُس کی بھی جسے تم نہیں دیکھتے[20] کہ بے شک، یہ ایک رسول کریم کا کلام ہے[21] اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے، تم لوگ کم ہی مانتے ہو۔ اور نہ کسی کاہن کا کلام ہے، تم

کے لیے آتا ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی راہ میں انفاق سے ہاتھ کھینچ کر اپنے جس مال کو اُس نے غلاظت بنا لیا، وہی قیامت میں اُس کا دھوون بن کر اُس کے سامنے آ جائے گا۔

۱۸؎ مطلب یہ ہے کہ عمل اور سزا میں مشابہت کی رعایت سے یہ کھانا اِنھی مجرموں کے لیے خاص ہو گا۔

۱۹؎ یعنی عالم مشہود، جس میں انفس و آفاق کے حقائق اور زمین پر خدا کی دینونت کے مظاہر سے قرآن نے جگہ جگہ اپنے انذار کا اثبات اور اِس طرح گویا اپنی حقانیت پر استدلال کیا ہے۔ اِس کی ایک مثال قوم نوح کی وہ سرگذشت ہے جو آگے سورۂ نوح (۷۱) میں سنائی گئی ہے۔

۲۰؎ یعنی عالم نامشہود، جس کی ایک نمایاں مثال آسمانوں میں نزول قرآن کا وہ اہتمام ہے جس کی تفصیلات آگے سورۂ جن (۷۲) میں خود جنات کی زبان سے بیان ہوئی ہیں۔

۲۱؎ رسول کریم سے مراد جبریل امین ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اِس کو کسی شیطان نے نہیں، بلکہ خدا کے ایک معزز فرشتے جبریل علیہ السلام نے الہام کیا ہے جن کے کسی الہام میں کوئی شیطان کبھی دراندازی نہیں کر سکتا۔

رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۳﴾ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ﴿۴۴﴾ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ﴿۴۵﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ﴿۴۶﴾ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾ وَاِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ

لوگ کم ہی سمجھتے ہو۔[۲۲] یہ رب العٰلمین کی طرف سے نازل ہوا ہے۔[۲۳] ہمارا یہ پیغمبر اگر اپنی طرف سے کوئی بات ہم پر بنا لاتا تو ہم اِس کو قوی ہاتھ سے پکڑ لیتے، پھر اِس کی رگ گردن کاٹ دیتے، پھر تم میں سے کوئی ہمیں اِس کام سے روک نہ سکتا۔[۲۴]

الحاقة
۶۹

۲۲۔ اصل الفاظ ہیں: 'قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ'۔ پچھلے جملے میں 'قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ دونوں میں فعل ہمارے نزدیک ارادۂ فعل کے معنی میں ہے، یعنی ماننا نہیں چاہتے، سمجھنا نہیں چاہتے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''یہ بالکل ٹھیک اِن مکذبین کے باطن کی تعبیر ہے۔ آخر قریش کے یہ لیڈر اتنے بدذوق اور غبی تو نہیں تھے کہ وہ اللہ کے کلام اور اپنے شاعروں اور کاہنوں کے کلام کے فرق کو نہ سمجھ سکیں۔ وہ اِس فرق کو سمجھتے تھے اور گاہ گاہ اُن کے اندر سچائی کے اعتراف کا جذبہ بھی ابھرتا رہا ہوگا، لیکن نفس کی خواہشوں کے بوجھ تلے یہ جذبہ اِس طرح دبا ہوا تھا کہ اول تو یہ ابھرتا ہی بہت کم تھا اور اگر کبھی ابھرتا بھی تو اتنا ضعیف ہوتا کہ وہ زندگی میں کوئی موثر تبدیلی نہ لاسکتا۔ بس کوئی ایسا ہی خوش قسمت ہوتا تو وہ اپنے نفس کے حجابات سے نکلنے میں کامیاب ہوتا۔'' (تدبر قرآن ۸/ ۵۵۳)

۲۳۔ یعنی اُس ہستی کی طرف سے نازل ہوا ہے جو بادشاہ کائنات ہے، اِس لیے ڈرو اُس وقت سے جب اِس کی تکذیب کا انجام بھگتنا پڑ جائے۔

۲۴۔ یہ قریش کے اِس الزام کی تردید بھی ہے جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لگاتے تھے کہ یہ سب کچھ آپ اپنے جی سے گھڑ کر پیش کر دیتے ہیں اور اُن کے اِس مطالبے کا جواب بھی کہ اِس قرآن کو ہم سے منوانا ہے تو اِس کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ یا کم سے کم اِس میں ایسی تبدیلی کردو کہ یہ

مِنكُم مُّكَذِّبِيْنَ ﴿۴۹﴾ وَاِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۰﴾ وَاِنَّهٗ لَحَقُّ

یہ تو درحقیقت ڈرنے والوں کے لیے ایک یاددہانی ہے۔ہم خوب جانتے ہیں کہ تم میں (اِس کے) جھٹلانے والے بھی ہیں۔(یہ اِسی طرح جھٹلاتے رہیں گے) اور (قیامت میں) اِن منکروں کے لیے یقیناً یہ ایک پچھتاوا بن جائے گا۔اِس میں شبہ نہیں کہ یہ ایک

ہمارے لیے قابل قبول ہو جائے۔آخر میں 'فَمَا مِنكُم مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ' کے جو الفاظ آئے ہیں، اُن میں 'حٰجِزِيْنَ' کا اِس طرح جمع کی صورت میں آنا اِس لیے موزوں ہوا ہے کہ لفظ 'اَحَدٍ' یہاں جمع کے مفہوم میں ہے، جس طرح سورۂ احزاب (۳۳) کی آیت ۳۲ 'لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ' میں ہے۔

انبیا علیہم السلام کے ساتھ یہ معاملہ کیوں ہوتا ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اِس طرح کی کڑی نگرانی اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کی کرتا ہے جن کو وہ منصب رسالت پر مامور فرماتا ہے، اِس لیے کہ اُن کی تحویل میں وحی کا خزانہ ہوتا ہے جس کی حفاظت ضروری ہے۔اِس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ جو شخص بھی خدا پر جھوٹ بولے، اُس کی گردن توڑ دی جائے۔جھوٹ بولنا تو درکنار کتنے ہیں جو خدا کو گالی دیتے ہیں، لیکن اِس دنیا میں اُن کو بھی مہلت ملی ہوئی ہے۔وہ اپنا انجام آخرت میں بھگتیں گے۔البتہ، خدا کا کوئی سچا رسول نہ خدا پر کوئی افترا کر سکتا اور نہ کسی کے دباؤ سے اُس کے پیغام میں کوئی کمی بیشی کر سکتا۔ رسولوں کو جو عصمت حاصل ہوتی ہے، اُس کی حکمت بھی یہی ہے کہ اُن کی امانت میں خدا کی شریعت ہوتی ہے، اُن کی معمولی بھول چوک اور غلطی پوری خلق کے لیے موجب فتنہ بن سکتی ہے، اِس وجہ سے اُن سے کوئی معمولی فروگزاشت بھی ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کو فوراً درست فرما دیتا ہے۔دوسروں کو یہ حفاظت حاصل نہیں ہوتی، کیونکہ وہ اُس ذمہ داری پر مامور نہیں ہوتے، جس پر حضرات انبیا علیہم السلام ہوتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۸/۵۵۴)

الْيَقِيْنِ ﴿۵۱﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۵۲﴾

سورة المعارج

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ﴿۱﴾ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ﴿۲﴾ مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ ﴿۳﴾ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ

یقینی حق ہے۔ اِس لیے، (اے پیغمبر، اِنھیں چھوڑو اور) اپنے رب عظیم کے نام کی تسبیح کرتے رہو[25]۔ ۳۸-۵۲

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

بہت جلدی مچائی ہے ایک جلدی مچانے والے نے[26]، اُس عذاب کے لیے جو اِن منکروں پر آ کر رہے گا، اُسے کوئی ہٹا نہ سکے گا۔ وہ اللہ کی طرف سے آئے گا جو عروج کے زینوں والا ہے[27]۔ (یہ ہر چیز کو اپنے پیمانوں سے ناپتے اور پھر جلدی مچا دیتے ہیں۔

۲۵؎ اِس طرح کے حالات میں یہی تسبیح ہے جو داعی حق کے لیے صبر و استقامت کا ذریعہ بنتی ہے۔

۲۶؎ اصل میں لفظ 'سُوؔال' استعمال ہوا ہے، لیکن اِس کا صلہ چونکہ آیت میں 'ب' آیا ہے، اِس لیے عربیت کی رو سے اِسے استعجال یا استہزا کے مفہوم پر متضمن سمجھنا چاہیے۔ یعنی وہ مذاق اڑانے کے لیے جلدی مچاتے اور کہتے ہیں کہ وہ عذاب کہاں رہ گیا؟ ابھی تک آیا کیوں نہیں؟ ہم کب سے اُس کے ڈراوے سن رہے ہیں، لیکن وہ چلا تو کہیں ستانے کے لیے بیٹھ گیا ہے کہ ابھی تک یہاں نہیں پہنچا؟

۲۷؎ یہ خدا کی بلندی بارگاہ کی تعبیر ہے۔ اِس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ اُس کے فیصلے اُس کی

مِقۡدَارُهٗ خَمۡسِيۡنَ اَلۡفَ سَنَةٍ ۚ﴿۴﴾ فَاصۡبِرۡ صَبۡرًا جَمِيۡلًا ﴿۵﴾ اِنَّهُمۡ يَرَوۡنَهٗ بَعِيۡدًا ۙ﴿۶﴾ وَّنَرٰىهُ قَرِيۡبًا ؕ﴿۷﴾

يَوۡمَ تَكُوۡنُ السَّمَآءُ كَالۡمُهۡلِ ۙ﴿۸﴾ وَتَكُوۡنُ الۡجِبَالُ كَالۡعِهۡنِ ۙ﴿۹﴾

اِنھیں بتاؤ کہ) فرشتے اور روح الامین[۲۸] (تمھارے حساب سے) پچاس ہزار سال کے برابر ایک دن میں اُس کے حضور چڑھ کر پہنچتے ہیں[۲۹]۔ اِس لیے، (اے پیغمبر)، تم (اِن کی باتوں پر) پورے حسن و وقار کے ساتھ صبر کرو[۳۰]۔ یہ اُس کو دور سمجھتے ہیں اور ہم اُسے بہت قریب دیکھ رہے ہیں۔ ۱-۷

(یہ بھی دیکھیں گے، یہاں اور اِس کے بعد آخرت میں بھی)۔

اُس دن جب آسمان تیل کی تلچھٹ کی طرح ہو جائے گا اور پہاڑ دُھنی ہوئی اُون

شان کے مطابق اور اُس کی بارگاہ کے لحاظ سے صادر ہوتے ہیں، اُنھیں تھڑدلے انسانوں کے جذبات و خواہشات اور توقعات پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔

۲۸؎ اِس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ وہ تمام ملائکہ کے سرخیل ہیں۔ عام کے بعد خاص کا یہ ذکر اُن کے اِسی مرتبے کے پیش نظر ہے۔

۲۹؎ یہ امور متشابہات میں سے ہے جن کی پوری حقیقت ہم یہاں نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن مطلب یہی ہے کہ اُنھیں خدا کو اپنے پیمانوں سے نہیں ناپنا چاہیے۔ اُس کی سلطنت میں دن پچاس پچاس ہزار سال کے بھی ہوتے ہیں۔

۳۰؎ اصل الفاظ ہیں: 'فَاصۡبِرۡ صَبۡرًا جَمِيۡلًا'۔ اِن سے کیا مراد ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...مطلب یہ ہے کہ اِن کے رویے سے نہ تو دل شکستہ اور مایوس ہو نہ اِن کے جواب میں کوئی عاجلانہ قدم اٹھاؤ اور نہ اپنے موقف میں کوئی کمزوری پیدا ہونے دو۔ مختلف صورتوں میں صبر کی ہدایت کے ساتھ اُن باتوں کی طرف اشارے بھی فرما دیے گئے ہیں جو صبر کو صبر جمیل بنانے کے

المعارج ۷۰

وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ﴿۱۰﴾ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ؕ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۭ بِبَنِيْهِ ﴿۱۱﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَ اَخِيْهِ ﴿۱۲﴾ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ﴿۱۳﴾ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ ﴿۱۴﴾

كَلَّا ؕ اِنَّهَا لَظٰى ﴿۱۵﴾ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ﴿۱۶﴾ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ﴿۱۷﴾ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ﴿۱۸﴾

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿۱۹﴾ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ﴿۲۰﴾ وَّاِذَا

المعارج ۷۰

کی طرح ہوں گے، اور کوئی سچا دوست بھی اُس وقت اپنے کسی دوست کو نہ پوچھے گا، اِس کے باوجود کہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے۔ مجرم چاہے گا کہ وہ اُس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنے بیٹوں کو، اپنی بیوی کو، اپنے بھائی کو، اپنے خاندان کو جو اُسے پناہ دیتا رہا، اور روے زمین کے ہر شخص کو فدیے میں دے دے، پھر اپنے آپ کو (اُس سے) چھڑا لے۔ ۸-۱۴

ہرگز نہیں، وہ آگ کی لپٹ ہے، چمڑی ادھیڑتی،[۳۱] ہر اُس شخص کو پکارتی ہوئی[۳۲] جس نے پیٹھ پھیری اور منہ موڑا اور مال جمع کیا، پھر سینت سینت کر رکھا۔[۳۳] ۱۵-۱۸

(یہ اِسی طرح جلدی مچاتے رہیں گے، تم اِن کی پروا نہ کرو)۔ حقیقت یہ ہے کہ

لیے ضروری ہیں۔'' (تدبر قرآن ۸/۵۶۷)

۳۱؎ یعنی وہ عذاب آگ کی لپٹ ہے۔ 'اِنَّهَا' میں ضمیر مونث آگ کی رعایت سے آئی ہے۔

۳۲؎ لفظ 'تَدْعُوْا' کا استعمال اِس آیت میں نہایت بلیغ ہے۔ یعنی پیغمبر کا بلانا تو اِن پر اثر انداز نہیں ہو رہا، لیکن ایک دن وہ بھی آئے گا، جب اِنھیں دوزخ بلائے گی۔

۳۳؎ یعنی آنکھیں بند کر کے، حلال و حرام، ہر راہ سے مال جمع بھی کیا اور اُسے گن گن کر رکھا بھی۔

مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ﴿۲۱﴾ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ﴿۲۲﴾ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ﴿۲۴﴾ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿۲۵﴾ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۲۶﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ

انسان بہت بے صبرا پیدا ہوا ہے[۳۴]۔ اُس پر جب مصیبت آتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب راحت ملتی ہے تو سخت بخیل بن جاتا ہے۔ ہاں، مگر وہ نہیں جو نمازی ہیں[۳۵]، جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں[۳۶]، جن کے مالوں میں سائل و محروم[۳۷] کے لیے ایک مقرر حق ہے[۳۸]،

۳۴؎ یہ انسان کی فطرت میں کسی چیز کے غلبے کی تعبیر ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، ہانڈی میں نمک ناقابل برداشت حد تک زیادہ ہو جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہانڈی نمک ہی سے تیار ہوئی ہے۔ عجلت کا داعیہ بجائے خود مذموم نہیں ہے اور انسان کی فطرت میں اِس کا ایک مقام بھی ہے، لیکن یہ اگر حد سے بڑھ جائے اور اِس کا ظہور بے محل ہو تو قابل مذمت ہے۔

لفظ 'الْاِنْسَان' سے اشارہ اُنھی بدبختوں کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے۔ کسی خاص جماعت کا ذکر جب اِس طرح عام لفظ سے کیا جائے تو اِس سے بے اعتنائی، بلکہ تحقیر کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔

۳۵؎ اِس سے معلوم ہوا کہ نفس کے داعیات میں اعتدال اور توازن پیدا کرنے اور شیطان کی ترغیبات سے اپنے آپ کو بچائے رکھنے کے لیے سب سے پہلی چیز نماز کا اہتمام ہے۔ اِس کے بغیر کوئی شخص اِس مقصد میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔

۳۶؎ یہ ایک نہایت اہم تنبیہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... پابندی کے ساتھ تھوڑا عمل اُس عمل سے کہیں زیادہ بابرکت ہے، جو اگرچہ مقدار میں زیادہ ہو، لیکن وہ محض وقتی اور ہنگامی ہو۔ ایک زور کا دونگڑا برس کر اگر ابر طویل عرصے کے لیے غائب ہو جائے تو فصلیں سوکھ کر تباہ ہو جاتی ہیں، برعکس اِس کے تھوڑی بارش بھی جھڑی کی شکل

عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿٢٧﴾ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ﴿٢٨﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ﴿٢٩﴾ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ

جو روز جزا کو برحق مانتے ہیں، جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں[39] ـــــ اِس لیے کہ اُن کے پروردگار کا عذاب ایسی چیز نہیں ہے کہ اُس سے کوئی نڈر ہو جائے ـــــ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں ـــــ اپنی بیویوں اور لونڈیوں[40] کے سوا، اِس لیے کہ

میں قائم و دائم رہے تو وہ کھیتوں کو شاداب رکھتی اور فصلوں کو بارآور کرتی ہے۔ یہی حال نماز کا بھی ہے۔ دین کا جو عام مطالبہ ایک مسلمان سے ہے، اگر وہ اُسی کو پابندی اور تسلسل کے ساتھ پورا کرے تو اُس کے عمل میں جو برکت ہوگی، وہ اُن لوگوں کے عمل میں نہیں ہوگی جو گاہ گاہ تو بڑے نمازی بن جاتے ہیں، لیکن پھر اِس طرح بھول جاتے ہیں کہ مسجد کی صورت بھی نہیں دیکھتے۔'' (تدبر قرآن ۸/ ۵۷۲)

۳۷؎ یہاں یہ لفظ 'سَآئِل' کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی وہ شخص جو محروم ہونے کے باوجود دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کرنے کا ننگ گوارا کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔

۳۸؎ نماز کے بعد یہ دوسری چیز ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کے مال میں غریبوں کا جو حق زکوٰۃ کی صورت میں مقرر کر دیا ہے، اُسے ادا کیا جائے۔ دین ابراہیمی کی ایک روایت کی حیثیت سے اہل عرب اِس سے پوری طرح واقف تھے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس دنیا میں اللہ کا بندہ بن کر رہنے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے: ایک یہ کہ خالق کے ساتھ انسان کا تعلق ٹھیک ٹھیک قائم ہو جائے۔ دوسری یہ کہ مخلوق کے ساتھ وہ صحیح طریقے سے جڑ جائے۔ پہلی چیز نماز سے حاصل ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا اولین مظہر ہے اور دوسری انفاق سے جو اُس کی مخلوق کے ساتھ محبت کا اولین مظہر ہے۔

۳۹؎ یہ اُن کے اندر خیر و صلاح کا اصل محرک بیان ہوا ہے۔

۴۰؎ بیویوں کے علاوہ لونڈیوں کے معاملے میں بھی یہ اجازت اِس لیے تھی کہ اُن کے لیے

مَلُومِينَ ۚ ﴿٣٠﴾ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ۚ ﴿٣١﴾ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ﴿٣٢﴾ وَالَّذِينَ هُم بِشَهَادَاتِهِمْ قَائِمُونَ ﴿٣٣﴾ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ﴿٣٤﴾ أُولَٰئِكَ فِي جَنَّاتٍ مُّكْرَمُونَ ﴿٣٥﴾

اُن کے معاملے میں اُن پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ ہاں، جو اِس کے آگے کچھ چاہیں تو وہی حد سے بڑھنے والے ہیں ـــــ جو (خلق اور خالق، دونوں کے معاملے میں) اپنی امانتوں[41] اور اپنے عہد[42] کا پاس کرتے ہیں، جو اپنی گواہی پر قائم رہتے ہیں اور جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں[43]۔ یہی ہیں جو (بہشت کے) باغوں میں ہوں گے، بڑی عزت کے ساتھ[44]۔ ۱۹-۳۵

آزادی کے ساتھ اور خاندانی عورتوں کی طرح زندگی بسر کرنے کی کوئی مناسب اور باوقار صورت اُس وقت تک پیدا نہیں ہوئی تھی۔

[41] امانتوں سے مراد یہاں وہ سب قوتیں، صلاحیتیں اور اسباب و وسائل ہیں جن سے انسان کو اللہ تعالیٰ نے اِس دنیا میں بہرہ مند فرمایا ہے۔

[42] لفظ عہد بھی یہاں وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...وہ عہد بھی اِس میں شامل ہے جو باہمی قول و قرار سے ہمارے اندر وجود میں آتا ہے، وہ عہد بھی اِس میں شامل ہے جو اگرچہ قول و قرار سے وجود میں نہیں آتا، لیکن ہر اچھے معاشرے میں وہ مسلم اور معروف ہے، اِسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہماری فطرت سے جو عہد لیا ہے، وہ بھی اِس میں شامل ہے اور سب سے زیادہ اہم حصہ اِس کا وہ عہد و میثاق ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعے سے ہم سے لیا ہے اور جس کی دفعات نہایت وضاحت سے شریعت میں مرقوم ہیں۔“ (تدبرقرآن ۸/۵۷۶)

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ﴿۳۶﴾ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ﴿۳۷﴾ اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ ﴿۳۸﴾ كَلَّا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾
فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ﴿۴۰﴾ عَلٰٓى

پھر کیا بات ہے کہ (ہمارا یہ فیصلہ سنتے ہی) یہ منکرین دائیں اور بائیں سے، گروہ در گروہ، تم پر پلے پڑ رہے ہیں؟ کیا اِن میں سے ہر شخص یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ راحت بھری جنت میں داخل کر لیا جائے گا؟ (صرف اِس لیے کہ وہ دنیا میں بڑا ہے)۔ ہرگز نہیں، (یہ اپنی بڑائی پر نہ اترائیں)، ہم نے اِن کو اُس چیز سے پیدا کیا ہے جسے یہ جانتے ہیں۔ ۳۶-۳۹
(یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اِنھیں دوبارہ پیدا نہ کر سکیں گے)؟ سو نہیں، میں قسم کھاتا ہوں اُس کی جو مشرق و مغرب کی تمام وسعتوں کا مالک ہے[۴۵]، ہم اِس پر قادر ہیں کہ اِن کو بدل کر

۴۳؎ یعنی اُن آفات سے نماز کی حفاظت کرتے ہیں جو اُس کے فوائد برباد کر دے سکتی ہیں۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اوپر نماز سے صالحین کی صفات بیان کرنا شروع کی تھیں اور اب نماز ہی پر اِس باب کو ختم کیا ہے۔ اِس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نماز ہی تمام خیر و صلاح کا منبع ہے اور وہی اِس کی محافظ بھی ہے۔

۴۴؎ اِس میں قریش کے اُن مغروروں پر تعریض بھی ہے جن کا زعم تھا کہ آخرت ہوئی بھی تو جس طرح دنیا میں تمام نعمتیں اُن کو حاصل ہیں، اُسی طرح وہاں بھی سارے مدارج اُنھی کے لیے ہوں گے۔

۴۵؎ اصل میں 'مَشٰرِق' اور 'مَغٰرِب' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ جمع کی صورت میں ہیں اور جمع کے بارے میں معلوم ہے کہ عربی زبان میں یہ کسی شے کی وسعتوں کو ظاہر کرنے کے لیے بھی آتی

اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۴۱﴾ فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِىْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۲﴾ يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ ﴿۴۳﴾ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِىْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۴﴾

اِن سے بہتر پیدا کردیں اور ہم اِس سے عاجز نہ رہیں گے۔ اِس لیے (یہ نہیں سمجھتے تو) اِنھیں چھوڑو، یہ باتیں بنائیں اور کھیلیں، یہاں تک کہ اپنے اُس دن کو پہنچ جائیں جس کی دھمکی اِنھیں دی جا رہی ہے۔ جس دن یہ اپنی قبروں سے بڑی تیزی کے ساتھ بھاگتے ہوئے نکلیں گے، گویا دوڑ کے لیے لگائے ہوئے نشانوں کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ اِن کی آنکھیں جھکی ہوں گی، اِن پر ذلت چھا رہی ہوگی۔ یہ ہے وہ دن جس سے یہ ڈرائے جاتے رہے۔ ۴۰-۴۴

ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔ اِس سے قسم کا یہ پہلو بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اِس جملے میں اللہ تعالیٰ کی غیر محدود قدرت سے بعث ونشر پر استدلال کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس پروردگار کے حکم سے سورج، چاند اور کروڑوں اربوں نجوم وکواکب طلوع وغروب ہوتے ہیں، اُس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے کہ جب چاہے، مرکھپ جانے کے بعد تمھیں ازسرِنو اٹھا کھڑا کرے۔ دنیا کی وہ کون سی چیز ہے جو اُس کے اِس ارادے میں رکاوٹ بن سکتی ہے؟

کوالالمپور

۴؍ فروری ۲۰۱۰ء

نوح - الجن
۷۱ــــــ۷۲

نوح - الجن

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ قوم نوح کی سرگذشت کے آئینے میں قرآن کے انذار اور اُس کے نتائج کی جو تصویر دکھاتی ہے، دوسری اُسی کے اثبات میں جنوں کی شہادت پیش کرتی اور قریش کو اِس کے بارے میں اپنے رویے پر نظر ثانی کی دعوت دیتی ہے۔

اِس لحاظ سے دیکھیے تو سورۂ حاقہ میں جو مضمون اِس سے پہلے 'مَا تُبْصِرُوْنَ' اور 'مَا لَا تُبْصِرُوْنَ' کے الفاظ میں بالاجمال بیان ہوا ہے، یہ دونوں سورتیں بالترتیب اُسی کے بعض پہلوؤں کی تفصیل ہیں۔

دونوں میں روے سخن قریش کے سرداروں کی طرف ہے اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ پچھلی سورتوں کی طرح یہ بھی ام القریٰ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ انذار میں نازل ہوئی ہیں۔

پہلی سورہ ــــ نوح ــــ کا موضوع قریش کے لیے رسولوں کی دعوت اور اُس کے مختلف مراحل کی وضاحت کرنا اور اُس کے اُن نتائج سے اُنھیں خبردار کرنا ہے جو سنت الٰہی کے مطابق اُسے نہ ماننے والوں کے لیے لازماً نکلتے ہیں۔

دوسری سورہ ــــ الجن ــــ کا موضوع جنوں کی شہادت سے قرآن مجید اور اُس کی حقانیت قریش پر ثابت کرنا اور اُنھیں یہ سمجھانا ہے کہ جس عذاب کا وہ مطالبہ کر

رہے ہیں، اُس کا علم اللہ ہی کے پاس ہے۔ خدا کے پیغمبر عذاب کا وقت بتانے کے لیے نہیں، خدا کا پیغام پہنچانے کے لیے آتے ہیں۔ وہ خدا سے عذاب نہیں، بلکہ اُس کی رحمت چاہیں۔ اِس کے لیے پیغمبر کے مقابلے میں سرکشی اور تمرد کا رویہ چھوڑ کر اُس کی دعوت پر لبیک کہیں اور خدا کے گھر میں خدا ہی کی عبادت کریں۔

سورة نوح

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖۤ اَنۡ اَنۡذِرۡ قَوۡمَکَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۱﴾ قَالَ یٰقَوۡمِ اِنِّیۡ لَکُمۡ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۲﴾ اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَ اتَّقُوۡہُ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ﴿۳﴾ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ مِّنۡ ذُنُوۡبِکُمۡ وَ یُؤَخِّرۡکُمۡ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ اِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ اِذَا جَآءَ لَا یُؤَخَّرُ ۘ لَوۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴﴾

نوح
۷۱

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

ہم نے نوح کو اُس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا کہ اپنی قوم کو خبردار کرو، اِس سے پہلے کہ ایک دردناک عذاب اُن پر آ جائے[۱]۔ اُس نے کہا: میری قوم کے لوگو، میں تمھارے لیے ایک صاف صاف خبردار کر دینے والا ہوں۔ (میں تمھیں دعوت دیتا ہوں) کہ اللہ کی بندگی کرو اور اُس کے حدود کے پابند رہو[۲] اور میری بات مانو۔ اِس کے نتیجے میں اللہ تمھارے گناہوں میں سے معاف فرمائے گا، (جو اِس سے پہلے تم سے ہوئے ہیں[۳])، اور تمھیں ایک مقرر وقت تک مہلت دے گا[۴]۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا

۱۔ یعنی عذاب سے پہلے اتمام حجت کے لیے اُسی طرح رسول بنا کر بھیجا، جس طرح اب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھیجا ہے۔ یہ اُس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کے تحت اللہ کے رسول مختلف قوموں کی طرف بھیجے جاتے رہے ہیں۔

۲۔ اصل میں لفظ 'تَقْوٰی' استعمال ہوا ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں اِس کے معنی زندگی کے تمام معاملات میں حدود الٰہی کی پابندی کرنے کے ہیں۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ دَعَوۡتُ قَوۡمِیۡ لَیۡلًا وَّ نَہَارًا ۙ﴿۵﴾ فَلَمۡ یَزِدۡہُمۡ دُعَآءِیۡۤ اِلَّا فِرَارًا ﴿۶﴾ وَ اِنِّیۡ کُلَّمَا دَعَوۡتُہُمۡ لِتَغۡفِرَ لَہُمۡ جَعَلُوۡۤا اَصَابِعَہُمۡ فِیۡۤ

مقرر کیا ہوا وقت جب آجاتا ہے تو پھر ٹالا نہیں جاتا۔ اے کاش، تم (اِس کو) سمجھتے۔ ۱-۴

(وہ یہی دعوت دیتا رہا، مگر وہ لوگ نہیں مانے۔ یہاں تک کہ) اُس نے کہا: میرے مالک، میں نے اپنی اِس قوم کو شب و روز پکارا، لیکن میری پکار سے یہ اور زیادہ بھاگتے ہی رہے[۵]۔ میں نے جب بھی اِنھیں بلایا، اِس لیے کہ (اِن کے پلٹنے پر[۶]) تو اِنھیں معاف

نوح ۷۱

[۳] اصل میں 'مِنْ ذُنُوْبِكُمْ' ہے۔ اِس سے پہلے 'مَا تَقَدَّمَ' کے الفاظ وضاحت قرینہ کی بنا پر حذف ہو گئے ہیں۔ ہم نے ترجمے میں اُنھیں کھول دیا ہے۔

[۴] یعنی اُس وقت تک مہلت دے گا جو افراد اور قوموں کی موت و حیات کے لیے اُس نے مقرر کر رکھی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''معین مدت' کی قید اِس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ اِس دنیا میں کوئی مہلت بھی غیر محدود نہیں ہے۔ یہ دنیا اور اِس کی ہر چیز وقتی اور فانی ہے۔ آدمی ایمان و عمل صالح کی زندگی گزارے، جب بھی اُس کو یہاں غیر محدود زندگی نہیں مل جاتی، بلکہ لازماً وہ ایک دن اپنی جان جان آفرین کے حوالے کرتا ہے۔ البتہ، یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے کسی عذاب سے نہیں ہلاک ہوتا، بلکہ وہ اپنی مہلت حیات سے بہرہ مند ہونے کی فرصت پاتا ہے۔ اِسی طرح کوئی قوم اگر ایمان، تقویٰ اور اطاعت رسول کی زندگی اختیار کرتی ہے تو اُس کو بھی اللہ تعالیٰ اُسی وقت تک بہرہ مند رکھتا ہے، جب تک وہ ایمان و تقویٰ پر استوار رہتی ہے۔ جوں ہی وہ اِس سے منحرف ہوتی ہے، اُس پر زوال کے آثار طاری ہونے شروع ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ جب اُس کا اخلاقی زوال اُس نقطہ پر پہنچ جاتا ہے جو آخری ہے تو اُس کی 'اَجَلٌ مُّسَمًّى' پوری ہو جاتی ہے اور قومی حیثیت سے اُس کا وجود صفحۂ ارض سے مٹ جاتا ہے۔ یہی حال اِس مجموعی دنیا کا بھی ہے۔ اِس کی مدت بھی معین و مقرر ہے۔ ایک دن آئے گا، جب اِس دار الامتحان کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور

اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۚ ﴿٧﴾ ثُمَّ اِنِّيْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۙ ﴿٨﴾ ثُمَّ اِنِّيْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۙ ﴿٩﴾

فرمائے تو اِنھوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں اور اپنی چادریں لپیٹ لیں[7] اور اپنی ضد پر اَڑ گئے اور بڑا غرور دکھایا۔[8] پھر میں نے اِن کو کھلم کھلا دعوت دی۔[9] پھر

ایک نیا عالم نئے نوامیس وقوانین کے ساتھ ظہور میں آئے گا، جس کو دارآخرت کہتے ہیں۔''

(تدبر قرآن ۸/ ۵۹۳)

۵۔ یہ دعوت کی راہ میں کم وبیش نو ساڑھے نو سو سال کی جدوجہد کے بعد اُس مرحلے کا بیان ہے، جب سیدنا نوح علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے استغاثہ کیا کہ اُن کی یہ جدوجہد بالکل بے اثر رہی ہے۔

۶۔ یہ الفاظ اصل میں بہ تقاضاے بلاغت حذف ہیں۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''...حضرت نوح علیہ السلام نے فعل کی جگہ ثمرۂ فعل کو رکھ دیا ہے تاکہ قوم کی بدبختی ومحرومی پوری طرح واضح ہو جائے کہ میں نے تو اِن کو تیری رحمت ومغفرت کا حق دار بنانے کے لیے بلایا، لیکن یہ ایسے شامت کے مارے نکلے کہ اِنھوں نے میری بات سننی ہی گوارا نہ کی۔''

(تدبر قرآن ۸/ ۵۹۵)

۷۔ یہ لیڈروں کے غرور وتکبر کی تصویر ہے کہ اُنھوں نے جوں ہی یہ بات سنی، نہایت بےزاری کے ساتھ اپنی چادر لپیٹی اور چل دیے۔

۸۔ اصل میں 'اَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا' کے جو الفاظ اِس مفہوم کے لیے آئے ہیں، اُن میں 'اَصَرُّوْا' درحقیقت 'اَصَرُّوْا اِصْرَارًا' ہے۔ 'اِسْتَكْبَرُوْا' کے بعد چونکہ مصدر کی وضاحت ہو گئی ہے، اِس لیے یہاں اِسے حذف کر دیا ہے۔

۹۔ انذار کے بعد یہ مرحلۂ انذار عام کا بیان ہے۔

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ط اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ﴿١٠﴾ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ﴿١١﴾ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ﴿١٢﴾

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ﴿١٣﴾ وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ﴿١٤﴾

ہانکے پکارے بلایا[10] اور چپکے چپکے بھی خوب سمجھایا۔ اِس طرح کہ میں نے کہا: اپنے رب سے معافی مانگ لو۔ بے شک، وہ بڑا معاف کر دینے والا ہے[11]۔ اِس کے نتیجے میں وہ تم پر چھاجوں مینہ برسائے گا[12] اور اموال سے، اور بیٹوں سے تم کو برکت دے گا اور تمھارے لیے باغ اگائے گا اور تمھارے لیے نہریں بہا دے گا[13]۔ ۵-۱۲

تمھیں کیا ہو گیا ہے، تم اللہ کے لیے کسی وقار کی توقع نہیں رکھتے[14]؟ دراں حالیکہ

۱۰؎ اصل الفاظ ہیں: 'ثُمَّ اِنِّیْٓ اَعْلَنْتُ'۔ اِن کے بعد بھی مصدر اُسی طرح محذوف ہے، جس طرح اوپر 'اَصَرُّوْا' کے بعد محذوف ہے۔

۱۱؎ مطلب یہ ہے کہ اُس کی مغفرت حاصل کرنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ تم صدق دل سے اُس کی طرف رجوع کرو۔ اُس سے بڑا کوئی معاف کرنے والا نہیں ہے کہ جس کی سفارش لے کر اُس کے حضور میں جانے کی ضرورت ہو۔

۱۲؎ اصل الفاظ ہیں: 'يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا'۔ 'مِدْرَارًا' کے معنی 'کثیر الدر'، یعنی خوب برسنے والے کے ہیں اور لفظ 'سَمَآء' ابر باراں کے لیے آیا ہے۔ عربی زبان میں یہ اِس معنی کے لیے بھی آتا ہے۔

۱۳؎ یہ اُس سنت الٰہی کا بیان ہے جو رسولوں کی دعوت قبول کر لینے والوں کے لیے لازماً ظاہر ہوتی ہے۔ آیت میں 'يَجْعَلْ لَّكُمْ' کی تکرار سے اِن نعمتوں کی گراں قدری کا جو مضمون پیدا ہوتا ہے، وہ عربیت کا ذوق رکھنے والوں سے مخفی نہیں ہے۔

اَلَمۡ تَرَوۡا كَيۡفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ﴿۱۵﴾ وَّجَعَلَ الۡقَمَرَ فِيۡهِنَّ نُوۡرًا وَّجَعَلَ الشَّمۡسَ سِرَاجًا ﴿۱۶﴾ وَاللّٰهُ اَنۡۢبَتَكُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ نَبَاتًا ﴿۱۷﴾ ثُمَّ يُعِيۡدُكُمۡ فِيۡهَا وَيُخۡرِجُكُمۡ اِخۡرَاجًا ﴿۱۸﴾ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الۡاَرۡضَ

اُس نے (تخلیق کے) کئی مدارج سے گزار کر تمھیں بنایا ہے[۱۵] ـــــ کیا[۱۶] دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہ بر تہ بنائے اور اُن میں چاند کو روشنی اور سورج کو چراغ بنایا؟ اور دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ ہی نے خاص اہتمام کے ساتھ تمھیں زمین سے اگایا[۱۷]؟ پھر وہ اِسی میں تمھیں لوٹاتا ہے اور اِسی سے یکایک نہایت آسانی کے ساتھ تم کو

۱۴؎ یعنی اِس بات کی توقع نہیں رکھتے کہ تمھاری بدمستیوں کے باوجود اُس کا جلال کبھی ظہور میں آئے گا اور اُس کی دنیا میں جو فساد تم برپا کر رہے ہو، اُس پر وہ تمھارا محاسبہ کرے گا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے ایسا سمجھ رکھا ہے تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ تمھاری نگاہوں میں اُس کی عظمت و جلالت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ تم اُس کو العیاذ باللہ بالکل بے حس، بے حمیت اور بے بس خیال کیے بیٹھے ہو کہ اُس کی دنیا میں جو دھاندلی چاہو، مچاتے پھرو، لیکن اُس کی غیرت و حمیت کبھی جوش میں نہیں آئے گی۔'' (تدبر قرآن ۸/۵۹۸)

۱۵؎ مدعا یہ ہے کہ جب اُس نے تمھاری خلقت میں اپنی قدرت و حکمت کی یہ شانیں دکھائی ہیں تو اُس کے لیے کیا مشکل ہے کہ مرنے کے بعد تمھیں از سر نو اٹھا کھڑا کرے؟

۱۶؎ یہاں سے آگے کی آیات نوح علیہ السلام کی تقریر کا حصہ نہیں ہیں، بلکہ اُن کی تقریر کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور تضمین ہیں۔ اِس کا قرینہ یہ ہے کہ اِن کے بعد اگلا پیرا پھر 'قَالَ نُوۡحٌ' سے شروع ہوا ہے۔ یہ اگر بطور تضمین نہ ہوتیں تو اِس کی ضرورت نہ تھی۔

۱۷؎ یہ ایک حقیقت کا بیان ہے، اِس لیے کہ ماں کے پیٹ سے انسانوں کی پیدایش کا سلسلہ

بِسَاطًا ﴿۱۹﴾ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ﴿۲۰﴾

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِیْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ یَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًا ﴿۲۱﴾ وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ﴿۲۲﴾ وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ

نکال کھڑا کرے گا۔[18] اور دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ ہی نے زمین کو تمھارے لیے ایک بچھونے کی طرح بچھا دیا ہے کہ تم پہاڑوں کے درمیان اِس کے کھلے راستوں میں چلتے رہو؟[19] ۱۳-۲۰

نوح نے کہا: اے مالک، اِنھوں نے میری بات نہیں مانی اور (اپنے) اُنھی (رہنماؤں) کے پیچھے چلے جن کے مال و اولاد نے اُن کی نامرادی میں اضافہ ہی کیا ہے[20] اور جنھوں

شروع کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اُنھیں براہ راست زمین کے پیٹ ہی سے پیدا کیا ہے۔ موقع کلام کے لحاظ سے دیکھیے تو اِس میں بلاغت کا یہ اعجاز ہے کہ جو دعویٰ ہے، وہی اُس دعوے کی دلیل بھی ہے۔ یعنی خدا نے سبزے کی طرح تمھیں زمین سے اگایا ہے، لہٰذا مرے ہوئے سبزے کو جس طرح وہ از سر نو زندہ کر دیتا ہے، اُسی طرح جب چاہے گا، تمھیں بھی زمین سے دوبارہ نکال کھڑا کرے گا۔

۱۸؎ 'نَبَاتًا' اور 'اِخْرَاجًا' کے الفاظ اِن آیتوں میں تاکید فعل کے لیے آئے ہیں۔ اِن کے لیے اردو میں کوئی ایسا اسلوب نہیں ہے جو اِن کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر سکے۔ ہم نے جو پہلو اختیار کیا ہے، وہ موقع کلام سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

۱۹؎ تضمین کی آیتیں یہاں ختم ہوئیں اور کلام پھر نوح علیہ السلام کی دعا سے مربوط ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت، بے نہایت حکمت اور عالم گیر ربوبیت کی جن نشانیوں کی طرف اِن آیتوں میں توجہ دلائی گئی ہے، وہ صاف بتاتی ہیں کہ جو خدا اپنی تخلیق کے یہ معجزے دکھانے پر قادر ہو گیا، اُس کے لیے انسانوں کو دوبارہ پیدا کر دینا بھی کچھ مشکل نہ ہو گا۔

الِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ﴿٢٣﴾ وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا ۚ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ﴿٢٤﴾ مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ

نے بڑی بڑی چالیں چلیں اور کہا کہ اپنے اِن معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑو، اور نہ وَدّ اور سُواع کو چھوڑو اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو چھوڑو۔[21] اور اِس طرح بہتوں کو گم راہ کر ڈالا۔ اور اب تو بھی، (اے مالک)، اِن ظالموں کی گم راہی ہی میں اضافہ کر۔ ۲۱-۲۴

اپنے[22] اِنھی گناہوں کی پاداش میں وہ غرق کیے گئے، پھر آگ میں ڈال دیے گئے۔[23]

---

۲۰ یہ مرحلۂ اتمام حجت میں قوم کے ردعمل کا بیان ہے۔

۲۱ یہ قوم نوح کے بڑے بڑے بتوں کے نام ہیں جنھیں بعد میں اہل عرب نے بھی پوجنا شروع کر دیا تھا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''اِن بتوں کے ناموں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ عربی نام ہیں۔ قوم نوح کا مسکن شمالی حجاز تھا، اِس وجہ سے اُس کی زبان کا عربی ہونا بعید نہیں۔ اِن بتوں کی سخت جانی قابل داد ہے کہ طوفان نے قوم نوح کے ایک ایک نقش کو مٹا دیا، لیکن اِن بتوں کی خدائی پھر بھی باقی رہی۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں مختلف قبائل عرب میں اِن بتوں کی پرستش پھر رائج ہو گئی۔ چنانچہ وَدّ قبیلۂ قضاعہ کی شاخ بنی کلب کا بت تھا۔ سُواع کی پرستش قبیلۂ ہذیل کرتا تھا۔ یغوث قبیلۂ طے کی بعض شاخوں کا بت تھا۔ یعوق قبیلۂ ہمدان کی ایک شاخ کا دیوتا تھا۔ نسر قبیلۂ حمیر کی ایک شاخ میں پجتا تھا۔ یہاں اِن بتوں کا ذکر جس ترتیب سے آیا ہے، اُس سے گمان ہوتا ہے کہ قوم نوح میں اِن کے مراتب کی ترتیب یہی تھی۔ یعنی وَدّ اور سُواع کا مرتبہ سب سے اونچا تھا اور یغوث، یعوق اور نسر مرتبے میں اُن سے نیچے تھے۔'' (تدبر قرآن ۸/ ۶۰۳)

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ﴿۲۵﴾

وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴿۲۶﴾ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿۲۷﴾ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا ﴿۲۸﴾

پھر اللہ کے مقابلے میں اُنھوں نے اپنے لیے کوئی مددگار نہیں پائے۔ ۲۵

اور نوح نے کہا: اے مالک، اِن منکروں میں سے تو اب کسی کو زمین پر نہ چھوڑ، اِس لیے کہ تو نے اِنھیں چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گم راہ ہی کریں گے اور (جنیں گے تو تیرے) نافرمان اور منکر ہی جنیں گے[۲۴]۔ میرے مالک، تو مجھے معاف فرما دے، میرے ماں باپ کو معاف فرما دے، اُن سب کو معاف فرما دے جو میرے گھر میں مومن ہو کر داخل ہو جائیں[۲۵]، سب مسلمان مردوں اور عورتوں کو معاف فرما دے، اور اِن ظالموں کے لیے اب اِن کی بربادی کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کر۔ ۲۶-۲۸

۲۲؎ یہ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تضمین ہے اور سلسلۂ بیان کو توڑ کر نوح علیہ السلام کی دعا کے ختم ہونے سے پہلے یہ بتانے کے لیے لائی گئی ہے کہ قوم پر اتمام حجت کے بعد پیغمبر جب اِس طرح عذاب کی دعا کرتا ہے تو اُس کی زبان سے پہلا جملہ نہیں نکلتا کہ وہ قبول ہو جاتی ہے۔

۲۳؎ فعل یہاں فیصلۂ فعل کے معنی میں ہے۔ یعنی یہ بات ٹھیرا دی گئی کہ اب آگ ہی اِن کا ٹھکانا ہو گی۔

۲۴؎ کم و بیش نو سو برس تک انذار کے نتیجے میں وہ اپنی قوم کو جس طرح پھٹک کر دیکھ چکے تھے، اُس کے بعد اُن کا یہ کہنا باعث تعجب نہ ہونا چاہیے کہ یہ جب جنیں گے تو تیرے نافرمان اور منکر ہی

نوح ۷۱

سورة الجن

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
قُلۡ اُوۡحِیَ اِلَیَّ اَنَّہُ اسۡتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الۡجِنِّ فَقَالُوۡۤا اِنَّا سَمِعۡنَا

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔
اِنھیں بتاؤ، (اے پیغمبر) کہ مجھے وحی کی گئی ہے[۲۶] کہ جنوں کی ایک جماعت نے

جنیں گے۔

۲۵۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی قوم سے براءت کے اِس مرحلے میں نوح علیہ السلام نے یہ اعلان بھی فرما دیا تھا کہ جو عذاب سے بچنا چاہتے ہوں، وہ اُس کے ظہور سے پہلے اُن کے گھر میں پناہ گیر ہو جائیں۔

۲۶۔ اِس سے واضح ہے کہ جنوں کے جو تاثرات اِس سورہ میں بیان ہوئے ہیں، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو براہ راست جنوں کی زبان سے نہیں، بلکہ وحی الٰہی کے ذریعے سے معلوم ہوئے۔ اِس سے پہلے یہی واقعہ سورۂ احقاف (۴۶) میں بیان ہوا ہے۔ وہاں بھی اِس کا اسلوب بتاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ روداد بعد میں سنائی گئی۔ اِس سے مقصود یہ تھا کہ قریش پر یہ حقیقت واضح کی جائے کہ جس قرآن کو وہ جنوں کا الہام کہہ کر رد کر رہے ہیں، اُس کے بارے میں خود جنات کیا کہتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جائے کہ نااہلوں کی ناقدری سے آپ آزردہ نہ ہوں اور قریش کو بھی کچھ غیرت دلائی جائے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...جنوں کے اِن تاثرات کی آپ کو اِس لیے اطلاع دی گئی کہ اپنی قوم کو آپ سنا دیں کہ جس کلام بلاغت نظام کے ساتھ تمھارا سلوک یہ ہے کہ اُس کو سن کر تم کانوں میں انگلیاں دے لیتے اور اُس کے سنانے والے کے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوتے ہو، دراں حالیکہ یہ کلام

قُرْاٰنًا عَجَبًا ۙ﴿۱﴾ يَّهْدِيْۤ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ؕ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَاۤ اَحَدًا ۙ﴿۲﴾ وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا ۙ﴿۳﴾ وَّاَنَّهٗ

اِس کو سنا تو اپنی قوم سے (جا کر) کہا: ہم نے ایک بڑا ہی دل پذیر[۲۷] قرآن سنا ہے جو ہدایت کا راستہ دکھاتا ہے، سو ہم اُس پر ایمان لے آئے ہیں[۲۸] اور اب ہم ہرگز کسی کو اپنے پروردگار کا شریک نہ ٹھیرائیں گے۔ اور یہ بھی کہ[۲۹] ہمارے رب کی شان بہت اونچی ہے،

تمھارے ہی لیے اترا ہے، اُس کلام کو سن کر ذی صلاحیت جنات اِس طرح اُس کے عاشق ہو جاتے ہیں کہ اپنی قوم کو اُس کی دعوت دینے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، حالاں کہ وہ براہ راست اُس کے مخاطب بھی نہیں۔'' (تدبر قرآن ۸/۶۱۵)

۲۷؎ اصل میں لفظ 'عَجَبًا' آیا ہے۔ یہ جس طرح انوکھے پن کے اظہار کے لیے آتا ہے، اُسی طرح کسی چیز کی اثر انگیزی اور دل پذیری کو ظاہر کرنے کے لیے بھی آتا ہے۔ یہ بات بھی ضمناً اِس سے معلوم ہوتی ہے کہ جن اپنے علاقے کے انسانوں کی زبان بھی پوری طرح سمجھ لیتے اور اُس کے حسن و قبح کو پرکھ سکتے ہیں۔

۲۸؎ اِس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح انسانوں کے پیغمبر تھے، اُسی طرح جنوں کے بھی پیغمبر تھے، بلکہ یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حق جہاں اور جس صورت میں بھی سامنے آئے، دنیا کی ہر ذی شعور مخلوق اُسے ماننے کی مکلّف ہے۔ چنانچہ جنوں کے کسی پیغمبر کی دعوت اگر ہم بھی سن سکتے تو اُس پر اُسی طرح ایمان کے مکلّف ہوتے، جس طرح جنوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر اپنے ایمان کا اظہار کیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے پیغمبروں پر ہمارے ایمان کی نوعیت بھی یہی ہے۔ ہم اُن کی شریعت کے پابند تو یقیناً نہیں ہیں، لیکن اُنھیں ماننا ہمارے لیے بھی اُسی طرح ضروری ہے، جس طرح اُن کی قوموں کے لیے ضروری تھا۔

كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا ﴿٤﴾ وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ﴿٥﴾ وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ﴿٦﴾ وَّاَنَّهُمْ ظَنُّوْا

اُس نے اپنے لیے کوئی بیوی بنائی ہے نہ اولاد۔ اور یہ بھی کہ ہمارا یہ احمق (سردار) اللہ کے بارے میں بالکل حق سے ہٹی ہوئی باتیں کہتا رہا ہے۔ اور یہ بھی کہ (ہم اِس کے پیچھے صرف اِس لیے چلتے رہے کہ) ہم نے سمجھا تھا کہ کیا جن اور کیا انسان، اللہ پر کوئی بھی جھوٹ نہیں باندھ سکتا۔ اور یہ بھی کہ (انسان کچھ پہلے ہی سرکش تھے، پھر) انسانوں میں سے کچھ احمق ہمارے اِن جنوں میں سے کچھ شریروں کی دہائی دیتے رہے تو اِنھوں نے اُن کی سرکشی بڑھا دی۔[30] اور یہ بھی کہ تمھاری طرح اُنھوں نے بھی

۲۹؎ یہ اور اِس کے بعد جنوں کی سب باتیں تالیف کلام کے لحاظ سے 'اِنَّا سَمِعْنَا' کے تحت نہیں، بلکہ 'اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهٗ' کے تحت ہیں۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۳۰؎ احمق اور شریر کے الفاظ ہم نے یہاں اُس تحقیر کی رعایت سے استعمال کیے ہیں جو لفظ 'رِجال' کی تنکیر میں پوشیدہ ہے۔ آیت میں جس بات کی طرف جنوں نے اشارہ کیا ہے، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اُس کی تفصیل فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''عرب کے مشرکین میں جنات سے متعلق یہ وہم تھا کہ وہ غیب کی خبریں معلوم کرنے کا ذریعہ ہیں۔ چنانچہ اِسی چیز نے اُن کے ہاں کہانت کا ایک پورا نظام کھڑا کر دیا جس کی بنیاد تمام تر... جھوٹ اور فریب پر تھی۔ کاہن اپنے جال میں پھنسے ہوئے بے وقوفوں میں سے جس کو ڈرا دیتے کہ فلاں خطرناک جن تم پر بہت برہم ہے، اگر تم نے اُس کے لیے فلاں چیز کی قربانی یا اتنی نذر نہ گزرانی تو وہ آفت میں مبتلا کر دے گا، تو وہ لازماً اُن کے حکم کی تعمیل کرتا۔ یہاں تک کہ اِنھی کاہنوں کے حکم سے بعض بے وقوف لوگ جنوں کو راضی کرنے کے لیے اپنی اولاد تک کو،

كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ۝٧ وَّ اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّ شُهُبًا ۝٨ وَّ اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۝٩ وَّ اَنَّا لَا نَدْرِيْٓ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ۝١٠ وَّ اَنَّا مِنَّا

یہی سمجھا کہ اللہ (مرنے کے بعد پھر) کسی کو (زندہ) نہ اُٹھائے گا۔ اور یہ بھی کہ (اِس قرآن کو سننے سے پہلے ہم کچھ تلاش میں تھے، اِس لیے کہ) ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو دیکھا کہ وہ سخت پہرے داروں سے پٹا پڑا ہے، اور اُس میں شہابوں کی بارش ہو رہی ہے۔ اور یہ بھی کہ ہم پہلے اُس کے ٹھکانوں میں سننے کے لیے جا بیٹھا کرتے تھے، مگر (ہم نے دیکھا کہ) اب جو سننے کی کوشش کرتا ہے، اپنے لیے گھات میں ایک انگارا پاتا ہے۔[۳۱] اور یہ بھی کہ (اُس وقت) ہم نہیں جانتے تھے کہ زمین والوں کے حق میں کوئی برائی مقصود ہے یا اُن کے پروردگار نے اُن کے لیے کسی خیر کا ارادہ کیا ہے۔[۳۲] اور یہ بھی

الجن ۷۲

جیسا کہ سورۂ انعام میں ذکر ہے، قربانی کر دیتے۔

اِسی نوع کا ایک دوسرا وہم یہ پایا جاتا تھا کہ ہر وادی اور ہر پہاڑی جنوں کے کسی خاص گروہ کا مسکن ہوتی ہے۔ اگر اُس وادی میں رات گزارنے کی نوبت آئے تو ضروری ہے کہ اُس کے سردار جن کی پناہ حاصل کر لی جائے، ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ کسی آفت میں مبتلا کر دے۔ چنانچہ دور جاہلیت میں اہل عرب جب کسی وادی میں شب گزارتے تو اُس وادی کے سردار جن کی دہائی دے کر اپنے گمان کے مطابق اُس کی پناہ حاصل کر لیتے۔" (تدبر قرآن ۸/۶۱۹)

۳۱؎ یہ قرآن کی حقانیت پر جنوں کی شہادت ہے جو ملاءِ اعلیٰ میں اُس کے نزول کا اہتمام دیکھ کر اُنھوں نے دی اور واضح کر دیا کہ قریش جس کتاب کو کاہنوں کا کلام قرار دے کر رد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اُس کا منبع کہاں ہے اور وہ کس ہستی کی طرف سے اور کس شان کے ساتھ نازل ہو

الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ؕ كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا ۙ﴿۱۱﴾ وَّاَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا ۙ﴿۱۲﴾ وَّاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰۤی اٰمَنَّا بِهٖ ؕ فَمَنْ یُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا یَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا ۙ﴿۱۳﴾ وَّاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ؕ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ﴿۱۴﴾ وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ۙ﴿۱۵﴾

کہ ہم میں نیک بھی رہے ہیں اور دوسرے بھی اور ہمارے راستے (اِس سے پہلے بھی) الگ الگ ہی تھے۔ اور یہ بھی کہ (ہم کبھی سرکش نہ تھے)، ہم سمجھتے تھے کہ اللہ کی گرفت سے نہ ہم زمین میں کہیں جا کر نکل سکتے ہیں اور نہ آسمان میں کہیں بھاگ کر اُس کو ہرا سکتے ہیں[۳۲]۔ اور یہ بھی کہ (ہمارا یہی خیال تھا جس کی بنا پر) ہم نے جب ہدایت کی یہ بات سنی تو اُس پر ایمان لے آئے۔ سو (اب تمھیں بھی دعوت دیتے ہیں کہ تم میں سے) جو اپنے رب کو مانیں گے، اُنھیں کسی نقصان اور کسی زیادتی کا اندیشہ نہ ہوگا۔ اور یہ بھی کہ (اِس کے بعد اب) ہمارے اندر وہ بھی ہوں گے جو حق کے سامنے سر جھکا دیں گے اور وہ بھی جو سرتابی پر اصرار کریں گے۔ سو جنھوں نے سر جھکا دیا، اُنھوں نے راستہ پا لیا اور جو نافرمان ہوئے، وہ پھر دوزخ کا ایندھن ہو کر رہے۔ ۱-۱۵

رہی ہے۔

۳۲؎ برائی کے لیے آیت میں 'اُرِیْدَ' اور بھلائی کے لیے 'اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ دو مختلف اسلوب کسی چیز کو اللہ تعالیٰ سے منسوب کرنے میں جنوں کے پاس ادب پر بھی دلالت کرتے ہیں اور اِس بات پر بھی کہ اُن کا گمان غالب یہی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے کسی بہت بڑی بھلائی ہی کا ارادہ کیا ہے۔ یہ بات نہ ہوتی تو پہلے فقرے کی طرح دوسرا فقرہ بھی

وَّاَنۡ لَّوِ اسۡتَقَامُوۡا عَلَی الطَّرِیۡقَۃِ لَاَسۡقَیۡنٰہُمۡ مَّآءً غَدَقًا ﴿۱۶﴾ لِّنَفۡتِنَہُمۡ فِیۡہِ ؕ وَمَنۡ یُّعۡرِضۡ عَنۡ ذِکۡرِ رَبِّہٖ یَسۡلُکۡہُ عَذَابًا صَعَدًا ﴿۱۷﴾ وَّاَنَّ الۡمَسٰجِدَ لِلّٰہِ فَلَا تَدۡعُوۡا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾ وَّاَنَّہٗ لَمَّا قَامَ

اور (اِن سے کہو، اے پیغمبر کہ) مجھے یہ وحی بھی آئی ہے[۳۴] کہ تمھاری قوم کے لوگ اگر توحید کی سیدھی راہ پر قائم رہتے[۳۵] تو ہم اُنھیں خوب سیراب کر دیتے، اِس لیے کہ اِس میں اُنھیں آزمائیں[۳۶]۔ اور (ہمارا فیصلہ ہے کہ اِن میں سے) جو اپنے پروردگار کی یاددہانی سے منہ موڑیں گے، اُنھیں وہ ایسے عذاب میں داخل کرے گا جو برابر چڑھتا جائے گا[۳۷]۔ اور یہ بھی کہ مسجدیں اللہ ہی کے لیے ہیں، اِس لیے اُن میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو

وہ مجہول کے مبہم اسلوب میں ادا کرتے۔

۳۳۔ عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق مقابل کے الفاظ اس آیت میں حذف ہیں۔ ہم نے ترجمے میں اُنھیں کھول دیا ہے۔

۳۴۔ جنوں کا تاثر بیان کرنے کے بعد اب یہاں سے روے سخن براہ راست قریش کی طرف ہے۔

۳۵۔ اصل الفاظ ہیں: 'عَلَی الطَّرِیۡقَۃِ'۔ یہ اسلوب دلیل ہے کہ توحید کا راستہ ایک جانا پہچانا راستہ ہے، اِسے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...یہ ایک حقیقت ہے، اِس لیے کہ انسان کی فطرت اِس کی گواہ ہے، عقل اِس کی طرف اشارہ کر رہی ہے، آفاق و انفس اِس کی گواہی دے رہے اور اللہ کے رسولوں اور اُس کی کتابوں نے اِسی راہ کی دعوت دی ہے۔'' (تدبر قرآن ۸/ ۶۲۴)

۳۶۔ یہ ایک برسر موقع تنبیہ ہے کہ دنیا میں انسان پر جو عنایت بھی ہوتی ہے، اُس کے امتحان کے لیے ہوتی ہے۔ اِس سے کسی کو اپنے بارے میں کسی زعم اور کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا

عَبۡدُ اللّٰهِ يَدۡعُوۡهُ كَادُوۡا يَكُوۡنُوۡنَ عَلَيۡهِ لِبَدًا ﴿۱۹﴾ قُلۡ اِنَّمَاۤ اَدۡعُوۡا رَبِّيۡ وَلَاۤ اُشۡرِكُ بِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۰﴾ قُلۡ اِنِّيۡ لَاۤ اَمۡلِكُ لَكُمۡ ضَرًّا وَّلَا

نہ پکارو۔[38] اور یہ بھی کہ جب اللہ کا یہ بندہ[39] (اُس کے گھر میں صرف) اُس کو پکارنے کھڑا ہو جاتا ہے تو لگتا ہے کہ یہ اُس پر ٹوٹ پڑیں گے۔ (اے پیغمبر)، کہہ دو: میں تو اپنے رب ہی کو پکارتا ہوں اور کسی کو اُس کا شریک نہ ٹھیراؤں گا۔ اِن سے کہہ دو: میں تمھارے

الجن
۷۲

چاہیے۔

۳۷۔ اِس سے کیا مراد ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"...اِس میں اشارہ ہے اِس حقیقت کی طرف کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور اپنی کتاب کی تکذیب کی پاداش میں جن کو پکڑتا ہے، اُن کی سزا وقتی اور ہنگامی نہیں ہوتی، بلکہ اُس میں برابر ترقی ہی ہوتی رہتی ہے۔ اِس دنیا میں جس عذاب سے وہ دوچار ہوتے ہیں، اُس سے بڑے عذاب سے اُن کو آخرت میں سابقہ پیش آئے گا اور پھر آگے اُن کے عذاب کی شدت میں ترقی ہی ہوتی رہے گی۔ اُس کے ختم یا اُس میں بالتدریج کمی ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔"

(تدبر قرآن ۶۲۵/۸)

۳۸۔ توحید کا یہ مضمون اُسی انذار کا حصہ ہے جو اوپر کی آیتوں میں مضمر ہے۔ لفظ 'مَسٰجِد' اگرچہ عام استعمال ہوا ہے، لیکن اِس کے مخاطب چونکہ قریش ہیں، اِس وجہ سے اِس کا پہلا مصداق بیت الحرام ہے۔ اِس کو جمع کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے تاکہ باقی مسجدیں بھی اِس میں شامل ہو جائیں۔

۳۹۔ اِس سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اِس لفظ میں آپ کے لیے پیار بھی ہے اور اِس حقیقت کا اظہار بھی کہ اللہ کے بندے کے لیے سب سے زیادہ معقول اور فطری کام کوئی ہو سکتا ہے تو یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے اللہ ہی کو پکارے، لیکن دنیا کا ضمیر اِس طرح بگڑ چکا ہے کہ یہی سب سے زیادہ صحیح اور اعلیٰ کام لوگوں کے

رَشَدًا ﴿٢١﴾ قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ۵ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿٢٢﴾ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ؕ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ﴿٢٣﴾ حَتّٰۤی اِذَا رَاَوْا مَا یُوْعَدُوْنَ فَسَیَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّ اَقَلُّ

لیے کسی نفع و ضرر اور کسی ہدایت و ضلالت کا کوئی اختیار نہیں رکھتا[۴۰]۔ کہہ دو: (میں کسی کو اُس کا شریک ٹھیراؤں تو جانتا ہوں کہ) مجھے اللہ کے غضب سے کوئی پناہ نہیں دے سکتا اور نہ میں اُس کے سوا کوئی ملجا کبھی پا سکوں گا۔ (نہیں، لوگو، میں تمھارے لیے اس طرح کا کوئی اختیار نہیں رکھتا)، میرا کام صرف یہ ہے کہ مجھے اللہ کی طرف سے پہنچانا ہے اور اُس کے پیغامات تمھیں دینے ہیں[۴۱]۔ تاہم (یاد رکھو کہ) جو اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کریں گے، اُن کے لیے پھر دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہاں تک کہ (اپنی قوت کے زعم میں مبتلا) یہ لوگ جب وہاں اُس چیز کو دیکھیں گے جس سے اُنھیں خبردار کیا جاتا ہے[۴۲] تو اُس وقت ضرور جان لیں گے کہ کس کی مدد کم زور اور

لیے ایک نہایت انوکھا اور ناگوار کام بن کے رہ گیا ہے۔'' (تدبر قرآن ۸/۶۲۶)

۴۰؎ 'ضَرًّا' کے بعد 'نفعًا' اور 'رَشَدًا' کے بعد 'غیًّا' اِس آیت میں محذوف ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ تقابل آپ سے آپ اِسے واضح کر رہا ہے۔

۴۱؎ یعنی میں تمھارے لیے کسی نفع و ضرر اور ہدایت و ضلالت کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ تمھاری نازبرداری کے لیے یا تم سے مرعوب ہو کر کسی کو اُس کا شریک ٹھیرا سکتا ہوں۔ میری ذمہ داری صرف یہ ہے کہ اللہ کا پیغام بے کم و کاست تمھیں پہنچا دوں۔

۴۲؎ یعنی جب دوزخ کا عذاب الیم اور اُس میں اپنی بے بسی دیکھ لیں گے جس سے اُنھیں دنیا

الجن ۷۲

عَدَدًا ﴿٢٤﴾ قُلْ اِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ يَجْعَلُ لَهٗ رَبِّيْٓ اَمَدًا ﴿٢٥﴾ عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ﴿٢٦﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿٢٧﴾ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ﴿٢٨﴾

کون گنتی میں تھوڑے ہیں۔ کہہ دو: میں نہیں جانتا کہ جس عذاب سے تم کو خبردار کیا جاتا ہے، وہ قریب ہی ہے یا میرا پروردگار ابھی اِسے کچھ اور ٹالے گا۔ (یہ غیب کی باتیں ہیں اور) اِس غیب کو وہی جانتا ہے اور اپنا یہ غیب کسی پر ظاہر بھی نہیں کرتا۔ رہے وہ جن کو وہ رسول کی حیثیت سے منتخب کر لیتا ہے، وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ سکتے[۴۳]، اُن کے آگے اور پیچھے تو وہ پہرا لگا دیتا ہے تاکہ معلوم رہے کہ اُنھوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیے ہیں، اور وہ اُن کے ماحول کو گھیرے میں اور اُن کی ہر چیز کو گنتی میں رکھتا ہے۔ ۱۶-۲۸

میں خبردار کیا جاتا ہے اور وہ اُس کا مذاق اڑاتے ہیں۔

۴۳؎ یعنی عذاب کے بارے میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ کب آئے گا اور کس طرح آئے گا۔

کوالالمپور

۹ر فروری ۲۰۱۰ء

مرحلۂ انذار عام

المزمل - الم نشرح

۷۳ —— ۹۴

المزمل ۷۳ - الم نشرح ۹۴

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو انذار عام کے لیے تیاری کی ہدایت ـــــ اِس انذار کا حکم، اِس کے حدود، تقاضے اور اِس کی ابتدا ۷۳-۷۴

قیامت کا اثبات اور اُس کے حوالے سے قریش کو انذار ۷۵-۷۶

قیامت کا اثبات اور اُس کے حوالے سے قریش کو انذار ۷۷-۷۸

قیامت کا اثبات، اُس کے حوالے سے قریش کو انذار اور اُس کے بارے میں اُن کے رویے پر اُنھیں تنبیہ ۷۹-۸۰

قیامت کی ہلچل اور اُس میں جزا و سزا کے حوالے سے قریش کو تنبیہ ۸۱-۸۲

قیامت کی جزا و سزا کے حوالے سے تنبیہ ۸۳-۸۴

قیامت سے متعلق قریش کے شبہات کی تردید اور اہل ایمان پر اُن کے ظلم و ستم اور پیغمبر اور اُس کی دعوت کے مقابلے میں اُن کی چالوں پر اُنھیں عذاب کی وعید ۸۵-۸۶

انذار قیامت اور نذیر کی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ۸۷-۸۸

انذار قیامت اور قریش کے سرداروں کو اُن کی سرکشی اور طغیان پر تنبیہ ۸۹-۹۰

انذار قیامت، سرکشی پر تنبیہ اور خاتمۂ کلام کے طور پر اُن کے لیے فلاح اور خسران کے راستوں کی وضاحت ۹۱-۹۲

نذیر کی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور آیندہ ایک بڑی کامیابی کی بشارت ۹۳-۹۴

المزمل - المدثر

۷۳ ـــــــ ۷۴

المزمل - المدثر

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جس بڑی ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیاریوں کی ہدایت کرتی ہے، دوسری میں آپ کے لیے اُس ذمہ داری کی وضاحت کی گئی ہے کہ انذار کے بعد اب آپ اپنی قوم کو انذار عام کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔

دونوں سورتوں میں خطاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہے اور آپ کے مخاطب قریش کے سرداروں سے بھی۔

اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ ام القریٰ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا مرحلۂ انذار عام اِنھی دو سورتوں سے شروع ہوا ہے۔

پہلی سورہ ـــــ المزمل ـــــ کا موضوع قوم کے ردعمل پر غم کی حالت سے نکل کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک بڑی ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیاریوں کی ہدایت اور قریش کے لیڈروں کو تنبیہ ہے کہ اُن کی مہلت تھوڑی رہ گئی، وہ اگر اپنے رویوں کی اصلاح نہیں کرتے تو اِس کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہیں۔

دوسری سورہ ـــــ المدثر ـــــ کا موضوع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اِس ذمہ داری کی وضاحت، اُس کے تقاضوں اور حدود سے آگاہی اور آپ کے مخاطبین کو تنبیہ و تہدید ہے کہ جس قیامت سے کھلم کھلا خبردار کرنے کا حکم ہم نے پیغمبر کو دیا ہے، اُسے کوئی معمولی چیز نہ سمجھو۔ وہ ایک ایسا دن ہے جو منکروں کے لیے آسان نہ ہوگا اور

ایک ایسی حقیقت ہے جو نہ جھٹلائی جا سکتی ہے اور نہ اُس سے بچنے کے لیے کوئی سفارش کسی کے کام آ سکتی ہے۔

سورۃ المزمل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یٰۤاَیُّہَا الۡمُزَّمِّلُ ۙ﴿۱﴾ قُمِ الَّیۡلَ اِلَّا قَلِیۡلًا ۙ﴿۲﴾ نِّصۡفَہٗۤ اَوِ انۡقُصۡ

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

اے اوڑھ لپیٹ کر بیٹھنے والے[1]، رات کو کھڑے رہو[2]، مگر تھوڑا۔ آدھی رات یا اُس

[1] اصل میں لفظ 'مُزَّمِّل' آیا ہے۔ یہ دراصل 'متزمل' ہے۔ 'ت' عربی قاعدے کے مطابق حرف 'ز' میں مدغم ہوگئی ہے۔ یہی تصرف اگلی سورہ کے لفظ 'مُدَّثِّر' میں بھی ہوا ہے۔ یہ اُس حالت کی تصویر ہے جو اپنی دعوت کے جواب میں قوم کا ردعمل دیکھ کر اُس زمانے میں آپ پر طاری رہتی تھی۔ اِس طرح کی ذہنی کیفیت میں آدمی کو سب سے بڑی غم گسار اپنی چادر ہی محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اُسے ہی لپیٹ کر اٹھتا، اُسی میں لپٹ کر چلتا اور اُسی میں چھپ کر اپنے ماحول سے کنارہ کش اور اپنے باطن میں غوطہ زن ہو جاتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...یہ حالت بالعموم ایسے شخص کی ہوتی ہے جو سامنے کے حالات سے فکرمند اور گردوپیش کے لوگوں کے رویے سے بددل ہو۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو ایک ایسے عذاب سے ڈرا رہے تھے جو اُن کے سروں پر منڈلا رہا تھا، لیکن لوگوں کی بے گانگی و بے زاری کا یہ حال تھا کہ بات سننا تو درکنار الٹے منہ نوچنے کو دوڑتے اور آپ کی بے قراری و ہم دردی کو خبط و جنون قرار دیتے۔ ایسے حالات میں آپ کا متفکر و مغموم رہنا ایک امر فطری تھا اور فکر و غم کی حالت میں آدمی کی چادر... اُس کی بہترین غم گسار ہوتی ہے۔ وہ اُس میں لپٹ کر جب چاہتا ہے، خلق سے منقطع اور خالق سے متصل ہو جاتا ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ چادر اہل عرب کے لباس کا ایک نہایت اہم جزو بھی تھی اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ

مِنۡهُ قَلِيۡلًا ﴿۳﴾ اَوۡ زِدۡ عَلَيۡهِ وَرَتِّلِ الۡقُرۡاٰنَ تَرۡتِيۡلًا ﴿۴﴾ اِنَّا سَنُلۡقِىۡ عَلَيۡكَ قَوۡلًا ثَقِيۡلًا ﴿۵﴾ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيۡلِ هِىَ اَشَدُّ وَطۡاً وَّاَقۡوَمُ قِيۡلًا ﴿۶﴾ اِنَّ لَكَ فِى النَّهَارِ سَبۡحًا طَوِيۡلًا ﴿۷﴾ وَاذۡكُرِ اسۡمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلۡ

سے کچھ کم کرلو یا اُس پر کچھ بڑھا دو اور اپنی اِس نماز میں قرآن کو ٹھیر ٹھیر کر پڑھو۔[۳] اِس لیے کہ عنقریب ایک بھاری بات کا بوجھ ہم تم پر ڈال دیں گے۔[۴] رات کا یہ اٹھنا، درحقیقت دل کی جمعیت[۵] اور بات کی درستی کے لیے بہت موزوں ہے۔[۶] اِس لیے کہ دن میں تو (اِس کام کی وجہ سے) تمھیں بہت مصروفیت رہے گی۔ (لہٰذا اِس وقت پڑھو)

چادر رکھتے بھی تھے۔'' (تدبر قرآن ۹/۲۲)

۲۔ رات سے مراد یہاں رات کا آخری نصف ہے جس میں آدمی کچھ سو کر اٹھتا ہے۔ قرآن نے آگے کی آیات میں اِس کی وضاحت کر دی ہے۔ اِس وقت کا اٹھنا ایک کٹھن کام ہے، اِس میں دیر سویر کا امکان بھی ہوتا ہے، اِس وجہ سے وقت کے معاملے میں وسعت رکھی گئی ہے۔ اگرچہ الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ پوری نصف شب کا قیام اولیٰ ہے۔

۳۔ روایتوں سے اِس کی تفصیل یہ معلوم ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم لحن سے قرآن پڑھتے، ہر آیت پر ٹھیرتے، غضب کے موقع پر اللہ کی پناہ مانگتے، رحمت کی آیتوں پر اُس کا شکر ادا کرتے، آیت میں سجدے کا حکم ہوتا تو امتثال امر کے طور پر فوراً سجدہ ریز ہو جاتے تھے۔

۴۔ یعنی اپنی قوم کو انذار عام کا بوجھ۔ اِسے بھاری بات کے بوجھ سے اِس لیے تعبیر کیا ہے کہ اِسی انذار عام سے بعد میں ہجرت و براءت اور جہاد و قتال کے وہ مراحل سامنے آئے جن کی شدت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کی سیرت و سوانح کا ہر طالب علم واقف ہے۔

۵۔ اصل میں 'اَشَدُّ وَطۡاً' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، جن کے معنی قدم اچھی طرح جمنے کے ہیں۔ لیکن صاف واضح ہے کہ یہ ظاہر یہاں انسان کے 'باطن' کی تعبیر ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی

اِلَیۡہِ تَبۡتِیۡلًا ؕ﴿۸﴾ رَبُّ الۡمَشۡرِقِ وَ الۡمَغۡرِبِ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ فَاتَّخِذۡہُ

اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرو[7] اور (رات کی اِس تنہائی میں) سب سے ٹوٹ کر اُسی کے ہو رہو[8]۔ وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے، اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، اِس لیے اُسی کو اپنا

رعایت سے کیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِس وقت اٹھنا اگرچہ اِس اعتبار سے ایک مشکل کام ہے کہ اِس وقت کی نیند بہت محبوب ہوتی ہے، لیکن اِس امتحان میں انسان اگر کامیاب ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی یاد اور اُس کی کتاب کے سمجھنے کے لیے اِس سے زیادہ بابرکت وقت اور کوئی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کو اِس ساعت میمون میں بستر سے اٹھنے کی توفیق دیتا ہے، اول تو اُس کو اپنے نفس کی خواہشوں پر غلبہ پانے کی ایسی قوت حاصل ہو جاتی ہے جو اُس کے لیے اصلاح نفس کی راہ میں فتوحات کے بے شمار دروازے کھول دیتی ہے۔ ثانیاً، اللہ تعالیٰ نے، جو رات اور دن کو وجود میں لانے والا ہے، اِس وقت کو اپنی رحمتوں کے نزول کے لیے مخصوص فرمایا ہے، جن کے دروازے اُس کے اُن بندوں کے لیے کھلتے ہیں جو اِس کی قدر و قیمت پہچانتے اور اِس وقت اُس کے دروازے پر سائل بن کر حاضر ہوتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۹/۲۵)

۶؎ یعنی بات کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے بہت موزوں ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ تہجد کی نماز میں تلاوت قرآن جہاں اپنی تہذیب نفس کے لیے ضروری ہے، وہاں سننے والوں کے دلوں کو زندہ کر دینے کے لیے بھی ایک ندائے غیب کی حیثیت رکھتی ہے۔

۷؎ یعنی اُس کی صفات پر متنبہ ہو کر اپنے دل کو اُس کی یاد سے معمور اور زبان کو اُس کی تسبیح و تحمید سے تر رکھو، اِس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے سب نام اُس کی صفات کی تعبیر ہیں اور دین و شریعت کی ساری عمارت اِنھی صفات پر استوار ہوئی ہے۔ لہٰذا خدا کے نام کا یہی ذکر ہے جو دعوت دین کی جدوجہد میں ہر لحظہ تمھارے ایمان و عقیدہ اور عزم و استقلال کی حفاظت کرے گا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

وَكِيْلًا ﴿٩﴾ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ﴿١٠﴾ وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا ﴿١١﴾ اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا ﴿١٢﴾ وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِيْمًا ﴿١٣﴾ يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ

کارساز بناؤ۔ یہ جو کچھ کہتے ہیں، اُس پر صبر کرو، اِن سے نہایت بھلے طریقے سے صرف نظر کرو[9] اور اِن جھٹلانے والوں، اِن اہل نعمت[10] کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو اور اِن کو بس ذرا سی مہلت دو۔[11] (اِن کے لیے) یقیناً ہمارے پاس بھاری بیڑیاں ہیں اور آگ کا ڈھیر ہے اور گلے

"...جس طرح انسان کی مادی زندگی کے لیے سانس ضروری ہے، اُسی طرح اُس کی روحانی زندگی کے لیے اللہ کی یاد ضروری ہے۔ سانس رک جائے تو جسم مردہ ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح اللہ سے غفلت ہو جائے تو روح پژمردہ ہو جاتی ہے۔ دل ذکر کی جھڑی ہی سے زندہ رہتا ہے اور دل کی زندگی ہی اصل زندگی ہے۔" (تدبر قرآن ۹/۲۷)

۸۔ یعنی ہر چیز سے بے تعلق ہو کر اُسی سے لو لگاؤ اور یہ وقت اُسی کی یاد میں بسر کرو۔ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دعوت دین کی جدوجہد میں صبر و ثبات کے لیے تہجد کی نماز، اُس میں قرآن کی تلاوت اور ذکر الٰہی کی کیا اہمیت ہے۔

۹۔ یعنی اِن کی زیادتیوں کو نظر انداز کر دو۔ ہو سکتا ہے کہ تمھارا یہی 'هَجْرٌ جَمِيْل' اِن کے رویے میں تبدیلی کا باعث بن جائے۔

۱۰۔ جھٹلانے والوں کی یہ صفت اُن کے جھٹلانے کا سبب بتانے کے لیے آئی ہے۔ یعنی اللہ کی بخشی ہوئی نعمتیں اُن کے لیے تمرد اور سرکشی کا باعث بنیں اور وہ اپنے پروردگار کے شکر گزار بننے کے بجائے اُس کے حریف بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

۱۱۔ یعنی تم الگ ہو کر بیٹھو اور مجھے تنہا اِن سرکشوں سے نمٹنے دو، پھر دیکھو کہ اِن کا حشر کیا ہوتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

وَالۡجِبَالُ وَكَانَتِ الۡجِبَالُ كَثِيۡبًا مَّهِيۡلًا ﴿۱۴﴾
اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلَيۡكُمۡ رَسُوۡلًا ۙ۬ شَاهِدًا عَلَيۡكُمۡ كَمَاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ رَسُوۡلًا ؕ﴿۱۵﴾ فَعَصٰى فِرۡعَوۡنُ الرَّسُوۡلَ فَاَخَذۡنٰهُ اَخۡذًا وَّبِيۡلًا ﴿۱۶﴾ فَكَيۡفَ تَتَّقُوۡنَ اِنۡ كَفَرۡتُمۡ يَوۡمًا يَّجۡعَلُ الۡوِلۡدَانَ شِيۡبَا ۖ﴿۱۷﴾ السَّمَآءُ

میں پھنستا ہوا کھانا ہے اور بہت دردناک عذاب بھی۔ اُس دن جب زمین اور پہاڑ لرز اُٹھیں گے اور پہاڑوں کا حال ایسا ہو جائے گا، گویا ریت کے ٹیلے ہیں جو بکھرے جا رہے ہیں۔ ۱-۱۴

تمھاری طرف، (اے قریش مکہ)، ہم نے اُسی طرح ایک رسول تم پر گواہ بنا کر بھیجا ہے، جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تھا۔[۱۲] پھر فرعون نے اُس رسول کی نافرمانی کی تو ہم نے اُس کو بڑے وبال میں پکڑ لیا۔ اِس لیے اگر تم بھی نہیں مانو

''اِس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ اِن جھٹلانے والوں کی تباہی میں کچھ دیر ہو رہی ہے، تو اُس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی اِن کے اندر تم موجود ہو۔ سنت الٰہی یہ ہے کہ جب تک پیغمبر قوم کے اندر موجود رہتا ہے، اُس وقت تک قوم پر عذاب نہیں آتا۔ تم چھوڑ دو تو چشم زدن میں اِن سرکشوں کا تیاپانچا ہو جاتا ہے۔ یہ اِن ظالموں کی بدبختی ہے کہ وہ تمھارے درپے آزار ہیں۔ اِن کے لیے عذاب کے مقابل میں امان کی دیوار تمھی ہو۔ اگر اِس امان سے اِنھوں نے اپنے آپ کو محروم کر لیا تو عذاب سے اِن کو کون بچائے گا؟'' (تدبر قرآن ۲۹/۹)

۱۲۔ یعنی تمھارے اوپر حق کی گواہی دینے والا بنا کر بھیجا ہے۔ یہ قرآن کی خاص تعبیر ہے جو اتمام حجت کے معنی میں آتی ہے۔ اِس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ خدا کا پیغمبر درحقیقت خدا کی عدالت ہے جو گواہی قائم ہو جانے کے بعد اُسی طرح حق و باطل کا فیصلہ سنا دے گی، جس طرح موسیٰ اور فرعون کے معاملے میں سنایا گیا تھا۔

مُنۡفَطِرٌۢ بِهٖ ؕ كَانَ وَعۡدُهٗ مَفۡعُوۡلًا ﴿۱۸﴾ اِنَّ هٰذِهٖ تَذۡكِرَةٌ ۚ فَمَنۡ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيۡلًا ﴿۱۹﴾

اِنَّ رَبَّكَ يَعۡلَمُ اَنَّكَ تَقُوۡمُ اَدۡنٰى مِنۡ ثُلُثَىِ الَّيۡلِ وَنِصۡفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيۡنَ مَعَكَ ؕ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيۡلَ وَالنَّهَارَ ؕ عَلِمَ اَنۡ لَّنۡ

گے تو اُس دن سے کس طرح بچو گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا؟[13] آسمان اُس کے بوجھ سے پھٹا پڑ رہا ہے[14] اور اللہ کا وعدہ شدنی ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ (اُس سے پہلے) یہ ایک یاددہانی ہے۔ سو جس کا جی چاہے، اپنے پروردگار کی طرف جانے کی راہ اختیار کر لے۔ ۱۵-۱۹

(ہم نے[15]، اے پیغمبر، تم کو حکم دیا تھا کہ رات میں قیام کرو)۔ تمھارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ تم کبھی دو تہائی رات کے قریب، کبھی آدھی رات اور کبھی ایک تہائی رات اُس کے حضور میں کھڑے رہتے ہو اور ایک گروہ تمھارے ساتھیوں میں سے بھی۔ (لوگوں کی ضرورت کے لحاظ سے) اللہ ہی رات اور دن کی تقدیر ٹھیراتا ہے۔[16] اُس نے جان لیا

۱۳؎ یہ تعبیر کسی ہول کی شدت اور بے پناہی بتانے کے لیے ہماری زبان میں بھی اختیار کی جاتی ہے۔

۱۴؎ مطلب یہ ہے کہ اہل بصیرت کے لیے قیامت کے آثار و شواہد اِس کے اندر ایسے نمایاں ہیں، جس طرح آخری دنوں میں حاملہ کا حمل ہوتا ہے۔ اُس کا صحیح وقت تو یقیناً کوئی نہیں بتا سکتا، مگر کسی دیکھنے والے کو اِس میں شبہ بھی نہیں ہوتا کہ وہ بہرحال جنے گی۔

۱۵؎ نماز تہجد کا جو حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سورہ کی ابتدا میں دیا گیا ہے، یہ عام مسلمانوں کے لیے اُس میں تخفیف کی آیت ہے جو ہجرت مدینہ سے پہلے کسی وقت نازل ہوئی اور مضمون کی مناسبت سے اِسی سورہ کا حصہ بنا دی گئی ہے۔ اِس تخفیف کی ضرورت اِس لیے

المزمل ۷۳

تُحۡصُوۡهُ فَتَابَ عَلَيۡكُمۡ فَاقۡرَءُوۡا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الۡقُرۡاٰنِؕ عَلِمَ اَنۡ سَيَكُوۡنُ مِنۡكُمۡ مَّرۡضٰىۙ وَاٰخَرُوۡنَ يَضۡرِبُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ يَبۡتَغُوۡنَ مِنۡ فَضۡلِ اللّٰهِۙ وَاٰخَرُوۡنَ يُقَاتِلُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ۖ فَاقۡرَءُوۡا مَا تَيَسَّرَ مِنۡهُۙ وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقۡرِضُوا اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًاؕ وَمَا تُقَدِّمُوۡا لِاَنۡفُسِكُمۡ مِّنۡ خَيۡرٍ تَجِدُوۡهُ عِنۡدَ اللّٰهِ هُوَ خَيۡرًا وَّ اَعۡظَمَ

کہ تم لوگ اِسے نباہ نہ سکو گے تو اُس نے تم پر عنایت کی نظر کی[17]۔ چنانچہ اب قرآن میں سے جتنا ممکن ہو، اِس نماز میں پڑھ لیا کرو[18]۔ اُسے معلوم ہے کہ آگے تم میں بیمار بھی ہوں گے، اور کچھ دوسرے وہ بھی جو خدا کے فضل کی تلاش میں سفر کریں گے، اور کچھ دوسرے جو اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے اُٹھیں گے۔ اِس لیے جتنا ممکن ہو، اِس میں سے پڑھ لیا کرو اور (اپنے شب و روز میں) نماز کا اہتمام رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور (دین و ملت کی ضرورتوں کے لیے) اللہ کو قرض دو، اچھا قرض۔ اور (یاد رکھو کہ) جو کچھ بھلائی تم اپنے

پیش آئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے شوق میں آپ کے بعض ساتھیوں نے یہ نماز اپنے اوپر لازم کر لی تھی۔ دراں حالیکہ نمازِ تہجد کا یہ حکم آپ کے لیے خاص تھا اور اپنی قوم کو انذار کی جو ذمہ داری بحیثیت پیغمبر آپ پر ڈالی گئی تھی، اُس میں صبر و ثبات کے لیے دیا گیا تھا۔

۱۶؎ یعنی اُن کے تقاضوں، مطالبات اور انسان پر اُن کے اثرات کو مقدر کرتا ہے۔

۱۷؎ اصل الفاظ ہیں: 'فَتَابَ عَلَيۡكُمۡ'۔ 'تَابَ' کے معنی لوٹنے کے ہیں، لیکن اِس کے ساتھ 'عَلٰی' نے وہ معنی پیدا کر دیے ہیں جو ہم نے ترجمے میں اختیار کیے ہیں۔

۱۸؎ آیت کا سیاق دلیل ہے کہ قرآن پڑھنے سے مراد یہاں نماز میں قرآن پڑھنا ہے۔

اَجْرًا ؕ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۰﴾

سورة المدثر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ﴿۱﴾ قُمْ فَاَنْذِرْ ۪ۙ﴿۲﴾ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۪ۙ﴿۳﴾ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۪ۙ﴿۴﴾

لیے آگے بھیجو گے، اُسے اللہ کے ہاں اُس سے بہتر اور ثواب میں برتر پاؤ گے۔ اللہ سے معافی مانگتے رہو۔ بے شک، اللہ غفور و رحیم ہے۔ ۲۰

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

اے اوڑھ لپیٹ کر بیٹھنے والے[19]، اٹھو اور انذار عام کے لیے کھڑے ہو جاؤ[20]۔ اپنے رب ہی کی کبریائی کا اعلان کرو[21]، اپنے دامن دل[22] کو پاک رکھو[23]، شرک کی غلاظت سے

۱۹۔ یہ اُسی حالت کی تصویر ہے جس کا ذکر اِس سے پہلے سورۂ مزمل میں ہوا ہے۔ 'مُدَّثِّر' اور 'مُزَّمِّل'، ہم معنی ہیں۔ لفظ 'مُدَّثِّر'، 'دثار' سے بنا ہے۔ یہ اُس چادر کو کہتے ہیں جو سونے کے لیے اوڑھ لی جاتی ہے۔

۲۰۔ یہ اُس ذمہ داری کا بیان ہے جس کی طرف پچھلی سورہ میں 'اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا' کے الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...مکہ اور طائف کے سرداروں کے کانوں میں توحید کی اذان دینا اور وہ بھی اِس دعوے کے ساتھ کہ آپ اللہ کے رسول ہو کر آئے ہیں، اگر اُنھوں نے آپ کے انذار کی تکذیب کی تو اُس کے عذاب کی زد میں آ جائیں گے، کوئی سہل کام نہیں تھا۔ اِس بھاری ذمہ داری سے آپ کا ہراس محسوس کرنا ایک امر فطری تھا۔ چنانچہ ابتداءً آپ نے اپنے کام کو اپنے خاص خاندان

وَالرُّجۡزَ فَاهۡجُرۡ ﴿۵﴾ وَلَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَكۡثِرُ ﴿۶﴾ وَلِرَبِّكَ فَاصۡبِرۡ ﴿۷﴾

دور رہو اور (دیکھو)، اپنی سعی کو زیادہ خیال کر کے[24] منقطع نہ کر بیٹھو اور اپنے پروردگار کے فیصلے کے انتظار میں ثابت قدم رہو۔[25] ۱-۷

والوں ہی تک محدود رکھا اور اُن پر بھی نہایت احتیاط کے ساتھ صرف اپنے بعض مشاہدات و تجربات کا اظہار فرما کر اُن کا ردعمل معلوم کرنا چاہا جو نہایت مخالفانہ صورت میں سامنے آیا۔ چنانچہ اِس دور میں آپ پر نہایت شدید فکرمندی کی حالت طاری رہی، جس کی تصویر 'مُزَّمِّل' اور 'مُدَّثِّر' کے الفاظ سے ہمارے سامنے آتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے جس مقصد کے لیے آپ کو مبعوث فرمایا تھا، وہ ہونا تھا۔ چنانچہ پہلے (سورۂ مزمل میں) آپ کو اِس صورت حال کے مقابلے کے لیے تیاری کی ہدایت ہوئی، پھر اِس سورہ میں کمر باندھ کر انذار عام کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کا حکم ہوا۔'' (تدبر قرآن ۹/۴۳)

۲۱؎ یعنی اعلان کرو کہ وہی سب سے بڑا، سب سے یگانہ، یکتا اور بے ہمتا ہے۔ اُس کے سوا جن کی بڑائی کا دعویٰ کیا جاتا ہے، وہ سب باطل ہیں۔

۲۲؎ اصل میں لفظ 'ثِیَاب' استعمال ہوا ہے، جس کے معنی کپڑے کے ہیں، لیکن کلام عرب میں یہ اُس مفہوم میں بھی آتا ہے جسے ہم اپنی زبان میں 'دامن دل' سے ادا کرتے ہیں۔

۲۳؎ یعنی توحید کے معاملے میں ہر آلایش سے پاک رکھو۔ آگے اِسی کو 'وَالرُّجۡزَ فَاهۡجُرۡ' کے الفاظ سے واضح کر دیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''اِس ہدایت کی ضرورت اِس لیے نہیں تھی کہ العیاذ باللہ آپ کے کسی شرک میں مبتلا ہونے کا اندیشہ تھا۔ آپ جس طرح دور اسلام میں طاہر و مطہر رہے، اُسی طرح جاہلیت میں بھی شرک کے ہر شائبہ سے پاک رہے۔ مقصود صرف کفار و مشرکین کو آگاہ کرنا تھا کہ وہ جان لیں کہ جو منذر اُن کے پاس آیا ہے، اُس کا موقف اُن کے دین شرک کے معاملے میں کیا ہے اور وہ اپنے رب کی طرف سے اِس باب میں کن ہدایات کے ساتھ مبعوث ہوا ہے۔'' (تدبر قرآن ۹/۴۵)

فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوۡرِ ۙ﴿۸﴾ فَذٰلِكَ يَوۡمَئِذٍ يَّوۡمٌ عَسِيۡرٌ ۙ﴿۹﴾ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ غَيۡرُ يَسِيۡرٍ ﴿۱۰﴾ ذَرۡنِيۡ وَمَنۡ خَلَقۡتُ وَحِيۡدًا ۙ﴿۱۱﴾ وَّجَعَلۡتُ

اِس لیے کہ جب صور پھونکا جائے گا تو وہ دن بڑا ہی سخت دن ہو گا، اِن منکروں کے لیے آسان نہ ہو گا۔[۲۶] چھوڑ دو مجھے اور اُس کو، جسے میں نے اکیلا پیدا کیا[۲۷] اور جگہ جگہ پھیلا ہوا

المدثر ۷۴

۲۴؎ اصل میں لفظ 'تَسْتَكْثِرُ' استعمال ہوا ہے۔ یہ حال کے مفہوم میں ہے۔ اِس کے معنی جس طرح زیادہ چاہنے کے ہیں، اُسی طرح زیادہ سمجھ لینے یا زیادہ خیال کرنے کے بھی ہیں۔ یہاں یہ اِسی دوسرے معنی میں آیا ہے۔

۲۵؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ'۔ اِن میں 'ل' اِس بات پر دلیل ہے کہ 'صبر' یہاں انتظار کے مفہوم پر متضمن ہے۔ مدعا یہ ہے کہ جب تک اللہ کا حکم نہ آ جائے، تم یہ خیال کر کے کہ فرض دعوت ادا ہو گیا، اپنی قوم کو چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ یہ ہدایت کیوں ہوئی؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ ہدایت اِس لیے فرمائی گئی کہ رسول جس فرض انذار پر مامور ہوتا ہے، اُس کے متعلق سنت الٰہی... یہ ہے کہ اگر قوم اُس کے انذار کی پروا نہیں کرتی تو ایک خاص مدت تک مہلت دینے کے بعد اللہ تعالیٰ اُس کو لازماً ہلاک کر دیتا ہے۔ یہ مہلت اتمام حجت کے لیے ملتی ہے اور اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ کسی قوم کو اِس کے لیے کتنی مہلت ملنی چاہیے۔ رسول کا فرض یہ ہے کہ وہ اُس وقت تک اپنے کام میں لگا رہے، جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کے پاس یہ ہدایت نہ آ جائے کہ اُس نے اپنا فرض ادا کر دیا، اب وہ قوم کو اُس کی تقدیر کے حوالے کر کے اِس علاقے سے ہجرت کر جائے۔ اگر رسول بطور خود یہ گمان کر کے قوم کو چھوڑ کر ہجرت کر جائے کہ اُس نے اپنا فرض ادا کر دیا تو اندیشہ ہے کہ حالات کا اندازہ کرنے میں اُس سے اُسی طرح کی غلطی صادر ہو جائے، جس طرح کی غلطی حضرت یونس علیہ السلام سے صادر ہوئی، جس پر اللہ تعالیٰ نے اُن کو تنبیہ فرمائی اور ایک سخت امتحان سے گزارنے کے بعد اُن کو پھر قوم کے پاس انذار کے

لَهٗ مَالًا مَّمۡدُوۡدًا ﴿۱۲﴾ وَّ بَنِيۡنَ شُهُوۡدًا ﴿۱۳﴾ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمۡهِيۡدًا ﴿۱۴﴾ ثُمَّ يَطۡمَعُ اَنۡ اَزِيۡدَ ﴿۱۵﴾ كَلَّا ؕ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيۡدًا ﴿۱۶﴾ سَاُرۡهِقُهٗ صَعُوۡدًا ﴿۱۷﴾

بہت فراواں مال اُس کو بخشا،[۲۸] حاضر باش بیٹے دیے[۲۹] اور اُس کے لیے عزوشرف کی راہ خوب ہموار کر دی۔ پھر وہ توقع رکھتا ہے کہ (جب اُسے یہاں یہ ملا ہے تو قیامت کے دن) اُس کے لیے میں اور زیادہ کروں گا۔ ہرگز نہیں، وہ تو ہماری آیتوں کا دشمن نکلا۔ (اِس لیے) عنقریب میں اُسے سخت چڑھائی چڑھاؤں گا۔[۳۰] ۸-۱۷

لیے واپس بھیجا اور اِس دوبارہ انذار سے اللہ تعالیٰ نے اُن کی پوری قوم کو ایمان کی توفیق بخشی۔''

(تدبر قرآن ۴۶/۹)

۲۶؎ مطلب یہ ہے کہ جس دن سے تم بے خوف بیٹھے ہو کہ آئے گا تو دیکھ لیں گے، وہ کوئی آسان دن نہ ہوگا۔ وہ بڑا ہی کٹھن دن ہوگا۔

۲۷؎ یہ قریش کے برخود غلط لیڈروں کو نہایت تند و تیز لہجے میں تنبیہ ہے جو اپنی رفاہیت کو اپنے عقیدہ و عمل کی صحت اور خدا کے منظور نظر ہونے کی دلیل سمجھتے تھے۔ اِس کے لیے جو حرف 'مَنْ' اصل میں آیا ہے، وہ واحد اور جمع، دونوں کے لیے آتا ہے اور اِس کے لیے ضمیریں بھی دونوں ہی طرح آسکتی ہیں۔ اِس سے کوئی خاص شخص مراد نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر مفسرین نے سمجھا ہے۔

۲۸؎ یعنی ہر شخص کی طرح ماں کے پیٹ سے تنہا پیدا ہوا، لیکن ہم نے ایسا پھیلا ہوا مال اُسے عطا فرمایا کہ استاذ امام کے الفاظ میں کہیں اُس کے باغ ہیں، کہیں اُس کے بنگلے اور کوٹھیاں ہیں، کہیں جانوروں کے گلے اور ریوڑ ہیں، کہیں رقبے، تجارتی آڑھتیں اور دکانیں ہیں۔

۲۹؎ یعنی ایسے بیٹے جو ہر موقع اور ہر مقام پر اُس کے ساتھ کھڑے ہونے والے ہیں۔ اِن کے لیے اصل میں لفظ 'شُهُوْد' آیا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

إِنَّهُۥ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ﴿١٨﴾ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿١٩﴾ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿٢٠﴾ ثُمَّ نَظَرَ ﴿٢١﴾ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ﴿٢٢﴾ ثُمَّ أَدْبَرَ وَٱسْتَكْبَرَ ﴿٢٣﴾ فَقَالَ إِنْ هَٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ يُؤْثَرُ ﴿٢٤﴾ إِنْ هَٰذَآ إِلَّا قَوْلُ ٱلْبَشَرِ ﴿٢٥﴾

(یہ مجرم[۳۱])، اِس نے سوچا اور بات بنائی۔ تو اِس پر خدا کی مار، اِس نے کیا بات بنائی! پھر اِس پر خدا کی مار، اِس نے کیا بات بنائی! پھر (اِدھر اُدھر) دیکھا، پھر تیوری چڑھائی اور منہ بنایا۔ پھر پلٹا اور اکڑا، پھر بولا: یہ محض (زبان و بیان کی) جادوگری ہے۔ (وہی) جو پہلے سے چلی آ رہی ہے۔ (یہ کوئی الہام نہیں ہے)۔ یہ محض انسان کا کلام ہے[۳۲]۔ ۱۸-۲۵

"...قبائلی زندگی میں خاندانی عصبیت و جمعیت کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ مدافعت و مقابلہ کا تمام تر انحصار اِس پر تھا۔ قوم و قبیلہ میں سرداری کا مقام اُسی کو حاصل ہوتا جس کے بیٹے زیادہ اور کنبہ بڑا ہو اور بیٹے ایسی صلاحیت و قابلیت رکھنے والے ہوں کہ ہر ضرورت کے موقع پر باپ کے ساتھ شانہ بہ شانہ کھڑے ہو سکیں۔ لفظ 'شُھُوْد' اِسی پہلو کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔"

(تدبر قرآن ۹/۴۹)

۳۰؎ یعنی دنیا میں جب یہ خیر و صلاح کی راہ میں کوئی چڑھائی چڑھنے کے لیے تیار نہیں ہوا تو اِس کی سزا کے طور پر اب میں دوزخ میں اِسے ایک سخت چڑھائی چڑھاؤں گا۔

۳۱؎ اِس سے آگے اُس عناد کی تصویر ہے جس کا ذکر اوپر 'اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا' (وہ تو ہماری آیتوں کا دشمن نکلا) کے الفاظ میں ہوا ہے۔ یعنی قرآن کے بارے میں اُس کے پیرووں نے جب اُس کی راے پوچھی تو اظہار راے کا جو متکبرانہ انداز اُس نے اختیار کیا، وہ یہ تھا۔ یہ تصویر ایسی مکمل ہے کہ اُس کے باطن کو گویا اِس نے ممثل کر دیا ہے۔

۳۲؎ یعنی اِس کے ساحرانہ اسلوب کو جتنی اہمیت چاہے دو، ہم اِس کا انکار نہ کریں گے۔ لیکن

سَاُصۡلِیۡهِ سَقَرَ ﴿۲۶﴾ وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا سَقَرُ ﴿۲۷﴾ لَا تُبۡقِیۡ وَلَا تَذَرُ ﴿۲۸﴾ لَوَّاحَةٌ لِّلۡبَشَرِ ﴿۲۹﴾ عَلَیۡهَا تِسۡعَةَ عَشَرَ ﴿۳۰﴾

وَمَا جَعَلۡنَاۤ اَصۡحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۪ وَّمَا جَعَلۡنَا عِدَّتَهُمۡ اِلَّا فِتۡنَةً لِّلَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا ۙ لِیَسۡتَیۡقِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ وَیَزۡدَادَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِیۡمَانًا وَّلَا یَرۡتَابَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ وَلِیَقُوۡلَ

(یہ مجرم)، میں عنقریب اِسے دوزخ میں ڈال دوں گا۔ اور تم کیا سمجھے کہ دوزخ کیا ہے؟ وہ نہ ترس کھائے گی،[۳۳] نہ چھوڑے گی۔ چمڑی جھلس دینے والی۔ اُس پر انیس مقرر ہیں۔[۳۴] ۲۶-۳۰

——ہم[۳۵] نے دوزخ پر فرشتے ہی مقرر کیے ہیں اور اُن کی یہ تعداد صرف اِس لیے بتائی ہے کہ اِسے منکروں کے لیے آزمایش بنا دیں[۳۶] تاکہ اہل کتاب کو یقین حاصل ہو، ایمان والوں کا ایمان بڑھے، اہل کتاب اور مومنین، دونوں کسی شک میں نہ رہیں، اور (اہل کتاب

اِسے آسمان پر نہ چڑھاؤ، یہ بہرحال انسان ہی کا کلام ہے۔

۳۳؎ اصل میں 'اَبۡقٰی عَلَیۡہ' ہے۔ صلہ اِس لیے نہیں آیا کہ یہاں اُس کے اظہار کا موقع نہیں تھا۔

۳۴؎ یعنی اُنیس فرشتے مقرر ہیں۔

۳۵؎ سورہ کی تلاوت کے دوران میں مخاطبین کے ردعمل پر یہ پوری آیت ایک برسرموقع تنبیہ ہے جو سلسلۂ بیان کے بیچ میں بالکل اُسی طرح آ گئی ہے، جس طرح ایک جملۂ معترضہ کلام کے بیچ میں آ جاتا ہے۔ پچھلی آیت سے حرف عطف کے ساتھ اِس کا اتصال دلیل ہے کہ یہ بعد میں نازل نہیں ہوئی۔

الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ

میں سے) وہ لوگ جن کے دلوں میں (حسد کا) روگ ہے اور منکرین (اِس کا مذاق اڑائیں اور) کہیں کہ اللہ نے اِس بات سے کیا چاہا ہے؟[۳۷] اللہ (اپنے قانون کے مطابق) جس کو چاہتا ہے، اِسی طرح گم راہ کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے، ہدایت بخشتا ہے۔[۳۸]

۳۶؎ چنانچہ دوسری آیات متشابہات کی طرح قرآن کی یہ بات بھی منکرین کے لیے یقیناً فتنہ بنی ہوگی کہ دوزخ پر اُنیس فرشتے مقرر ہیں۔ کسی نے کہا ہوگا کہ جب دوزخ میں فرشتے بھی ہوں گے تو پھر کیا ڈر ہے؟ جس طرح وہ گزاریں گے، ہم بھی گزار لیں گے اور کسی نے کہا ہوگا کہ اگر انیس ہی ہیں تو پھر کیا اندیشہ ہے؟ اتنی بے حساب مخلوق جس کے دوزخ میں ڈالے جانے کی وعید سنائی جا رہی ہے، نہایت آسانی کے ساتھ اُن سے نمٹ لے گی۔

۳۷؎ یہ آزمایش کا نتیجہ بیان فرمایا ہے کہ سچے اہل کتاب کو اِس سے یقین حاصل ہوگا اور ایمان والوں کا ایمان بڑھے گا اور وہ کسی شک میں نہ رہیں گے کہ خدا کی بات ہی سچی ہے اور منکرین جن باتوں کا سہارا لے کر اُس کی مخالفت کر رہے ہیں، وہ کس قدر پوچ، بے معنی اور لغو ہیں۔ حق و باطل کی کشمکش میں بارہا ایسا ہوتا ہے کہ حق کے مخالفین کا رویہ اور اعتراضات کی لغویت اِسی طرح ماننے والوں کے ایمان و یقین میں اضافے کا باعث بن جاتی ہے۔ فرمایا ہے کہ منکرین اِس کے برخلاف خدا کی باتوں کا مذاق اڑا کر اپنے کفر میں اضافہ کر لیں گے۔

۳۸؎ یعنی اِس قانون کے مطابق کہ گم راہ وہی ہوں گے جو اِس طرح کی آزمایشوں میں اپنے رویے سے اپنے آپ کو گم راہی کا مستحق بنا لیں گے اور ہدایت اُنھی کو ملے گی جو ہدایت کے سزاوار ہیں۔

رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ؕ وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكۡرٰى لِلۡبَشَرِ ﴿۳۱﴾

كَلَّا وَالۡقَمَرِ ﴿۳۲﴾ وَالَّيۡلِ اِذۡ اَدۡبَرَ ﴿۳۳﴾ وَالصُّبۡحِ اِذَاۤ اَسۡفَرَ ﴿۳۴﴾ اِنَّهَا لَاِحۡدَى الۡكُبَرِ ﴿۳۵﴾ نَذِيۡرًا لِّلۡبَشَرِ ﴿۳۶﴾ لِمَنۡ شَآءَ مِنۡكُمۡ اَنۡ يَّتَقَدَّمَ اَوۡ يَتَاَخَّرَ ﴿۳۷﴾ كُلُّ نَفۡسٍۢ بِمَا كَسَبَتۡ رَهِيۡنَةٌ ﴿۳۸﴾ اِلَّاۤ اَصۡحٰبَ الۡيَمِيۡنِ ﴿۳۹﴾

المدثر
۷۴

(یہ اپنے علم کے معاملے میں کسی زعم میں نہ رہیں، حقیقت یہ ہے کہ) تیرے پروردگار کے لشکروں کو خود اُس کے سوا کوئی نہیں جانتا[۳۹]۔ اور یہ سرگذشت[۴۰] تو لوگوں کے لیے محض ایک یاددہانی ہے۔ ۳۱

(یہ کوئی مذاق اڑانے اور جلدی مچانے کی چیز نہیں ہے)۔ ہرگز نہیں، چاند گواہی دیتا ہے اور رات بھی، جب اُس نے پیٹھ پھیر لی، اور صبح بھی، جب وہ روشن ہو جاتی ہے کہ قیامت کا یہ ماجرا بڑے ماجروں میں سے ہے، انسان کی تنبیہ کے لیے سنایا گیا ہے[۴۱]، تم میں سے ہر اُس شخص کے لیے جو چاہے کہ (ماننے کے لیے) آگے

[۳۹] متشابہات کے بارے میں جس رویے کا ذکر اوپر ہوا ہے، وہ بالعموم اِسی غرور ہمہ دانی سے پیدا ہوتا ہے کہ جو بات ہمارے علم و عقل کے حدود سے باہر ہے، وہ درست کیسے ہوسکتی ہے؟

[۴۰] یعنی قیامت کی سرگذشت جو اِس سورہ میں سنائی جارہی ہے۔

[۴۱] اوپر کی قسموں اور اُن کے اِس مقسم علیہ کے درمیان بات کا ایک حصہ بربنائے قرینہ مقدر ہے۔ اِسے کھول دیجیے تو پوری بات اِس طرح ہے کہ لیل و نہار کی گردش اور چاند کا عروج و محاق گواہی دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں ترتیب و تدریج ہے۔ رات کے بعد صبح اپنے وقت پر ہوتی ہے اور چاند بھی درجہ بدرجہ ہلال سے بدر کے مقام پر پہنچتا ہے، لہٰذا جب وقت آئے گا تو دنیا بھی اپنے سب مراحل طے کر کے ظہور قیامت تک پہنچ جائے گی۔ یہ تاخیر کوئی مذاق اڑانے اور

فِیْ جَنّٰتٍ ۛ؃ یَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۴۰﴾ۙ عَنِ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۴۱﴾ۙ مَا سَلَکَکُمْ فِیْ سَقَرَ ﴿۴۲﴾ قَالُوْا لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ ﴿۴۳﴾ۙ وَلَمْ نَکُ نُطْعِمُ الْمِسْکِیْنَ ﴿۴۴﴾ۙ وَکُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِیْنَ ﴿۴۵﴾ۙ وَکُنَّا نُکَذِّبُ بِیَوْمِ الدِّیْنِ ﴿۴۶﴾ۙ حَتّٰۤی اَتٰىنَا الْیَقِیْنُ ﴿۴۷﴾ؕ

بڑھے یا (رد کر کے) پیچھے ہٹ جائے۔ ہر متنفس (اُس روز) اپنی کمائی کے بدلے رہن ہو گا[۴۲]۔ دہنے والوں کے سوا[۴۳]۔ وہ باغوں میں ہوں گے۔ اِن مجرموں کے بارے میں باہم پوچھ رہے ہوں گے۔ وہ اُن سے پوچھیں گے: تمھیں کیا چیز دوزخ میں لے آئی؟ وہ کہیں گے: (ہماری بدنصیبی کہ) ہم نمازی نہ تھے، ہم غریبوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور کٹ حجتیاں کرنے والوں کے ساتھ ہم بھی کٹ حجتیاں کرتے تھے اور بدلے کے دن کو جھٹلاتے تھے[۴۴]، یہاں تک کہ یقین کی گھڑی آ گئی۔ ۳۲-۴۷

جلدی مچانے کی چیز نہیں ہے۔ اِس وقت جو بات سمجھنے کی ہے، وہ یہ ہے کہ قیامت کا ماجرا بڑے ماجروں میں سے ہے جو انسان کی تنبیہ کے لیے سنایا گیا ہے۔

۴۲؎ یعنی جزا و سزا کے دن اُس کا عمل ہی اُسے چھڑائے گا۔ اگر کوئی اِس زعم میں مبتلا ہے کہ اُس کا حسب و نسب یا ربط و تعلق یا کسی کی شفاعت اُسے چھڑا لے گی تو اُسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ اُس کا یہ زعم محض زعم باطل ہے۔

۴۳؎ یہ قرآن کی خاص تعبیر ہے، یعنی اُن لوگوں کے سوا جن کا نامۂ اعمال اُن کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔

۴۴؎ آخرت کا یقین، نماز اور انفاق، یہی پورے دین کا خلاصہ ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ قرآن کی رو سے دنیا میں اللہ کا بندہ بن کر رہنے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے: ایک یہ کہ

فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ﴿٤٨﴾ فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ ﴿٤٩﴾ كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ﴿٥٠﴾ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ﴿٥١﴾ بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴿٥٢﴾ كَلَّا ۭ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿٥٣﴾ كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ﴿٥٤﴾ فَمَنْ شَاۗءَ ذَكَرَهٗ ﴿٥٥﴾

تب اِن کے شفاعت کرنے والوں کی شفاعت اِن کے کچھ کام نہ آئے گی۔[۴۵] سو اِنھیں کیا ہو گیا ہے کہ اِس یاددہانی سے منہ موڑ رہے ہیں،[۴۶] گویا بدکے ہوئے گدھے ہیں جو شیر سے ڈر کر بھاگ پڑے ہیں۔ بلکہ اِن میں سے تو ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ (پیغمبر کے بجاے خدا کی طرف سے براہ راست) کھلے ہوئے صحیفے اُسے پکڑا دیے جائیں۔[۴۷] ہرگز نہیں، (یہ نہ ہوا ہے، نہ ہونا ہے)، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ قیامت کا اندیشہ نہیں رکھتے۔ (اِن کے پیچھے نہ پڑو)، ہرگز نہیں، یہ تو ایک یاددہانی ہے۔ سو جس کا جی چاہے، اِس سے نصیحت

خالق کے ساتھ انسان کا تعلق ٹھیک قائم ہو جائے۔ دوسری یہ کہ مخلوق کے ساتھ وہ صحیح طریقے سے جڑ جائے۔ پہلی چیز نماز سے حاصل ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا اولین مظہر ہے اور دوسری انفاق سے جو اُس کی مخلوق کے ساتھ محبت کا اولین مظہر ہے۔

۴۵؎ یہ 'نفی الشیء بلازمہ' کا اسلوب ہے، یعنی وہاں نہ اِن کے مزعومہ شفاعت کرنے والے ہوں گے اور نہ اُن کی شفاعت۔

۴۶؎ اصل میں لفظ 'مُعْرِضِيْنَ' آیا ہے۔ یہ ضمیر مجرور سے حال پڑا ہوا ہے۔

۴۷؎ یہ وہی احمقانہ مطالبہ ہے جو سورۂ انعام (۶) کی آیت ۱۲۴ میں بیان ہوا ہے کہ ہم اُس وقت تک ایمان نہ لائیں گے، جب تک ہمیں بھی وہ چیز جو رسولوں کو ملی ہے، اُس طرح نہ ملے، جس طرح اُن کو ملی ہے۔

وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ﴿۵۶﴾

حاصل کرے — اور یہ کوئی نصیحت حاصل نہ کریں گے، اِلّا یہ کہ اللہ ہی (اپنے قانون کے مطابق) چاہے[۴۸] — (سو جس کا جی چاہے، اِس سے نصیحت حاصل کرے)۔ وہی اہل تقویٰ ہے اور وہی اِس کا مستحق ہے کہ اُس کا پروردگار اُسے بخش دے۔ ۴۸-۵۶

۴۸؎ یعنی ہدایت و ضلالت کے بارے میں اپنے قانون کے مطابق چاہے کہ انبیا علیہم السلام کی لائی ہوئی ہدایت سے اُس کو بہرہ یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ اِس قانون کی وضاحت ہم اِس سے پہلے حاشیہ ۳۸ کے تحت کر چکے ہیں۔

کوالالمپور

۱۲؍ فروری ۲۰۱۰ء

القيامة - الدهر

٧٥ ـــ ٧٦

القیامۃ - الدھر

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ نفس لوامہ کی شہادت سے قیامت کو ثابت کرتی ہے، دوسری میں یہی دعویٰ انسان کے وجود میں خیر وشر کے الہام سے ثابت کیا گیا ہے۔ پہلی میں انذار اور دوسری میں بشارت کا پہلو نمایاں ہے۔ دونوں سورتوں میں خطاب اصلاً قریش کے سرداروں سے ہے اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ پچھلی سورتوں کی طرح یہ بھی ام القریٰ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ انذار عام میں نازل ہوئی ہیں۔

دونوں سورتوں کا موضوع قیامت کا اثبات اور اِس کے حوالے سے قریش کو انذار ہے۔

سورة القيامة

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لَاۤ اُقۡسِمُ بِیَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ ۙ﴿۱﴾ وَ لَاۤ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَۃِ ؕ﴿۲﴾ اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَہٗ ؕ﴿۳﴾ بَلٰی قٰدِرِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡ

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

(یہ قیامت کو جھٹلاتے ہیں)؟ نہیں[۱]، میں قیامت کے دن کو گواہی میں پیش کرتا ہوں[۲]، اور نہیں[۳]، میں (تمھارے اندر تمھارے) ملامت کرنے والے نفس کو گواہی میں پیش کرتا ہوں[۴]۔ کیا انسان[۵] یہ سمجھتا ہے کہ ہم اِس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں! ہم

۱۔ ہم اپنی زبان میں فوراً کسی بات کی تردید کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں: نہیں، خدا کی قسم اصل بات یوں ہے۔ یہ بالکل اِسی طرح کا اسلوب ہے۔ لہٰذا 'نہیں' یہاں گواہی کی نفی کے لیے نہیں، بلکہ مخاطب کے اُس خیال کی نفی کے لیے آیا ہے جس کی تردید اِس گواہی سے پیش نظر ہے۔

۲۔ اصل میں یہاں قسم کا اسلوب ہے جس کا مقسم علیہ محذوف ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ قسم خود مقسم علیہ پر اِس طرح دلالت کر رہی ہے کہ اُس کے اظہار کی ضرورت نہیں رہی۔ قسم کا یہ اسلوب اُس وقت اختیار کیا جاتا ہے، جب مخاطب کو یہ بتانا مقصود ہو کہ وہ جس چیز کو جھٹلا رہا ہے، وہ خود اپنے وجود پر اِس طرح گواہی دے رہی ہے کہ کسی عاقل کے لیے اُس سے انکار کی گنجایش نہیں ہے۔ گویا جس چیز کی قسم کھائی گئی ہے، اُس نے بجائے خود دعویٰ اور دلیل اور قسم اور مقسم علیہ، دونوں کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔

۳۔ یہ پہلے 'نہیں' پر عطف ہے جس کی وضاحت اوپر ہوئی ہے۔

نُسَوِّيَ بَنَانَهٗ ④ بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ⑤ يَسْـَٔلُ

تو اِس کی پور پور درست کر سکتے ہیں[6]۔ (نہیں، یہ بات نہیں[7])، بلکہ حق یہ ہے کہ

[4] یہ دوسری قسم ہے۔ اِس کا مقسم علیہ بھی حذف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر اُس کا ضمیر جو اُسے برائیوں پر متنبہ کرتا ہے، اپنے وجود ہی سے گواہی دیتا ہے کہ قیامت ہو کر رہے گی۔ اِس کی تقریر اِس طرح ہے کہ انسان کے اندر ایک ملامت کرنے والا نفس برائی پر سرزنش کے لیے ہر وقت موجود ہے۔ اُس کے باطن کی یہ عدالت ہر موقع پر اپنا بے لاگ فیصلہ سنا رہی ہے۔ اِس کے معنی ہی یہ ہیں کہ انسان شتر بے مہار نہیں ہے۔ پھر جب وہ شتر بے مہار نہیں ہے تو لازم ہے کہ اُس سے باز پرس ہو۔ قیامت کا دن اللہ تعالیٰ نے اِسی باز پرس کے لیے مقرر کر رکھا ہے جس کی خبر اُس کے پیغمبر ہمیشہ دیتے رہے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اگر انسان شتر بے مہار ہے تو یہ نفس لوامہ اُس کے اندر کہاں سے آ گھسا؟ اگر اُس کا خالق لوگوں کی نیکی اور بدی، دونوں سے بے تعلق ہے تو اُس نے نیکی کی تحسین اور بدی پر سرزنش کے لیے انسان کے اندر یہ خلش کیوں اور کہاں سے ڈال دی؟ پھر یہیں سے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب اُس نے ہر انسان کے اندر یہ چھوٹی سی عدالت قائم کر رکھی ہے تو اِس پورے عالم کے لیے وہ ایک ایسی عدالت کبریٰ کیوں نہ قائم کرے گا جو سارے عالم کے اعمال خیر و شر کا احتساب کرے اور ہر شخص کو اُس کے اعمال کے مطابق جزا یا سزا دے؟ اِن سوالوں پر جو شخص خواہشوں سے آزاد ہو کر غور کرے گا، وہ اِن کا یہی جواب دے گا کہ بے شک، انسان کا اپنا وجود گواہ ہے کہ وہ خیر و شر کے شعور کے ساتھ پیدا ہوا ہے۔ وہ شتر بے مہار نہیں ہے، بلکہ اُس کے لیے لازماً ایک پرسش کا دن آنے والا ہے جس میں اُس کو اُس کی بدیوں کی سزا ملے گی، اگر اُس نے یہ بدیاں کمائی ہوں گی اور نیکیوں کا صلہ ملے گا، اگر اُس نے نیکیاں کی ہوں گی۔ اُسی دن کی یاد دہانی ہی کے لیے خالق نے اُس کا ایک چھوٹا سا نمونہ خود انسان کے نفس کے اندر رکھ دیا ہے تا کہ انسان اُس سے غافل نہ رہے اور اگر کبھی غفلت ہو جائے تو خود اپنے نفس کے اندر جھانک

اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ۝٦

فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝٧ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝٨ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝٩ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ۝١٠ كَلَّا لَا وَزَرَ ۝١١ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ نِ الْمُسْتَقَرُّ ۝١٢ يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ

انسان اپنے ضمیر کے روبرو شرارت کرنا چاہتا ہے۔[8] پوچھتا ہے: قیامت کب آئے گی؟ ۱-۶

پھر جب دیدے پتھرائیں گے اور چاند گہنائے گا اور سورج اور چاند، دونوں اکٹھے کر دیے جائیں گے تو یہی انسان اُس دن کہے گا: اب کہاں بھاگ کر جاؤں ـــــ ہرگز نہیں، اب کہیں پناہ نہیں! اُس دن تیرے رب ہی کے سامنے جا ٹھیرنا ہوگا۔

کر اُس کی تصویر دیکھ لے۔ یہی حقیقت حکما اور عارفین نے یوں سمجھائی ہے کہ انسان ایک عالم اصغر ہے جس کے اندر اِس عالم اکبر کا پورا عکس موجود ہے۔ اگر انسان اپنے کو صحیح طور پر پہچان لے تو وہ خدا اور آخرت، سب کو پہچان لیتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۹/۸۰)

۵ روے سخن قریش کے منکرین کی طرف ہے، لیکن اُن سے اظہار بے زاری کے لیے بات ایک عام لفظ 'انسان' سے فرما دی ہے۔

۶ اصل الفاظ ہیں: 'بَلٰى قٰدِرِيْنَ'۔ 'قٰدِرِيْنَ' اِن میں 'نَجْمَعَ' کی ضمیر جمع سے حال واقع ہوا ہے۔

۷ یعنی یہ بات نہیں ہے کہ ہڈیوں کو جمع کرنا اِنھیں بعید از امکان نظر آتا ہے۔ یہ محض سخن سازی ہے جو حقیقت سے فرار کے لیے کی جا رہی ہے۔

۸ یعنی ضمیر کی تذکیر و تنبیہ کے باوجود شرارت کرنا چاہتا ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ جو شخص قیامت کو جھٹلاتا ہے، وہ درحقیقت اپنے آپ کو جھٹلاتا ہے، اِس لیے کہ قیامت کی سب سے بڑی گواہی خود نفس انسانی کے اندر موجود ہے۔

يَوۡمَئِذٍۢ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ﴿۱۳﴾ بَلِ الۡاِنۡسَانُ عَلٰی نَفۡسِهٖ بَصِیۡرَةٌ ﴿۱۴﴾
وَّلَوۡ اَلۡقٰی مَعَاذِیۡرَهٗ ﴿۱۵﴾
لَا تُحَرِّكۡ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعۡجَلَ بِهٖ ﴿۱۶﴾ اِنَّ عَلَیۡنَا جَمۡعَهٗ وَقُرۡاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾

اُس دن انسان کو بتایا جائے گا کہ اُس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا ہے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے، اگرچہ وہ اپنے لیے کتنے ہی بہانے بنائے[9]۔ ۷-۱۵

(اِن[10] پر اتمام حجت کی جلدی میں، اے پیغمبر)، تم اِس قرآن کو جلد پا لینے کے لیے اپنی زبان کو اِس پر نہ چلاؤ۔ (یہ اِسی طرح اترے گا[11]۔ تم مطمئن رہو)، اِس کا جمع

[9] اصل الفاظ ہیں: 'وَلَوۡ اَلۡقٰی مَعَاذِیۡرَهٗ'۔ اِن میں 'مَعَاذِیۡرَهٗ' دراصل 'معذرۃ' کی جمع 'معاذر' ہے جس میں 'ی' زیادہ ہوگئی ہے، جس طرح 'مناکیر' میں زیادہ ہوگئی ہے۔

[10] آیت ۱۶ سے ۱۹ تک یہ پوری عبارت ایک جملۂ معترضہ ہے جو سلسلۂ کلام کو بیچ میں توڑ کر ارشاد فرمائی گئی ہے۔ اِس کے مخاطب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ پورے قرآن کو جلد حاصل کر لینے کے لیے آپ کے شوق و اضطراب اور عجلت و بے قراری پر یہ برسرموقع آپ کو صبر و انتظار کی تلقین ہے۔ اپنی قوم پر اتمام حجت آپ کا فریضۂ منصبی تھا۔ اِس طرح کی غیر معمولی ذمہ داری کو جلد سے جلد اور سرخ روئی کے ساتھ پورا کر دینے کی خواہش ایک فطری خواہش تھی۔ پھر قریش بھی بار بار تقاضا کرتے تھے کہ قرآن اگر خدا کی طرف سے نازل کیا جا رہا ہے تو ایک ہی مرتبہ پورا کیوں نازل نہیں کر دیا جاتا۔ قرآن جیسی بے نظیر کتاب کسی شخص کو کائنات کے بادشاہ اور جہانوں کے پروردگار کی طرف سے دی جا رہی ہو اور اُس کے اندر یہ خواہش پیدا ہو جائے کہ پوری کتاب جلد اُسے مل جائے تو اِس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔ آپ کے قلب کو تمام قوت، روح کو زندگی، عقل کو رہنمائی اور ارادے کو ثبات و استحکام قرآن ہی سے حاصل ہوتا تھا، یہ چیز بھی اُس کو جلد پا لینے کے

لیے شوق و اضطراب کا باعث بن جاتی تھی۔ اِن آیتوں میں اِسی عجلت و بے قراری سے آپ کو روکا گیا ہے، جس کا اظہار آپ کی طرف سے بعض ایسے موقعوں پر ہوا ہوگا، جب وحی کے آنے میں کچھ زیادہ وقفہ ہو گیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اگرچہ شوق و عجلت کا مضمون ادب کے پامال مضامین میں سے ہے، لیکن اُس عجلت و بے قراری کی تعبیر کون کر سکتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اُس وقت طاری ہوتی ہوگی، جب ایک طویل وقفے کے انتظار کے بعد اور مخالفین کی ژاژ خائیوں کے طوفان کے اندر حضرت جبریل امین علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نامہ و پیام کے ساتھ نمودار ہوتے رہے ہوں گے! ایک بچہ بھوکا ہو اور ماں اُس کو چھاتی سے لگائے تو وہ چاہتا ہے کہ ماں کی چھاتی کا سارا دودھ ایک ہی سانس میں سڑپ لے۔ صحرا کا مسافر پیاس سے تڑپ رہا ہو اور طویل انتظار کے بعد اُس کو پانی کا ڈول مل جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ پورا ڈول ایک ہی دفعہ پیٹ میں انڈیل لینا چاہتا ہے۔ ایک فراق زدہ کو جدائی کی کٹھن گھڑیاں گزارنے کے بعد نامۂ محبوب مل جائے تو وہ چاہے گا کہ ایک ہی نظر میں اُس کا ایک ایک حرف پڑھ ڈالے۔ اگرچہ یہ مثالیں... ناقص ہیں، تاہم اِن سے کچھ اندازہ اُس شوق، اُس عجلت اور اُس اضطراب کا کیا جا سکتا ہے جن کا اظہار آپ کی طرف سے بے اختیارانہ اُس وقت ہوتا رہا ہوگا، جب آپ وحی سے مشرف ہوتے رہے ہوں گے۔''

(تدبر قرآن ۹/۸۵)

<u>۱۱</u> یعنی اِسی تدریج کے ساتھ تھوڑا تھوڑا کر کے اترے گا، جس طرح اتر رہا ہے۔ دعوت کی حکمت اِسی کا تقاضا کرتی ہے۔ قرآن نے یہ بات لفظوں میں بیان نہیں فرمائی، اِس لیے کہ یہ آپ سے آپ واضح ہے۔ اِس کے ساتھ، البتہ آگے کی آیتوں میں یہ اطمینان دلا دیا ہے کہ قرآن سے متعلق کسی معاملے میں بھی فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اِس کی حفاظت، جمع و ترتیب، قراءت اور اِس کے جو مقامات وضاحت کا تقاضا کرتے ہیں، اُن کی وضاحت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لے رکھی ہے۔ آپ کسی تشویش میں مبتلا نہ ہوں۔ یہ کام بھی اُس کی طرف سے اپنے وقت پر انجام پا جائیں گے۔ قرآن میں یہ اسلوب دوسرے مقامات میں بھی ہے کہ ایک بات ہوئی ہے تو اُس کی رعایت سے اُس کے بعض متعلقات بھی اُس موقع پر بیان کر دیے گئے ہیں۔

فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿١٨﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿١٩﴾

کرنا اور سنانا[12]، سب ہماری ذمہ داری ہے۔ اِس لیے جب (اُس وقت) ہم اِس کو پڑھیں تو اِس کی اُس قراءت کی پیروی کرو[13]۔ پھر ہمارے ہی ذمے ہے کہ (اگر کہیں ضرورت ہو تو) ہم (تمھارے لیے) اِس کی وضاحت کر دیں[14]۔ ۱۶-۱۹

القیامة
۷۵

۱۲؎ یعنی جمع و ترتیب کے بعد ایک مرتبہ پھر سنانا۔ سورۂ اعلیٰ (۸۷) کی آیت ۶ میں یہی بات 'سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓی' کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ اِسے عرضۂ اخیرہ کی قراءت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جبریل علیہ السلام نے آپ کی حیات مبارک کے آخری رمضان میں دو مرتبہ آپ کے ساتھ قرآن کا مذاکرہ فرمایا*۔ یہ اِسی قراءت کے مطابق تھا۔ سلف اِسے قراءت عامہ کہتے رہے ہیں**۔ اللہ تعالیٰ کے اِس ارشاد سے واضح ہے کہ قرآن مجید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ جمع کر کے آپ کی زندگی ہی میں سنا دیا گیا تھا۔

۱۳؎ یعنی اُس قراءت کی پیروی کرو جو ایک کتاب کی صورت میں قرآن کی ترتیب کے بعد ہم کریں گے۔ اِس سے پہلے اگر کوئی آیت اِس سے مختلف طریقے پر پڑھی جاتی رہی ہے تو اُس کا اعتبار نہ ہو گا۔ قرآن اِسی ترتیب اور اِسی قراءت کے ساتھ اِس وقت ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ چند علاقوں کو چھوڑ کر امت کی عظیم اکثریت اِسی کے مطابق قرآن کی تلاوت کر رہی ہے۔ اِس کے علاوہ کوئی دوسری قراءت نہ قرآن ہے اور نہ اُسے قرآن قرار دیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ عرضۂ اخیرہ کے بعد ہمیشہ کے لیے اِسی قراءت کی پیروی کی جائے۔

۱۴؎ یہ اُن آیات کی طرف اشارہ ہے جو کسی سابق حکم کی شرح و وضاحت کے لیے نازل ہوئی ہیں۔ قرآن میں یہ بالعموم 'كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ' یا اِس کے ہم معنی الفاظ میں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ یہاں فرمایا ہے، یہ اُسی کی تکمیل ہے۔

* بخاری، رقم ۴۹۹۸۔
** البرہان، الزرکشی ۱/۳۳۱۔

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ﴿٢٠﴾ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿٢١﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿٢٢﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿٢٣﴾ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ﴿٢٤﴾ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿٢٥﴾

كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿٢٦﴾ وَقِيْلَ مَنْ سكتة رَاقٍ ﴿٢٧﴾ وَّظَنَّ اَنَّهُ

(لوگو،[15] تم اِسے نہیں جھٹلا سکتے)، ہرگز نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تم اِس جلد ملنے والی سے محبت کرتے ہو اور اُس کو چھوڑے ہوئے ہو جو دیر سے آنے والی ہے۔ (لیکن وہ آئے گی اور اِس طرح آئے گی کہ) کتنے چہرے اُس دن ترو تازہ ہوں گے، اپنے پروردگار کی رحمت کے منتظر[16]، اور کتنے چہرے اُس دن اترے ہوئے ہوں گے، سمجھ رہے ہوں گے کہ اُن پر وہ ٹوٹنے والی ہے جو کمر توڑ ڈالے گی[17]۔ ۲۰-۲۵

(نہیں، تم اِس کو نہیں جھٹلا سکتے)، ہرگز نہیں، اُس دن جب جان ہنسلی میں آ

۱۵؎ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و انتظار کی تلقین کے بعد یہاں سے کلام پھر اصل سلسلۂ بیان کے ساتھ مربوط ہو گیا ہے۔

۱۶؎ اصل الفاظ ہیں: 'اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ'۔ 'نظر' کے بعد 'اِلٰى' ہو تو یہ جس طرح کسی چیز کی طرف دیکھنے کے لیے آتا ہے، اُسی طرح کسی کی عنایت اور توجہ کے منتظر اور متوقع ہونے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ سیاق کلام دلیل ہے کہ یہاں یہ اِسی دوسرے معنی میں ہے۔ یعنی دوزخ میں جانے والے اِس اندیشے میں ہوں گے کہ اُن پر وہ ٹوٹنے والی ہے جو کمر توڑ ڈالے گی۔ اِس کے مقابل میں ایمان والے اپنے پروردگار کی رحمت کے منتظر اور اُس کی عنایت کے متوقع ہوں گے۔ اُنھیں اِس طرح کا کوئی اندیشہ نہ ہو گا۔

۱۷؎ اِس جملے کی صحیح تالیف ہمارے نزدیک وہی ہے جو زمخشری نے اپنی تفسیر ''الکشاف'' میں

الۡفِرَاقُ ﴿۲۸﴾ وَ الۡتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿۲۹﴾ اِلٰی رَبِّکَ یَوۡمَئِذِ ۣالۡمَسَاقُ ﴿ؕ۳۰﴾

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی ﴿۳۱﴾ وَلٰکِنۡ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی ﴿۳۲﴾ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰۤی اَهۡلِهٖ یَتَمَطّٰی ﴿ؕ۳۳﴾ اَوۡلٰی لَکَ فَاَوۡلٰی ﴿۳۴﴾ ثُمَّ اَوۡلٰی لَکَ

پھنسے گی[18] اور کہا جائے گا: اب ہے کوئی جھاڑنے والا[19]! اور انسان سمجھ لے گا کہ جدائی کا وقت آ پہنچا اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹ جائے گی[20]۔ وہ دن تیرے رب کی طرف جانے کا دن ہوگا۔ ۲۶-۳۰

لیکن (انسان کو دیکھو)، اِس نے نہ تو قیامت کے اچھے انجام کو سچ مانا، نہ نماز پڑھی، بلکہ جھٹلا دیا اور منہ موڑا[21]۔ پھر اکڑتا ہوا اپنے لوگوں میں چل دیا۔ افسوس ہے، تجھ پر

بیان کی ہے، یعنی 'یُفۡعَلُ بِهَا فِعۡلٌ هُوَ فِیۡ شِدَّتِهٖ وَفَظَاعَتِهٖ فَاقِرَۃٌ'۔

۱۸؎ اصل الفاظ ہیں: 'بَلَغَتِ التَّرَاقِیَ'۔ اِن میں ضمیر 'نفس' کے لیے ہے جو عربی زبان کے عام اسلوب کے مطابق یہاں حذف ہے۔

۱۹؎ یہ اظہار یاس کا جملہ ہے۔ اصل میں 'قِیۡلَ مَنۡ رَاقٍ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں نکرہ سے پہلے 'مَنۡ' غلبۂ یاس کی تعبیر کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ معاملہ آخر ہو چکا۔ اب کون شفا دے سکتا ہے؟ 'قِیۡلَ' کا صیغۂ مجہول بھی غایت درجہ بلیغ ہے۔ گویا ایسا سخت وقت ہوگا کہ کوئی اِس طرف توجہ نہ دے سکے گا کہ کہنے والا کون ہے۔

۲۰؎ یعنی ضعف و بے بسی کا یہ عالم ہوگا کہ پنڈلی پنڈلی سے لپٹ جائے گی۔

۲۱؎ اصل الفاظ ہیں: 'فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی، وَلٰکِنۡ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی'۔ اِن میں 'صَدَّقَ' اور 'کَذَّبَ' کے بعد 'بِالۡحُسۡنٰی' کا لفظ بر بنائے قرینہ حذف ہو گیا ہے۔ اِسی طرح 'تَوَلّٰی' بالکل

القیامة ۷۵

فَاَوْلٰى ﴿۳۵﴾

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ﴿۳۶﴾ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ﴿۳۷﴾ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ﴿۳۸﴾ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۳۹﴾ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ﴿۴۰﴾

افسوس ہے! پھر افسوس ہے، تجھ پر افسوس ہے[۲۲]! ۳۱-۳۵

کیا[۲۳] انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا وہ حقیر پانی کی بوند نہ تھا جو ٹپکا دی جاتی ہے[۲۴]؟ پھر (اِس سے) وہ ایک خون کا لوتھڑا بنا۔ پھر اللہ نے اُسے بنایا، پھر سنوارا۔ پھر اُس کے جوڑے بنائے، نر اور مادہ۔ کیا اُس پروردگار کو اب قدرت نہیں کہ مردوں کو زندہ کر دے؟ ۳۶-۴۰

اُسی طرح 'صَلّٰی' کے مقابل میں آیا ہے، جس طرح 'کَذَّبَ' 'صَدَّقَ' کے مقابل میں ہے۔

۲۲۔ اصل میں 'اَوْلٰی لَکَ فَاَوْلٰی' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'اَوْلٰی' 'ویل' سے ہے اور یہ کلام عرب میں زجر، ملامت، حسرت وافسوس اور اظہار نفرت کے لیے آتا ہے۔

۲۳۔ یہ اُسی مضمون پر سورہ ختم ہو رہی ہے جس سے شروع ہوئی تھی۔

۲۴۔ اصل میں لفظ 'یُمْنٰی' آیا ہے۔ اِس کا صیغۂ مجہول عدم اعتنا پر دلالت کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان ایک بوند ٹپکا کر الگ ہو جاتا ہے اور پھر کچھ نہیں جانتا کہ رحم مادر میں قدرت اُس پر کیا کیا تصرفات کر رہی ہے۔

سورۃ الدھر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

هَلۡ اَتٰی عَلَی الۡاِنۡسَانِ حِیۡنٌ مِّنَ الدَّهۡرِ لَمۡ یَکُنۡ شَیۡئًا

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

کیا انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی گزرا ہے کہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا؟[۲۵]

الدھر ۷۶

۲۵ استفہام کا یہ اسلوب اُس وقت اختیار کیا جاتا ہے، جب مخاطب سے کوئی ایسی بات منوانا پیش نظر ہو، جو اگرچہ بالبداہت واضح ہو اور مخاطب اُسے تسلیم بھی کرتا ہو، لیکن عملاً اُس سے انحراف پر مصر ہو۔ اِس میں گلہ، شکایت، غصہ، رنج، ملامت، اپیل اور یاددہانی، سب مضامین پنہاں ہوتے ہیں جو سادہ خبریہ اسلوب میں ادا نہیں ہو سکتے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اِس سوال سے مقصود انسان کی قوت فکر کو حرکت میں لانا ہے کہ وہ سوچے کہ آخر قدرت نے اُس پر یہ اہتمام کیوں صرف فرمایا؟ اُس کو اِن اعلیٰ صلاحیتوں سے کیوں نوازا؟ کیا محض اِس لیے کہ وہ کھائے پیے اور ایک دن ختم ہو جائے! کیا اِن صلاحیتوں سے متعلق اُس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی؟ کیا جس نے اِس اہتمام سے اُس کو وجود بخشا، اُس کا کوئی حق اُس پر قائم نہیں ہوتا؟ یہ سوالات ہر اُس شخص کے اندر پیدا ہونے چاہییں جو اپنے وجود پر غور کرے۔
>
> اپنا وجود انسان سے سب سے زیادہ قریب بھی ہے اور اُس کی ہر چیز انسان کو دعوت فکر بھی دیتی ہے۔ آیت کے استفہامیہ اسلوب نے اِس حس فکر کو بیدار کرنا چاہا ہے کہ انسان کی نظروں سے خدا اوجھل ہے تو اُس کا اپنا وجود تو اوجھل نہیں ہے، وہ خود اپنے اندر خدا کی قدرت و حکمت اور اُس کے عدل و رحمت کی نشانیاں دیکھ سکتا ہے۔ اِسی طرح، اگر وہ غور کرے تو یہ حقیقت بھی اُس پر روشن ہو جائے گی کہ ہر چند اُس نے قیامت ابھی دیکھی نہیں، لیکن خود اُس کے نفس کے

مَّذْكُوْرًا ﴿١﴾ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا ﴿٢﴾ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا

یہ حقیقت ہے کہ ہم نے انسان کو پانی کی ایک ملی جلی بوند سے پیدا کیا ہے[۲۶]۔ ہم اُس کو الٹتے پلٹتے رہے[۲۷]، یہاں تک کہ ہم نے اُس کو دیکھتا سنتا بنا دیا[۲۸]۔ ہم نے اُسے خیر و شر کی

اندر قیامت کے شواہد اور اُس کے دلائل اتنے واضح ہیں کہ وہ اُن کا انکار نہیں کر سکتا، بشرطیکہ وہ بالکل ہٹ دھرم اور کج رو نہ ہو۔'' (تدبرقرآن ۱۰۶/۹)

الدہر ۷۶

۲۶۔ اصل میں لفظ 'اَمْشَاج' استعمال ہوا ہے۔ یہ 'مشج' اور 'مشیج' کی جمع ہے اور اُن الفاظ میں سے ہے جو جمع ہونے کے باوجود مفرد کی صفت کے طور پر آتے ہیں۔ ملی جلی بوند سے اُس کا مختلف قویٰ و عناصر سے مرکب ہونا بھی مراد ہو سکتا ہے اور مرد و عورت کے نطفوں کا امتزاج بھی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ جہاں مختلف عناصر اور متضاد طبائع اور مزاجوں کا امتزاج ہو، وہاں اُن کے اندر ایسا اعتدال و توازن برقرار رکھنا کہ پیش نظر مقصد کے مطابق صالح نتیجہ برآمد ہو، بغیر اِس کے ممکن نہیں کہ یہ کام ایک حکیم و قدیر کی نگرانی میں ہو۔ کسی اتفاقی حادثے کے طور پر اِس طرح کے حکیمانہ کام کا وقوع ممکن نہیں ہے۔'' (تدبرقرآن ۱۰۷/۹)

۲۷۔ اصل میں لفظ 'نَبْتَلِيْهِ' آیا ہے۔ یہ تالیف کے لحاظ سے حال ہے۔ 'ابتلاء' کے معنی لغت میں جانچنے پرکھنے کے ہیں۔ اِس کے لیے چونکہ بالعموم کسی چیز کو مختلف پہلوؤں سے الٹ پلٹ کر دیکھا جاتا ہے، اِس لیے یہیں سے اِس میں مختلف اطوار سے گزارنے کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ انسان کی تخلیق کے یہ اطوار سورۂ حج (۲۲) کی آیت ۵ اور سورۂ مومنون (۲۳) کی آیات ۱۲-۱۴ میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ یہ قطرہ بہت سے مراحل سے گزر کر گوہر ہوا ہے اور ہر مرحلے میں ہم نے اِسے اچھی طرح جانچا ہے کہ جس دور میں جو صلاحیت اِس کے اندر پیدا ہونی چاہیے، اُس کا امتحان ہو جائے اور اُس کے بعد یہ اگلے مرحلے میں داخل ہو۔

وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ﴿۳﴾

اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَاۡ وَ اَغْلٰلًا وَّ سَعِيْرًا ﴿۴﴾ اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ﴿۵﴾ عَيْنًا يَّشْرَبُ

راہ سجھا دی[29]۔ اب وہ چاہے شکر کرے یا کفر کرے[30]۔ ۱-۳

(اِس کا نتیجہ یہ ہے کہ) ہم نے منکروں کے لیے زنجیریں، طوق اور دہکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے[31]۔ اِس کے برخلاف ہمارے وفادار بندے شراب کے جام[32] پییں گے جن میں آبِ کافور کی ملونی ہو گی۔ یہ ایک چشمہ ہے[33] جس کے پاس (بیٹھ کر[34])

۲۸؎ یہ انسان کی تمام اعلیٰ صفات کی نہایت جامع تعبیر ہے۔ یہی انسان کا اصلی امتیاز ہے اور اِسی بنا پر وہ ارادہ و اختیار کی نعمت سے نوازا گیا ہے۔

۲۹؎ یہ انسان کو سمیع و بصیر بنانے کا ثمرہ بیان ہوا ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، انسان اِس کے نتیجے میں اپنے اوپر خیر اور شر کا گواہ بن گیا ہے اور اُس کے پاس بدی کی راہ اختیار کرنے کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہ گیا۔

۳۰؎ یہ انسان کے ارادہ و اختیار کا بیان ہے۔

۳۱؎ یعنی جب ہم نے اِسے خیر و شر کا امتیاز بخشا ہے اور اِس کے ساتھ ارادہ و اختیار کی نعمت بھی عطا فرمائی ہے تو اِس کا نتیجہ یہ ہے اور یہی ہونا چاہیے کہ ایک دن ایسا آئے جس میں وہ اپنے کفر اور سرکشی کی یہ جزا پالے۔

۳۲؎ اصل میں لفظ 'کَاْس' آیا ہے۔ یہ شراب اور جامِ شراب، دونوں کے لیے آتا ہے۔

۳۳؎ یہ قرآن نے خود وضاحت کر دی ہے کہ کافور سے مراد کافور نہیں، بلکہ یہ جنت کے ایک چشمے کا نام ہے۔ لیکن اِس نام میں کیا رعایت ملحوظ ہے؟ یہ امور متشابہات میں سے ہے جس کی حقیقت ہم یہاں نہیں سمجھ سکتے۔

بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا ۝٦ يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا ۝٧ وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝٨ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝٩ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ۝١٠ فَوَقٰىهُمُ

اللہ کے یہ بندے پییں گے اور (جس طرف چاہیں گے)، بہ سہولت اُس کی شاخیں نکال لیں گے[۳۵]۔ یہ اپنی نذریں پوری کرتے[۳۶] اور اُس دن سے ڈرتے رہے جس کا ہول ہر چیز کو گھیر لے گا۔ یہ مسکین اور یتیم اور قیدی[۳۷] کو کھانا کھلاتے رہے، اِس کے باوجود کہ خود اُس کے ضرورت مند تھے۔ یہ اِس جذبے سے کھلاتے تھے کہ ہم تمھیں صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے کھلا رہے ہیں۔ نہ تم سے بدلہ چاہتے ہیں، نہ شکر گزاری کی توقع رکھتے ہیں۔

۳۴؎ اصل الفاظ ہیں: 'یَشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ'۔ اِن میں 'ب' ظرفیت کے لیے ہے۔ لب جو بیٹھ کر پینا مے نوشی کے لوازم میں سے ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ یہ چشمہ خدا کے بندوں کے لیے خاص ہوگا اور وہ اُس کے کنارے بیٹھ کر پییں گے۔

۳۵؎ یعنی اہل جنت کو اِس کے لیے رخت سفر باندھ کر نکلنا نہیں پڑے گا، بلکہ جو جہاں چاہے گا، اُس کی شاخیں نکال لے گا اور استاذ امام کے الفاظ میں اُس کی لذتوں اور اُس کی سیر سے بغیر کسی زحمت سفر کے خوش وقت اور شاد کام ہوگا۔

۳۶؎ یعنی شریعت کے واجبات تو الگ، نیکی اور خیر کے جو کام وہ خود اپنے اوپر واجب کر لیتے ہیں، اُنھیں بھی نہایت اہتمام کے ساتھ پورا کرتے ہیں۔

۳۷؎ یتیم اور مسکین کے ساتھ قیدی کا ذکر یہاں اُس زمانے کے حالات کے لحاظ سے ہوا ہے، جب جیل کا کوئی باقاعدہ نظام موجود نہیں تھا اور قید میں پڑے ہوئے لوگ اپنی ضرورتیں لوگوں سے

فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ﴿۱۱﴾ وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ﴿۱۲﴾ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۚ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا ﴿۱۳﴾ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ﴿۱۴﴾ وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا۠ ﴿۱۵﴾ قَوَارِيْرَا۠ مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا ﴿۱۶﴾

ہم اپنے پروردگار کی طرف سے اُس دن کا اندیشہ رکھتے ہیں جو نہایت روکھا ہے، بڑا ہی ترش رو ہے۔ سو اللہ نے اُنھیں اُس دن کی مصیبت سے بچالیا اور اُنھیں تازگی اور سرور سے لاملایا اور اُن کے صبر کے بدلے میں[۳۸] اُنھیں (رہنے کے لیے) باغ اور (پہننے کے لیے) ریشمی پوشاک عطا فرمائی۔ وہ اُس میں تختوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔ نہ اُس میں دھوپ کی حدت دیکھیں گے، نہ سرما کی شدت۔ اُس کے درختوں کے سایے اُن پر جھکے ہوئے اور اُن کے خوشے بالکل اُن کی دسترس میں ہوں گے۔ اُن کے سامنے چاندی کے برتن، (اُن کے کھانے کے لیے) اور شیشے کے پیالے (اُن کے پینے کے لیے)، گردش میں ہوں گے ــــ شیشے بھی چاندی کے،[۳۹] جنھیں اُن کے خدام نے (ہر خدمت کے لیے) نہایت موزوں اندازوں کے ساتھ سجا دیا

سوال کر کے پوری کرتے تھے۔

۳۸؎ یعنی جس ضبط نفس، حوصلے اور برداشت کے ساتھ اُنھوں نے نیکی اور خیر کے سب کام کیے، اُس کے بدلے میں۔

۳۹؎ یعنی ایسے شیشے جو دیکھنے میں شیشے ہوں گے، مگر درحقیقت چاندی کے جوہر سے بنے ہوں گے۔

الدھر ۷۶

وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيلًا ﴿١٧﴾ عَيْنًا فِيهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيلًا ﴿١٨﴾ وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ ۚ إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُورًا ﴿١٩﴾ وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَّمُلْكًا كَبِيرًا ﴿٢٠﴾ عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّإِسْتَبْرَقٌ

ہے[۴۰]۔۴-۱۶

اور (یہی نہیں)، اُنھیں وہاں ایسی شراب کے جام پلائے جائیں گے جس میں آب زنجبیل کی ملونی ہوگی۔ یہ بھی جنت میں ایک چشمہ ہے جسے سلسبیل کہا جاتا ہے[۴۱]۔ اُن کی خدمت میں وہ لڑکے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے[۴۲]، دوڑتے پھرتے ہوں گے۔ تم اُن کو دیکھو گے تو یہی خیال کرو گے کہ موتی ہیں جو بکھیر دیے گئے ہیں[۴۳] اور دیکھو گے تو جہاں دیکھو گے، وہاں بڑی نعمت اور بڑی بادشاہی دیکھو گے۔ اِس حال میں کہ اُن کی اوپر کی پوشاک

۴۰؎ تاکہ وقت، حالات اور ضرورت کے لحاظ سے وہ اُنھیں پورے اہتمام کے ساتھ خدمت میں پیش کر سکیں۔

۴۱؎ 'زَنْجَبِيْل' کے معنی لغت میں سونٹھ کے ہیں۔ 'سَلْسَبِيْل' کا لفظ رواں دواں کے معنی میں آتا ہے۔ یہ نام کس مناسبت سے اپنے مسمّٰی پر دلالت کرتے ہیں؟ اِس کی حقیقت قیامت ہی میں واضح ہوگی۔ قرآن میں سورتوں کے نام جس طرح رکھے گئے ہیں، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ نام بادنیٰ مناسبت بھی رکھے جاتے ہیں۔

۴۲؎ یعنی نوخیزی کے باعث چست، مستعد اور سرگرم بھی رہیں گے اور اپنے مخدوموں کی خدمت میں برابر رہنے کی وجہ سے اُن کے ذوق و مزاج اور عادات سے اچھی طرح واقف بھی ہوں گے۔

۴۳؎ یہ اِن لڑکوں کے حسن و جمال، نظافت، خوش ادائی اور خوش لباسی کی تصویر ہے۔

وَّحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ﴿٢١﴾ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿٢٢﴾ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا ﴿٢٣﴾ ۚ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ

ہی سبز سندس اور استبرق کے کپڑے ہیں[44]۔ اُن کو چاندی کے کنگن پہنا دیے گئے ہیں[45] اور اُن کے پروردگار نے اُنھیں خود (اپنے حضور میں) شراب طہور پلائی ہے[46]۔ یقیناً تمھارے لیے یہ تمھارے عمل کا صلہ ہے اور (تمھیں مبارک کہ) تمھاری سعی مشکور ہوئی۔ ۱۷-۲۲

(تم اِن کی پروا نہ کرو، اے پیغمبر[47])، تم پر یہ قرآن ہم نے ہی نازل کیا ہے اور نہایت

الدھر ۷۶

۴۴؎ اصل میں 'عٰلِیَهُمْ ثِیَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'عَالِیَ' حال واقع ہوا ہے۔ سندس اور استبرق ایران کے بنے ہوئے کپڑوں کے نام ہیں۔ اہل عرب کو جنت کی نعمتوں کا تصور دلانے کے لیے مصر و ایران کی تمدنی چیزوں کے نام مستعار لیے گئے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ عرب کے لوگ اُس زمانے میں اِنھی سے زیادہ آشنا تھے۔ یہ بھی من جملہ متشابہات ہیں جن کی اصل حقیقت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ جب اوپر کی پوشاک، یعنی عبا اور قبا سندس و استبرق کی ہوگی تو اِس پر قیاس کرو کہ وہ اور کیا کچھ پہنیں گے۔

۴۵؎ قرآن مجید میں دوسری جگہ سونے کے کنگنوں کا ذکر ہے، یعنی بعض موقعوں پر اُنھیں سونے اور بعض موقعوں پر چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے۔

۴۶؎ یہ غالباً اُس مشک بو، مہر بند شراب ناب کی طرف اشارہ ہے جو مقربین کے لیے خاص ہے۔ سورۂ مطففین (۸۳) کی آیات ۲۵-۲۸ میں اِس کا ذکر نہایت اہتمام کے ساتھ ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ چشمۂ زنجبیل اور کافور سے آگے درجہ بدرجہ قرب الٰہی کی منزلیں طے کرتے ہوئے وہ اُس مقام پر پہنچیں گے، جہاں خود اُن کا پروردگار اُنھیں شراب طہور پلائے گا۔

۴۷؎ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات ہے جس میں مخاطبین کے ردعمل پر آپ کو صبر و انتظار

رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ﴿۲۴﴾ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿۲۵﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ﴿۲۶﴾

اہتمام کے ساتھ نازل کیا ہے۔[48] اِس لیے تم اپنے پروردگار کے فیصلے کے انتظار میں ثابت قدم رہو[49] اور اِن میں سے کسی گنہ گار، کسی ناشکرے کی بات کا دھیان نہ کرو[50] (ہم اِن سے نمٹ لیں گے)۔ اور صبح و شام اپنے رب کا نام یاد کرو اور رات میں بھی اُس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤ اور رات کے بڑے حصے میں اُس کی تسبیح کرتے رہو۔[51] ۲۳-۲۶

کی تلقین کی گئی ہے۔

۴۸ اصل میں 'اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا' کے الفاظ ہیں۔ اِن میں بڑا زور اور بڑی عظمت و جلالت ہے۔ مدعا یہ ہے کہ جب ہم نے نازل کیا ہے تو بے فکر ہو جاؤ۔ اِس کے مخالفوں سے ہم ہی نمٹ لیں گے۔ یہ تمھاری نہیں، ہماری ذمہ داری ہے۔

۴۹ اصل الفاظ ہیں: 'فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ'۔ اِن میں 'ل' اِس بات کا قرینہ ہے کہ 'فَاصْبِرْ' یہاں انتظار کے مفہوم پر متضمن ہے۔

۵۰ اصل میں لفظ 'اِطَاعَة' آیا ہے۔ یہ دھیان کرنے اور پروا کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ یہاں اِسی مفہوم میں ہے۔ گنہ گار اور ناشکرے کے لیے اصل میں 'اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اِن میں سے پہلا بندوں کے حقوق تلف کرنے والوں اور دوسرا خدا کے حقوق ادا نہ کرنے والوں کے لیے معروف ہے۔ یہ دونوں صفتیں اگرچہ لازم و ملزوم ہیں، لیکن اشخاص کے رجحانات کے لحاظ سے کوئی ایک بعض اوقات دوسری پر غلبہ پا لیتی ہے۔

۵۱ یہ اُسی نماز تہجد کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اِس سے پہلے سورۂ مزمل میں ہوا ہے۔

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا ﴿٢٧﴾ نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ ۚ وَاِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا ﴿٢٨﴾ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿٢٩﴾ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿٣٠﴾ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿٣١﴾

الدھر
۷۶

(یہ اِس لیے نہیں مان رہے کہ) یہ صرف جلد ملنے والی سے محبت کرتے ہیں اور اپنے آگے ایک بھاری دن کو پس پشت ڈال رہے ہیں۔ (حقیقت یہ ہے کہ) اِنھیں ہم نے ہی پیدا کیا ہے اور اِن کے جوڑ بند مضبوط کیے ہیں اور (یہ بھی حقیقت ہے کہ) ہم جب چاہیں، اِنھیں بالکل ٹھیک اِنھی کی طرح بدل دیں گے۔[۵۲] (یہ نہیں مانتے تو اِنھیں چھوڑو)۔ یہ آیتیں تو ایک یاددہانی ہیں۔ اِس لیے جس کا جی چاہے، اپنے رب کی طرف جانے کی راہ اختیار کر لے۔ اور تم نہیں چاہتے، مگر یہ کہ اللہ ہی (اپنے قانون کے مطابق[۵۳]) چاہے۔ بے شک، اللہ علیم و حکیم ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے، (اِسی علم و حکمت کی بنا پر) اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے۔ اور اِن ظالموں کے لیے تو اُس نے بڑا دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۲۷-۳۱

۵۲؎ مطلب یہ ہے کہ اِن کے جوڑ بند پھر اُسی طرح درست کر دیں گے، جس طرح وہ اِس وقت ہر لحاظ سے درست ہیں۔

۵۳؎ یعنی اپنے اِس قانون کے مطابق کہ ہدایت اُنھیں ملے گی جو اُس کے مستحق ہیں اور

گم راہی میں وہی مبتلا کیے جائیں گے جو اپنے آپ کو اُس کا سزاوار بنا لیتے ہیں۔

کراچی

۱۸/فروری ۲۰۱۰ء

المرسلات - النبا

۷۷ ــــ ۷۸

المرسلات - النبا

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ آفاق کے آثار و شواہد، تاریخ کے حقائق اور انسان کی خلقت میں خدا کی قدرت و حکمت کی نشانیوں سے قیامت کو ثابت کرتی ہے، دوسری میں یہی دعویٰ آفاق میں، خاص طور پر خدا کی ربوبیت کے آثار و شواہد سے ثابت کیا گیا ہے۔ دونوں میں دلائل کے پہلو بہ پہلو زجر و توبیخ اور تہدید و ملامت، ہر آیت سے نمایاں ہے۔

روئے سخن قریش کے سرداروں کی طرف ہے اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ پچھلی سورتوں کی طرح یہ بھی ام القریٰ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ انذار عام میں نازل ہوئی ہیں۔

دونوں سورتوں کا موضوع قیامت کا اثبات اور اُس کے حوالے سے قریش کو انذار ہے۔

سورۃ المرسلات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالۡمُرۡسَلٰتِ عُرۡفًا ۙ﴿۱﴾ فَالۡعٰصِفٰتِ عَصۡفًا ۙ﴿۲﴾ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشۡرًا ۙ﴿۳﴾ فَالۡفٰرِقٰتِ فَرۡقًا ۙ﴿۴﴾ فَالۡمُلۡقِیٰتِ ذِکۡرًا ۙ﴿۵﴾ عُذۡرًا

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ ہوائیں جن کی باگ چھوڑ دی جاتی ہے[۱]، پھر وہ اندھا دھند غبار اڑاتی ہیں، اور یہ ہوائیں جو بادلوں کو اٹھا کر پھیلاتی ہیں[۲]، پھر بانٹ کر الگ الگ معاملہ کرتی ہیں[۳]، پھر

۱۔ اصل الفاظ ہیں: 'وَالۡمُرۡسَلٰتِ عُرۡفًا'۔ 'مُرۡسَلٰت' کے معنی چھوڑی ہوئی کے ہیں۔ یہ لفظ یہاں ہواؤں کے لیے آیا ہے۔ 'عُرۡف' ایال کے اُن بالوں کے لیے آتا ہے جو گھوڑوں کی پیشانی پر لٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔ اِن بالوں کو پکڑ کر گھوڑوں کو روکا بھی جا سکتا ہے اور اِن کو چھوڑ کر اُنھیں جولانی کے لیے چھوڑا بھی جا سکتا ہے۔ قرآن نے یہاں ہواؤں کو گھوڑوں سے اور اُنھیں چھوڑ دینے کو گھوڑوں کی ایال چھوڑ دینے سے تعبیر کر کے غایت درجہ بلاغت کے ساتھ اِس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ ہوائیں خود مختار نہیں ہیں۔ اِن کی پیشانی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جب چاہتا ہے، اِنھیں روک لیتا ہے اور جب چاہتا ہے، چھوڑ دیتا ہے۔

۲۔ اصل میں 'وَالنّٰشِرٰتِ نَشۡرًا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِس سے پچھلی آیت میں 'عٰصِفٰت' کا عطف 'ف' کے ساتھ ہے۔ قرآن نے 'النّٰشِرٰت' کو 'و' کے ساتھ عطف کر کے واضح کر دیا ہے کہ ہواؤں کی پہلی قسم سے یہ دوسری قسم الگ ہے۔ پہلی قسم طوفانی ہواؤں کی ہے جو تند ہو کر بستیوں کے لیے عذاب بن جاتی ہیں۔ یہ دوسری قسم اُن ہواؤں کی ہے جو رحمت کے بادل اپنے

اَوْ نُذْرًا ۝٦ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ۝٧

فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۝٨ وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ۝٩ وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ۝١٠ وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ۝١١ لِاَيِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ ۝١٢ لِيَوْمِ الْفَصْلِ ۝١٣ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۝١٤ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ

دلوں میں یاددہانی ڈالتی ہیں[4]، کسی پر اتمام حجت اور کسی کو انذار کے لیے[5]، یہ گواہی دیتی ہیں[6] کہ جس عذاب کا وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے، وہ آکر رہے گا۔ ۱-۷

اِس لیے جب ستارے مٹا دیے جائیں گے اور آسمان پھٹ جائے گا اور پہاڑ ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے اور رسولوں کے لیے (اُن کے پروردگار کے حضور میں) حاضری کا وقت مقرر ہو گا[7] ـــــ جانتے ہو کہ اُن کو اِس حاضری میں کس دن کے لیے دیر

دوش پر اٹھا کر لاتی ہیں، پھر اُنھیں فضا میں پھیلا دیتی ہیں۔

۳؎ یعنی کسی جگہ بادل ہانک کر لاتی ہیں، کسی جگہ سے اُنھیں اڑا لے جاتی ہیں۔ ایک جگہ برسا دیتی ہیں، دوسری کو پیاسا چھوڑ جاتی ہیں۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ سب معاملات چونکہ 'نشر' کے بعد اور اِس کے ذریعے سے ہوتے ہیں، اِس وجہ سے 'فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا' اور 'فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا' اصل میں 'ف' کے ساتھ عطف ہوئے ہیں۔

۴؎ یعنی الگ الگ معاملہ کر کے انسانوں پر خدا کے اختیار مطلق کی یاددہانی دلوں میں ڈالتی ہیں۔

۵؎ اِس مفہوم کے لیے اصل میں 'عُذْرًا اَوْ نُذْرًا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں حرف 'اَوْ' تقسیم کے لیے ہے، یعنی اتمام حجت اُن کے لیے جو غفلت کی سرمستی میں پڑے رہنا چاہتے ہیں اور انذار اُن کے لیے جو یاددہانی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

۶؎ یعنی اِس طرح خدا کے اختیار مطلق اور اُس کے عذاب و ثواب کی علامت بن کر گواہی دیتی

لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ ﴿۱۵﴾
اَلَمۡ نُهۡلِكِ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ نُتۡبِعُهُمُ الۡاٰخِرِيۡنَ ﴿۱۷﴾ كَذٰلِكَ

ہوئی؟ اِسی فیصلے کے دن کے لیے۔ اور تم کیا سمجھے کہ یہ فیصلے کا دن کیا ہے؟[8] تباہی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔[9] ۸-۱۵

(یہ نہیں جھٹلاتے ہیں تو بتائیں)، کیا ہم نے اگلوں کو ہلاک نہیں کیا؟ پھر اِن کے

ہیں۔

۷ اصل الفاظ ہیں: 'اِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتۡ' 'یہ 'اُقِّتَتۡ' درحقیقت 'وقتت' ہے۔ اِس جملے میں وہی اسلوب ہے جو عربی زبان میں مثال کے طور پر 'أبغني خادمًا' جیسے جملوں میں اختیار کیا جاتا ہے، یعنی 'أبغ لی خادمًا'۔ رسولوں کی جس حاضری کا اِس میں ذکر ہوا ہے، وہ اِس لیے ہوگی کہ اپنی قوموں کے سامنے وہ یہ بتائیں کہ انذار کی جو ذمہ داری اُنھیں سونپی گئی تھی، وہ اُنھوں نے پوری کی یا نہیں، اور پوری کی تو قوموں کی طرف سے اُنھیں کیا جواب ملا؟

۸ 'کس دن کے لیے دیر ہوئی؟'۔۔۔ تم کیا سمجھے کہ یہ فیصلے کا دن کیا ہے؟۔۔۔ یہ اسالیب کلام قرآن میں بالعموم کسی چیز کی ہیبت و عظمت ظاہر کرنے کے لیے آتے ہیں۔

۹ ترجیع کا یہ جملہ 'اِذَا' کا جواب نہیں ہے۔ 'اِذَا' کا جواب اِن آیتوں میں شرط ہی سے واضح ہے، چنانچہ حذف کر دیا ہے۔ اِس جملے کی حیثیت یہاں اپنے ماقبل سے گہرے ربط کے باوجود ایک مستقل جملے کی ہے۔ اِس سورہ کے تقریباً ہر پیرے کے بعد یہ بالکل اِسی طرح آیا ہے، اور اِس کے نتیجے میں اتنے مختلف پہلوؤں کا جامع بن گیا ہے کہ موقع و محل کی مناسبت سے ہر جگہ اپنا ایک خاص مفہوم رکھتا ہے۔

۱۰ فیصلے کے دن پر یہ اب اُن قوموں کی تاریخ سے استدلال ہے، جو رسولوں کو جھٹلانے کے نتیجے میں ہلاک کر دی گئیں اور جن کی سرگذشتیں بڑی تفصیل کے ساتھ قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی

نَفۡعَلُ بِالۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۱۸﴾ وَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ ﴿۱۹﴾
اَلَمۡ نَخۡلُقۡکُّمۡ مِّنۡ مَّآءٍ مَّہِیۡنٍ ﴿ۙ۲۰﴾ فَجَعَلۡنٰہُ فِیۡ قَرَارٍ
مَّکِیۡنٍ ﴿ۙ۲۱﴾ اِلٰی قَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ ﴿ۙ۲۲﴾ فَقَدَرۡنَا ٭ۖ فَنِعۡمَ الۡقٰدِرُوۡنَ ﴿۲۳﴾
وَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ ﴿۲۴﴾

پچھلوں کو کیا ہم اِنھی کے پیچھے نہیں لگاتے رہے[11]؟ ہم مجرموں کے ساتھ یہی کرتے ہیں۔ تباہی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے[12]۔ ۱۶-۱۹

(تم سمجھتے ہو کہ مرنے کے بعد ہم تمھیں اٹھا نہ سکیں گے)؟ کیا ہم نے ایک بے وقعت پانی سے تم کو پیدا نہیں کیا؟ پھر اُس کو ایک مقرر وقت تک ہم نے ایک محفوظ جگہ[13] میں رکھا۔ سو ہم نے اِسی طرح ٹھیرایا تو ہم کیا خوب ٹھیرانے والے ہیں[14]!

ہیں۔

[11] اصل الفاظ ہیں: 'ثُمَّ نُتۡبِعُہُمُ الۡاٰخِرِیۡنَ'۔ اِس جملے میں فعل ناقص حذف ہے، یعنی 'کُنَّا نُتۡبِعُہُمۡ'۔ مطلب یہ ہے کہ ہماری یہ سنت ہمیشہ جاری رہی ہے۔ اِس میں کوئی تبدیلی نہ اِس سے پہلے کبھی ہوئی ہے، نہ اب تمھارے معاملے میں ہوگی۔

[12] یہ بظاہر ایک مختصر سا جملہ ہے، لیکن اِس کے ابہام میں جو ہول ناکی چھپی ہے، وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

[13] اصل میں لفظ 'قَرَار' استعمال ہوا ہے۔ یہ قرار اور جاے قرار، دونوں کے لیے آتا ہے۔ یہاں یہ جاے قرار کے معنی میں ہے، یعنی رحم مادر جسے اللہ تعالیٰ نے خاص اِسی مقصد کے لیے بنایا ہے۔ اِس کی صفت 'مَکِیۡن' آئی ہے، جو اگر جگہ کے لیے آئے تو اِس سے ایسی جگہ مراد ہوتی ہے جو ہر طرح کے خطرات اور اندیشوں سے مامون ہو۔

[14] یعنی کس قدرت اور کس حکمت کے ساتھ ٹھیرانے والے ہیں۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ﴿٢٥﴾ اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا ﴿٢٦﴾ وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ﴿٢٧﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٢٨﴾

(پھر کس طرح جھٹلاتے ہو؟[15]) تباہی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔ ۲۰-۲۴

کیا[16] ہم نے زمین کو زندوں اور مردوں کے لیے اکٹھا کرنے والی نہیں بنایا؟[17] اور اُس میں اونچے پہاڑ نہیں جمائے اور (اُن کے اندر سے چشمے نکال کر) تم کو میٹھا پانی نہیں پلایا؟ (پھر کس طرح جھٹلاتے ہو؟[18]) تباہی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔ ۲۵-۲۸

۱۵؎ یعنی اپنے وجود کے اندر اِن سب چیزوں کا علانیہ مشاہدہ کرنے کے بعد کس طرح جھٹلاتے ہو؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اللہ تعالیٰ نے اپنے عجائب قدرت کی اِن نشانیوں کی طرف توجہ دلا کر فرمایا کہ دیکھ لو، انسان کی پیدایش میں ہم نے اپنے کیا کیا کرشمے دکھائے ہیں اور ہم کتنی اعلیٰ اور برتر قدرت رکھنے والے ہیں! مطلب یہ ہے کہ جب ہماری قدرت کی یہ اعلیٰ شانیں انسان کی خلقت میں ظاہر ہیں تو ہم اُس کو دوبارہ پیدا کرنا چاہیں گے تو اِس سے کیوں عاجز رہ جائیں گے!''

(تدبر قرآن ۹/۱۳۹)

۱۶؎ فیصلے کے دن پر اب یہ زمین میں خدا کی ربوبیت کے شواہد سے استدلال کیا ہے۔

۱۷؎ اصل میں لفظ 'کِفَاتًا' استعمال ہوا ہے۔ اِس کے معنی جمع کر لینے والی کے ہیں۔ اِس معنی کے لحاظ سے اِس میں فاعل کی قوت پیدا ہوگئی ہے، لہٰذا 'اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا' اِسی سے منصوب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زمین صرف زندوں ہی کو اپنی آغوش میں نہیں لیے ہوئے ہے، سب مردے بھی اِسی میں دفن ہیں اور یہ اپنے اندر اُنھیں محفوظ کیے ہوئے ہے۔ چنانچہ اِس کا پروردگار جب اِسے حکم دے گا کہ اپنی امانت نکال کر لائے تو یہ بغیر کسی تردد کے اِس حکم کی تعمیل کرے گی۔

اِنۡطَلِقُوۡۤا اِلٰی مَا کُنۡتُمۡ بِہٖ تُکَذِّبُوۡنَ ﴿۲۹﴾ اِنۡطَلِقُوۡۤا اِلٰی ظِلٍّ ذِیۡ ثَلٰثِ شُعَبٍ ﴿۳۰﴾ لَّا ظَلِیۡلٍ وَّ لَا یُغۡنِیۡ مِنَ اللَّهَبِ ﴿۳۱﴾ اِنَّهَا تَرۡمِیۡ بِشَرَرٍ کَالۡقَصۡرِ ﴿۳۲﴾ کَاَنَّہٗ

اب چلو اُس چیز کی طرف جس کو تم جھٹلاتے رہے۔ چلو اُس سایے کی طرف[19] جس کی تین شاخیں ہیں[20]، (تم کو ہر طرف سے گھیرنے کے لیے)۔ اِس میں نہ چھاؤں ہے، نہ یہ آگ کے شعلوں سے بچاتا ہے[21]۔ وہ محلوں[22] جیسے انگارے پھینکتی ہے[23] ـــــ زرد اونٹوں کی

۱۸؎ یعنی خدا کی قدرت اور اُس کی ربوبیت کے اتنے بدیہی شواہد دیکھنے کے باوجود کس طرح جھٹلاتے ہو؟

۱۹؎ یعنی دھوئیں کے سایے کی طرف۔ سورۂ واقعہ (۵۶) کی آیات ۴۳-۴۴ میں اِس کا ذکر 'ظِلٍّ مِّنۡ یَّحۡمُوۡمٍ، لَّا بَارِدٍ وَّلَا کَرِیۡمٍ' کے الفاظ میں ہوا ہے۔

۲۰؎ مطلب یہ ہے کہ جب فرشتے اُنھیں دھکیلیں گے تو آگے تینوں سمتوں میں ـــــ دائیں، بائیں اور سامنے ـــــ اُن کے لیے دھواں ہی دھواں ہوگا۔ سایے کی تین شاخوں سے یہی تینوں سمتیں مراد ہیں جن میں دوزخ کی آگ کا دھواں پھیلا ہوا ہوگا۔ صرف ایک چوتھی سمت اُس سے محفوظ ہوگی جس سے فرشتے، جیسا کہ لفظ 'اِنۡطَلِقُوۡۤا' سے واضح ہے، اُنھیں آگ کی طرف دھکیل رہے ہوں گے۔

۲۱؎ یہ برسرِ موقع اُس مغالطے کو دور کر دیا ہے جو سایے کے لفظ سے پیدا ہو سکتا ہے۔

۲۲؎ اصل الفاظ ہیں: 'اِنَّهَا تَرۡمِیۡ بِشَرَرٍ'۔ 'اِنَّهَا' میں ضمیر کا مرجع آگ ہے جو دھوئیں کے ذکر سے مفہوم ہوتی ہے۔

۲۳؎ یہ تشبیہ شعلوں کی وسعت، بلندی اور رنگ کے لحاظ سے دی گئی ہے۔ محلوں کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ بالعموم بلند جگہوں پر بنائے جاتے ہیں۔ دور سے دیکھیے تو چمکتے ہوئے نظر آتے

جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ﴿۳۳﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۴﴾
هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴿۳۶﴾
وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۷﴾
هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۚ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾ فَاِنْ كَانَ
لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ ﴿۳۹﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۰﴾

المرسلات ۷۷

طرح[۲۴] ـــــ (یہ سب تم دیکھو گے)۔ تباہی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔ ۲۹-۳۴

یہ وہ دن ہے جس میں وہ کچھ بول نہ سکیں گے اور نہ اُنھیں اجازت ہوگی کہ (خدا کے سامنے آئیں تو) کوئی عذر پیش کر رہے ہوں[۲۵]۔ تباہی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔ ۳۵-۳۷

یہ فیصلے کا دن ہے۔ ہم نے تم کو اور تم سے پہلے گزرے ہوئے سب لوگوں کو جمع کر دیا ہے۔ اب اگر کوئی چال تم چل سکتے ہو تو میرے مقابلے میں چل دیکھو[۲۶]۔ تباہی ہے

ہیں اور اوپر کا رنگ نیچے سے بالکل مختلف معلوم ہوتا ہے۔ آگ کے بڑے بڑے شعلے بھی دور سے اِسی طرح اٹھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

۲۴۔ اصل میں 'کَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں ضمیر کا مرجع 'شَرَر' ہے اور اِس میں لفظ کی رعایت کی گئی ہے۔ یہ مذکر، مونث، واحد، جمع، سب کے لیے یکساں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں یہ جمع کے مفہوم میں ہے۔ چنانچہ اِس کی تشبیہ 'جِمَالَةٌ صُفْرٌ' (زرد اونٹوں کی جماعت) سے دی گئی ہے۔ زرد کی قید اِس لیے ہے کہ دھوئیں کی آڑ سے اٹھتے ہوئے شعلے اِسی رنگ سے مشابہ ہوتے ہیں اور دور سے دیکھیے تو بالکل ملگجے زرد اونٹوں کی طرح نظر آتے ہیں۔

۲۵۔ روز قیامت کی ہول ناکی کی تصویر کے بعد یہ مجرموں کی بے بسی اور درماندگی کی تصویر

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۴۱﴾ وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۴۲﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۵﴾

اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔ ۳۸-۴۰

خدا سے ڈرنے والے آج سایوں اور چشموں اور اپنی چاہت کے میووں میں گھرے ہوئے ہیں ـــــ کھاؤ اور پیو مزے سے[۲۷] اپنے اُس عمل کے صلے میں جو تم کرتے رہے۔ ہم اُن لوگوں کو اِسی طرح جزا دیتے ہیں جو خوبی سے عمل کریں[۲۸]۔ تباہی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔ ۴۱-۴۵

ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُن کی زبانیں گنگ ہو جائیں گی۔ کسی کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکے گی۔

۲۶؎ رسولوں کے مقابلے میں اُن کے منکرین نے جو کوششیں کیں، اُنھیں یہاں 'کَیْد' سے تعبیر فرمایا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... اِس کی وجہ... یہ ہے کہ اِس راہ میں اُن کی ساری بھاگ دوڑ محض اپنی سیادت کو بچانے کے لیے تھی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات حق ہے، لیکن اپنی نفس پرستی اور انانیت کے سبب سے اُس کے قبول کرنے پر وہ تیار نہیں ہوئے، بلکہ طرح طرح کے شبہات و اعتراضات ایجاد کر کے اپنے عوام کو اُنھوں نے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ جو کر رہے ہیں، دلیل کے ساتھ کر رہے ہیں اور اُن کا مقصود اپنے آبائی دین کا تحفظ ہے۔ حالاں کہ یہ محض اُن کی چال تھی۔" (تدبر قرآن ۹/ ۱۴۴)

۲۷؎ اصل میں لفظ 'هَنِيْٓـًٔا' آیا ہے۔ یہ مفعول سے حال واقع ہوا ہے جو پچھلے دونوں افعال سے مفہوم ہو رہا ہے۔

۲۸؎ سورہ کی ابتدا میں فرمایا تھا کہ ہم مجرموں کے ساتھ یہی کرتے ہیں۔ اُس کے مقابل میں

کُلُوۡا وَ تَمَتَّعُوۡا قَلِیۡلًا اِنَّکُمۡ مُّجۡرِمُوۡنَ ﴿۴۶﴾ وَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ ﴿۴۷﴾
وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمُ ارۡکَعُوۡا لَا یَرۡکَعُوۡنَ ﴿۴۸﴾ وَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ ﴿۴۹﴾
فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَہٗ یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۵۰﴾

سورۃ النبا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
عَمَّ یَتَسَآءَلُوۡنَ ۚ﴿۱﴾ عَنِ النَّبَاِ الۡعَظِیۡمِ ۙ﴿۲﴾ الَّذِیۡ ہُمۡ

تم بھی کچھ دن کھابرت لو۔ حقیقت یہ ہے کہ تم لوگ مجرم ہو۔ تباہی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔ ۴۶-۴۷

(یہ ہر نعمت دنیا میں پاتے ہیں) اور جب اِن سے کہا جاتا ہے کہ (اپنے پروردگار کے حضور میں) جھک جاؤ تو نہیں جھکتے۔ تباہی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔ ۴۸-۴۹

(یہ مجرم، اِنھوں نے قرآن کو جھٹلا دیا ہے)، اب اِس کے بعد وہ کیا بات ہے جسے یہ مانیں گے؟ ۵۰

—— ۲ ——

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ لوگ کس چیز کے بارے میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں؟[۲۹] کیا اُس بڑی

اب فرمایا ہے کہ جو اچھا عمل کریں، اُنھیں ہم صلہ دیتے ہیں اور اس طرح صلہ دیتے ہیں۔

فِيهِ مُخۡتَلِفُونَ ۝٣ كَلَّا سَيَعۡلَمُونَ ۝٤ ثُمَّ كَلَّا سَيَعۡلَمُونَ ۝٥
اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ مِهٰدًا ۝٦ وَّالۡجِبَالَ اَوۡتَادًا ۝٧ وَّخَلَقۡنٰكُمۡ

خبر کے بارے میں[30] جس کے متعلق اِن میں سے ہر ایک اپنی سی کہہ رہا ہے۔[31] (اِن کی یہ باتیں کچھ نہیں)، ہرگز نہیں۔ یہ عنقریب جان لیں گے۔ ہم پھر کہتے ہیں کہ ہرگز نہیں، یہ عنقریب جان لیں گے۔[32] ۱-۵

(یہ[33] دیکھیں تو سہی)، کیا زمین کو ہم نے گہوارہ اور پہاڑوں کو (اُس کی) میخیں نہیں

الفبا
۷۸

۲۹۔ اصل میں لفظ 'تَسَاءُل' آیا ہے۔ اِس کے معنی آپس میں کسی چیز کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے کے ہیں۔ یہ بعض اوقات محض سخن گستری اور استہزا کے لیے بھی ہوتی ہے۔ یہاں یہ اِسی مفہوم میں ہے، یعنی کس چیز کا مذاق اڑا رہے ہیں اور اُس کے بارے میں چندرا چندرا کر پوچھ رہے ہیں؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

''اِس سوال سے اِس سورہ کا آغاز اِس کے مزاج کا پتا دے رہا ہے کہ اِس میں اُن کو بتایا جائے گا کہ جس چیز کا وہ مذاق اڑا رہے ہیں، وہ مذاق اڑانے اور ہنسی دل لگی کی چیز نہیں، بلکہ وہ سوچیں تو اُن کے لیے سر پیٹنے اور خون کے آنسو بہانے کی چیز ہے۔'' (تدبر قرآن ۹/۱۵۷)

۳۰۔ یہاں اگرچہ اصل میں حرف استفہام نہیں ہے، لیکن معنوی لحاظ سے یہ اُسی استفہام کے تحت ہے جو اِس سے پہلے آیا ہے۔

۳۱۔ مطلب یہ ہے کہ اُسے جھٹلانے کے لیے اِن میں سے کوئی کچھ کہہ رہا ہے اور کوئی کچھ۔ یہ اُس کے بارے میں سخت تناقض فکر میں مبتلا ہیں۔

۳۲۔ یعنی یہاں بھی جان لیں گے، جب اتمام حجت کے بعد ہمارا فیصلہ صادر ہو جائے گا اور وہاں بھی، جہاں پکڑ بلائے جائیں گے۔

۳۳۔ یہاں سے آگے آفاق میں ربوبیت کے اُن آثار کی طرف توجہ دلائی ہے جو ایک

اَزۡوَاجًا ﴿۸﴾ وَّجَعَلۡنَا نَوۡمَكُمۡ سُبَاتًا ﴿۹﴾ وَّجَعَلۡنَا الَّيۡلَ لِبَاسًا ﴿۱۰﴾ وَّجَعَلۡنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ﴿۱۱﴾ وَّ بَنَيۡنَا فَوۡقَكُمۡ سَبۡعًا شِدَادًا ﴿۱۲﴾ وَّجَعَلۡنَا

بنایا؟[۳۴] اور تم کو جوڑوں کی صورت میں پیدا نہیں کیا؟[۳۵] اور تمھاری نیند کو تمھارے لیے باعث راحت نہیں بنایا؟[۳۶] اور رات کو لباس[۳۷] اور دن کو وقت معاش نہیں بنایا؟ اور تمھارے

روز جزا کے لازمی ہونے پر ایسی واضح حجت ہیں کہ کوئی سلیم الفطرت انسان اُن کا انکار نہیں کر سکتا اور اپنے آپ کو ہر حال میں اِس اعتراف پر مجبور پاتا ہے کہ یقیناً فیصلے کا دن ایک مقرر وقت ہے۔

استاذ امام لکھتے ہیں:

”...انسان اگر غور کرے تو یہ سمجھنے سے وہ قاصر نہیں رہے گا کہ جو رب اِس زمین کے گھوارے میں اِس اہتمام کے ساتھ اُس کی پرورش کر رہا ہے، کس طرح ممکن ہے کہ وہ ایک ایسا دن نہ لائے جس میں اُن لوگوں کو انعام دے جنھوں نے اُس کی ربوبیت کا حق پہچانا اور اُس کو ادا کیا ہو اور اُن لوگوں کو سزا دے جنھوں نے اُس کی ناشکری اور نافرمانی کی ہو؟ ربوبیت کے ساتھ مسئولیت لازمی ہے۔ ایسا نہ ہو تو اِس کے معنی یہ ہوئے کہ اِس کائنات کے خالق کے نزدیک شکر گزار اور نابکار، دونوں برابر ہیں۔ یہ ایسی بھونڈی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ سے متعلق اِس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔“ (تدبر قرآن ۱۵۹/۹)

۳۴؎ اِس لیے کہ تمھارے سمیت وہ کسی طرف لڑھک نہ جائے۔

۳۵؎ تاکہ تم ایک دوسرے سے طمانیت اور سکینت حاصل کرو۔ یہاں سے اسلوب کلام اگرچہ الفاظ کے اعتبار سے خبریہ ہو گیا ہے، لیکن معنوی لحاظ سے یہ 'اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ مِهٰدًا' ہی پر عطف ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۳۶؎ آیت میں لفظ 'سُبَاتًا' استعمال ہوا ہے۔ اِس کے اصل معنی کاٹنے کے ہیں۔ نیند کو 'سُبَات' اِس وجہ سے کہا ہے کہ یہ عمل کو منقطع کرتی ہے اور اِس طرح انسان کو راحت اور سکون حاصل کرنے

النبا
۷۸

سِرَاجًا وَّهَّاجًا ﴿۱۳﴾ وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ﴿۱۴﴾
لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ﴿۱۵﴾ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ﴿۱۶﴾ اِنَّ
يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا ﴿۱۷﴾
يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ﴿۱۸﴾ وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ
فَكَانَتْ اَبْوَابًا ﴿۱۹﴾ وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ﴿۲۰﴾ اِنَّ
جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ﴿۲۱﴾ لِّلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا ﴿۲۲﴾ لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ

النبا ۷۸

اوپر سات محکم آسمان نہیں بنائے؟ اور اِن میں ایک دہکتا چراغ نہیں بنایا[۳۸]؟ اور نچڑتی بدلیوں سے چھاجوں مینہ نہیں برسایا کہ اُس سے اناج اور سبزہ اور گھنے باغ اگائیں؟ یہ سب منادی کر رہا ہے کہ یقیناً فیصلے کا دن ایک مقرر وقت ہے[۳۹]۔ ۶-۱۷

جس دن صور پھونکا جائے گا تو تم فوج در فوج چلے آؤ گے۔ اور آسمان کھول دیا جائے گا تو اُس میں دروازے ہی دروازے ہو جائیں گے۔ اور پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ سراب بن کر رہ جائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہنم گھات میں ہے، سرکشوں کا

کا موقع بہم پہنچاتی ہے۔

۳۷ یعنی ایک ایسی چیز جو انسان کو لباس کی طرح ہر چیز سے محفوظ کر کے اپنے اندر چھپا لیتی ہے۔

۳۸ یعنی سورج۔

۳۹ یعنی اِس بات کی منادی کر رہا ہے کہ جس پروردگار نے انسان کے لیے ربوبیت کا یہ اہتمام کیا ہے، وہ اُسے غیر مسئول نہ چھوڑے گا اور لازماً ایک ایسا دن لائے گا جس میں ہر ایک اپنے عمل کے مطابق جزا یا سزا پا لے گا۔

اَحْقَابًا ﴿۲۳﴾ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ﴿۲۴﴾ اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ﴿۲۵﴾ جَزَآءً وِّفَاقًا ﴿۲۶﴾ اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ﴿۲۷﴾ وَّكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ﴿۲۸﴾ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا ﴿۲۹﴾ فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ﴿۳۰﴾

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ﴿۳۱﴾ حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا ﴿۳۲﴾ وَّكَوَاعِبَ

ٹھکانا۔ اِس میں وہ مدتوں پڑے رہیں گے[۴۰]۔ نہ اِس میں ٹھنڈک کا مزہ چکھیں گے، نہ پینے کی کسی چیز کا، گرم پانی اور بہتی پیپ کے سوا۔ اُن کے عمل کے مطابق اُن کا بدلہ۔ وہ کسی حساب کی توقع نہ رکھتے تھے اور ہماری آیتوں کو اُنھوں نے بے دریغ جھٹلا دیا تھا[۴۱] اور اِدھر (اُن کی) ہر چیز ہم نے لکھ کر گن رکھی تھی۔ اِس لیے اب چکھو کہ ہم تمھارے لیے عذاب ہی بڑھائیں گے[۴۲]۔ ۱۸-۳۰

خدا سے ڈرنے والوں کے لیے، البتہ اُس دن بڑی فیروزمندی ہے۔ (رہنے

۴۰؎ اصل میں لفظ 'اَحْقَاب' استعمال ہوا ہے۔ اِس کے معنی قرنوں کے ہیں۔ قرآن میں اِس کی وضاحت 'خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا' کے الفاظ میں کی گئی ہے۔ زبان کا قاعدہ ہے کہ مجمل کو مفصل کی روشنی میں سمجھتے ہیں۔ یہاں بھی ضروری ہے کہ اِسے 'خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا' کی روشنی میں سمجھا جائے۔ پھر یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ آیت میں یہ سرکشوں کا انجام بیان ہوا ہے اور اُن کے بارے میں قرآن میں تصریح ہے کہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے، اُنھیں وہاں سے نکلنا نصیب نہ ہوگا۔

۴۱؎ اصل میں لفظ 'كِذَّابًا' آیا ہے۔ یہ تکذیب کے معنی میں مصدر ہے اور یہاں تاکید فعل کے لیے استعمال ہوا ہے۔

۴۲؎ یہ مستقبل کے ماجرے کو زیادہ موثر بنانے کے لیے حاضر کے اسلوب میں بدل دیا ہے۔

اَتۡرَابًا ﴿۳۳﴾ وَّ کَاۡسًا دِہَاقًا ﴿۳۴﴾ لَا یَسۡمَعُوۡنَ فِیۡہَا لَغۡوًا وَّ لَا کِذّٰبًا ﴿۳۵﴾ جَزَآءً مِّنۡ رَّبِّکَ عَطَآءً حِسَابًا ﴿۳۶﴾

رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا بَیۡنَہُمَا الرَّحۡمٰنِ لَا یَمۡلِکُوۡنَ مِنۡہُ خِطَابًا ﴿۳۷﴾ یَوۡمَ یَقُوۡمُ الرُّوۡحُ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ صَفًّا ۖؕۚ لَّا یَتَکَلَّمُوۡنَ اِلَّا مَنۡ اَذِنَ لَہُ الرَّحۡمٰنُ وَ قَالَ صَوَابًا ﴿۳۸﴾ ذٰلِکَ الۡیَوۡمُ الۡحَقُّ

کے لیے) باغ اور (کھانے کے لیے) انگور اور (دل بہلانے کے لیے) اٹھتی جوانیوں والی ہم سنیں[۴۳] اور (اُن کی صحبت میں پینے کے لیے) چھلکتے جام۔ وہاں وہ کوئی بے ہودہ بات اور کوئی بہتان نہ سنیں گے۔ یہ تیرے پروردگار کی طرف سے بدلہ ہوگا، اُس کی عنایت بالکل اُن کے عمل کے حساب سے۔ ۳۱-۳۶

زمین اور آسمانوں اور اُن کے درمیان کی ہر چیز کے پروردگار، خداے رحمٰن کی طرف سے۔ کسی کو یارا نہیں کہ اُس کی طرف سے کوئی بات کرے۔ اُس دن، جب فرشتے اور جبریل امین، سب اُس کے حضور میں صف بستہ کھڑے ہوں گے۔ اُس دن، جب وہی بولیں گے جنھیں رحمٰن اجازت دے اور وہ صحیح بات کہیں[۴۴]۔ یہ دن شدنی ہے، اِس لیے اب

۴۳؎ ہم سنی کا ذکر اِس لیے ہوا ہے کہ استاذ امام کے الفاظ میں یہ آپس کی بے تکلفی، دل چسپی اور ہم طرحی و ہم مذاقی کے لیے ایک ضروری چیز ہے۔

۴۴؎ یہ اُن لوگوں کو توجہ دلائی ہے جو اِس خبط میں مبتلا تھے کہ اُن کے دیوی دیوتا جو چاہیں گے، ناز و تدلل سے منوالیں گے۔ اہل عرب، بالخصوص فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھ کر پوجتے اور اُن کے بارے میں یہی اعتقاد رکھتے تھے۔ فرمایا ہے کہ یہ محض طمع خام ہے۔ وہاں کسی کے لیے کوئی بات کہنے کا یارا نہ ہوگا، الّا یہ کہ خداے رحمٰن ہی اجازت دے۔

فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّہٖ مَاٰبًا ﴿۳۹﴾ اِنَّآ اَنْذَرْنٰکُمْ عَذَابًا قَرِیْبًا ۚ ۵ۙ

یَّوْمَ یَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ یَدٰہُ وَیَقُوْلُ الْکٰفِرُ یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرٰبًا ﴿۴۰﴾

جو چاہے، اپنے پروردگار کی طرف ٹھکانا بنا لے[۴۵]۔ ہم نے تمھیں اُس عذاب سے آگاہ کر دیا ہے جو قریب آ لگا ہے، اُس دن، جب آدمی وہ سب کچھ دیکھ لے گا جو اُس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا اور منکر پکارے گا کہ اے کاش، میں مٹی ہوتا! ۳۷-۴۰

۴۵؎ یعنی جو اپنی خیر چاہتا ہے، اُس کے لیے صحیح راستہ یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کے پاس ٹھکانا بنانے کی کوشش کرے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...(اِس) سے ایک بات تو یہ نکلی کہ اِس معاملے میں اللہ اور رسول کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ لوگوں کو اِس دن سے آگاہ کر دیا جائے۔ یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اِس کا خوف اتار بھی دیا جائے۔

دوسری بات یہ نکلی کہ اِس دن پناہ صرف اللہ تعالیٰ ہی بنے گا، کسی اور کی پناہ اِس دن کسی کو حاصل ہونے والی نہیں ہے۔

تیسری بات یہ نکلی کہ اللہ کو پناہ بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ اِس دنیا میں اُس کی بتائی ہوئی راہ اختیار کی جائے۔ جس نے یہاں اُس کی راہ نہیں اختیار کی، وہ آخرت میں اُس کی پناہ نہیں حاصل کر سکے گا۔" (تدبر قرآن ۹/۱۶۶)

کراچی

۲۰ رفروری ۲۰۱۰ء

النبا
۷۸

النّٰزعٰت - عبس

٧٩ ـــــ ٨٠

النّٰزِعٰت - عبس

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ میں قریش کی قیادت کو اُس کے جس رویے پر تنبیہ ہے، دوسری میں اُسی پر ایک خاص واقعے کے پس منظر میں اِس شدت سے عتاب ہے کہ سورہ کی ہر آیت سے گویا ابلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

دوسری سورہ میں خطاب اگرچہ بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہوا ہے، لیکن روے سخن، اگر غور کیجیے تو دونوں سورتوں میں فراعنۂ قریش کی طرف ہے اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ پچھلی سورتوں کی طرح یہ بھی ام القریٰ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ انذار عام میں نازل ہوئی ہیں۔

پہلی سورہ میں استدلال آفاق کے آثار و شواہد اور تاریخ کے حقائق سے ہے۔

دوسری سورہ میں آفاقی دلائل کے ساتھ انسان کی خلقت میں خدا کی قدرت و حکمت کی نشانیوں کو بھی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

دونوں سورتوں کا موضوع قیامت کا اثبات، اُس کے حوالے سے قریش کو انذار اور اُس کے بارے میں اُن کے رویے پر اُنھیں تنبیہ ہے۔

دوسری سورہ میں یہ تنبیہ، البتہ نہایت سخت عتاب کی صورت اختیار کر گئی ہے۔

سورۃ النّٰزعٰت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالنّٰزِعٰتِ غَرۡقًا ۙ﴿۱﴾ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشۡطًا ۙ﴿۲﴾ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبۡحًا ۙ﴿۳﴾

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

ہوائیں گواہی دیتی ہیں جڑ سے اکھاڑنے والی[۱] اور وہ بھی جو بہت نرمی سے چلتی ہیں[۲]۔

۱ اصل میں لفظ 'نٰزِعٰت' آیا ہے۔ سورۂ قمر (۵۴) کی آیت ۲۰ میں فرمایا ہے: 'تَنۡزِعُ النَّاسَ کَاَنَّهُمۡ اَعۡجَازُ نَخۡلٍ مُّنۡقَعِرٍ'۔ یہ اِسی فعل 'تَنۡزِعُ' سے اسم صفت ہے۔ 'غَرۡقًا' کا نصب مصدر کی وجہ سے ہے، اِس لیے کہ معنی کے لحاظ سے یہ اور 'نَزۡعًا' کم و بیش مترادف ہیں۔

۲ اصل میں 'نٰشِطٰت' ہے۔ یہ 'نشط' سے ہے جس کے معنی کسی کام کو نرمی کے ساتھ کرنے کے بھی آتے ہیں۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ یہ نرم رو اور آہستہ خرام ہواؤں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ سورۂ ذاریات (۵۱) کی آیت ۳ میں اِسی مضمون کے لیے 'فَالۡجٰرِیٰتِ یُسۡرًا' کے الفاظ آئے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''یہ امر واضح رہے کہ تند اور نرم رو ہواؤں کے عمل کی ظاہری نوعیت اگرچہ الگ تھلگ ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے عجائبات تصرف کی شانیں دونوں کے اندر نمایاں ہیں۔ سورۂ ذاریات میں سیاق کلام اور ہے، اِس وجہ سے ہوا کی نرم روی کا ذکر بارش کے مقدمے کے طور پر آیا ہے۔ یہاں اِس کا ذکر مستقلاً ہوا ہے، اِس وجہ سے یہ رحمت اور نقمت، دونوں کو محتمل ہے۔ رحمت کے لیے اِس کا محتمل ہونا تو بالکل واضح ہے کہ ہوا کی مروحہ جنبانی ہی زندگی اور راحت و نشاط کا ذریعہ ہے، لیکن اِس کا رحمت یا نقمت بننا کلیتاً اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے۔ وہ چاہتا ہے تو بعض اوقات اِس کی نرم روی کو بھی عذاب بنا دیتا ہے۔ چنانچہ آگے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی سرگذشت

فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۙ﴿۴﴾ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ﴿۵﴾

اور (فضاؤں میں) تیرتے دوڑتے،[3] پھر اِس دوڑ میں ایک دوسرے سے بڑھتے، پھر حکم کی تدبیر کرتے ہوئے بادل[4] گواہی دیتے ہیں[5] کہ جس چیز کا وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے، وہ ہو کر رہے گی۔[6] ۱-۵

بیان ہوئی ہے جس سے اِس حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے تند پوربی ہوا کے تصرف سے نجات دی اور اِسی ہوا کے سکون کو فرعون اور اُس کی فوجوں کی تباہی کا ذریعہ بنا دیا۔'' (تدبر قرآن ۱۷۶/۹)

۳؎ اصل میں لفظ 'سٰبِحٰت' استعمال ہوا ہے۔ یہ 'سبح' سے ہے جس کے معنی تیرنے کے بھی آتے ہیں۔ ہواؤں کے ساتھ اِس کا ذکر اشارہ کر رہا ہے کہ یہ بادلوں کی صفت کے طور پر آیا ہے۔ اِس کی جو دو صفتیں اِس کے بعد مذکور ہوئی ہیں، وہ 'ف' کے ساتھ آئی ہیں۔ یہ واضح قرینہ ہے کہ یہ دونوں صفتیں اِسی کی ہیں اور اِن میں باہم دگر ترتیب بھی ہے۔

۴؎ یہ وہی بات ہے جو سورۂ ذاریات (۵۱) کی آیات ۳-۴ میں 'فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا، فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا' کے الفاظ میں اور سورۂ مرسلات (۷۷) کی آیات ۴-۵ میں 'فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا، فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا' کے لفظوں میں فرمائی ہے۔ 'فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا' کے معنی بالکل وہی ہیں جو 'فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا' کے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''اِس سے پہلے 'فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا' کے الفاظ بادلوں کی اُس بھاگ دوڑ کی تصویر پیش کر رہے ہیں جو فضا میں اُس وقت نمایاں ہوتی ہے، جب اُن کے مختلف دستے ایک دوسرے پر سبقت کرتے دیکھے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سب اپنے غیبی حاکم کے حکم کی تعمیل میں سرگرم تگاپو ہیں اور ہر ایک اِس بات کا آرزومند ہے کہ امتثال امر میں اول نمبر اُسی کا رہے۔''

(تدبر قرآن ۱۷۷/۹)

۵؎ یعنی تاریخ میں اپنی اُن سرگذشتوں سے گواہی دیتے ہیں، جب یہ قوموں کے لیے کبھی

يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ﴿٦﴾ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ﴿٧﴾ قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ ﴿٨﴾ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ﴿٩﴾
يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ ﴿١٠﴾ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ﴿١١﴾ قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ﴿١٢﴾

اُس دن، جب تھرتھری چھوٹے گی، ایک کے پیچھے دوسری[7]، اُس دن کتنے دل (خوف سے) دھڑکتے ہوں گے۔ اُن کی نگاہیں جھکی ہوں گی[8]۔ ۶-۹

پوچھتے ہیں: کیا (مرنے کے بعد) ہم ضرور اِسی طرح پلٹا کر واپس لائے جائیں گے[9]؟ کیا اُس وقت، جب ہم کھنکھناتی ہڈیاں ہوں گے[10]؟ کہنے لگے کہ یہ لوٹنا تو پھر بڑے نقصان کا لوٹنا ہوا[11]! ۱۰-۱۲

عذاب اور کبھی رحمت بن کر برستے رہے۔

۶؎ ہواؤں اور بادلوں کی گواہی یہاں قسم کے اسلوب میں بیان ہوئی ہے۔ یہ اِن قسموں کا مقسم علیہ ہے جو اصل میں بربنائے وضاحت قرینہ حذف ہو گیا ہے۔

۷؎ یہ اُن دو جھٹکوں کی طرف اشارہ ہے جو سورۂ زمر (۳۹)، آیت ۶۸ کے مطابق پہلے اور دوسرے صور کے پھونکنے سے پڑیں گے۔

۸؎ نگاہوں کی اضافت یہاں دل کی طرف کی گئی ہے۔ اِس سے یہ اشارہ مقصود ہے کہ آدمی کی شخصیت اصلاً دل ہی سے عبارت ہے۔ نگاہوں میں جو کچھ جھلکتا ہے، وہ درحقیقت دل کی کیفیتیں ہوتی ہیں جن کے مخفی سے مخفی پہلو بھی، اگر ہم چاہیں تو نگاہوں کے آئینے میں دیکھ سکتے ہیں۔

۹؎ اصل الفاظ ہیں: 'ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ'۔ 'حافرة' کے معنی نقش قدم کے ہیں۔ اِس سے 'رد فی الحافرة' اور 'رد علی الحافرة' عربی زبان کے محاورے ہیں جو الٹے پاؤں واپس لانے کے معنی میں مستعمل ہیں۔

فَاِنَّمَا هِیَ زَجۡرَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾ فَاِذَا هُمۡ بِالسَّاهِرَةِ ﴿۱۴﴾
هَلۡ اَتٰىكَ حَدِيۡثُ مُوۡسٰی ﴿۱۵﴾ اِذۡ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالۡوَادِ الۡمُقَدَّسِ
طُوًى ﴿۱۶﴾ اِذۡهَبۡ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۱۷﴾ فَقُلۡ هَلۡ لَّكَ اِلٰۤى
اَنۡ تَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ وَاَهۡدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخۡشٰى ﴿۱۹﴾ فَاَرٰىهُ الۡاٰيَةَ الۡكُبۡرٰى ﴿۲۰﴾

سو (یہ مذاق اڑاتے ہیں تو سن لیں کہ) یہ بس ایک ہی ڈانٹ ہوگی، پھر دفعتاً یہ میدان میں سامنے ہوں گے۔ ۱۳-۱۴

(اچھا[12] سنو)، کیا موسیٰ کی سرگذشت تمھیں پہنچی ہے؟ جب اُس کے پروردگار نے طویٰ کی مقدس وادی میں اُسے پکارا[13] کہ فرعون کے پاس جاؤ، اُس نے بہت سر اٹھا لیا ہے[14] اور اُس سے کہو کہ کیا تم میں کچھ جذبہ ہے کہ پاکیزگی کی طرف آجاؤ[15] اور میں تم

۱۰؎ یہ تعجب پر تعجب کا مفہوم ہے جو استفہام کے بعد استفہام کے اعادہ سے ادا کیا گیا ہے۔

۱۱؎ یعنی بظاہر کچھ سنجیدہ اسلوب میں کہنے لگے کہ یہ لوٹنا تو بڑے نقصان کی بات ہے۔ یہ جملہ اگرچہ مذاق کے طور پر کہا گیا ہے، لیکن اُن کے باطن کی غمازی بھی کر رہا ہے کہ قیامت کے جھٹلانے پر اُن کا اپنا دل بھی مطمئن نہیں ہے۔ اُس کے دلائل کا وزن وہ محسوس کرتے اور اُسے نہ ماننے کے نتائج سے ڈرتے ہیں، لیکن معاملہ وہی ہے کہ —— پر طبیعت اِدھر نہیں آتی۔

۱۲؎ یہاں سے آگے قصۂ فرعون وکلیم سے استدلال ہے۔ فراعنۂ قریش کو اِس کے پردے میں قیامت کے نہ ماننے پر تنبیہ وتہدید کی گئی ہے۔

۱۳؎ یہ اُس واقعے کی طرف اشارہ ہے جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو اُس وقت پیش آیا، جب مدین سے واپس آتے ہوئے وہ طور کے دامن میں آگ کی چمک دیکھ کر وہاں سے آگ لینے یا راستہ معلوم کرنے کے لیے گئے۔

۱۴؎ یہ فرعون کے دعویٰ ربوبیت اور بنی اسرائیل کے ساتھ اُس کے ظالمانہ رویے کی طرف

فَكَذَّبَ وَعَصٰى ﴿٢١﴾ ثُمَّ اَدۡبَرَ يَسۡعٰى ﴿٢٢﴾ فَحَشَرَ فَنَادٰى ﴿٢٣﴾ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الۡاَعۡلٰى ﴿٢٤﴾ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الۡاٰخِرَةِ وَالۡاُوۡلٰى ﴿٢٥﴾ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَعِبۡرَةً لِّمَنۡ يَّخۡشٰى ﴿٢٦﴾

کو تمھارے پروردگار کی راہ دکھاؤں کہ تم اُس سے ڈرو؟[16] پھر اُس نے (فرعون کے پاس جا کر) اُسے بڑی نشانی دکھائی،[17] لیکن اُس نے جھٹلا دیا اور نہیں مانا۔ پھر اپنی سرگرمیوں کے لیے پلٹا اور لوگوں کو اکٹھا کر کے پکارا، پھر کہا کہ تمھارا سب سے بڑا رب تو میں ہوں۔[18] بالآخر، اللہ نے دنیا اور آخرت، دونوں کے عذاب میں اُسے پکڑ لیا۔ (لوگو)، اِس سرگذشت میں یقیناً بڑی عبرت ہے اُن کے لیے جو ڈرنے والے ہوں۔[19] ۱۵-۲۶

اشارہ ہے۔

۱۵؎ انبیا علیہم السلام کی دعوت اور اُن کے لائے ہوئے دین کا مقصد یہی تزکیہ ہے۔ یہ مقصد جس اسلوب میں بیان کیا گیا ہے، اُس کی بلاغت قابل توجہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اِس فقرے پر غور فرمایئے تو معلوم ہو گا کہ اِس میں بہ یک وقت انتہائی درجے کی ناصحانہ شفقت بھی ہے اور ساتھ ہی وہ عظمت و جلالت بھی جو اللہ تعالیٰ یا اُس کے سفیر کے کلام میں ہونی چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تک تمھاری جو روش رہی ہے، وہ تو یہی بتاتی ہے کہ تم سے کسی خیر کی توقع نہ رکھی جائے، لیکن اللہ تعالیٰ بڑا کریم ہے۔ اب بھی گنجایش ہے کہ اگر تم سلامت روی کی زندگی اختیار کرنے کی رغبت ظاہر کرو تو یہ رستہ تم کو دکھانے کی کوشش کی جائے۔" (تدبر قرآن ۹/ ۱۸۰)

۱۶؎ اِس سے معلوم ہوا کہ انسان صرف خدا کی خشیت سے پاکیزگی اختیار کرتا ہے اور خدا کی خشیت اُس کی صحیح معرفت سے پیدا ہوتی ہے۔

۱۷؎ یعنی عصا کے سانپ بن جانے کی نشانی۔

۱۸؎ یہ فرعون کی اُس تقریر کی طرف اشارہ ہے جو سورۂ زخرف (۴۳) کی آیات ۵۱-۵۵ میں

ءَاَنۡتُمۡ اَشَدُّ خَلۡقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰهَا ﴿۲۷﴾ رَفَعَ سَمۡكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿۲۸﴾ وَاَغۡطَشَ لَيۡلَهَا وَاَخۡرَجَ ضُحٰىهَا ﴿۲۹﴾ وَالۡاَرۡضَ بَعۡدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿۳۰﴾ اَخۡرَجَ مِنۡهَا مَآءَهَا وَمَرۡعٰىهَا ﴿۳۱﴾ وَالۡجِبَالَ اَرۡسٰىهَا ﴿۳۲﴾ مَتَاعًا لَّكُمۡ وَلِاَنۡعَامِكُمۡ ﴿۳۳﴾

(تم نہیں مانتے تو بتاؤ)[20]، کیا تمھیں بنانا مشکل ہے یا آسمان کو؟ اللہ نے اُسے بنایا ہے، اُس کا گنبد اونچا کیا ہے، پھر اُس کو خوب درست کیا ہے اور (اُس پر چھائی ہوئی) اُس کی رات اُس نے ڈھانک دی اور اُس کا دن بے نقاب کیا ہے۔ اِس کے بعد زمین کو اُس نے بچھایا ہے[21]، اُس کے اندر سے اُس کا پانی اور چارا نکالا ہے اور اُس کے پہاڑ (اُس میں) گاڑے ہیں۔ تمھارے لیے اور تمھارے مویشیوں کے لیے[22] متاعِ زیست کے طور پر۔ ۲۷-۳۳

تفصیل کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔

۱۹؎ بات اگرچہ عام صیغے سے فرمائی گئی ہے، لیکن اشارہ اُنھی لوگوں کی طرف ہے جو سورہ کے مخاطب ہیں، یعنی قریش مکہ۔

۲۰؎ آگے آیت ۳۳ تک آفاق کے آثار و شواہد سے استدلال فرمایا ہے۔

۲۱؎ تخلیق کے جو مراحل قرآن میں بیان ہوئے ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے زمین نے ایک واضح صورت اختیار کی، اِس کے بعد آسمان کو درست کیا گیا اور آخر میں وہ عمل ہوا جس نے زمین کو زندگی کے لیے بالکل سازگار بنا دیا۔ یہ اِسی مرحلے کا ذکر ہے۔

۲۲؎ مطلب یہ ہے کہ اِن آثار و شواہد کو دیکھو اور غور کرو کہ جس پروردگار نے زمین سے لے کر آسمان تک تمھارے لیے ربوبیت کا یہ اہتمام فرمایا ہے، کیا اُس نے صرف اِس لیے تمھیں پیدا کیا ہے کہ کھاؤ، پیو اور مر کر مٹی ہو جاؤ؟ کیا فی الواقع یہی سمجھتے ہو کہ دنیا رام کی لیلا اور یزداں کی تماشا گاہ

فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ﴿٣٤﴾ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ﴿٣٥﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ﴿٣٦﴾ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ﴿٣٧﴾ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿٣٨﴾ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿٣٩﴾ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿٤٠﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿٤١﴾

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا ﴿٤٢﴾ فِيْمَ اَنْتَ

النّٰزعٰت ۷۹

چنانچہ (حقیقت یہ ہے کہ) جب وہ بڑا ہنگامہ برپا ہوگا تو یہ سب درہم برہم ہو جائے گا۔[23] اُس دن[24] انسان اپنا سب کیا دھرا یاد کرے گا اور دوزخ اُن کے سامنے بے نقاب کر دی جائے گی جو اُس سے دوچار ہوں گے۔ سو جس نے سرکشی اختیار کی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی[25] تو دوزخ ہی اُس کا ٹھکانا ہوگی اور جو اپنے پروردگار کے حضور میں پیشی سے ڈرا اور اپنے نفس کو خواہشوں کی پیروی سے روکا تو بہشت ہی اُس کا ٹھکانا ہے۔ ۳۴-۴۱

وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ آخر وہ گھڑی کب آکر ٹھیرے گی؟[26] تمھیں اِس بحث سے

ہے؟ ذرا سوچو کہ جس کی حکمت کائنات کے ذرے ذرے سے نمایاں ہے، اُس خالق کے بارے میں تم نے یہ کیا رائے قائم کی ہے؟

۲۳؎ یہ 'اِذَا' کا جواب ہے جسے اصل میں بربنائے قرینہ حذف کر دیا گیا ہے۔

۲۴؎ اصل الفاظ ہیں: 'یَوْمَ یَتَذَکَّرُ الْاِنْسَانُ'۔ اِن میں 'یَوْمَ' جواب شرط محذوف سے منصوب ہے، جس طرح آیت ۶ میں یہ مقسم علیہ محذوف سے منصوب ہوا ہے۔

۲۵؎ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ سرکشی وہی اختیار کرے گا جو آخرت کو نظر انداز کر کے دنیا اور

مِنۡ ذِكۡرٰىهَا ﴿۴۳﴾ؕ اِلٰى رَبِّكَ مُنۡتَهٰىهَا ﴿۴۴﴾ؕ اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُنۡذِرُ مَنۡ يَّخۡشٰىهَا ﴿۴۵﴾ؕ كَاَنَّهُمۡ يَوۡمَ يَرَوۡنَهَا لَمۡ يَلۡبَثُوۡۤا اِلَّا عَشِيَّةً اَوۡ ضُحٰىهَا ﴿۴۶﴾

سورۃ عبس

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ﴿۱﴾ۙ اَنۡ جَآءَهُ الۡاَعۡمٰى ﴿۲﴾ؕ وَمَا يُدۡرِيۡكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ﴿۳﴾ۙ اَوۡ يَذَّكَّرُ فَتَنۡفَعَهُ الذِّكۡرٰى ﴿۴﴾ؕ

عبس
۸۰

کیا تعلق؟ اُس کا علم تیرے رب ہی کے حوالے ہے۔ تم تو صرف اُن لوگوں کو خبردار کر دینے والے ہو جو اُس سے ڈریں۔ یہ جس دن اُس کو دیکھیں گے تو یہی سمجھیں گے کہ گویا ایک شام یا اُس کی صبح سے زیادہ دنیا میں نہیں رہے۔ ۴۲-۴۶

—— ۲ ——

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا، اِس پر کہ اُس کی مجلس میں وہ نابینا[۲۷] آ گیا۔ تمھیں کیا معلوم، (اے پیغمبر) کہ شاید وہ (پوچھتا اور) سدھرتا یا (تم سناتے)، وہ نصیحت سنتا اور یہ نصیحت اُس کے کام آتی! ۱-۴

اُس کے مال و منال کا پجاری بن جائے گا۔

۲۶؎ اصل میں لفظ 'مُرْسٰی' آیا ہے۔ اِس کے معنی لنگر انداز ہونے کے ہیں۔ اِس میں ایک قسم کا طنز پوشیدہ ہے۔ یعنی وہ پوچھتے ہیں کہ جس قیامت کی خبریں تم شب و روز ہمیں سناتے ہو، وہ کہاں رہ گئی؟ اُس کا سفینہ آخر کب ہمارے ساحل پر لنگر انداز ہو گا؟

۲۷ے روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نابینا سے مراد یہاں ام المومنین سیدہ خدیجہ کے پھوپھی زاد بھائی عبداللہ بن ام مکتوم ہیں۔ قریش کے سرداروں کے ساتھ آپ کی ایک مجلس میں یہ اچانک تشریف لے آئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اِن کا آنا غالباً اِس لیے ناگوار ہوا کہ مبادا قریش کے سردار اُنھیں دیکھ کر بدک جائیں اور اِس طرح اپنی دعوت پہنچانے کا جو موقع آپ کو میسر ہوا ہے، وہ ضائع ہو جائے۔

سورہ کے لب و لہجے سے بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ نابینا سے بے رخی برتنے پر اِس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر عتاب فرمایا گیا ہے، لیکن پوری سورہ پر تدبر کیجیے تو صاف واضح ہو جاتا ہے کہ عتاب کا رخ اصلاً فراعنۂ قریش کی طرف ہے۔ شروع میں غائب کا اسلوب بھی اِسی لیے اختیار فرمایا ہے کہ براہ راست خطاب کی صورت میں تنبیہ تنبیہ نہ رہتی، فی الواقع عتاب بن جاتی، دراں حالیکہ معاملہ اِس سے زیادہ نہ تھا کہ خدا کی خوشنودی کے لیے اپنی ذمہ داری کی حد سے آپ کچھ آگے بڑھ گئے تھے۔ اِس میں نفس کی کسی خواہش یا اخلاق کی کسی پستی کا، معاذ اللہ، کوئی شائبہ نہ تھا۔ چنانچہ آگے کی آیتوں سے واضح ہے کہ آپ کو یہاں جس بات پر توجہ دلائی گئی ہے، وہ صرف یہ ہے کہ قریش کے سرداروں کے معاملے میں اُس سے زیادہ ذمہ داری آپ نے اپنے اوپر لے لی، جتنی خدا کی طرف سے آپ پر ڈالی گئی ہے۔ آپ نے اُن تک دعوت پہنچا دی، آپ کا فرض پورا ہو گیا۔ اِن ناقدروں کے پیچھے اب اپنے ساتھیوں کی حق تلفی آپ کو نہیں کرنی چاہیے۔ سدھرنے اور نصیحت پانے کے لیے جو لوگ آپ کی مجلس میں آتے ہیں، وہی آپ کے التفات کے حق دار ہیں۔ یہ جو بے پروائی برت رہے ہیں، اِن کو اب اِن کے حال پر چھوڑیے۔ اِن کی کوئی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔ امام حمید الدین فراہی نے اپنی تفسیر سورۂ عبس میں عتاب کے اِس رخ کو ایک تمثیل سے سمجھایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”اِس کو ایک مثال سے سمجھو۔ فرض کرو، ایک نہایت مستعد اور فرض شناس چرواہا ہے۔ اُس کے گلے کی کوئی فربہ بھیڑ گلے سے الگ ہو کر کھو جاتی ہے۔ چرواہا اُس کی تلاش میں نکلتا ہے، ہر

اَمَّا مَنِ اسۡتَغۡنٰی ۙ﴿۵﴾ فَاَنۡتَ لَہٗ تَصَدّٰی ؕ﴿۶﴾ وَمَا عَلَیۡکَ اَلَّا یَزَّکّٰی ؕ﴿۷﴾ وَاَمَّا مَنۡ جَآءَکَ یَسۡعٰی ۙ﴿۸﴾ وَهُوَ یَخۡشٰی ۙ﴿۹﴾ فَاَنۡتَ عَنۡہُ تَلَہّٰی ﴿ۚ۱۰﴾

یہ جو بے پروائی برتتے ہیں، اِن کے تو تم پیچھے پڑتے ہو[۲۸]، دراں حالیکہ یہ اگر نہ سدھریں تو تم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اور جو شوق سے تمھارے پاس آتا ہے[۲۹] اور خدا سے ڈرتا بھی ہے[۳۰] تو اُس سے تم بے پروائی برتتے ہو[۳۱]۔ ۵-۱۰

عبس
۸۰

قدم پر اُس کی کھر کے نشانات ملتے جارہے ہیں، جنگل کے کسی گوشے سے اُس کی آواز بھی آ رہی ہے۔ اِس طرح وہ کامیابی کی امید میں دور تک نکل جاتا ہے اور اپنے اصل گلے سے کچھ دیر کے لیے غافل ہو جاتا ہے۔ جب وہ لوٹتا ہے تو آقا اُس کو ملامت کرتا ہے کہ تم پورے گلے کو چھوڑ کر ناحق ایک دیوانی بھیڑ کے پیچھے ہلکان ہوئے۔ اُس کو چھوڑ دیتے، بھیڑیا کھا جاتا، وہ اسی کے لائق تھی۔ بتاؤ، اِس میں عتاب کس پر ہوا؟ چرواہے پر یا کھوئی ہوئی بھیڑ پر۔ بالکل یہی صورت معاملہ یہاں بھی ہے۔ عتاب کا رخ بظاہر تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ضرور ہے، لیکن غصے کا سارا زور منکرین ومخالفین پر ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تو اِس عتاب کے اندر نہایت دل نواز شفقتیں مضمر ہیں۔'' (نظام القرآن ۲۸۰)

۲۸؎ اصل میں لفظ 'تَصَدّٰی' استعمال ہوا ہے۔ یہ درحقیقت 'تَتَصَدَّدُ' ہے جس میں ایک 'ت' عربیت کے قاعدے سے حذف ہوگئی ہے اور ایک 'د' 'ی' میں بدل گئی ہے۔

۲۹؎ آیت میں 'یَسۡعٰی' کا لفظ ہے۔ اِس کے اصل معنی کسی کام کو ذوق وشوق اور سرگرمی کے ساتھ کرنے کے ہیں۔ اِس کے لیے دوڑنا لازم نہیں ہے، یہ بعض اوقات اِس کے مفہوم میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہاں واضح ہے کہ یہ اپنے اصل معنی میں آیا ہے۔

۳۰؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَهُوَ یَخۡشٰی'۔ یہ 'اَمَّا مَنِ اسۡتَغۡنٰی' کے مقابل میں ہیں۔ یعنی ایک طرف وہ لوگ ہیں جو بے پروائی برتتے ہیں اور دوسری طرف خدا کا یہ بندہ ہے جو سراپا خشیت

كَلَّآ اِنَّهَا تَذۡكِرَةٌ ﴿۱۱﴾ فَمَنۡ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿۱۲﴾ فِىۡ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿۱۳﴾

ہرگز نہیں، (اِن کے پیچھے پڑنے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے)۔ یہ تو ایک یاددہانی ہے۔[۳۲] سو جس کا جی چاہے، اِس سے یاددہانی حاصل کرے (اور جس کا جی چاہے،

ہوکر تمھارے پاس آتا ہے۔

۳۱؎ سورہ کے جن مطالب پر اِس پیرے کی آیتوں سے روشنی پڑتی ہے، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اُن کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ایک یہ کہ اِن میں بظاہر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو عتاب ہے، اُس کا اصل رخ آپ کی طرف نہیں، بلکہ قریش کے اُن نااہل لیڈروں کی طرف ہے جن سے کسی خیر کی امید باقی نہیں رہی تھی۔ اِس وجہ سے ضروری ہو گیا تھا کہ آپ اِن سے صرف نظر کر کے اپنی ساری توجہ کا مرکز اُن غریبوں کو بنائیں جو اسلام لا چکے تھے اور آپ کی تعلیم و تربیت کے اصل حق دار تھے۔

دوسری یہ کہ حضور کو کسی فرض کی ادائیگی میں کسی کوتاہی پر نہیں ٹوکا گیا ہے، بلکہ اِس بات پر ٹوکا گیا ہے کہ آپ نے اُس سے زیادہ ذمہ داری اپنے اوپر اٹھا لی ہے، جتنی اللہ تعالیٰ نے آپ پر ڈالی ہے۔ گویا یہ اُسی طرح کا پرمحبت و جاں نواز عتاب ہے جو 'لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ اَلَّا يَكُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِيۡنَ'* اور اِس مضمون کی دوسری آیات میں گزر چکا ہے۔

تیسری یہ کہ اِن میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ رہنمائی دی گئی ہے کہ اسلام کی اصل دولت وہ غریب ہیں جن کے اندر خدا کی خشیت ہے، نہ کہ وہ امیر جن کے سینے خدا کی خشیت سے خالی ہیں۔ اِس وجہ سے آپ اپنی توجہ کا اصل مرکز اُنھی کو بنائیں جو اہل ہیں۔ اُن کے پیچھے اپنا وقت نہ ضائع کریں جن کے اندر خیر کی کوئی رمق باقی نہیں رہی ہے۔'' (تدبرقرآن ۹/۲۰۰)

۳۲؎ اصل میں 'اِنَّهَا تَذۡكِرَةٌ' کے الفاظ ہیں۔ اِن میں ضمیر کا مرجع 'ذِكۡرٰى' ہے جو اِس سے پہلے آیت ۴ میں آیا ہے۔ آگے 'ذَكَرَهٗ' میں بھی ضمیر کا مرجع وہی ہے، لیکن 'ذِكۡرٰى' اور 'تَذۡكِرَة'،

* الشعراء ۲۶: ۳۔

مَّرۡفُوۡعَةٍ مُّطَهَّرَةٍۭ ﴿۱۴﴾ بِاَيۡدِيۡ سَفَرَةٍ ﴿۱۵﴾ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ﴿۱۶﴾

کانوں میں انگلیاں ٹھونس لے[۳۳]) ـــــ ادب کے لائق[۳۴]، بلند اور اچھوتے[۳۵] صحیفوں میں، بڑے معزز[۳۶]، بہت وفادار[۳۷] لکھنے والوں[۳۸] کے ہاتھ میں[۳۹]۔ ۱۱-۱۶

دونوں میں مراد چونکہ قرآن مجید ہے، اِس لیے معنی کی رعایت سے وہاں ضمیر مذکر آئی ہے۔

۳۳؎ کلام کا یہ حصہ عربیت کے اسلوب پر اصل میں حذف ہے۔

۳۴؎ اصل الفاظ ہیں: 'فِيۡ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ'۔ اِن میں مبتدا حذف ہے، یعنی 'هُوَ فِيۡ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ'۔ 'صُحُف' 'صحيفة' کی جمع ہے۔ یہ اِس طرح جمع کی صورت میں ہو تو بعض اوقات کتاب کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں اِس سے لوح محفوظ کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

۳۵؎ یہ دونوں صفات اِس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ ارواح خبیثہ اور شیاطین کی دسترس سے یہ کلام بالکل محفوظ ہے۔

۳۶؎ یعنی وہ ایسے بلند مرتبہ اور معزز ہیں کہ اُن سے کسی خیانت کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ وہ نہ اِس میں خود کوئی تغیر و تبدل کر سکتے ہیں اور نہ کسی شیطان کو اِس کا موقع دے سکتے ہیں۔

۳۷؎ یہ صفت اُن کی امانت داری کا وصف مزید نمایاں کرتی ہے۔

۳۸؎ اصل میں لفظ 'سَفَرَة' استعمال ہوا ہے۔ یہ 'سافر' کی جمع ہے۔ اِس کے معنی اصلاً لکھنے کے ہیں اور یہاں یہ اِسی معنی میں آیا ہے۔

۳۹؎ اِن آیتوں کا مدعا یہ ہے کہ یہ قرآن کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے منت سماجت کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ یہ نہایت ہی پاکیزہ اور نہایت بلند و برتر کلام ہے۔ لہٰذا اِس کو اِسی حیثیت سے اور اِسی شان کے ساتھ پیش کرنا چاہیے۔ یہ لوگوں کا محتاج نہیں ہے، بلکہ لوگ ہی اِس کے محتاج ہیں۔ اِس کے مخاطبین اگر اِس کی ناقدری کر رہے ہیں تو اپنے آپ کو خسارے میں مبتلا کر رہے ہیں۔ تم مطمئن رہو، اِن کا یہ غرور و تکبر عنقریب خاک میں ملا دیا جائے گا۔

قُتِلَ الۡاِنۡسَانُ مَاۤ اَكۡفَرَهٗ ﴿۱۷﴾ مِنۡ اَیِّ شَیۡءٍ خَلَقَهٗ ﴿۱۸﴾ مِنۡ نُّطۡفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ﴿۱۹﴾ ثُمَّ السَّبِیۡلَ یَسَّرَهٗ ﴿۲۰﴾ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقۡبَرَهٗ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنۡشَرَهٗ ﴿۲۲﴾

برا ہو انسان کا[۴۰]، یہ کیسا ناشکرا ہے[۴۱]! (کیا یہ نہیں جانتا کہ) خدا نے کس چیز سے اِسے بنایا ہے[۴۲]؟ پانی کی ایک بوند سے؛ اِسے بنایا ہے، پھر اِس کی تقدیر ٹھیرائی ہے، پھر زندگی کی راہ اِس کے لیے ہموار کی ہے[۴۳]۔ پھر اِسے موت دی، پھر قبر میں رکھوایا ہے[۴۴]۔ پھر (کیا مشکل ہے)، وہ جب چاہے گا، اِسے دوبارہ اٹھا کھڑا کرے گا[۴۵]؟ ۱۷-۲۲

۴۰؎ لفظ انسان اگرچہ عام ہے، لیکن اِس سے مراد وہی فراعنۂ قریش ہیں جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے۔ اُن سے اظہار بے زاری کے لیے گویا منہ پھیر کر بات عام صیغے سے کہہ دی ہے۔

۴۱؎ یہ اسلوب، اگر غور کیجیے تو اظہار نفرت اور اظہار تعجب، دونوں کا حامل ہے۔

۴۲؎ یعنی یہ کس غرے میں مبتلا ہے؟ کس دلیل سے روز جزا کا انکار کرتا ہے اور کس طرح کہتا ہے کہ اگر آخرت ہوئی بھی تو وہاں اِس کے لیے وہی مراتب ہوں گے جو دنیا میں اِسے حاصل ہیں؟ کیا یہ نہیں جانتا کہ اِس کے خالق نے اِسے کس چیز سے اور کس طرح پیدا کیا ہے؟

۴۳؎ اِس سے مراد وہ رہنمائی اور تیسیر ہے جو مہد سے لحد تک زندگی کے تمام نشیب و فراز میں قدرت کی طرف سے انسان کو حاصل ہوتی ہے۔

۴۴؎ اصل میں لفظ 'اَقْبَرَهٗ' آیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اِس لفظ میں ایک لطیف اشارہ اِس بات کی طرف بھی ہے کہ جو مرتا ہے، وہ فنا نہیں ہو جاتا، بلکہ قدرت اُس کو زمین کی تحویل میں دے دیتی ہے۔ جو شے تحویل میں دی جاتی ہے، وہ لازماً ایک دن واپس لی جاتی ہے۔ چنانچہ جب وقت آئے گا، اللہ تعالیٰ اِس امانت کو زمین سے واپس لے گا۔" (تدبر قرآن ۹/ ۲۰۷)

كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ﴿٢٣﴾ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ﴿٢٤﴾ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ﴿٢٥﴾ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ﴿٢٦﴾ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ﴿٢٧﴾ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ﴿٢٨﴾ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ﴿٢٩﴾ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ﴿٣٠﴾ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ﴿٣١﴾ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿٣٢﴾

عبس
٨٠

ہرگز نہیں، (اِسے چھوڑ نہیں دیا جائے گا)۔ اِس کے پروردگار نے جو اِسے فرمایا ہے[٤٦]، وہ اِس نے ابھی تک پورا نہیں کیا ہے[٤٧]۔ (اِسے دلیل چاہیے) تو یہ انسان ذرا اپنا کھانا ہی دیکھ لے کہ ہم نے خوب پانی برسایا ہے، پھر زمین کو پھاڑ کر چیرا ہے، پھر اُس میں غلے اُگا دیے ہیں اور انگور اور ترکاریاں اور زیتون اور کھجور اور گھنے باغ، میوے اور تازہ و شاداب سبزہ، تمھارے لیے اور تمھارے مویشیوں کے لیے، متاع زیست کے طور پر۔ ۲۳-۳۲

[٤٥] یہ وہ بدیہی نتیجہ ہے جس کے لیے اِس پیرے کی آیتوں میں اُن مراحل کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو انسان کی پیدایش، نشو ونما، اُس کے بچپن، جوانی اور زوال وفنا میں خدا کی تقدیر، تدبیر اور تیسیر کو نمایاں کرتے اور اِس طرح انسان کی تخلیق میں کارفرما اُس کی عظیم قدرت اور عظیم حکمت پر دلالت کرتے ہیں تاکہ مخاطبین پر اُن کے غرور کی بے ثباتی بھی واضح ہو جائے اور وہ اِس آئینے میں اُس جزا و سزا کو بھی دیکھ لیں جس کے لیے قرآن اُنھیں خبردار کر رہا ہے۔

[٤٦] مطلب یہ ہے کہ اِس کی فطرت میں اپنی ربوبیت کے اعتراف اور ایک روز جزا پر ایمان کا جو فرمان ودیعت کیا اور نبیوں کے ذریعے سے جس کی یاددہانی فرمائی ہے۔

[٤٧] یہ جملہ اُس جملے کے بالکل متوازی ہے جس سے پچھلے پیرے کی ابتدا ہوئی ہے۔ 'قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ' کے الفاظ میں جس طرح ہٹ دھرموں کی ہٹ دھرمی پر اظہار تعجب کے بعد انسان کی خلقت سے قیامت پر استدلال کیا ہے، یہاں اُسی طرح 'كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ'

فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ﴿۳۳﴾ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ﴿۳۴﴾ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ﴿۳۵﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ﴿۳۶﴾ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ﴿۳۷﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿۳۸﴾ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿۳۹﴾ وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿۴۰﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿۴۱﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿۴۲﴾

اِس لیے جب وہ کانوں کو بہرا کر دینے والی آ جائے گی تو اِن سے پوچھو کہ پھر کدھر جائیں گے؟[۴۸] اُس دن آدمی اپنے بھائی سے بھاگے گا، اور اپنی ماں سے، اپنے باپ سے، اپنی بیوی اور اپنے بیٹوں سے بھاگے گا۔ اُس دن ہر شخص کو اِن میں سے اپنی اپنی پڑی ہو گی۔ کتنے چہرے اُس دن روشن ہوں گے، ہنستے ہوئے، ہشاش بشاش! اور کتنے چہرے ہوں گے کہ اُن پر اُس دن خاک اڑتی ہو گی، سیاہی چھا رہی ہو گی۔ یہی منکر، یہی نافرمان ہوں گے۔[۴۹] ۳۳-۴۲

کے الفاظ میں سورہ کے مخاطبین کو زجر و ملامت کے بعد انسان کے گردوپیش میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے آثار سے قیامت پر دلیل قائم کی ہے۔

۴۸ یہ 'اِذَا' کا جواب ہے جو آیت میں بر بنائے قرینہ حذف ہے۔

۴۹ یعنی وہ یہی منکر، یہی نافرمان چہرے ہوں گے جو اِس وقت سامنے ہیں۔

کراچی

۲۳ر فروری ۲۰۱۰ء

عبس
۸۰

التكوير - الانفطار

٨١ ـــــ ٨٢

التکویر - الانفطار

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ میں قرآن کی حقانیت سے اور دوسری سورہ میں انسان کی خلقت میں خدا کی آیات سے استدلال کیا گیا ہے۔ روے سخن قریش کے سرداروں کی طرف ہے اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ پچھلی سورتوں کی طرح یہ بھی ام القریٰ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ انذار عام میں نازل ہوئی ہیں۔

دونوں کا موضوع قیامت کی ہلچل کے حوالے سے مخاطبین کو متنبہ کرنا ہے کہ ہنگامۂ محشر برپا ہوگا تو اِسی لیے برپا ہوگا کہ تم میں سے ہر شخص یہ جان لے کہ اُس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا ہے۔

سورة التکویر

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِذَا الشَّمۡسُ کُوِّرَتۡ ﴿۱﴾ وَ اِذَا النُّجُوۡمُ انۡکَدَرَتۡ ﴿۲﴾ وَ اِذَا الۡجِبَالُ سُیِّرَتۡ ﴿۳﴾ وَ اِذَا الۡعِشَارُ عُطِّلَتۡ ﴿۴﴾ وَ اِذَا الۡوُحُوۡشُ حُشِرَتۡ ﴿۵﴾ وَ اِذَا الۡبِحَارُ سُجِّرَتۡ ﴿۶﴾ وَ اِذَا النُّفُوۡسُ زُوِّجَتۡ ﴿۷﴾

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

جب سورج کی بساط لپیٹ دی جائے گی، جب تارے ماند پڑ جائیں گے، جب پہاڑ چلائے جائیں گے[۱]، جب دس ماہہ گابھن اونٹنیاں چھٹی پھریں گی[۲]، جب وحشی جانور (اپنی سب دشمنیاں بھول کر) ایک ہی جگہ اکٹھے ہو جائیں گے[۳]، جب سمندر ابل

۱؎ دوسرے مقامات میں قرآن نے اِس کی تفصیل کر دی ہے کہ پہاڑ اِس طرح اڑتے پھریں گے، جس طرح بادل اڑتے پھرتے ہیں۔

۲؎ اصل میں لفظ 'عِشَار' استعمال ہوا ہے۔ یہ 'عشراء' کی جمع ہے اور اُس اونٹنی کے لیے آتا ہے جو دس ماہ کے حمل سے ہو۔ یہ وقت اُس کے بچہ جننے کا ہوتا ہے۔ اِس طرح کی اونٹنیاں قدرتی طور پر اُن کے مالکوں کو بہت عزیز ہوتی تھیں اور وہ اُن کی نگہداشت کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ قرآن نے عظیم چیزوں کی بے ثباتی کے بعد یہ محبوب چیزوں کی بے وقعتی کا ذکر کرنے کے لیے اِنھی اونٹنیوں کو مثال میں پیش کر کے فرمایا ہے کہ اُس دن کی افراتفری اور نفسی نفسی کی حالت میں لوگوں کو اپنی عزیز سے عزیز چیزوں کا بھی کچھ ہوش نہ رہے گا۔

۳؎ یعنی انسان تو انسان، اُس دن کا ہول وحشی جانوروں پر بھی یہ حالت طاری کر دے گا۔

وَاِذَا الۡمَوۡءٗدَةُ سُئِلَتۡ ۞ بِاَیِّ ذَنۡۢبٍ قُتِلَتۡ ۞ وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتۡ ۞ وَاِذَا السَّمَآءُ کُشِطَتۡ ۞ وَاِذَا الۡجَحِیۡمُ سُعِّرَتۡ ۞ وَاِذَا

پڑیں گے[4]، جب[5] جیوں کے جوڑ (اُن کے عمل کے لحاظ سے) باندھیں گے[6]، جب اُس سے جو زندہ گاڑ دی گئی، پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر ماری گئی[7]؟ جب دفتر کھولے

استاذ امام لکھتے ہیں:

"... جنگل میں آگ لگ جائے یا سیلاب کا پانی پھیل جائے تو جنگلی جانور سراسیمگی کی حالت میں جس ٹیلے یا ٹیکرے پر اُن کو پناہ ملنے کی توقع ہو، وہاں اکٹھے ہو جاتے ہیں اور مشترک مصیبت کا ہول اُن پر ایسا طاری ہوتا ہے کہ بکری، شیر اور بھیڑیے پاس پاس کھڑے ہوتے ہیں، لیکن کسی کو ہوش نہیں رہتا کہ اُس کا حریف یا شکار اُس کی بغل میں ہے۔ یہی صورت حال خوف ناک ترین شکل میں ظہور قیامت کے وقت پیش آئے گی۔" (تدبر قرآن ۹/۲۲۰)

۴۔ اصل میں لفظ 'سُجِّرَتۡ' آیا ہے۔ اِس کے معنی تنور میں ایندھن بھر کر بھڑکا دینے کے ہیں۔ اِس سے یہ دریاؤں اور سمندروں کے بے قابو ہو کر اپنے حدود سے باہر نکل پڑنے کے لیے استعمال ہوا۔

۵۔ یہاں سے قیامت کے دوسرے مرحلے کا ذکر شروع ہوتا ہے، یعنی ظہور قیامت کے بعد جو حالات پیش آئیں گے۔

۶۔ یہ وہی بات ہے جو سورۂ واقعہ (۵۶) کی آیت ۷ 'وَکُنۡتُمۡ اَزۡوَاجًا ثَلٰثَۃً' میں بیان ہوئی ہے، یعنی عقیدہ وعمل کے لحاظ سے لوگ الگ الگ گروہوں میں تقسیم کر دیے جائیں گے۔

۷۔ عرب جاہلی میں بعض اجڈ اور سنگ دل باپ کبھی فقر کے اندیشے سے اور کبھی اِس غیرت میں کہ کوئی شخص اُن کا داماد بنے گا، اپنی بیٹیوں کو زندہ قبروں میں دفن کر دیتے تھے۔ یہ اِسی جاہلیت کی طرف اشارہ ہے۔ اِس سے مقصود اِس بات کی طرف توجہ دلانا ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے دادرسی کے مستحق وہ معصوم ہوں گے جو اُن لوگوں کے ہاتھوں ظلم کا شکار ہوئے جنھیں خدا نے

الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ﴿۱۳﴾ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ﴿۱۴﴾
فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ﴿۱۵﴾ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ﴿۱۶﴾ وَالَّيْلِ

جائیں گے[8]، جب آسمان کی کھال کھینچ لی جائے گی[9]، جب دوزخ دہکائی جائے گی[10]، جب بہشت قریب لے آئی جائے گی[11]، اُس وقت (لوگو، تم میں سے) ہر شخص یہ جان لے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔ ۱-۱۴

(یہ قرآن کی دعوت ہے، اِسے شیطانوں سے کیا تعلق)؟

اِس لیے، نہیں، (یہ کسی شیطان کا الہام نہیں ہے[12])۔ میں اُن تاروں کو گواہی میں

التکویر
۸۱

اُن کا محافظ بنایا تھا۔

۸۔ اور اِس کے نتیجے میں لوگوں کے اعمال ناموں میں رقم اُن کا سارا کچا چٹھا اُن کے سامنے آ جائے گا۔

۹۔ اصل میں لفظ 'کُشِطَتْ' استعمال ہوا ہے۔ اونٹ کی کھال کھینچ لینے کے لیے یہ عربی زبان کا ایک معروف لفظ ہے۔ کھال اتار لینے کے بعد ذبیحہ کا گوشت سرخ سرخ نظر آتا ہے۔ قرآن نے یہ اِسی سے آسمان کے سرخ ہو جانے کو تعبیر کیا ہے۔ آگے کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کی یہ سرخی غالباً جہنم کے بھڑکتے شعلوں کے سبب سے ہو گی۔

۱۰۔ یعنی جب مجرموں کو اُس میں ڈالنے کا وقت قریب ہو گا تو اُن کو جلانے کے لیے وہ خاص طور پر بھڑکا دی جائے گی۔

۱۱۔ یعنی اہل جنت کی تشریف کے لیے وہ اُن کے سامنے پیش کر دی جائے گی۔

۱۲۔ قرآن کے انذار سے لوگوں کی توجہ ہٹانے اور اُن کو بدگمان کر دینے کے لیے قریش کے لیڈروں نے ایک اشغلا یہ بھی ایجاد کیا تھا کہ جس طرح کاہن شیطانوں کے القا سے غیب کی باتیں بتاتے ہیں، یہ قرآن بھی، معاذ اللہ، اُسی طرح کی کوئی چیز ہے جسے وحی الٰہی کے طور پر پیش کیا جا رہا

اِذَا عَسْعَسَ ﴿۱۷﴾ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ﴿۱۸﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۹﴾

پیش کرتا ہوں جو پلٹتے، چلتے، (شیطانوں پر آگ برساتے، پھر) چھپ جاتے ہیں[13]، اور رات کو جب وہ پیچھے ہٹتی[14] اور صبح کو جب وہ (اُس کے بوجھ سے نکل کر) سانس لیتی ہے[15]

ہے۔ آگے تاروں کی گواہی سے قرآن نے اُن کے اِسی زعم کی تردید فرمائی ہے۔

۱۳؎ اصل میں 'اَلْخُنَّسِ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ عربی زبان میں یہ تاروں کی صفات کے طور پر ایسے معروف ہیں کہ بالعموم موصوف کے بغیر ہی آجاتے ہیں۔ یہاں یہ اُس وقت کی تصویر کے لیے آئے ہیں، جب تاروں کے دیدبانوں سے شہابوں کے تیر برق خاطف کی طرح نکلتے اور اپنے ہدف کو نشانہ بنا کر ترکش میں چھپ جاتے ہیں۔ ملاءِ اعلیٰ کے راستوں پر جنوں کی دراندازی روکنے کے لیے یہ اہتمام عام حالات میں بھی ہوتا ہے، لیکن سورۂ جن میں قرآن نے واضح فرمایا ہے کہ اُس کے زمانۂ نزول میں اِس کی نوعیت ایسی غیر معمولی تھی کہ جنوں نے اُسے دیکھا تو اُن کو خیال ہوا کہ دنیا والوں کے ساتھ یقیناً کوئی اہم معاملہ ہونے والا ہے۔ قرآن نے یہاں اِسی اہتمام کو شہادت میں پیش کر کے فرمایا ہے کہ وہ جہاں سے نازل ہو رہا ہے، وہاں کسی جن اور کسی شیطان کے لیے رسائی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اِس لیے ہوش کے ناخن لو، خدا کی یہ کتاب یقیناً وحیِ الٰہی ہے۔ اِسے ہرگز کسی شیطان کا القا قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۱۴؎ اصل میں لفظ 'عَسْعَسَ' استعمال ہوا ہے۔ اِس کے معنی تاریک ہو جانے کے بھی ہیں اور پیچھے ہٹ جانے کے بھی۔ یہاں یہی دوسرے معنی قابلِ ترجیح ہیں، اِس لیے کہ یہ 'تَنَفَّسَ' کے مقابل میں ہے۔ پھر سورۂ مدثر (۷۴) کی آیات ۳۲-۳۴ میں دیکھیے تو بالکل اِسی جگہ لفظ 'اَدْبَرَ' آیا ہے جس میں کسی دوسرے معنی کے لیے گنجایش نہیں ہو سکتی۔

۱۵؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ'۔ اِس تعبیر کی بلاغت نگاہ میں رہے۔ فرمایا ہے کہ رات کے بوجھ تلے صبح اِس طرح دبی ہوتی ہے کہ گویا اُس کا دم گھٹ رہا ہے، یہاں تک کہ یہ بوجھ ہٹا دیا جاتا ہے اور وہ سانس لینے لگتی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ تم ابھی تک کاہنوں کے خرافات کے بوجھ

ذِی قُوَّۃٍ عِنۡدَ ذِی الۡعَرۡشِ مَکِیۡنٍ ﴿۲۰﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیۡنٍ ﴿۲۱﴾

کہ بے شک، یہ ایک رسول کریم[16] کا لایا ہوا کلام ہے، بہت صاحب قوت، عرش والے کے ہاں بہت بلند مرتبہ، اُس کا حکم وہاں مانا جاتا ہے اور وہ نہایت امین بھی ہے[17]۔ ۱۵-۲۱

تلے دبے ہوئے ہو۔ دیکھنے کی کوشش کرو تو دیکھ سکتے ہو کہ تمھارے ماحول میں یہ قرآن صبح درخشاں کی طرح طلوع ہو چکا ہے۔ صبح طلوع ہوتی ہے تو دیدۂ بینا رکھنے والا کوئی شخص اُسے رات نہیں کہہ سکتا۔ یہ قرآن بھی تمھارے ماحول میں پھیلی ہوئی علم و عمل کی ظلمتوں میں ایسا ہی روشن، الگ اور ممتاز ہے۔ عقل کے اندھے ہیں جو اِسے کاہنوں کا کلام سمجھتے ہیں۔ یہ تو ایک رسول کریم کا لایا ہوا کلام ہے۔

۱۶؎ آگے کی صفات سے واضح ہے کہ اِس سے مراد یہاں جبریل امین ہیں۔ اُن کے لیے 'کریم' کی جو صفت آئی ہے، اُس کا موقع و محل سمجھ لینا چاہیے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...مطلب یہ ہے کہ محروم القسمت ہیں وہ لوگ جو اِس قرآن کو کاہنوں کی بکواس کی قسم کی کوئی چیز قرار دیتے اور اللہ کے رسول کو کاہن کہتے ہیں۔ کاہن جو کچھ پیش کرتے ہیں، وہ شیطانی القا ہوتا ہے جس میں صداقت کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ وہ غیب دانی کے مدعی ہوتے ہیں، لیکن اُن کے شیاطین کی رسائی ملاء اعلیٰ تک ہونا تو درکنار، وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسے مردود و مبغوض ہیں کہ وہ آسمانوں میں گھات لگانے کی کوشش کرتے ہیں تو اُن پر شہابوں کے ذریعے سے سنگ باری ہوتی ہے۔ اِس کے برعکس یہ کلام جو اِن کو سنایا جا رہا ہے، یہ اللہ کے ایک ایسے فرستادہ کا لایا ہوا کلام ہے جو خدا کی بارگاہ میں عزت پائے ہوئے اور نہایت مقرب و مکرم ہے۔''

(تدبر قرآن ۹/۲۲۸)

۱۷؎ اصل الفاظ ہیں: 'مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِیۡنٍ'۔ لفظ 'ثَمَّ' یہاں اُسی مفہوم میں ہے جس میں یہ عربی زبان میں معروف ہے اور 'مُطَاع' سے متعلق ہے، اِسے لفظ 'اَمِیۡن' سے متعلق نہیں سمجھنا چاہیے۔ ہم نے بیان کیا ہے کہ یہ جبریل امین کی صفات ہیں۔ غور کیجیے تو اِن سے بھی اُسی حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے جو اوپر مذکور ہوئی ہے، یعنی وہ ایسے بلند مرتبہ ہیں کہ کوئی شیطان نہ اُنھیں کسی طرح

وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ﴿٢٢﴾ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ﴿٢٣﴾ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ﴿٢٤﴾ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿٢٥﴾

اور (قریش کے لوگو)، تمھارا ساتھی[18] کوئی دیوانہ بھی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس نے اِس رسول کریم کو بالکل کھلے افق پر دیکھا ہے[19]۔ (تم جانتے ہو کہ) وہ غیب کی باتوں پر کبھی حریص نہیں رہا[20]۔ (اِس لیے ہرگز نہیں)، یہ کسی شیطان رجیم کا الہام نہیں ہے[21]۔ ۲۲-۲۵

مغلوب کرسکتا ہے اور نہ وہ اُس سے مرعوب یا متاثر ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اُن کے ذریعے سے یہ قرآن پوری حفاظت کے ساتھ ملاء اعلیٰ سے قلب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تک پہنچ جاتا ہے، اُس میں کسی شیطان کے لیے دراندازی کا کوئی موقع نہیں ہوتا۔

۱۸؎ اصل میں لفظ 'صَاحِبُکُم' آیا ہے۔ اِس کے استعمال میں بڑی بلاغت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تمھارے اندر پیدا ہوئے اور تمھارے ساتھ ہی رہے ہیں اور اب اِنھیں دیوانہ، کاہن، خبطی اور معلوم نہیں کیا کیا قرار دے رہے ہو۔ تمھیں سوچنا چاہیے کہ تمھارا ضمیر کیا فی الواقع اِس معاملے میں تمھاری زبان کا ساتھ دے سکتا ہے؟

۱۹؎ یعنی اِس میں نہ فریب نفس کا احتمال ہے، نہ فریب نظر کا شبہ۔ یہ کھلے ہوئے افق کا ایک ایسا مشاہدہ ہے جس کے بارے میں کسی مشاہدہ کرنے والے کو کبھی کوئی تردد نہیں ہو سکتا۔

۲۰؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ'۔ 'ضَنِیْن' کے معنی بخیل کے ہیں، لیکن اِس کا صلہ آیت میں 'ب' نہیں، بلکہ 'علیٰ' ہے۔ چنانچہ عربیت کی رو سے یہ 'حریص' کے مفہوم پر متضمن ہے، یعنی غیب کی باتوں کو سمیٹ لینے پر حریص۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارا یہ پیغمبر تمھارے کاہنوں اور تارک الدنیا درویشوں کی طرح غیب دانی کے شوق میں چلے کاٹتا اور مراقبے نہیں کرتا

التکویر ۸۱

فَاَیۡنَ تَذۡہَبُوۡنَ ﴿۲۶﴾ اِنۡ ہُوَ اِلَّا ذِکۡرٌ لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۲۷﴾ لِمَنۡ شَآءَ مِنۡکُمۡ اَنۡ یَّسۡتَقِیۡمَ ﴿۲۸﴾ وَمَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۲۹﴾

سورۃ الانفطار

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِذَا السَّمَآءُ انۡفَطَرَتۡ ﴿۱﴾ وَ اِذَا الۡکَوَاکِبُ انۡتَثَرَتۡ ﴿۲﴾ وَ اِذَا

سو تم کہاں کھوئے جاتے ہو؟ یہ تو دنیا والوں کے لیے ایک یاددہانی ہے، تم میں سے اُن کے لیے جو سیدھی راہ چلنا چاہیں۔ اور تم نہیں چاہتے، مگر یہ کہ اللہ، عالم کا پروردگار ہی (اپنے قانون کے مطابق[۲۲]) چاہے۔ ۲۶-۲۹

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

جب آسمان پھٹ جائے گا[۲۳]، جب تارے بکھر جائیں گے، جب سمندر پھوٹ بہیں

رہا، بلکہ وحی الٰہی سے اضطراری طور پر سرفراز ہوا ہے اور اپنے پروردگار کے حکم کی تعمیل میں اُس کو تمھارے سامنے پیش کر رہا ہے۔

۲۱ 'رَجِیۡم' کے معنی ہیں: سنگ سار کیا ہوا۔ یہ جبریل امین کی صفت 'کریم' کے مقابل میں آیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ جس نے قرآن نازل کیا ہے، وہ تو اللہ کا ایک عالی مقام فرشتہ ہے اور تمھارے کاہنوں پر جو شیاطین اترتے ہیں، وہ شہابوں کی سنگ باری سے کھدیڑے اور راندے ہوئے ہوتے ہیں، وہ قرآن کے لانے والے کس طرح ہو سکتے ہیں؟

۲۲ یعنی اپنے اِس قانون کے مطابق کہ وہ ہدایت اُنھیں دیتا ہے جو اُس کے مستحق ہوتے ہیں

الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝٣ وَإِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ۝٤ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ ۝٥

گے،[24] جب قبریں کھول دی جائیں گی، اُس وقت (لوگو، تم میں سے) ہر شخص یہ جان لے گا کہ اُس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا ہے۔[25] ۱-۵

اور گم راہی میں اُنھی کو مبتلا کرتا ہے جو اپنے ارادہ و اختیار کے سوء استعمال سے اپنے آپ کو اُس کا سزاوار بنا لیتے ہیں۔

۲۳؎ یعنی جب قیامت کی ہلچل پڑے گی تو یہ آسمان جو اِس وقت ایک محکم چھت کی صورت میں دکھائی دیتا ہے، اِس میں شگاف ہی شگاف نظر آئیں گے۔ اِس کی صورت کیا ہوگی؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اِس کا صحیح تصور آج نہیں کیا جا سکتا، لیکن اِس کی یاددہانی اِس لیے فرمائی گئی ہے کہ جو اغنیا و مستکبرین اپنے قلعوں اور گڑھیوں کے اعتماد پر بالکل نچنت ہیں، سمجھتے ہیں کہ اُنھوں نے جو کچھ بنا رکھا ہے، وہ اُن کو ہر خطرے سے محفوظ رکھنے کے لیے کافی ہے، اُن کو جھنجھوڑا جائے کہ قیامت کی ہلچل ایسی ہوگی کہ تمھارے بنائے ہوئے گھروندوں کا تو کیا ذکر، اِس پورے عالم کی یہ محکم چھت جس میں تم ڈھونڈے سے بھی کوئی رخنہ نہیں پا سکتے، بالکل رخنہ ہی رخنہ اور شگاف ہی شگاف بن کر رہ جائے گی۔" (تدبر قرآن ۹/۲۳۹)

۲۴؎ اصل میں لفظ 'فُجِّرَتْ' آیا ہے۔ پچھلی سورہ میں اِس مضمون کے لیے 'سُجِّرَتْ' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ وہ سمندروں کی آزادی و بے قیدی اور 'فُجِّرَتْ' اُن کے جوش و ہیجان کو نمایاں کرتا ہے۔

۲۵؎ یعنی وہ کیا کرتوت ہیں جو اُس نے آگے بھیجے اور کرنے کے کیا کام تھے جن کی حسرتیں وہ دنیا میں پیچھے چھوڑ آیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الۡاِنۡسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الۡكَرِيۡمِ ۙ﴿۶﴾ الَّذِىۡ خَلَقَكَ فَسَوّٰٮكَ فَعَدَلَكَ ۙ﴿۷﴾ فِىۡۤ اَىِّ صُوۡرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ؕ﴿۸﴾ كَلَّا بَلۡ تُكَذِّبُوۡنَ بِالدِّيۡنِ ۙ﴿۹﴾ وَاِنَّ عَلَيۡكُمۡ لَحٰفِظِيۡنَ ۙ﴿۱۰﴾

الانفطار ۸۲

اے انسان[۲۶]، (تو اِس حقیقت کو نہیں مانتا؟ تعجب ہے)، تجھے کس چیز نے تیرے رب کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا ہے[۲۷]؟ جس نے تجھے بنایا، پھر تیرے نوک پلک سنوارے، پھر تجھے بالکل متناسب کیا، اِس طرح کہ جس صورت میں تجھ کو چاہا، جوڑ دیا[۲۸]۔ ۶-۸

ہرگز نہیں، (اُس دن کے بارے میں جو کچھ تم کہتے ہو، اُس کی ہرگز کوئی بنیاد نہیں ہے)، بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) تم جزا و سزا کو جھٹلانا چاہتے ہو[۲۹]، دراں حالیکہ تم پر نگران

۲۶؎ لفظ اگرچہ عام ہے، لیکن آگے آیت ۹ سے واضح ہے کہ روے سخن قریش کے اُنھی سرداروں کی طرف ہے جو اِس سورہ کے مخاطب ہیں۔

۲۷؎ یعنی کیا اِس چیز نے دھوکے میں ڈال دیا ہے کہ وہ ایسا کریم ہے کہ تمھاری سرکشی پر فوراً تمھیں نہیں پکڑتا؟ یہی بات ہے تو حقیقت یہ ہے کہ تم نے بہت سخت دھوکا کھایا ہے۔

۲۸؎ مطلب یہ ہے کہ جس پروردگار کی یہ قدرتیں اور عنایتیں دیکھتے ہو، اُس کے بارے میں کس طرح سوچتے ہو کہ تمھارے نیکوں اور بدوں میں امتیاز نہ کرے گا اور اِس امتیاز کے لیے مرنے کے بعد تمھیں اٹھانا چاہے گا تو اٹھا نہ سکے گا؟

۲۹؎ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس اجمال کی تفصیل فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہاں یہ بات یاد رکھیے کہ بعض اوقات انسان جھٹلانا تو کسی چیز کو چاہتا ہے، لیکن اِس کے خلاف کچھ کہنے کی گنجایش نہیں پاتا، اِس وجہ سے بعض غیر متعلق سوالات چھیڑتا ہے تاکہ اُس کے باب میں کچھ شبہات پیدا کرنے کی راہ کھلے۔ قریش کے منکرین اِسی طرح کی الجھن میں گرفتار

كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ﴿۱۱﴾ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۱۲﴾
اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿۱۳﴾ وَّاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ﴿۱۴﴾ يَّصْلَوْنَهَا
يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿۱۵﴾ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ ﴿۱۶﴾

مقرر ہیں[۳۰]، بڑے معزز لکھنے والے[۳۱]، وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو[۳۲]۔ ۹-۱۲
(اُس[۳۳] دن) نیک لوگ یقیناً نعمتوں میں ہوں گے اور بدکار یقیناً جہنم میں۔ بدلے کے دن یہ اُس میں جا پڑیں گے، اِس طرح کہ پھر کبھی اُس سے اوجھل نہ ہو سکیں گے[۳۴]۔ ۱۳-۱۶

تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جزا و سزا کو جھٹلانا ایک امر بدیہی کو جھٹلانا ہے، لیکن اِس کو ماننے کے لیے بھی تیار نہیں تھے۔ اِس وجہ سے بعض بناوٹی شبہات کی آڑ لے کر یہ نمایش کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ گویا اُن کے پاس کچھ دلائل ہیں جن کی بنا پر وہ قرآن کے انذار کو نہیں مان رہے ہیں۔''

(تدبر قرآن ۹/ ۲۴۳)

۳۰؎ اِس لیے اِس مغالطے میں نہ رہو کہ تمھاری خلوت و جلوت سے کون واقف ہو سکتا ہے کہ ایک دن تمھارا محاسبہ کر سکے۔

۳۱؎ اصل میں لفظ 'کِرَام' استعمال ہوا ہے۔ اِس سے مقصود اِس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ وہ جس کام پر مامور ہیں، اُسے نہایت فرض شناسی سے انجام دیتے ہیں۔ نہ اُس میں کوئی تساہل برتتے ہیں، نہ کسی کے دباؤ میں آکر جانب داری کا کوئی شائبہ اُس میں آنے دیتے ہیں۔

۳۲؎ یعنی تمھارے ہر قول و فعل سے واقف ہوتے ہیں۔ سورۂ ق (۵۰) میں اُن کے بارے میں مزید وضاحت ہے کہ یہ فرشتے دو ہیں اور دائیں بائیں، دونوں طرف سے نگرانی کرتے ہیں۔

۳۳؎ اوپر جس اہتمام و انتظام کا ذکر ہے، یہاں سے آگے اُس کا نتیجہ بیان ہوا ہے کہ وہ جب اِس طرح تمھاری نگرانی کر رہا ہے تو کیسے ہو سکتا ہے کہ نیک و بد کے ساتھ ایک ہی طرح کا معاملہ کرے؟ نہیں، وہ نیک لوگوں کو لازماً جنت میں اور بروں کو جہنم میں داخل کرے گا۔ وہ اگر ایسا نہ

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿١٧﴾ ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿١٨﴾
يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۭ وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ﴿١٩﴾

تم کیا سمجھے[35] اُس بدلے کے دن کو؟ بتاؤ، کیا سمجھے اُس بدلے کے دن کو؟[36] اُس دن کوئی شخص کسی دوسرے کے لیے کچھ نہ کر سکے گا۔ معاملہ اُس دن اللہ ہی کے ہاتھ میں ہو گا۔ ۱۷-۱۹

کرے تو ماننا پڑے گا کہ اُس کی یہ دنیا ایک اندھیر نگری ہے، اِس میں حق وانصاف کا کوئی تصور نہیں ہے۔

۳۴۔ یہی بات قرآن مجید کے دوسرے مقامات میں 'خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا' کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

۳۵۔ اصل میں واحد کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ اِس کے مخاطب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہیں، بلکہ وہی لوگ ہیں جو 'مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ' کے مخاطب ہیں۔

۳۶۔ یہ سوال کسی جواب کے لیے نہیں، بلکہ اُس دن کے ہول کا تصور پیدا کرنے کے لیے ہے۔ غور کیجیے تو اِس کی تکرار نے اِسے مزید پر ہول بنا دیا ہے۔

کوالالمپور

۲۷ رفروری ۲۰۱۰ء

المطففین - الإنشقاق

۸۳ — ۸۴

المطففین - الإنشقاق

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ میں انسان کی فطرت میں خیر وشر کے شعور سے اور دوسری میں آفاق کے آثار وشواہد سے استدلال کیا گیا ہے۔ دونوں میں روے سخن قریش کے سرداروں کی طرف ہے اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ پچھلی سورتوں کی طرح یہ بھی ام القریٰ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ انذار عام میں نازل ہوئی ہیں۔

دونوں سورتوں کا موضوع قریش کو متنبہ کرنا ہے کہ قیامت کے بارے میں وہ کسی غلط فہمی میں نہ رہیں۔ اُنھیں ہر حال میں اپنے پروردگار کے حضور میں پیشی کے لیے اٹھنا ہے اور اپنے اعمال کے لحاظ سے لازماً الگ الگ انجام کو پہنچنا ہے۔

سورۃ المطففین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَیۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِیۡنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِیۡنَ اِذَا اکۡتَالُوۡا عَلَی النَّاسِ یَسۡتَوۡفُوۡنَ ۫﴿۲﴾ وَ اِذَا کَالُوۡہُمۡ اَوۡ وَّزَنُوۡہُمۡ یُخۡسِرُوۡنَ ؕ﴿۳﴾ اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّہُمۡ

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

تباہی ہے ڈنڈی مارنے والوں کے لیے[۱]، یہ جو لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں اور جب اُن کے لیے ناپتے یا تولتے ہیں تو اُس میں ڈنڈی مارتے ہیں[۲]۔ کیا یہ نہیں سمجھتے

۱۔ یہ جملہ محض خبریہ نہیں ہے، اِس میں لعنت کا مضمون بھی چھپا ہوا ہے۔

۲۔ ڈنڈی مارنے والوں کی اِس صفت سے صاف واضح ہے کہ سورہ میں مجرد ناپ تول کی کمی زیر بحث نہیں ہے، بلکہ ایک خاص کردار کی طرف اشارہ مقصود ہے جو دوسروں کے لیے ناپنے اور تولنے میں تو ڈنڈی مارتا ہے، مگر اُن سے لینے میں بڑا احساس ہوتا ہے اور ہرگز نہیں چاہتا کہ اُس کے لیے کوئی چیز تولی جائے تو اُس میں رتی برابر کمی ہو۔ قرآن نے اِسی کردار کو یہاں اپنے اِس دعوے پر شہادت کے لیے پیش کیا ہے کہ انسان اپنے اندر خیر و شر میں امتیاز کا شعور رکھتا ہے، اُنھیں ہرگز برابر نہیں سمجھتا۔ ظلم اور انصاف کے درمیان فرق، عدل کے ساتھ محبت اور ظلم سے نفرت اُس کی فطرت میں ودیعت ہے۔ لہٰذا وہ اِس بات پر کبھی راضی نہیں ہو سکتا کہ ظالم اور عادل کے ساتھ ایک ہی طرح کا معاملہ کیا جائے، بلکہ پوری شدت کے ساتھ چاہتا ہے کہ دونوں کے ساتھ الگ الگ معاملہ ہونا چاہیے۔ قرآن اُسے توجہ دلاتا اور تعجب کے اسلوب میں پوچھتا ہے کہ اپنی فطرت کی اِس شہادت کے باوجود وہ کیسے یہ گمان رکھتا ہے کہ ظالم اور عادل، دونوں مر کر مٹی ہو جائیں گے اور اُن کا پروردگار اُن کے اعمال کے لحاظ سے اُنھیں کوئی جزا یا سزا نہ دے گا؟

المطففین
۸۳

مَّبۡعُوۡثُوۡنَ ﴿۴﴾ لِيَوۡمٍ عَظِيۡمٍ ﴿۵﴾ يَّوۡمَ يَقُوۡمُ النَّاسُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۶﴾
كَلَّاۤ اِنَّ كِتٰبَ الۡفُجَّارِ لَفِىۡ سِجِّيۡنٍ ﴿۷﴾ وَمَاۤ اَدۡرٰٮكَ
مَا سِجِّيۡنٌ ﴿۸﴾ كِتٰبٌ مَّرۡقُوۡمٌ ﴿۹﴾ وَيۡلٌ يَّوۡمَٮِٕذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ ﴿۱۰﴾
الَّذِيۡنَ يُكَذِّبُوۡنَ بِيَوۡمِ الدِّيۡنِ ﴿۱۱﴾ وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖۤ اِلَّا كُلُّ

کہ ایک دن ضرور اٹھائے جائیں گے؟ ایک بڑے دن کی حاضری کے لیے۔ اُس دن جب لوگ جہانوں کے پروردگار کے حضور میں پیشی کے لیے اُٹھیں گے[۳]۔ ۱-۶

(کہتے ہیں کہ اُس دن انجام میں سب برابر ہوں گے[۴])۔ ہرگز نہیں، نافرمانوں کا نامۂ اعمال یقیناً سجین[۵] میں ہوگا۔ اور تم کیا سمجھے کہ سجین کیا ہے[۶]؟ ایک دفتر ہے لکھا ہوا۔ تباہی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔ یہ جو بدلے کے دن کو جھٹلا رہے ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ اُس کو وہی جھٹلاتا ہے جو حد سے بڑھنے والا، حق تلفی کرنے والا

۳۔ یعنی کسی عام ہستی کے سامنے نہیں، بلکہ رب العٰلمین کے حضور میں پیشی کے لیے اُٹھیں گے تو اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُس کے لیے جو دن مقرر کیا گیا ہے، اُس کی عظمت، اہمیت اور ضرورت کیا ہے اور اُس کے فیصلے کس طرح اُن پر ناطق ہو جائیں گے۔

۴۔ یعنی جانتے ہیں کہ خیر و شر برابر نہیں ہو سکتے۔ ناپ تول میں اِن کا رویہ گواہی دیتا ہے کہ اِس کا شعور اِن کی فطرت میں ودیعت ہے، لیکن پھر بھی کہتے ہیں کہ نیک و بد کا انجام ایک ہی ہوگا۔

۵۔ یہ لفظ یہاں اپنے لغوی مفہوم میں نہیں، بلکہ ایک نام کے طور پر آیا ہے۔ چنانچہ آگے قرآن نے خود وضاحت کر دی ہے کہ یہ 'سِجِّین' کیا ہے۔

۶۔ یہ اسلوب بیان 'سِجِّین' کے ہول کو ظاہر کرتا ہے۔

المطففین
۸۳

مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝١٢ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝١٣
كَلَّا بَلْ سكتة رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝١٤ كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ
رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝١٥ ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ۝١٦

المطففين
٨٣

ہے[7]۔ اُسے جب ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ اگلوں کے افسانے ہیں۔ ہرگز نہیں، بلکہ اِن کے دلوں پر اِن کے عمل کا زنگ بیٹھ گیا ہے[8]۔ (اِن کا خیال ہے کہ قیامت ہوئی تو وہاں بھی یہی مقرب ہوں گے)۔ ہرگز نہیں، اُس دن تو یہ اپنے پروردگار سے روک دیے جائیں گے،[9] پھر لازماً دوزخ میں جا پڑیں گے، پھر

۷۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کو کوئی شخص علم و عقل کی بنیاد پر نہیں جھٹلا سکتا۔ اِسے جھٹلانے کی جرأت وہی لوگ کر سکتے ہیں جو دنیا میں ظلم و عدوان کا رویہ اختیار کر کے اپنی فطرت کو مسخ کر چکے ہوں۔

۸۔ یعنی نفس کی خواہشوں کو انھوں نے اِس طرح اپنا رہنما بنایا ہے کہ اِن کی بدعملیوں کا زنگ اِن کے دلوں پر بیٹھ گیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اللہ تعالیٰ نے فطرت کے اندر جو دلائل ودیعت فرمائے ہیں اور عقل و دل کے اندر سوچنے سمجھنے کی جو صلاحیت بخشی ہے، یہ چیزیں کام اُسی صورت میں آتی ہیں، جب انسان اِن کی قدر کرے اور اِن سے فائدہ اٹھائے۔ اگر اِن سے فائدہ نہ اٹھائے، بلکہ اِن کے مقابل میں نفس کی خواہشوں ہی کو اپنا رہنما بنا لے اور اِن اعلیٰ صلاحیتوں کو ٹھکرا دے تو آہستہ آہستہ آدمی کی بدعملیوں کا زنگ اِن پر چڑھنا شروع ہوتا ہے اور بالتدریج اِس طرح اِن کا احاطہ کر لیتا ہے کہ اِن کے اندر کسی صحیح چیز کے داخل ہونے کی کوئی گنجایش سرے سے باقی ہی نہیں رہ جاتی۔“

(تدبر قرآن ۹/۲۵۹)

۹۔ یعنی اُس کے قرب، اُس کی عنایات اور اُس کے انوار و تجلیات کے مشاہدے سے بالکل

ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۷﴾

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ﴿۱۸﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ﴿۱۹﴾ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴿۲۰﴾ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۱﴾ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿۲۲﴾ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴿۲۳﴾ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ﴿۲۴﴾ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ﴿۲۵﴾ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ؕ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴿۲۶﴾

المطففين
۸۳

کہا جائے گا: یہ وہی چیز ہے جس کو تم جھٹلاتے رہے ہو[۱۰]۔ ۷-۱۷

(نہیں، اچھے اور برے کبھی برابر نہیں ہو سکتے)، ہرگز نہیں، فرماں برداروں کا نامۂ اعمال یقیناً علّیّین میں ہوگا۔ اور تم کیا سمجھے یہ علّیّین کیا ہے[۱۱]؟ ایک دفتر ہے لکھا ہوا، مقرب فرشتوں کی نگرانی میں۔ بے شک، یہ فرماں بردار (وہاں) نعمتوں میں گھرے ہوں گے، تختوں پر بیٹھے سیر دیکھتے۔ اِن کے اِس عیش کی تازگی تم اِن کے چہروں پر دیکھو گے۔ اِنھیں سر بندمے ناب پلائی جائے گی، جس پر مشک کی مہر لگی ہوگی۔ یہ چیز ہے کہ جس کی طلب میں طالبوں کو ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کے لیے سرگرم ہونا چاہیے[۱۲] ـــــ اور

محروم کر دیے جائیں گے۔

۱۰؎ آیت میں لفظ 'ثُمَّ' دو مرتبہ آیا ہے۔ یہ جس طرح دہرایا گیا ہے، اِس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اِن کی فضیحت کے لیے یہ بات اِن سے خاص اہتمام کے ساتھ کہی جائے گی۔

۱۱؎ 'سِجِّیْن' کے ذکر میں یہ اسلوب بیان اُس کے ہول کے اظہار کے لیے اختیار کیا گیا تھا۔ یہاں یہ 'عِلِّیِّیْن' کی عظمت و شان پر دلالت کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔

۱۲؎ یعنی جدوجہد، سرگرمی اور ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوششوں کا میدان اگر کوئی

وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ﴿۲۷﴾ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۸﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ﴿۲۹﴾ وَاِذَا
مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ﴿۳۱﴾
وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ﴿۳۲﴾ وَمَآ اُرْسِلُوْا

اُس میں تسنیم کی ملونی[13] ہوگی، ایک خاص چشمہ[14] جس کے کنارے بیٹھ کر خدا کے یہ مقرب بندے پییں گے۔[15] ۱۸-۲۸

(وہ بھی دن تھے کہ) یہ مجرم ایمان والوں پر ہنستے تھے، جب اُن کے پاس سے گزرتے تو آنکھوں سے اشارے کرتے تھے، جب اپنے لوگوں میں پلٹتے تو مزے لیتے ہوئے پلٹتے تھے[16]، اور جب اُن کو دیکھتے تو کہتے تھے کہ بے شک، یہ بہکے ہوئے لوگ

ہے تو یہی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...یہ اہل ایمان کے لیے ترغیب وتشویق بھی ہے اور اِس میں اُن سگان دنیا پر طنز بھی ہے جو حیات چند روزہ کی حقیر و فانی لذتوں کے حصول کی جدوجہد میں اپنے رات دن ایک کیے ہوئے ہیں اور چاہنے کی جو چیزیں ہیں، اُن کا چاہنے والا کوئی بھی نہیں ہے۔" (تدبر قرآن ۲۶۱/۹)

۱۳؎ ملونی کا لفظ اُن چیزوں کے لیے بولا جاتا ہے جو شراب کے کیف میں اضافے یا اُس کی تندی میں اعتدال پیدا کرنے کے لیے اُس میں ملائی جاتی ہیں۔

۱۴؎ اصل میں لفظ 'عَيْنًا' آیا ہے۔ اِس کا نصب اختصاص کے لیے ہے۔

۱۵؎ اصل الفاظ ہیں: 'يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ'۔ 'بِهَا' میں 'ب' ظرفیت کے مفہوم میں ہے۔ لب جو بیٹھ کر پینا مے نوشی کے لوازم میں سے ہے، لہٰذا خاص اہتمام کے ساتھ فرمایا ہے کہ مقربین کے لیے یہ بزم چشمۂ تسنیم کے کنارے آراستہ کی جائے گی۔

۱۶؎ یعنی ایسے سفلہ تھے کہ اپنے گھروں میں جاتے تو اِن حرکتوں پر ندامت کے بجائے اِن کا

عَلَيۡهِمۡ حٰفِظِيۡنَ ﴿۳۳﴾ فَالۡيَوۡمَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنَ الۡكُفَّارِ يَضۡحَكُوۡنَ ﴿۳۴﴾
عَلَى الۡاَرَآئِكِ ۙ يَنۡظُرُوۡنَ ﴿۳۵﴾ هَلۡ ثُوِّبَ الۡكُفَّارُ مَا كَانُوۡا يَفۡعَلُوۡنَ ﴿۳۶﴾

سورة الإنشقاق

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اِذَا السَّمَآءُ انۡشَقَّتۡ ﴿۱﴾ وَ اَذِنَتۡ لِرَبِّهَا وَحُقَّتۡ ﴿۲﴾ وَ اِذَا
الۡاَرۡضُ مُدَّتۡ ﴿۳﴾ وَ اَلۡقَتۡ مَا فِيۡهَا وَتَخَلَّتۡ ﴿۴﴾ وَ اَذِنَتۡ

ہیں۔ یہ اصلاح کے مدعی بن کر اٹھے ہیں، دراں حالیکہ یہ اُن پر کوئی نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے[۱۷]۔ لیکن آج ایمان والے اِن منکروں پر ہنس رہے ہیں، تختوں پر بیٹھے اِن کا انجام دیکھتے ہوئے ـــــ کیوں، پالیا نا اِن منکروں نے اپنے کرتوتوں کا بدلہ! ۲۹-۳۶

ـــــ ۲ ـــــ

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے پروردگار کے حکم کی تعمیل کرے گا اور اُسے یہی زیبا ہے[۱۸]، اور جب زمین تان دی جائے گی[۱۹] اور جو کچھ اُس کے اندر ہے، اُسے باہر

ذکر بڑے فخر کے ساتھ اپنے گھر والوں سے بھی کرتے تھے۔

۱۷۔ یہ منکرین ہی کے قول کا ایک حصہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...یعنی پوری بات یوں ہے کہ جب وہ مسلمانوں کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ پکے گم راہ ہیں، یہ ہمارے اعمال وعقائد کو کفر وشرک قرار دیتے ہیں، حالاں کہ یہ ہمارے اوپر داروغہ مقرر کر کے نہیں بھیجے گئے ہیں کہ ہماری ہر چیز پر اعتراض اٹھائیں اور ہماری اصلاح کے مدعی بن کر کھڑے ہوں۔“ (تدبر قرآن ۹/۲۶۳)

لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ﴿۵﴾

يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ﴿۶﴾

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ﴿۷﴾ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا

پھینک کر خالی ہو جائے گی اور اپنے پروردگار کے حکم کی تعمیل کرے گی اور اُسے یہی چاہیے، وہی تمھارے پروردگار سے ملاقات کا دن ہو گا۔ ۱-۵

اے انسان[۲۰]، تو بھی (اِسی دن کے لیے) کشاں کشاں اپنے پروردگار کی طرف جا رہا ہے[۲۱] اور اُس سے ضرور ملنے والا ہے۔ پھر جس کا نامۂ اعمال وہاں اُس کے دہنے ہاتھ

۱۸؎ یعنی انسان جس زعم میں چاہے، مبتلا رہے، لیکن حق یہ ہے کہ آسمان جیسی عظیم چیز کے لیے بھی یہی زیبا ہے کہ وہ اپنے پروردگار کے حکم کی تعمیل کرے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''یہ فقرہ یہاں اُن مغروروں کی تنبیہ وتعلیم کے لیے آیا ہے جو بات بات پر اللہ اور رسول کے خلاف محاذ قائم کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ برسر موقع اُن کو توجہ دلا دی گئی کہ آسمان تو اپنے رب کے حکم کی تعمیل میں پاش پاش ہو جائے گا اور یہی اُس کے لیے زیبا ہے۔ اب وہ نادان جن کی حیثیت اِس آسمان کے نیچے بالکل ایک ذرۂ بے مقدار کی ہے، سوچ لیں کہ اُن کا یہ رویہ کس طرح جائز ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے رب سے لڑنے اُٹھیں اور اِس زعم میں مبتلا ہوں کہ کوئی اُن کو اُن کی جگہ سے ہلا نہیں سکتا!'' (تدبر قرآن ۹/۲۷۱)

۱۹؎ مطلب یہ ہے کہ زمین کے نشیب وفراز، دریا، پہاڑ اور وادیاں، سب برابر ہو جائیں گی اور وہ ایک چادر کی طرح تان دی جائے گی۔

۲۰؎ خطاب اگرچہ عام ہے، لیکن روے سخن قریش کے اُنھی مغروروں کی طرف ہے جو اِس سورہ کے مخاطب ہیں۔

۲۱؎ یہ اُس حالت کی تصویر ہے جس میں ہم سب خدا کے قانون کی زنجیروں میں بندھے ہوئے

يَّسِيْرًا ۙ﴿۸﴾ وَّيَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ؕ﴿۹﴾ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۙ﴿۱۰﴾ فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۙ﴿۱۱﴾ وَّيَصْلٰى

میں دیا جائے گا، اُس کا حساب نہایت ہلکا ہوگا[۲۲] اور وہ خوش خوش اپنے لوگوں کی طرف پلٹ آئے گا[۲۳]۔ اور جس کا نامۂ اعمال اُس کے پیچھے ہی سے[۲۴] (اُس کے بندھے ہوئے

نہایت بے بسی کے ساتھ اپنے رب کے حضور میں پیشی کے لیے اُس کی طرف جا رہے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...یہ نہایت بلیغ تعبیر ہے اِس حقیقت کی کہ انسان جس دن سے وجود میں آتا ہے، اُسی دن سے اُس کا سفر خدا کی ٹھیرائی ہوئی منزل، یعنی موت کی راہ میں شروع ہو جاتا ہے اور یہ سفر بلا کسی توقف کے جاری رہتا ہے۔ موسم سخت ہو یا نرم، آدمی مریض ہو یا صحت مند، حالات مساعد ہوں یا نامساعد، کسی حال میں بھی یہ منقطع نہیں ہوتا۔ ولادت سے لے کر موت تک بچپن، مراہقہ، جوانی، ادھیڑ پن، پیری اور ناتوانی کے مختلف مراحل آتے ہیں، لیکن اِس میں ایک منٹ، بلکہ سیکنڈ کے لیے بھی وقفہ نہیں ہوتا۔ انسان قانون قدرت کی زنجیروں میں ایسا جکڑا ہوا ہے کہ وہ اِس راہ میں نہ بھی چلنا چاہے، جب بھی اُس کو چلنا پڑے گا اور اِس بے بسی میں شاہ اور گدا، شریف اور وضیع، امیر اور مامور، نیک اور بد، سب یکساں ہیں۔“ (تدبر قرآن ۹/۲۷۳)

۲۲۔ مطلب یہ ہے کہ حساب تو ہوگا، لیکن نہایت ہلکا ہوگا اور نیکیوں کا پلڑا بھاری دیکھ کر اُس کی غلطیوں سے درگذر کی جائے گی۔

۲۳۔ یعنی اپنے اُن اہل و عیال کی طرف پلٹ آئے گا جن کی عاقبت سنوارنے کے لیے وہ دنیا میں فکرمند رہا۔

۲۴۔ اِن الفاظ سے یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ اُس کے دونوں ہاتھ مجرموں کی طرح پیچھے بندھے ہوں گے۔ سورۂ حاقہ (۶۹) کی آیت ۲۵ میں وضاحت ہے کہ مجرموں کے اعمال نامے اُن کے بائیں ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے۔ یہاں مزید وضاحت کر دی ہے کہ سامنے سے دیے

سَعِيۡرًا ۞ اِنَّهٗ كَانَ فِيۡۤ اَهۡلِهٖ مَسۡرُوۡرًا ۞ اِنَّهٗ ظَنَّ اَنۡ لَّنۡ يَّحُوۡرَ ۞ بَلٰۤى ۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيۡرًا ۞

فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِالشَّفَقِ ۞ وَالَّيۡلِ وَمَا وَسَقَ ۞ وَالۡقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۞ لَتَرۡكَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ ۞

ہاتھوں میں) پکڑا دیا جائے گا، وہ جلد موت کی دہائی دے گا اور دوزخ میں جا پڑے گا۔[25] یہ اپنے لوگوں میں مگن رہا۔ اِس کا خیال تھا کہ اِسے ہرگز کہیں پلٹ کر نہیں جانا ہے۔ ہاں، کیوں نہیں، اِسے ضرور پلٹ کر جانا ہے۔ اِس لیے کہ اِس کا پروردگار تو اِسے دیکھ رہا تھا۔ ۶-۱۵

اِس لیے یہ بات نہیں،[26] میں شفق کو گواہی میں پیش کرتا ہوں، اور رات کو اور اُس کے سمیٹ لینے کو،[27] اور چاند کو، جب وہ پورا ہو جائے کہ (اپنے پروردگار کے حضور میں پیشی کے لیے) تم بھی درجہ بدرجہ لازماً اِسی طرح اوپر چڑھو گے۔[28] ۱۶-۱۹

جانے کے بجائے یہ پیچھے ہی سے اُن کو پکڑا دیے جائیں گے۔

۲۵؎ یہ الفاظ بظاہر 'موت کی دہائی دے گا' سے پہلے آنے چاہییں تھے، لیکن بلاغت کے تقاضے سے مسبب کو سبب پر مقدم کر دیا ہے تاکہ یہ 'فَسَوۡفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيۡرًا' کے بالمقابل آ جائے۔

۲۶؎ یعنی یہ بات نہیں کہ دنیا میں تمھیں ڈھیل ملی ہوئی ہے تو اب یہیں رہ جاؤ گے۔

۲۷؎ اصل الفاظ ہیں: 'مَا وَسَقَ'۔ اِن میں 'مَا' ہمارے نزدیک مصدریہ ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۲۸؎ یعنی جس طرح شفق کی سرخی بتدریج رات کے اندھیرے میں تبدیل ہو جاتی اور وہ آہستہ

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٢٠﴾ وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ ﴿٢١﴾ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ ﴿٢٢﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ ﴿٢٣﴾ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٢٤﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴿٢٥﴾

سو اِنھیں کیا ہو گیا ہے کہ نہیں مانتے اور جب اِن کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو (اُس کی عظمت کے اعتراف میں) سجدہ ریز نہیں ہو جاتے! بلکہ (تعجب ہے کہ) یہ منکر تو الٹا جھٹلا رہے ہیں، حالاں کہ جو کچھ یہ جمع کر رہے ہیں[29]، اللہ اُسے خوب جانتا ہے۔ اِس لیے، (اے پیغمبر)، اِنھیں ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔ ہاں، جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہیں، اُن کے لیے وہاں دائمی اجر ہے۔ ۲۰-۲۵

آہستہ ہر چیز کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے، اور جس طرح پہلی تاریخوں کا چاند درجہ بدرجہ ماہ کامل بن جاتا ہے، اُسی طرح تمھاری یہ دنیا بھی بتدریج آگے بڑھتی ہوئی ایک دن قیامت کی منزل تک پہنچ جائے گی اور تم اپنے پروردگار کے حضور میں پیش ہو جاؤ گے۔

۲۹ یعنی اپنے اعمال اور نتائج اعمال کی صورت میں جو کچھ جمع کر رہے ہیں۔

کوالالمپور

۲۸ر فروری ۲۰۱۰ء

البروج - الطارق

۸۵ ـــــ ۸٦

البروج - الطارق

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ میں بنائے استدلال آفاق کے آثار و شواہد اور تاریخ کے ناقابل تردید حقائق ہیں۔ دوسری سورہ میں آفاقی دلائل کے ساتھ انسان کی خلقت میں خدا کی قدرت و حکمت کی نشانیوں کو بھی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ دونوں میں روے سخن قریش کے سرداروں کی طرف ہے اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ پچھلی سورتوں کی طرح یہ بھی ام القریٰ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ انذار عام میں نازل ہوئی ہیں۔

دونوں سورتوں کا موضوع قیامت سے متعلق قریش کے شبہات کی تردید اور اُنھیں تہدید ہے کہ اہل ایمان پر اُن کا ظلم و ستم اور پیغمبر کے مقابلے میں اُن کی چالیں اب اپنے انجام تک پہنچنے کو ہیں۔ استدراج کا جو دام اُن کے لیے بچھایا گیا ہے، اُس سے وہ نکل نہ سکیں گے۔ اُن کا وقت اب قریب آ لگا ہے۔

سورة البروج

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الۡبُرُوۡجِ ۙ﴿۱﴾ وَالۡیَوۡمِ الۡمَوۡعُوۡدِ ۙ﴿۲﴾ وَشَاهِدٍ وَّمَشۡهُوۡدٍ ؕ﴿۳﴾ قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ ۙ﴿۴﴾ النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ ۙ﴿۵﴾

— ۱ —

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

برجوں والا آسمان گواہی دیتا ہے[1] اور وہ دن بھی جس کا وعدہ (تم سے) کیا جا رہا ہے[2]؛ اور (دنیا میں) ہر دیکھنے والا، (اگر وہ عبرت کی نگاہ سے دیکھے) اور جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے[3]، یہ سب گواہی دیتے ہیں کہ قیامت ہو کر رہے گی[4]۔ (اِس لیے) مارے گئے

[1] برج کے معنی قلعے اور گڑھی کے ہیں۔ یہاں اِس سے مراد آسمان کے وہ قلعے اور گڑھیاں ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے فرشتے برابر کائنات کی نگرانی کے لیے مامور رہتے ہیں۔ اِن کی گواہی اِس لیے پیش کی گئی کہ مکہ اور طائف کے فراعنہ کو متنبہ کیا جائے کہ مسلمانوں پر جو ظلم و ستم وہ توڑ رہے ہیں، اُس کا یوم حساب دور نہیں ہے۔ آسمان کے برج گواہی دیتے ہیں کہ ہر چیز خدا کی نگاہ میں ہے اور اُس کے کروبی اُن میں بیٹھے ہوئے ہر گوشے کی نگرانی کر رہے ہیں۔ یہ اہتمام اِسی لیے کیا گیا ہے کہ دنیا کو جزا و سزا کے دن تک پہنچانا مقصود ہے۔

[2] یعنی روز قیامت جو آپ ہی اپنی گواہی ہے۔ کوئی ذی ہوش اس کا انکار نہیں کر سکتا، اِس لیے کہ اِس کی شہادت خود انسان کے نفس کے اندر موجود ہے، اِس کو ثابت کرنے کے لیے کسی خارجی شہادت کی ضرورت نہیں ہے۔

[3] اِس سے مراد خدا کی قدرت، رحمت، حکمت اور ربوبیت کی نشانیاں اور زمین پر اُس کی

اِذۡ هُمۡ عَلَیۡهَا قُعُوۡدٌ ۙ﴿۶﴾ وَّ هُمۡ عَلٰی مَا یَفۡعَلُوۡنَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ شُهُوۡدٌ ؕ﴿۷﴾
وَ مَا نَقَمُوۡا مِنۡهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَمِیۡدِ ۙ﴿۸﴾ الَّذِیۡ

ایندھن بھری آگ کی گھاٹی والے[۵]، جب وہ (دوزخ میں) اُس پر بیٹھ گئے اور جو کچھ وہ (دنیا میں) ایمان والوں کے ساتھ کرتے رہے، اُس کا نتیجہ دیکھ رہے ہیں[۶]۔ ۱-۷

یہ محض اِس لیے اِن کے دشمن ہو گئے کہ اِنھوں نے اللہ کو مان لیا، وہ زبردست، اپنی

البروج
۸۵

دینونت کے مظاہر ہیں جنھیں انسان ہمیشہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتے رہے ہیں۔

۴؎ یہ اوپر کی سب قسموں کا مقسم علیہ ہے جو اصل میں وضاحت قرینہ کی بنا پر حذف کر دیا گیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...یہ طریقہ اُن مواقع میں اختیار کیا جاتا ہے جہاں جواب قسم اِس قدر واضح ہو کہ ذکر کے بغیر بھی ذہن اُس کی طرف بے تکلف منتقل ہو سکے۔ اِس سے کلام میں ایجاز بھی پیدا ہو جاتا ہے اور وہ ساری بات جواب قسم کی حیثیت سے محذوف بھی مانی جا سکتی ہے جس کے لیے کلام کا سیاق و سباق مقتضی ہو۔“ (تدبر قرآن ۹/۲۸۹)

۵؎ یہ قریش کے اُن فراعنہ کو وعید ہے جو مسلمانوں کو ایمان سے پھیرنے کے لیے ظلم و ستم کا بازار گرم کیے ہوئے تھے۔ اُنھیں بتایا گیا ہے کہ وہ اگر اپنی روش سے باز نہ آئے تو دوزخ کی اُس گھاٹی میں پھینک دیے جائیں گے جو ایندھن سے بھری ہوئی ہے۔ اُس کی آگ نہ دھیمی ہو گی اور نہ بجھے گی۔

۶؎ یہ اِن اشقیا کے انجام کی تصویر ہے کہ وہ آگ بھری گھاٹی پر بیٹھ کر اپنا ٹھکانا دیکھیں گے اور پھر اپنے کرتوتوں کا انجام بھگتنے کے لیے اُسی میں پھینک دیے جائیں گے۔ اِس کے لیے ماضی کے صیغے قطعیت کے اظہار کے لیے اختیار کیے گئے ہیں۔ قرآن میں یہ اسلوب دوسرے مقامات میں

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ؕ ۹
اِنَّ الَّذِیْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَتُوْبُوْا

ذات میں آپ محمود، وہی جو زمین اور آسمانوں کی سلطنت کا مالک ہے[ے]۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے[۸]۔ ۸-۹

جن لوگوں نے مومن مردوں اور عورتوں کو ستایا[۹] اور پھر نہیں پلٹے، اُن کے لیے

البروج
۸۵

بھی ہے۔ لفظ 'شُهُود' 'نتیجۂ فعل' کے معنی میں ہے۔ اِس کی مثالیں بھی قرآن میں کئی مقامات پر دیکھی جاسکتی ہیں۔

ے یعنی اِن کو صرف اِس جرم کی سزا دی جا رہی ہے کہ یہ اللہ پر ایمان لے آئے ہیں۔ اِس کے لیے اللہ تعالیٰ کی دو صفتوں 'الْعَزِیْز' اور 'الْحَمِیْد' کا حوالہ قابل توجہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...صفت 'عزیز' اُس کی عزت، قدرت، شان اور عظمت و جلال کو ظاہر کرتی ہے اور 'حمید' سے اُس کی رحمت، ربوبیت اور سزا وار حمد و شکر ہونے کا اظہار ہوتا ہے۔ اِن کے حوالے سے مقصود اِس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ جو ذات اِن صفات سے متصف ہے، وہی حق دار ہے کہ اُس پر ایمان لایا جائے۔ جو اُس پر ایمان لائے، اُنھوں نے اُس کا سہارا لیا ہے جس کا سہارا ہی اصل سہارا ہے اور وہی فلاح پانے والے ہوں گے۔ اِس میں ضمناً مظلوم مسلمانوں کے لیے جو بشارت اور اُن کے درپے آزار کفار کے لیے جو وعید مضمر ہے، وہ محتاج بیان نہیں ہے۔"

(تدبر قرآن ۲۹۱/۹)

۸ یعنی اِن کے ظلم و ستم کو بھی دیکھ رہا ہے اور اِس کے مقابلے میں ایمان والوں کی استقامت کو بھی دیکھ رہا ہے۔ لہٰذا وہ وقت دور نہیں، جب وہ اِن اشقیا سے اپنے مظلوم بندوں کا انتقام لے گا اور بھرپور انتقام لے گا۔

۹ اصل میں لفظ 'فَتَنُوْا' آیا ہے۔ قرآن مجید میں یہ خاص کر اُس ظلم و ستم کے لیے آتا ہے جو کسی

فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ ﴿١٠﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيرُ ﴿١١﴾

إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ ﴿١٢﴾ إِنَّهُ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيدُ ﴿١٣﴾ وَهُوَ الْغَفُورُ الْوَدُودُ ﴿١٤﴾ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ ﴿١٥﴾ فَعَّالٌ لِمَا يُرِيدُ ﴿١٦﴾

دوزخ کی سزا ہے اور اُن کے لیے جلنے کا عذاب ہے[10]۔ اِس کے برخلاف جو اپنے ایمان پر قائم رہے[11] اور جنھوں نے نیک عمل کیے، اُن کے لیے بہشت کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہی درحقیقت بڑی کامیابی ہے۔ ۱۰-۱۱

تیرے پروردگار کی پکڑ یقیناً بڑی سخت ہے، (یہ کسی غلط فہمی میں نہ رہیں)۔ کچھ شک نہیں کہ وہی ابتدا کرتا ہے اور وہی لوٹائے گا[12]۔ وہ بخشنے والا ہے، اگر یہ پلٹیں۔ بڑی محبت کرنے والا، عرش کا مالک، بزرگ و برتر، جو چاہے کر ڈالنے والا ہے[13]۔ ۱۲-۱۶

پر اُس کے دین سے اُس کو پھیرنے کے لیے کیا جائے۔ آیت میں مردوں کے ساتھ عورتوں کا بھی ذکر ہے۔ یہ اِس اہتمام کے ساتھ اِس لیے کیا گیا ہے کہ اپنی کم زوری کے باعث اُس زمانے میں وہ، خاص طور پر نشانۂ ستم بنی ہوئی تھیں۔

۱۰؎ یعنی دوزخ کی دوسری سزاؤں کے ساتھ اُن کے لیے خاص طور پر آگ کا عذاب بھی ہے۔

۱۱؎ اصل میں فعل 'اٰمَنُوْا' آیا ہے۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہ اپنے کامل معنی میں ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۱۲؎ اوپر کی آیتوں میں قیامت کی جس جزا و سزا کا ذکر ہے، یہ اُس کی دلیل بیان کر دی ہے کہ

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ﴿۱۷﴾ فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ ﴿۱۸﴾
بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ﴿۱۹﴾ وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ ﴿۲۰﴾
بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿۲۱﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿۲۲﴾

سورۃ الطارق

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ﴿۱﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ﴿۲﴾ النَّجْمُ

تجھے اُن لشکروں کی خبر پہنچی ہے (جو اِسی طرح سرکش ہو گئے تھے)؟ فرعون اور ثمود کے لشکروں کی؟[14] (پھر کیا یہ کوئی جھٹلانے کی چیز ہے)؟ ہرگز نہیں، بلکہ اِن منکروں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ یہ جھٹلانے میں لگے رہیں گے اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ اِنھیں آگے اور پیچھے سے گھیرے ہوئے ہے۔ نہیں، یہ کوئی جھٹلانے کی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ بلند پایہ قرآن ہے۔ (ہر شیطان کی دراندازی سے بالاتر)، یہ لوح محفوظ میں ہے۔ ۱۷-۲۲

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

آسمان گواہی دیتا ہے اور رات میں آنے والے بھی۔ اور تم کیا سمجھے کہ رات میں

جب خدا نے پیدا کیا ہے تو وہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھا بھی سکتا ہے۔ جب پہلی بار پیدا کرنے میں اُس کو کوئی مشکل پیش نہیں آئی تو دوبارہ کیوں آئے گی؟

۱۳؎ یعنی نہ وہ کسی کا محتاج ہے اور نہ کوئی اُس کے ارادوں میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔

۱۴؎ اوپر جو حقائق بیان ہوئے ہیں، یہ اُن کو ثابت کرنے کے لیے تاریخ کی بعض مثالوں کی

الثَّاقِبُ ﴿۳﴾ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ﴿۴﴾ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ﴿۵﴾ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ﴿۶﴾ يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ﴿۷﴾ اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ﴿۸﴾

آنے والے کیا ہیں؟ چمکتے تارے۔ یہ سب گواہی دیتے ہیں کہ بے شک، ہر جان پر ایک نگہبان مقرر ہے[۱۵]۔ ۱-۴

اچھا تو انسان[۱۶] ذرا یہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ اچھلتے پانی سے جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔ (اُس کا پروردگار اِس طرح

طرف اشارہ فرمایا ہے۔

۱۵۔ اصل الفاظ ہیں: 'اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ'۔ اِن میں 'ل' کے بجائے 'لَمَّا' اشباع کے اصول پر محض آہنگ کو برقرار رکھنے کے لیے آ گیا ہے۔ آیت میں جن نگہبانوں کا ذکر ہے، وہ اِسی لیے مقرر کیے گئے ہیں کہ ایک یوم الحساب آنے والا ہے جس میں ہر شخص کا علم و عمل محاسبے کے لیے پیش کیا جائے گا۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ اِس کو سمجھنے کے لیے آسمان کو دیکھنا چاہیے جس کا محکم نظام انسان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ اِسی طرح تاروں کو دیکھنا چاہیے جن کی نگاہیں ہر وقت اُس پر لگی رہتی ہیں۔ کس کی مجال ہے کہ اُن کی نگرانی سے اپنے آپ کو بچا لے۔ یہ خدا کے پہرے دار ہیں جو کبھی نہیں سوتے۔ انسان غور کرے تو یہ عظیم الشان انتظام گواہی دے رہا ہے کہ خدا کے لیے ذرا مشکل نہیں ہے کہ وہ ہر جان پر ایک نگہبان مقرر کر دے جو اُس کی ایک ایک چیز کو دیکھتا رہے۔ لہٰذا ہر شخص کو سمجھ لینا چاہیے کہ نہ دنیا کوئی بے راعی کا گلہ ہے اور نہ انسان کو اُس میں شتر بے مہار بنا کر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اُس کے لیے ایک یوم الحساب لازماً آنا ہے جس کے احتساب سے کوئی بھی خود کو بچا نہ سکے گا۔

۱۶۔ لفظ انسان اگرچہ عام ہے، لیکن روے سخن قریش کے اُنھی سرداروں کی طرف ہے جو سورہ

الطارق
۸۶

يَوۡمَ تُبۡلَى السَّرَآئِرُ ۙ﴿۹﴾ فَمَا لَهٗ مِنۡ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ؕ﴿۱۰﴾
وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجۡعِ ۙ﴿۱۱﴾ وَالۡاَرۡضِ ذَاتِ الصَّدۡعِ ۙ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ
لَقَوۡلٌ فَصۡلٌ ۙ﴿۱۳﴾ وَّمَا هُوَ بِالۡهَزۡلِ ؕ﴿۱۴﴾

پیدا کر سکتا ہے تو) یقیناً وہ اُسے لوٹا بھی سکتا ہے[۱۷]۔ ۵-۸

اُس دن، جب دلوں کے بھید پرکھے جائیں گے[۱۸]، اُس وقت انسان کے پاس نہ کوئی زور ہو گا اور نہ کوئی مدد کرنے والا۔ ۹-۱۰

(پھر یہی نہیں)، آسمان گواہی دیتا ہے، بارش برسانے والا اور زمین گواہی دیتی ہے، پھٹ جانے والی[۱۹] کہ ہماری یہ بات ایک دوٹوک بات ہے۔ یہ کوئی ہنسی مسخری نہیں ہے[۲۰]۔ ۱۱-۱۴

کے مخاطب ہیں۔

۱۷؎ یعنی اِس طرح ایک حقیر پانی سے پیدا کر سکتا ہے تو یقیناً لوٹا بھی سکتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... یہ پانی نہ کوئی جوہر نایاب ہے اور نہ یہ کسی ایسی ولایت سے آتا ہے جو خدا کی خدائی کے حدود سے باہر ہو، بلکہ انسان ہی کی ریڑھ اور اُس کی چھاتیوں کے بیچ سے اچھلتا ہے اور قدرت اِسی کو اپنے سانچے میں جس شکل و صورت پر چاہتی ہے، ڈھالتی ہے اور پھر اُس کو بطن مادر سے باہر لاتی ہے۔“ (تدبر قرآن ۹/ ۳۰۳)

۱۸؎ یعنی جب اعمال کے ساتھ اُن کے پیچھے دلوں میں چھپا ہوا اخلاص بھی پرکھا جائے گا اور نیتوں کا فساد بھی۔

۱۹؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَالۡاَرۡضِ ذَاتِ الصَّدۡعِ'۔ 'صَدۡع' کے معنی پھٹنے کے ہیں۔ یہ اُس حالت کی تعبیر ہے، جب بارش سے زمین کے مسامات کھل جاتے ہیں اور وہ پانی جذب کر کے پھول

اِنَّهُمۡ يَكِيۡدُوۡنَ كَيۡدًا ﴿۱۵﴾ وَّاَكِيۡدُ كَيۡدًا ﴿۱۶﴾ فَمَهِّلِ الۡكٰفِرِيۡنَ اَمۡهِلۡهُمۡ رُوَيۡدًا ﴿۱۷﴾

(اِس کے بارے میں) یہ ایک چال چل رہے ہیں[۲۱] اور میں بھی ایک چال چل رہا ہوں[۲۲]۔ اِس لیے اِن منکروں کو چھوڑ دو، (اے پیغمبر)، اِنھیں بس ذرا دیر کے لیے چھوڑ دو[۲۳]۔ ۱۵-۱۷

پودوں سے لہلہا اُٹھتی ہے۔

۲۰؎ اوپر انسان کی خلقت سے جزا و سزا پر استدلال کیا ہے۔ یہ اب اِسی دعوے پر ایک آفاقی دلیل پیش فرمائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آسمان کی بارش سے جس طرح زمین کے بطن میں چھپا ہوا سبزہ جی اٹھتا ہے اور اُس کے شگافوں سے نکل کر لہلہانے لگتا ہے، قیامت کے دن جب خدا کا حکم ہوگا تو اُس میں دفن مردے بھی اُسی طرح جی اُٹھیں گے۔ موت کے بعد زندگی کا یہ مشاہدہ تم ہر روز کرتے ہو۔ یہ اِس بات کی دلیل ہے کہ قیامت کے بارے میں قرآن کا دعویٰ بھی ایک قول فیصل ہے۔ یہ ہرگز کوئی مذاق کی بات نہیں ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''جس طرح سابق سورہ کے آخر میں مکذبین قیامت کو متنبہ فرمایا ہے کہ قرآن کے اِس انذار کا مذاق نہ اڑاؤ، یہ لوح محفوظ سے اترا ہوا نہایت برتر کلام ہے، اُسی طرح اِس سورہ کے آخر میں ایک نئے اسلوب سے آگاہ فرمایا کہ یہ قرآن جس روز حساب سے تمھیں آگاہ کر رہا ہے، وہ ایک امر قطعی اور اٹل ہے جس سے تمھیں لازماً سابقہ پیش آنا ہے تو اِس کو مذاق کا موضوع نہ بناؤ، بلکہ دانش مندی اور عاقبت بینی کا تقاضا یہ ہے کہ اِس کو توجہ سے سنو، سمجھو اور آنے والے دن کی تیاری کرو۔'' (تدبر قرآن ۹/۳۰۵)

۲۱؎ اشارہ ہے اُن شبہات کی طرف جو قیامت کے بارے میں لوگوں کو الجھن میں ڈالنے اور احمق بنائے رکھنے کے لیے گھڑے جا رہے تھے، دراں حالیکہ گھڑنے والے بھی جانتے تھے کہ یہ

محض سخن سازی ہے جو حقیقت سے فرار کے لیے کی جا رہی ہے۔

۲۲؎ یعنی یہ چال کہ انھیں اُس وقت پکڑوں جب اِن کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے۔

۲۳؎ مطلب یہ ہے کہ خدا نے اِن کی باگ اگرچہ تمھارے ہاتھ میں دے دی ہے، لیکن وہ یہ چاہتا ہے کہ انھیں ذرا سی ڈھیل اور دے دی جائے تاکہ یہ اپنا پیمانہ بھر لیں اور جب پکڑے جائیں تو کوئی عذر پیش نہ کر سکیں۔

کوالالمپور

۲/ مارچ ۲۰۱۰ء

الاعلیٰ - الغاشیۃ

۸۷ــــ۸۸

الاعلیٰ - الغاشیۃ

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ اِن میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہے اور قریش کے سرداروں سے بھی، اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ پچھلی سورتوں کی طرح یہ بھی ام القریٰ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ انذار عام میں نازل ہوئی ہیں۔

دونوں سورتوں کا موضوع انذار قیامت ہے، لیکن دونوں میں اِس کے ساتھ داعی کے لیے تسلی اور مخاطبین کے رویے پر حسرت و افسوس کا مضمون بھی نمایاں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دونوں سورتوں میں اطمینان دلایا گیا ہے کہ تذکیر و نصیحت سے آگے آپ کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اِس کے بعد یہ لوگوں کا کام ہے کہ نصیحت پائیں اور ہمارا کام ہے کہ اُن کی سرکشی پر اُن سے نمٹ لیں۔ آپ کو اِس معاملے میں کوئی تردد نہیں ہونا چاہیے۔

سورۃ الاعلیٰ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سَبِّحِ اسۡمَ رَبِّکَ الۡاَعۡلَی ۙ﴿۱﴾ الَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰی ۪ۙ﴿۲﴾ وَ الَّذِیۡ قَدَّرَ فَہَدٰی ۪ۙ﴿۳﴾ وَ الَّذِیۡۤ اَخۡرَجَ الۡمَرۡعٰی ۪ۙ﴿۴﴾ فَجَعَلَہٗ غُثَآءً اَحۡوٰی ؕ﴿۵﴾

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

اپنے پروردگار کے نام کی تسبیح کرو[1] (اے پیغمبر)، جو سب سے برتر ہے، جس[2] نے بنایا، پھر نوک پلک سنوارے، جس نے (ہر چیز کے لیے) اندازہ ٹھیرایا، پھر (اُس کے مطابق) چلنے کی راہ دکھائی، جس نے سبزہ نکالا، پھر اُسے گھنا سرسبز وشاداب بنا دیا۔[3] ۱-۵

---

۱ لفظ 'تَسْبِیح' میں تنزیہہ کا پہلو غالب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اُن سب باتوں سے منزہ قرار دو جو اُس کے شایان شان نہیں ہیں اور اُس کی تنزیہہ کے اِس شعور کے ساتھ اُس کی یاد سے اپنے دل کو آباد اور اپنی زبان کو تر رکھو، اِس لیے کہ راہ حق میں صبر واستقامت کا حصول اگر ہو سکتا ہے تو اِسی یاد سے ہو سکتا ہے۔

۲ اِس سے آگے آیت ۵ تک اللہ تعالیٰ نے اپنا طریقہ بتایا ہے کہ اُس کے ہر کام میں ایک ترتیب وتدریج ہوتی ہے اور وہ اپنی حکمت کے تقاضے سے ہر چیز کو اِسی ترتیب وتدریج سے اُس کے اتمام تک پہنچاتا ہے۔

۳ اصل میں 'غُثَآءً اَحۡوٰی' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے، اُس کے دلائل کی تفصیل کوئی شخص اگر چاہے تو امام حمید الدین فراہی کی کتاب ''مفردات القرآن'' اور استاذ امام

سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنۡسٰۤى ﴿٦﴾ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ يَعۡلَمُ الۡجَهۡرَ

(یہ قرآن بھی اِسی طرح[4] ایک دن اپنے اتمام کو پہنچے گا، پھر) عنقریب اِس کو ہم پورا تمھیں پڑھا دیں گے تو تم نہیں بھولو گے، مگر وہی جو اللہ چاہے گا[5]۔ وہ اُس کو بھی

امین احسن اصلاحی کی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں دیکھ سکتا ہے۔

۴ یعنی اِسی ترتیب و تدریج اور اہتمام کے ساتھ جس کا مشاہدہ تم انسان کی تخلیق، اُس کی قوتوں اور صلاحیتوں کے نشوونما، اُس کے مادی اور عقلی عروج و کمال، اُس کی روحانی اور اخلاقی ترقی اور اُس کی زندگی کے تمام مراحل و مقامات میں بھی کرتے ہو اور سبزے کی نمود اور اُس کے گھنا اور سرسبز و شاداب ہو جانے میں بھی۔ یہ خدا کا قانون ہے اور وہ تمھارے ساتھ بھی اِسی قانون کے مطابق معاملہ کرے گا۔ اُس نے جس وحی آسمانی سے تمھیں نوازا ہے، اُس کے تمام مراحل اِسی تدریج سے طے ہوں گے اور جلد تم دیکھو گے کہ اِسی اہتمام کے ساتھ وہ اپنے اتمام کو پہنچ جائے گی۔ اِس وقت جو مشکلات پیش آ رہی ہیں، وہ تمھاری تربیت کے لیے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ تمھیں اُن افضال و عنایات کا حق دار بنائے جو تمھارے لیے مقدر ہیں۔

۵ یہ پورے قرآن کو جلد حاصل کر لینے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شوق و اضطراب اور عجلت و بے قراری پر آپ کو صبر و انتظار کی تلقین بھی ہے اور قرآن کے بارے میں آپ کی اِس تشویش پر تسلی بھی کہ اِس وقت تو یہ آپ کے حافظے میں تازہ ہے، لیکن پورا ہو جانے کے بعد اور وقت گزرنے کے ساتھ اِس کی کوئی چیز حافظے سے نکل نہ جائے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ حالات کے لحاظ سے تھوڑا تھوڑا کر کے یہ قرآن جس طرح آپ کو دیا جا رہا ہے، اِس کے دینے کا صحیح طریقہ یہی ہے، لیکن اِس سے آپ کو اِس کی حفاظت کے بارے میں کوئی تردد نہیں ہونا چاہیے۔ اِس کی جو قراءت اِس کے زمانۂ نزول میں اِس وقت کی جا رہی ہے، اِس کے بعد اِس کی ایک دوسری قراءت ہو گی۔ اِس موقع پر اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تحت اِس میں سے کوئی چیز اگر ختم کرنا چاہیں یا کسی جگہ کوئی تغیر و

وَمَا يَخْفٰى ۝۷ وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۝۸

جانتا ہے جو (اِس وقت تمھارے) سامنے ہے اور اُس کو بھی جو (تم سے) چھپا ہوا ہے۔ اِسی طرح ہم (اِن مشکلوں سے بھی) درجہ بدرجہ تمھیں آسانی کی طرف لے چلیں گے۔[6] ۶-۸

تبدل کرنا چاہیں تو اُسے کرنے کے بعد آپ کو اِس طرح پڑھا دیں گے کہ اِس میں سہو ونسیان کا کوئی امکان باقی نہ رہے گا اور اپنی آخری صورت میں یہ بالکل محفوظ آپ کے حوالے کر دیا جائے گا۔

قرآن کی یہی قراءت ہے جسے اصطلاح میں عرضۂ اخیرہ کی قراءت کہا جاتا ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جبریل امین ہر سال جتنا قرآن نازل ہو جاتا تھا، رمضان کے مہینے میں اُسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھ کر سناتے تھے۔ آپ کی زندگی کے آخری سال میں، جب یہ عرضۂ اخیرہ کی قراءت ہوئی تو اُنھوں نے اِسے دو مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھ کر سنایا۔*

سلف اِسے قراءت عامہ کہتے رہے ہیں۔ چند علاقوں کو چھوڑ کر امت کی عظیم اکثریت اِس وقت اِسی کے مطابق قرآن کی تلاوت کر رہی ہے۔ سورۂ قیامہ میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ عرضۂ اخیرہ کے بعد قیامت تک کے لیے اِسی قراءت کی پیروی کی جائے۔

[6] یعنی تمھارے حالات کے حاضر و مستقبل سے واقف ہے۔ اِس لیے مخالفتوں کے ہجوم سے گھبرا کر جلدی میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم جس طرح نازل کر رہے ہیں، اُسی طرح پیش کرتے رہو۔ یہ مخالفتیں عنقریب ختم ہو جائیں گی اور وہ آسانی پیدا ہو جائے گی جو سنت الٰہی کے مطابق تمھارے لیے مقدر ہے۔

اِس آخری بات کے لیے اصل میں 'وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'يُسْرٰى' صفت ہے جس کا موصوف 'الطريقة' یا اِس کا ہم معنی کوئی لفظ حذف کر دیا گیا ہے۔

*بخاری، رقم ۴۹۹۸۔

فَذَكِّرْ إِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ﴿٩﴾ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ﴿١٠﴾ وَيَتَجَنَّبُهَا الْأَشْقَى ﴿١١﴾ الَّذِي يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ﴿١٢﴾ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ﴿١٣﴾
قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿١٤﴾ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴿١٥﴾

اِس لیے یاددہانی کرو، اگر یاددہانی نفع دے۔ جو خدا سے ڈرتا ہے، وہ عنقریب نصیحت پالے گا اور اِس سے گریز وہی بڑا بدبخت کرے گا[7] جو بڑی آگ میں جا پڑے گا[8]، پھر نہ اُس میں مرے گا، نہ جیے گا۔ ۹-۱۳

البتہ فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اِس کے لیے اپنے رب کا نام یاد کیا، پھر نماز پڑھی[9]۔ ۱۴-۱۵

---

۷ اشارہ ہے ائمۂ قریش، خاص کر ابولہب کی طرف جس نے اُس نور کی قدر نہیں کی جو اللہ تعالیٰ نے اُس کی فطرت میں ودیعت فرمایا تھا۔ چنانچہ اُس نور سے بھی محروم کر دیا گیا جو قرآن کی صورت میں آسمان سے نازل ہوا۔

۸ یعنی دوزخ کی آگ جو دنیا کی ہر آگ سے بڑی ہے۔ اِس کے لیے اصل میں 'اَلنَّارُ الْكُبْرٰى' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِس کی توام سورہ —— الغاشیة —— میں یہی بات 'اَلْعَذَابُ الْأَكْبَرُ' کے الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

۹ دین کا مقصد یہی پاکیزگی (تزکیہ) ہے جس کا صلہ روز قیامت انسان کو فردوس بریں کی صورت میں ملے گا۔ اِس مقصد تک پہنچنے کے لیے جو طریقہ اختیار کرنا چاہیے، اُس کو اللہ تعالیٰ نے یہاں دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ یعنی انسان صفات الٰہی کے صحیح شعور کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی یاد پر قائم اور اپنے پورے وجود کے ساتھ اُس کے سامنے سرنگوں ہو جائے۔ نماز اِسی یاد اور اِسی قنوت کا

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿١٦﴾ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿١٧﴾ اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿١٨﴾ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ﴿١٩﴾

سورة الغاشية

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ﴿١﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ﴿٢﴾

لوگو، تم کوئی حجت نہیں پاتے، بلکہ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو[۱۰]، دراں حالیکہ آخرت اُس سے بہتر بھی ہے اور پایدار بھی۔ (پھر یہ کوئی نئی بات بھی نہیں ہے)۔ یہی بات اُن صحیفوں میں بھی تھی جو اِس سے پہلے آئے، ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں[۱۱]۔ ۱۶-۱۹

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

کیا تمھیں[۱۲] اُس آفت کی خبر پہنچی ہے جو (پورے عالم پر) چھا جائے گی؟ کتنے

سب سے بڑا مظہر ہے۔

۱۰؎ سورہ کے آخر میں یہ ائمۂ قریش کی مخالفت کے اصل سبب سے پردہ اٹھا دیا ہے۔

۱۱؎ اسفار تورات کی صورت میں یہ صحیفے اِس وقت بھی بائیبل کے مجموعۂ کتب مقدسہ میں موجود ہیں اور اِن میں یہ حقائق اِس قدر واضح اور موثر انداز میں بیان ہوئے ہیں کہ اِنھیں جہاں سے پڑھیے، ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔

۱۲؎ یہ خطاب اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن آگے کی آیتوں سے واضح ہے کہ روے سخن

عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ﴿٣﴾ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ﴿٤﴾ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ﴿٥﴾ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ﴿٦﴾ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ﴿٧﴾

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ﴿٨﴾ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ﴿٩﴾ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿١٠﴾ لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ﴿١١﴾ فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ﴿١٢﴾

چہرے[۱۳] اُس دن اترے ہوئے ہوں گے، نڈھال، تھکے ہارے۔ وہ دہکتی آگ میں پڑیں گے۔ اُنھیں ایک کھولتے ہوئے[۱۴] چشمے کا پانی پلایا جائے گا۔ اُن کے لیے جھاڑ کانٹوں کے سوا کوئی کھانا نہ ہوگا[۱۵] جو نہ توانا کرے گا، نہ بھوک مٹائے گا۔ ۱-۷

اِس کے برخلاف کتنے چہرے اُس دن پر رونق ہوں گے، اپنی سعی پر راضی، اونچے باغ میں[۱۶]۔ وہاں کوئی بے ہودہ بات نہ سنیں گے[۱۷]۔ اُس[۱۸] میں چشمہ رواں ہوگا۔

قریش کے اُنھی سرداروں کی طرف ہے جو آخرت سے بالکل بے خوف ہو چکے تھے۔ خطاب کی ابتدا سوال سے کی ہے۔ اِس طرح کا سوال جواب حاصل کرنے کے لیے نہیں، بلکہ کسی چیز کے ہول، ہیبت یا اُس کی عظمت و جلالت کے اظہار کے لیے ہوتا ہے۔

۱۳؎ اِس سے مراد اگرچہ اشخاص ہیں، لیکن اُن کو چہروں سے اِس لیے تعبیر کیا ہے کہ جو کچھ اُن پر گزرے گی، اُس کا اظہار سب سے نمایاں طریقے پر اُن کے چہروں ہی سے ہوگا۔

۱۴؎ اصل میں لفظ 'اٰنِيَة' استعمال ہوا ہے، یعنی جس کی گرمی اپنے آخری نقطے پر پہنچی ہوئی ہو۔

۱۵؎ اصل الفاظ ہیں: 'لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ'۔ اِن میں استثنا منقطع ہے، یعنی کھانے کی کوئی چیز اُن کے لیے سرے سے وہاں ہوگی ہی نہیں۔ ہاں، کچھ ہوگا تو جھاڑ کانٹے اور

فِيهَا سُرُرٌ مَّرْفُوعَةٌ ﴿١٣﴾ وَّ اَكْوَابٌ مَّوْضُوعَةٌ ﴿١٤﴾ وَّ نَمَارِقُ مَصْفُوفَةٌ ﴿١٥﴾ وَّ زَرَابِيُّ مَبْثُوثَةٌ ﴿١٦﴾

اَفَلَا يَنْظُرُونَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿١٧﴾ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ﴿١٨﴾ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ﴿١٩﴾ وَاِلَى

اُس میں اونچی مسندیں بچھی ہوں گی اور ساغر قرینے سے رکھے ہوئے اور غالیچے ترتیب سے لگے ہوئے اور نہالچے ہر طرف پڑے ہوئے۔ ۸-۱۶

(یہ نہیں مانتے) تو کیا اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے؟ اور آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے اٹھایا گیا؟ اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے؟ اور زمین کو

اِس طرح کی دوسری چیزیں ہوں گی جنھیں وہ بے بسی کے عالم میں کھانے پر مجبور ہوں گے۔

۱۶؎ یعنی اونچے باغ میں۔ اہل عرب کے ہاں ایک اچھے باغ کا تصور یہی تھا کہ وہ بلندی پر ہو، اُس کے حاشیے پر کھجوروں کے اونچے درخت ہوں تاکہ دور ہی سے نگاہوں کو اپنی طرف کھینچے اور بادسموم کی تاخت اور سیلاب کے حملوں سے محفوظ رہے۔

۱۷؎ یہ ماحول کی پاکیزگی کی طرف اشارہ ہے کہ وہاں تحیت وسلام اور محبت واخلاص کے چرچے ہوں گے، کسی فتور عقل اور ہذیان سے دوچار نہیں ہونا پڑے گا۔

۱۸؎ یہاں سے آگے جنت کے مناظر اور اُس کے سامان آرایش وزیبایش کا ذکر ہے۔ یہ جنت کی ایک تصویر ہے۔ اِس سے ملتی جلتی دسیوں تصویریں قرآن مجید کے دوسرے مقامات میں مذکور ہوئی ہیں۔ اِن میں چونکہ تمثیل کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے، اِس وجہ سے اِن کے کسی اختلاف کو تضاد پر محمول نہیں کرنا چاہیے۔ یہ مختلف تصویریں جنت کی نعمتوں کے تنوع اور اُن کی بوقلمونی کو ظاہر کرتی ہیں۔

الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ﴿٢٠﴾ وقفة

فَذَكِّرْ قف إِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ﴿٢١﴾ لَسْتَ عَلَيْهِمْ

نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی؟[19] ۱۷-۲۰

اِس کے باوجود نہیں مانتے تو تم یاددہانی کردو، (اے پیغمبر)، تم یاددہانی کرنے

[19] یہ قیامت کے اُنھی حقائق پر، جو پیچھے مذکور ہیں، آفاق کی بعض نشانیوں سے استدلال فرمایا ہے۔ ترتیب بیان میں یہ ندرت ملحوظ ہے کہ پہلے مخاطبین کے ماحول میں قریب کی نمایاں ترین چیز، اونٹ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ پھر نگاہ کو آسمان کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اِس کے بعد زمین کی طرف لوٹتے ہوئے بیچ میں پہاڑ آ گئے ہیں۔ پہاڑوں کے بعد، ظاہر ہے کہ عرب کے ماحول میں زمین ہی مخاطبین کی توجہ کا مرکز بن سکتی تھی۔ چنانچہ آخر میں اِسی کا ذکر ہے۔ اِن نشانیوں میں سے دو ـــــ اونٹ اور زمین ـــــ ربوبیت کے پہلو سے اور دو ـــــ آسمان اور پہاڑ ـــــ خدا کی قدرت و حکمت کے پہلو سے زیادہ نمایاں ہیں۔ قرآن کے طلبہ اِس حقیقت سے واقف ہیں کہ اُس کے سارے فلسفہ و حکمت کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی اِنھی صفات پر قائم ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس اجمال کی تفصیل فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"...سب سے پہلے اونٹ کی طرف توجہ دلائی کہ آخر وہ اپنے سفر و حضر کے سب سے زیادہ خدمت گزار، وفا شعار اور جاں نثار ساتھی اونٹ ہی پر کیوں نہیں غور کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کو کن صفات و خصوصیات کے ساتھ پیدا کیا ہے! کس طرح اُس کو اُن کا مطیع بنایا ہے کہ ایک عظیم الجثہ اور طویل القامت جانور ہونے کے باوجود اُس کی ناک میں نکیل ڈال کر وہ جدھر چاہیں، لیے پھرتے ہیں اور وہ بے چون و چرا اُن کی اطاعت کرتا ہے۔ وہ حضر میں اُن کا رات دن کا ساتھی ہے؛ سفر میں اُن کا باربردار رفیق؛ صحرا میں اُن کا سفینہ ہے۔ ہفتہ ہفتہ بھر وہ بھوک اور پیاس کا مقابلہ کرتا ہے۔ خاردار جھاڑیوں سے اپنا پیٹ بھر لیتا ہے اور کسی بڑی سے بڑی مشقت سے بھی انکار نہیں کرتا۔ اُس کا گوشت، پوست، دودھ، ہر چیز مالک کے کام آتی ہے۔

یہاں تک کہ اُس کا بول و براز بھی رائگاں جانے والی چیز نہیں ـــــ اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اتنے گوناگوں فوائد و مصالح کے ساتھ یہ جانور آپ سے آپ پیدا ہو گیا اور انسان نے اُس کو اتفاق سے پکڑ کر اپنے لیے سازگار بنا لیا ہے یا رب کریم نے اپنی قدرت و حکمت سے اُس کو پیدا کیا اور اُس کو انسان کی خدمت میں لگایا ہے۔ ظاہر ہے کہ عقل اِس دوسری بات ہی کی گواہی دیتی ہے۔ اگر یہ دوسری ہی بات قابل قبول ہے تو کیا انسان پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ وہ اپنے رب کا شکر گزار بندہ بن کر زندگی گزارے جس نے اُس کے لیے بغیر کسی استحقاق کے زندگی کی یہ آسایشیں فراہم کی ہیں، ورنہ ایک دن اپنے رب کے آگے جواب دہی اور اپنے کفران نعمت کی سزا بھگتنے کے لیے تیار رہے۔

...اونٹ جیسے طویل القامت جانور کا ذکر آیا تو وہیں سے آسمان کی طرف توجہ دلا دی ہے کہ وہ آسمان پر کیوں نہیں غور کرتے کہ کس طرح یہ چھت بلند کی گئی! یعنی ایسی ناپیدا کنار چھت بلند تو ہو گئی، لیکن کسی کو وہ ستون نظر نہیں آتے جن پر یہ قائم ہے۔ پھر اِس سے بھی عجیب یہ ماجرا ہے کہ نہیں معلوم کہ کب سے یہ قائم ہے، لیکن کوئی ماہر سے ماہر انجینئر کسی بڑی سے بڑی دوربین کی مدد سے بھی اِس میں کسی معمولی سے معمولی رخنے یا خلا کی نشان دہی نہیں کر سکتا۔ پھر اِس سے بھی عجیب تر ماجرا یہ ہے کہ ہے تو یہ زمین سے اتنی دور کہ اِس کی مسافت کا علم کسی کو نہیں، لیکن اِسی کے سورج، چاند، ستارے اور سیارے زمین کی رونق اور اُس کے لیے روشنی، حرارت اور زندگی کا ذریعہ ہیں۔ اِسی سے بارش نازل ہوتی ہے جس سے زمین کی تمام مخلوقات کو روزی حاصل ہوتی ہے۔

انسان سوچے کہ جس خالق کی قدرت و حکمت کا یہ حال ہے کہ وہ آسمان کو بنا سکتا ہے، کیا اُس کے مرکھپ جانے کے بعد دوبارہ اُس کو اٹھا کھڑا کرنا اُس کے لیے مشکل ہو جائے گا! چنانچہ قرآن میں جگہ جگہ یہ سوال اللہ تعالیٰ نے کیا ہے کہ بتاؤ، تمھارا پیدا کیا جانا زیادہ مشکل ہے یا آسمان کا؟

...آسمان اور اُس کے عجائبات کی سیر کرانے کے بعد نگاہ کو پھر زمین کی طرف توجہ دلائی اور اُس کی اُس نشانی کی طرف اشارہ فرمایا جو زمین و آسمان کے مابین خالق کائنات کی قدرت و حکمت کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ فرمایا کہ پہاڑوں کو دیکھو کہ وہ کس طرح نصب کیے گئے ہیں۔ وہ زمین کے توازن کو قائم رکھے ہوئے ہیں کہ مبادا وہ سب کے سمیت کسی سمت کو لڑھک

جائے۔ وہ ہواؤں اور بادلوں کو بھی کنٹرول کرتے ہیں تاکہ بارش کی تقسیم قدرت کی حکمت اور اُس کے منشا کے مطابق ہو۔ ہیں تو یہ پتھر کے، لیکن قدرت نے اُن کے اندر سے خلق کی سیرابی کے لیے شیریں پانی کے سوتے جاری کر رکھے ہیں۔ وہ قدرت کے بے شمار قیمتی خزانوں کے امین ہیں جن کو انسان برابر دریافت کرنے اور اُن کو اپنے تمدن کی تعمیر و ترقی میں صرف کرنے میں رات دن سرگرم ہے۔ اُن میں ایسے پہاڑ بھی ہیں جو ناقابل عبور ہیں، لیکن قدرت نے اُن کے اندر درے اور راستے نکال دیے ہیں تاکہ وہ قوموں اور قوموں کے درمیان حجاب بن کے نہ رہ جائیں۔ انسان غور کرے کہ کیا یہ خالق کی عظیم قدرت، عظیم حکمت اور اُس کی عالم گیر ربوبیت پر شاہد نہیں ہیں! اور پھر غور کرے کہ کیا جو خالق اِن صفات سے متصف ہے، وہ انسان کو اِس دنیا میں شتر بے مہار بنا کے چھوڑے رکھے گا، کوئی دن ایسا نہیں لائے گا جس میں وہ سب کا حساب کرے اور ہر ایک کو اُس کے عمل کے مطابق جزا یا سزا دے؟ کیا یہ اُس کی ربوبیت اور اُس کی حکمت کا بدیہی تقاضا نہیں ہے؟ کیا کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ یہ اُس کی قدرت کے دائرے سے خارج اور بعید از امکان ہے؟

...(اِس کے بعد) نگاہ کو پہاڑوں سے زمین پر اتارا اور دعوت دی کہ زمین کو دیکھیں کہ کس طرح یہ اُن کے قدموں کے نیچے بچھائی گئی ہے۔ کس طرح اِس کے گوشے گوشے میں اُن کی پرورش کے لیے ضرورت کی چیزیں پیدا کی گئی ہیں۔ اِس کی مسطح زمینوں پر یہ اپنے گھر بنا لیتے ہیں۔ اِس کے میدانوں میں اِن کے کھیت اور اِن کے باغ و چمن ہیں۔ اِس کی نہریں، اِس کے کنوئیں اور اِس کے چشمے اِن کے کھیتوں اور باغوں کو شاداب رکھتے ہیں۔ اِس کے جنگلوں اور اِس کی وادیوں میں اِن کے چوپایوں اور گلوں کے لیے پیٹ بھرنے کے غیر محدود وسائل موجود ہیں۔ اِن ساری چیزوں کو دیکھیں اور سوچیں کہ جس نے اِن کو اِس بنے بنائے گھر میں اتارا اور اِس کی ساری چیزیں وہ برت رہے ہیں، کیا اُس کو اِس امر سے کوئی بحث نہیں ہے کہ کون گھر کے مالک کی پسند کے مطابق زندگی گزارتا ہے اور کون اُس کو اپنے اب وجد کی میراث سمجھ کر اُس میں اکڑتا اور اودھم مچاتا ہے؟ ظاہر ہے کہ عقل یہی کہتی ہے کہ اُس کو اِس سے بحث ہے اور ہونی چاہیے۔ اگر یہ نہ ہو تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ العیاذ باللہ یا تو وہ بے حس و بلید اور خیر و شر

بِمُصَيۡطِرٍ ﴿۲۲﴾ اِلَّا مَنۡ تَوَلّٰی وَ كَفَرَ ﴿۲۳﴾ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الۡعَذَابَ الۡاَكۡبَرَ ﴿۲۴﴾ اِنَّ اِلَيۡنَاۤ اِيَابَهُمۡ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيۡنَا حِسَابَهُمۡ ﴿۲۶﴾

والے ہی ہو، تم اِن پر کوئی داروغہ نہیں ہو[20]۔ (ماننے والے یقیناً مانیں گے)، رہے وہ جو منہ موڑیں گے اور انکار کر دیں گے تو اللہ اُنھیں بڑے عذاب[21] سے دوچار کرے گا۔ یقیناً اُنھیں ہمارے پاس ہی پلٹنا ہے۔ پھر اُن کا حساب بھی ہماری ہی ذمہ داری ہے[22]۔ ۲۱-۲۶

کے شعور سے عاری ہے یا بالکل بے بس و مجبور ہے۔'' (تدبر قرآن ۹/۳۳۳)

۲۰۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات ہے کہ آپ نے انذار کر دیا، آپ کی ذمہ داری پوری ہوگئی۔ اِس کے بعد بھی اِسی طرح خبردار کرتے رہیے۔ آپ کا فرض صرف تبلیغ و تذکیر ہے۔ یہ ذمہ داری آپ پر نہیں ہے کہ زبردستی اِن کے دلوں میں ایمان اتار دیں۔ تبلیغ و دعوت کے سوا آپ سے کسی چیز کی پرسش نہیں ہونی ہے۔

۲۱۔ یعنی جہنم کا عذاب جو دنیا کے ہر عذاب سے بڑا ہوگا۔ پچھلی سورہ میں اِسی کو 'اَلنَّارَ الۡکُبۡرٰی' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

۲۲۔ یعنی یہ محض دھمکی نہیں ہے، بلکہ ہم پر واجب ہے کہ اِن کا حساب لیں۔ استاذ امام کے الفاظ میں، اگر ہم ایسا نہ کریں تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ یہ دنیا ایک بازیچۂ اطفال اور ایک بالکل بے مقصد و بے حکمت کارخانہ ہے، حالاں کہ خالق کا کوئی کام نہ حکمت سے خالی ہے، نہ ہو سکتا ہے۔

کوالالمپور

۲/ مارچ ۲۰۱۰ء

الفجر - البلد

٨٩ ـــــ ٩٠

الفجر - البلد

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ دونوں میں خطاب قریش کے سرداروں سے ہے، لیکن اسلوب میں اعراض کا پہلو نمایاں ہے۔ اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ پچھلی سورتوں کی طرح یہ بھی ام القریٰ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ انذار عام میں نازل ہوئی ہیں۔

دونوں سورتوں کا موضوع قریش کے سرداروں کو طغیان اور سرکشی کے رویے پر تنبیہ ہے جو خدا کی نعمتیں پانے کے بعد خدا اور خلق کے معاملے میں وہ اختیار کیے ہوئے تھے۔

سورة الفجر

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَالۡفَجۡرِ ۙ‏ ﴿۱﴾ وَلَيَالٍ عَشۡرٍ ۙ‏ ﴿۲﴾ وَّالشَّفۡعِ وَالۡوَتۡرِ ۙ‏ ﴿۳﴾ وَالَّيۡلِ اِذَا

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

فجر[1] گواہی دیتی ہے، اور چاند کی ہر دس راتیں[2]، اور جفت اور طاق مہینا[3]، اور

۱۔ اِس سے مراد وہ وقت ہے، جب دن کی روشنی ایک سفید دھاری کی صورت میں شب کی سیاہ دھاری سے الگ ہو کر نمایاں ہوتی ہے۔

۲۔ اصل میں 'لَيَالٍ عَشۡرٍ' کا لفظ آیا ہے۔ یہ نکرہ ہے، اِس لیے اِس سے مہینے کی تیس راتوں میں سے ہر دس راتیں مراد لی جا سکتی ہیں۔ چاند کے تدریجی عروج و زوال کی طرف اشارے کے لیے یہ نہایت بلیغ اسلوب ہے، اِس لیے کہ پہلی دس راتوں میں وہ ایک باریک ناخن کی شکل سے شروع ہو کر بڑھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ آدھے سے زیادہ روشن ہو جاتا ہے۔ دوسری دس راتوں میں وہ اپنے عروج و کمال پر ہوتا ہے اور آخری دس راتوں میں وہ زوال کی طرف بڑھنا شروع ہوتا ہے، یہاں تک کہ قرآن کی تعبیر کے مطابق کھجور کی سوکھی ٹہنی کے مانند ہو کر رہ جاتا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس تعبیر کے متعلق لکھا ہے:

> ''اِس آیت میں چاند کی تصویر چشم تخیل کے سامنے اِس طرح آتی ہے گویا وہ ایک فرماں بردار ناقہ ہے جس کی نکیل ایک غیبی ساربان کے ہاتھ میں ہے جو اُس کو منزل بہ منزل ایک معین بلندی تک چڑھاتا اور پھر وہاں سے اُس کو درجہ بدرجہ اسی طرح اتارتا ہے، یہاں تک کہ قطع منازل کے اِس پر مشقت سفر میں وہ سوکھ کر کانٹا بن کے رہ جاتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۳۴۸/۹)

۳۔ اِس لیے کہ مہینا کبھی تیس اور کبھی انتیس دن کا ہوتا ہے جس میں چاند اپنے عروج و زوال کا

يَسۡرِ ﴿٤﴾ هَلۡ فِيۡ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيۡ حِجۡرٍ ﴿٥﴾
اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ﴿٦﴾ اِرَمَ ذَاتِ الۡعِمَادِ ﴿٧﴾ الَّتِيۡ

رات بھی جب وہ رخصت ہوتی ہے[4] کہ صبح قیامت ہونی ہے[5]۔ اِس میں کسی عاقل کے لیے کیا ہے کوئی بڑی گواہی[6]؟ ۱-۵

تو[7] نے دیکھا نہیں کہ تمھارے پروردگار نے عاد[8] کے ساتھ کیا کیا؟ وہی ستونوں والے[9]

سفر پورا کر لیتا ہے۔

۴۔ اصل الفاظ ہیں: 'اِذَا يَسۡرِ '۔ یہ قید اِس لیے لگائی ہے کہ ٹھیک اُس وقت کی طرف توجہ دلائی جائے، جب وہ رخصت ہونے کے لیے چل کھڑی ہوتی ہے اور افق میں فجر کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں۔

۵۔ یعنی رات جس طرح مختلف مراحل سے گزر کر فجر تک پہنچتی ہے اور چاند جس طرح دس دس راتوں میں اپنے منازل طے کرتا ہوا کبھی انتیس اور کبھی تیس دنوں میں اپنا سفر پورا کر لیتا ہے، اِس میں ترتیب و تدریج اور اِس کے ساتھ نتیجہ خیزی کا ایک حیرت انگیز قانون ہے جو صاف کارفرما نظر آتا ہے۔ پھر یہ بات بھی نظر آتی ہے کہ یہ خدا کے ہاتھ میں مسخر ہیں اور وہ بار بار اِنھیں منزل تک پہنچا کر اِسی سفر کے لیے لوٹا رہا ہے۔ اِس لحاظ سے دیکھیے تو قرآن کی اِس بات کو ماننے میں بھی کسی عاقل کو کوئی تردد نہیں ہونا چاہیے کہ ہماری یہ دنیا بھی ایک دن لازماً اپنے انجام کو پہنچے گی اور صبح قیامت ہو کر رہے گی جس میں مرنے والے ایک مرتبہ پھر زندگی کی طرف لوٹا دیے جائیں گے۔ چاند ہر ماہ طلوع ہو کر اور راتیں ہر روز رخصت ہو کر اِسی حقیقت کی یاددہانی کرتی ہیں۔

۶۔ آیت میں استفہام کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ اِس میں زجر و ملامت بھی ہے اور اتمام حجت بھی۔ مطلب یہ ہے کہ انسان اگر عقل سے کام لے تو آفاق کی اِن نشانیوں میں شہادت تو بہت بڑی ہے، لیکن قریش کے اِن فراعنہ میں کیا کوئی عاقل ہے بھی؟

لَمۡ یُخۡلَقۡ مِثۡلُهَا فِی الۡبِلَادِ ۪ۙ﴿۸﴾ وَ ثَمُوۡدَ الَّذِیۡنَ جَابُوا الصَّخۡرَ بِالۡوَادِ ۪ۙ﴿۹﴾ وَ فِرۡعَوۡنَ ذِی الۡاَوۡتَادِ ۪ۙ﴿۱۰﴾ الَّذِیۡنَ طَغَوۡا فِی الۡبِلَادِ ۪ۙ﴿۱۱﴾

ارم[۱۰] جن کے برابر دنیا کے ملکوں میں کوئی قوم پیدا نہیں کی گئی[۱۱]۔ اور ثمود کے ساتھ جنھوں نے وادی القریٰ[۱۲] میں پتھر تراشے۔ اور میخوں والے فرعون کے ساتھ[۱۳]۔ یہ وہ لوگ تھے

۷؎ آفاق کی نشانیوں کے بعد آگے تاریخ کے دلائل کی طرف توجہ دلائی ہے۔

۸؎ اِس سے مراد وہ قدیم قوم عاد ہے جسے قرآن مجید اور تاریخ عرب میں عاد اولیٰ کا نام دیا گیا ہے۔

۹؎ یہ اِس قوم کی تعمیری ترقیوں کی تعبیر کے لیے اُسی طرح کا کنایہ ہے، جس طرح سورۂ سبا (۳۴) کی آیت ۱۳ میں سیدنا سلیمان علیہ السلام کے جودوکرم اور فیاضی کی تعبیر 'جِفَانٍ کَالۡجَوَابِ وَقُدُوۡرٍ رّٰسِیٰتٍ' کے الفاظ سے کی گئی ہے۔

۱۰؎ اِنھیں عاد ارم اِس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ سامی نسل کی اُس شاخ سے تعلق رکھتے تھے جو ارم بن سام بن نوح سے چلی تھی۔ یہاں، خاص طور پر اِس نسبت کے ساتھ اِن کے ذکر کی وجہ یہ ہے کہ اِن کی فوجی اور تعمیری ترقیوں کی ابتدا اِسی ارم سے ہوئی۔

۱۱؎ یعنی تعمیری ترقیوں کے ساتھ قد وقامت اور زور وقوت کے لحاظ سے بھی اُس زمانے میں کوئی قوم اِن کی ہم پایہ نہ تھی۔

۱۲؎ اصل میں لفظ 'الۡوَاد' استعمال ہوا ہے۔ اِس سے مراد وادی القریٰ ہے جہاں اِس قوم نے اپنے اسلاف کے طریقے پر پہاڑوں کو ترشوا کر اپنے لیے ایوان و محل بنائے۔

۱۳؎ فوجیں بالعموم خیموں میں رہتی ہیں اور خیمے میخوں سے نصب کیے جاتے ہیں۔ قرآن نے ستونوں والے ارم کی طرح یہ تعبیر فرعون کی فوجوں کی کثرت کو بیان کرنے کے لیے اختیار کی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

فَاَكۡثَرُوۡا فِيۡهَا الۡفَسَادَ ﴿۱۲﴾ فَصَبَّ عَلَيۡهِمۡ رَبُّكَ سَوۡطَ عَذَابٍ ﴿۱۳﴾
اِنَّ رَبَّكَ لَبِالۡمِرۡصَادِ ﴿۱۴﴾

جنھوں نے دنیا کے ملکوں میں سر اٹھایا اور اُن میں بڑا اودھم مچایا تو تیرے پروردگار نے اُن پر عذاب کا تازیانہ برسا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس طرح کے سرکشوں کے لیے تیرا پروردگار گھات لگائے رہا ہے۔[۱۴] ۶-۱۴

"...قدیم زمانے میں مستقل فوجیں رکھنے کا رواج نہیں تھا۔ حملے یا دفاع کی ضرورت کے لیے قبیلوں اور خاندانوں کے نوجوان بالکل وقت کے وقت اپنی خدمات پیش کرتے اور ضرورت پوری ہو جانے کے بعد منتشر ہو جاتے، لیکن فرعون نے، تورات سے معلوم ہوتا ہے، ملک کی حفاظت کے لیے مستقل فوج قائم کی جو مملکت کے مختلف حصوں میں برابر اپنے ڈیروں، خیموں کے ساتھ گشت کرتی رہتی۔ اُس نے اپنے نوابوں اور امرا پر بھی یہ پابندی عائد کر رکھی تھی کہ ایک خاص تعداد میں اسلحہ، گھوڑے اور رتھ تیار رکھیں تاکہ ضرورت پڑنے پر حکومت کی موثر خدمت کر سکیں۔ اِسی خصوصی امتیاز کی بنا پر فرعون کو 'ذُو الۡاَوۡتَاد' (میخوں والا) کہا گیا۔"

(تدبر قرآن ۹/۳۵۵)

۱۴؎ یعنی اُن سرکشوں کے لیے جن کی طرف رسولوں کی بعثت ہوئی اور اُن کی طرف سے اتمام حجت کے باوجود اُنھوں نے ماننے سے انکار کر دیا اور اپنے فساد پر قائم رہے۔ یہ قریش کے لیے اثبات قیامت کا استدلال بھی ہے اور تنبیہ و تہدید بھی کہ اُن کی طرف بھی ایک رسول کی بعثت ہو چکی ہے۔ اُنھوں نے جو فساد سرزمین عرب میں برپا کر رکھا ہے، اُسے اب زیادہ دیر تک برداشت نہیں کیا جائے گا۔ اُن کا پروردگار اپنی سنت کے مطابق گھات لگائے ہوئے ہے۔ اُن کی شرارتیں بڑھتی رہیں تو اُس کے عذاب کا تازیانہ اُن کی پیٹھ پر بھی اُسی طرح برس جائے گا، جس طرح اِس سے پہلے مختلف قوموں کی پیٹھ پر برستا رہا ہے۔

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ۬ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ﴿۱۵﴾ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ۬ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ﴿۱۶﴾ ۚ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ﴿۱۷﴾ ۙ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿۱۸﴾ ۙ وَتَاْكُلُوْنَ

لیکن[۱۵] انسان کا حال یہ ہے کہ اُس کا رب جب اُسے آزماتا ہے اور اِس کے لیے اُس کو عزت بخشتا اور نعمتیں عطا فرماتا ہے تو کہتا ہے کہ میرے رب نے میری شان بڑھائی ہے۔ اور جب اُسے آزماتا ہے اور اِس کے لیے اُس کی روزی اُس پر تنگ کر دیتا ہے تو کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کر ڈالا[۱۶]۔ نہیں، یہ اِس لیے نہیں ہوتا، ہرگز نہیں، بلکہ تمھیں آزمانے کے لیے ہوتا ہے اور تمھارا حال یہ ہے کہ تم یتیم کی قدر نہیں کرتے[۱۷] اور مسکینوں کو کھانا کھلانے کے لیے ایک دوسرے کو نہیں

۱۵۔ یہاں سے آگے اب اُس مغالطے سے پردہ اٹھایا ہے جس میں مبتلا ہو کر قومیں اِس انجام کو پہنچتی رہی ہیں۔ بات کے تدریجی ارتقا سے واضح ہو جائے گا کہ مخاطب قریش کے سردار ہی ہیں، لیکن بات عام صیغے سے کہہ دی ہے کہ فراخی نعمت پر فخر و غرور اور تنگی رزق کے نتیجے میں مایوسی و نامرادی کے یہ رویے بالعموم انسانوں کے لیے دنیا کے امتحان میں ناکامی کا باعث بنتے ہیں۔

۱۶۔ یعنی ایک فخر و غرور میں مبتلا ہو جاتا اور دوسرا مایوسی اور نامرادی کا شکار ہو کر یا تو صحیح زندگی بسر کرنے کا حوصلہ ہی کھو بیٹھتا ہے یا استاذ امام کے الفاظ میں قسمت آزمائی کی ایسی راہیں اختیار کر لیتا ہے جو اُس کو خدا سے نہایت ہی دور لے جا پھینکتی ہیں اور وہ بالکل شیطان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔

۱۷۔ یہ نہیں فرمایا کہ یتیم کی مدد نہیں کرتے، بلکہ فرمایا ہے کہ یتیم کی قدر نہیں کرتے۔ استاذ امام

التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ﴿١٩﴾ وَّ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿٢٠﴾
كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿٢١﴾ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ

ابھارتے[18] اور وراثت کو سمیٹ کر ہڑپ کر جاتے ہو اور مال کی محبت میں متوالے ہوئے رہتے ہو۔ ۱۵-۲۰

(انسان سمجھتا ہے کہ وہ یونہی چھوڑ دیا جائے گا[19]) ؟ ہر گز نہیں، جب زمین کوٹ کوٹ کر برابر کر دی جائے گی[20]، اور تیرا پروردگار جلوہ فرما ہوگا، اِس طرح کہ فرشتے صف در

الفجر
۸۹

لکھتے ہیں:

''یتیموں کے لیے یہاں لفظِ 'اِکرام' استعمال ہوا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مطلوب صرف یہ نہیں ہے کہ کسی نہ کسی شکل میں مال دار لوگ اُن کی کچھ مدد کر دیا کریں، بلکہ اصل مطلوب یہ ہے کہ سوسائٹی میں اُن کو عزت کا مقام حاصل ہو۔ وہ دھکے کھاتے نہ پھریں، بلکہ جہاں بھی جائیں، لوگ اُن کو احترام سے دیکھیں اور یہ عقیدہ رکھیں کہ خدا نے اُن کو جو مال عطا فرمایا ہے، اُس کی کوئی وقعت خدا کے ہاں ہے تو اِسی شکل میں ہے، جب یتیموں کی خدمت کر کے اُن کا مال اپنے لیے شرف کا مقام پیدا کرے۔ ورنہ وہ شرف کا ذریعہ نہیں، بلکہ وبال اور رسوائی ہے۔'' (تدبر قرآن ۹/۳۵۸)

۱۸ مطلب یہ ہے کہ مسکینوں کی خدمت کے لیے تمھارے معاشرے میں وہ سر گرمی نہیں ہوتی جو ایک زندہ معاشرے میں اُن کے لیے لازماً ہونی چاہیے۔

۱۹ یعنی اپنے اِس رویے کے باوجود یونہی چھوڑ دیا جائے گا اور اُس کے لیے کوئی یوم الحساب نہیں ہوگا۔

۲۰ یعنی جس زمین کی زینتوں اور جس کے بناؤ سنگھار پر ریجھے ہوئے ہو، یہ کوٹ کوٹ کر بالکل برابر کر دی جائے گی۔ استاذ امام کے الفاظ میں نہ اِس کے دریا اور پہاڑ باقی رہیں گے، نہ وادی و کہسار، نہ باغ و چمن رہیں گے اور نہ ایوان و محل، صرف صفاچٹ میدان رہ جائے گا۔

صَفًّا صَفًّا ﴿٢٢﴾ وَجِايْٓءَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ ۙ يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ﴿٢٣﴾ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ ﴿٢٤﴾ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ ﴿٢٥﴾ وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ ﴿٢٦﴾

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٢٨﴾ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ﴿٢٩﴾ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴿٣٠﴾

صف کھڑے ہوں گے[21] اور جہنم اُس دن قریب لے آئی جائے گی، اُس دن انسان سمجھے گا۔ پر اُس کے اِس سمجھنے سے کیا حاصل! وہ کہے گا: اے کاش، میں نے اپنی اِس زندگی کے لیے کچھ کیا ہوتا! پھر اُس دن جو عذاب وہ پروردگار دے گا، ویسا عذاب دینے والا کوئی نہیں اور جس طرح باندھے گا، اُس طرح باندھنے والا کوئی نہیں۔ ۲۱-۲۶

(دوسری طرف) وہ فرمائے گا: اے نفس مطمئن[22]، اپنے رب کی طرف لوٹ، اِس حال میں کہ تو اُس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی۔ سو میرے بندوں میں شامل ہو اور میری جنت میں داخل ہو۔ ۲۷-۳۰

۲۱؎ یہ امور متشابہات میں سے ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ 'راسخین فی العلم' اِس طرح کی چیزوں کے درپے نہیں ہوتے*۔

۲۲؎ یہ خطاب لائق توجہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اِس خطاب سے اُن کے نفس کی اُس خاص صفت پر روشنی پڑ رہی ہے جس کی بنا پر وہ جنت کے حق دار قرار پائیں گے۔ اوپر آیات ۱۵-۱۶ میں اُن تنگ ظرفوں اور تھڑ دلوں کا حال بیان ہوا تھا جن کو نعمت ملتی ہے تو وہ بہک کر اترانے اور فخر کرنے والے بن جاتے ہیں اور جب ذرا تنگی رزق کی آزمایش پیش آ جائے تو بالکل دل شکستہ ہو کر خدا سے مایوس اور شاکی بن جاتے

* آل عمران ۳: ۷۔

سورة البلد

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لَاۤ اُقۡسِمُ بِهٰذَا الۡبَلَدِ ۙ﴿۱﴾ وَ اَنۡتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الۡبَلَدِ ۙ﴿۲﴾ وَ وَالِدٍ

—— ۲ ——

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

نہیں، (یہ ہمیشہ اِس طرح نہیں تھے[۲۳])۔ میں اِس شہر کو گواہی میں پیش کرتا ہوں،

ہیں۔ اِس کے بعد اُن کا انجام بیان ہوا۔ اب اِس کے مقابل میں اُن لوگوں کا حال اور انجام بیان ہو رہا ہے جن کے قدم تنگی اور فراخی، دونوں طرح کے حالات میں جادۂ حق پر استوار رہتے ہیں۔ نعمت ملتی ہے تو وہ اُس کو اپنے شکر کا امتحان سمجھتے ہیں اور طغیان و فساد میں مبتلا ہونے کے بجائے کوشش کرتے ہیں کہ اپنے رب کے امتحان میں پورے اتریں اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے اُن پر احسان فرمایا ہے، وہ بھی اللہ کے بندوں پر احسان کریں۔ اِسی طرح اگر اُن کو تنگی رزق سے سابقہ پیش آتا ہے تو بے حوصلہ اور اپنے رب سے مایوس ہونے کے بجائے اِس کو وہ اپنے صبر کا امتحان سمجھتے ہیں اور جان کی بازی لگا کر کوشش کرتے ہیں کہ اِس امتحان سے سرخ رو نکلیں، نہ دنیا میں اُن کو اپنے ضمیر کے آگے شرمندہ ہونا پڑے نہ آخرت میں اپنے رب کے آگے۔ اِن لوگوں کا دل چونکہ عسر و یسر اور نرمی و سختی، دونوں طرح کے حالات میں اپنے رب سے راضی و مطمئن اور ڈانواں ڈول ہونے سے محفوظ رہتا ہے، اِس وجہ سے اُس کو نفس مطمئنہ سے تعبیر فرمایا ہے اور یہی لوگ ہیں جو جنت کے وارث ہوں گے۔'' (تدبر قرآن ۹/۳۶۱)

۲۳؎ سورہ کے شروع میں 'لَا' ایک پوری بات کی تردید کے لیے آیا ہے جس پر بعد کا مضمون خود دلالت کر رہا ہے۔ ہم نے اِسے کھول دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اِسی مال و منال اور حشمت و جاہ کے ساتھ اِس وادی غیر ذی زرع میں نہیں آئے تھے جو آج اِنھیں حاصل ہو گیا ہے۔

وَمَا وَلَدَ ﴿٣﴾ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ ﴿٤﴾
اَیَحْسَبُ اَنْ لَّنْ یَّقْدِرَ عَلَیْهِ اَحَدٌ ﴿٥﴾ یَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا
لُّبَدًا ﴿٦﴾ اَیَحْسَبُ اَنْ لَّمْ یَرَهٗۤ اَحَدٌ ﴿٧﴾

(اے پیغمبر) ـــــ اور (یہ تمھارے لیے اجنبی نہیں)، تم اِسی شہر میں رہتے ہو[24] ـــــ اور باپ اور اُس کی اولاد کو بھی،[25] (جن سے یہ شہر آباد ہوا) کہ ہم نے انسان کو یہاں پیدا کیا تو اُس وقت وہ یقیناً بڑی مشقت میں تھا۔[26] ۱-۴

(اب وہ نعمتوں میں ہے تو) کیا وہ سمجھتا ہے کہ اُس پر کسی کا زور نہیں؟ (اُس سے کہا جاتا ہے کہ خرچ کرو تو) کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال لٹا دیا۔[27] کیا وہ سمجھتا ہے کہ اُسے

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنے فرزند اسمٰعیل علیہ السلام کو یہاں آباد کیا تو یہ ایک بالکل بنجر، بے آب و گیاہ اور امن و سلامتی سے محروم علاقہ تھا۔ جس فراخی رزق و رفاہیت کے ساتھ آج یہ رہ رہے ہیں، یہ ہمیشہ سے نہیں تھی۔ یہ اِسی گھر کے طفیل اِنھیں حاصل ہوئی ہے، لیکن ایسے برخود غلط ہیں کہ اب اِسے اپنا استحقاق سمجھ رہے ہیں۔

۲۴؎ یعنی یہ کسی دور دراز علاقے کی شہادت نہیں ہے، بلکہ تمھارے اپنے ہی شہر کی حکایت ہے جس سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ اِس کی تاریخ تمھاری اپنی تاریخ ہے۔ یہ تمھارے لیے کوئی اجنبی جگہ نہیں ہے۔

۲۵؎ یعنی ابراہیم علیہ السلام اور اُن کی ذریت۔ لفظ 'وَالِدٍ' کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے۔

۲۶؎ یہ اُس زمانے کی طرف اشارہ ہے، جب اسمٰعیل علیہ السلام اور اُن کی اولاد اِس بنجر اور بے آب و گیاہ علاقے میں آباد ہوئی۔ سورۂ ابراہیم (۱۴) کی آیات ۳۵-۳۷ اور سورۂ قریش (۱۰۶) میں یہی مضمون اِس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔

۲۷؎ یعنی اللہ کی راہ میں انفاق کی ترغیب دینے والوں کو چپ کرانے کے لیے کہتا ہے کہ آخر

البیان

البلد
۹۰

اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّهٗ عَیۡنَیۡنِ ۙ﴿۸﴾ وَ لِسَانًا وَّ شَفَتَیۡنِ ۙ﴿۹﴾ وَ هَدَیۡنٰهُ النَّجۡدَیۡنِ ﴿ۚ۱۰﴾ فَلَا اقۡتَحَمَ الۡعَقَبَةَ ﴿۫ۖ۱۱﴾ وَ مَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡعَقَبَةُ ﴿ؕ۱۲﴾

کسی نے دیکھا نہیں؟ ۵-۷

کیا ہم نے اُس کو دو آنکھیں نہیں دیں (کہ حقائق کو دیکھتا)[28]؟ اور زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے (کہ بھلائی کی ترغیب دیتا)[29]؟ اور اُس کو دونوں راستے نہیں سجھائے (کہ اچھے اور برے کو سمجھتا)[30]؟ مگر وہ گھاٹی پر نہیں چڑھا[31]۔ اور تم کیا سمجھے کہ وہ گھاٹی کیا ہے[32]؟ یہی کہ

کہاں تک خرچ کروں۔ اِس سے پہلے ڈھیروں مال اِسی طرح کے مصارف میں اڑا چکا ہوں۔

۲۸؎ مطلب یہ ہے کہ آنکھوں کا صحیح مصرف اگر کوئی تھا تو یہی تھا کہ اُنھیں عبرت نگاہی کے لیے استعمال کیا جائے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...فرمایا کہ وہ غور کریں کہ کیا ہم نے اُن کو دو آنکھیں نہیں دیں کہ وہ اُن سے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ ایک طرف تو ہم نے اُن کو مال و جاہ سے نوازا اور دوسری طرف اُن کے آگے پیچھے ایسے یتیم و نادار، غریب و لاچار اور کم زور و بیمار بھی ہیں جو نان شبینہ کو محتاج، تن ڈھانکنے سے مجبور، آنکھوں اور ہاتھ پاؤں کی نعمت سے محروم ہیں؟ ہم نے آنکھیں دے کر اُن کو یہ منظر اِس لیے دکھایا کہ وہ اِس سے عبرت حاصل کریں اور اپنے رب کے شکر گزار بنیں کہ اُس نے محض اپنے فضل سے اُن کو اِس طرح کی کسی آزمایش سے محفوظ رکھا اور پھر اِس شکر گزاری کا حق یوں ادا کریں کہ پوری فیاضی سے اِن ضرورت مندوں پر اپنا وہ مال صرف کریں جو اُن کے رب نے اِس طرح کے لوگوں کے حق کی حیثیت سے اُن کی تحویل میں دیا۔“ (تدبر قرآن ۹/۳۷۳)

۲۹؎ زبان کے ساتھ دو ہونٹوں کا ذکر اِس لیے ہوا ہے کہ زبان میں تکلم کی صلاحیت اِنھی دو ہونٹوں سے پیدا ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زبان بھی دی اور اِس کے ساتھ ناپ تول کر بولنے کے لیے دو ہونٹ بھی دیے، لیکن عجیب بدقسمتی ہے کہ اُس نے اِسے حق کی تکذیب اور ژاژ خائی

فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿۱۳﴾ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ﴿۱۴﴾ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴿۱۵﴾ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ

گردن چھڑائی جائے[۳۳] یا بھوک کے دن کسی قرابت مند یتیم یا کسی خاک آلود مسکین کو کھانا

کے لیے تو استعمال کیا، مگر جو مواقع، فی الواقع اِس کے استعمال کے تھے، اُن میں یہ ہمیشہ گنگ رہی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''اِس آیت سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ انسان جس نیکی کا احساس کرے، اُس کے انجام دینے کے لیے خود بھی اقدام کرے اور دوسروں کو بھی اُس کے لیے ابھارے۔ یہ چیز اُس کے فرائض میں داخل ہے، ورنہ اُس کی نیکی ادھوری رہ جائے گی۔ معاشرے سے متعلق بھی ہر شخص پر اُس کی صلاحیت کے اعتبار سے ذمہ داری عائد ہوتی ہے، جس کو ادا کیے بغیر کوئی شخص عند اللہ بری نہیں ہوسکتا۔'' (تدبر قرآن ۹/ ۳۷۴)

۳۰؎ شعور و مشاہدہ اور نطق و بیان کی صلاحیت کے بعد اب یہ خیر و شر میں امتیاز کی صلاحیت کا ذکر ہے۔ دونوں راستوں سے اشارہ اُنھی دو راستوں کی طرف ہے جنھیں سورۂ دہر (۷۶) اور سورۂ شمس (۹۱) میں بالترتیب 'اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا' اور 'فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا' سے تعبیر فرمایا ہے۔

۳۱؎ انسانوں سے ہم دردی اور خدا کی بندگی، دونوں کے لیے نفس کو نقد لذتوں سے دست بردار ہونا پڑتا ہے، لہٰذا یہ دونوں چیزیں انسان پر ہمیشہ شاق گزرتی ہیں۔ قرآن مجید نے اِسی رعایت سے اِنھیں گھاٹی پر چڑھنے سے تعبیر کیا ہے۔

۳۲؎ یہ وہی اسلوب ہے جس کا ذکر اِس سے پہلے ہو چکا ہے کہ سوال کا یہ انداز کسی چیز کی عظمت و جلالت یا اُس کے ہول کو ظاہر کرنے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔

۳۳؎ یعنی غلام آزاد کیے جائیں۔ قرآن نے یہاں اِسے خیر کے کاموں میں سرفہرست رکھا

وَتَوَاصَوۡا بِالۡمَرۡحَمَةِ ﴿۱۷﴾ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡمَیۡمَنَةِ ﴿۱۸﴾ وَالَّذِیۡنَ

کھلایا جائے۔[۳۴] پھر آدمی اُن میں سے ہو جو ایمان لائے اور جنھوں نے ایک دوسرے کو اُس پر ثابت قدمی کی نصیحت کی اور دوسروں سے ہم دردی کی نصیحت کی۔[۳۵] یہی خوش بخت ہیں، یہ

ہے۔ اِس سے ہر شخص اِس حکم کی اہمیت کا اندازہ کرسکتا ہے۔ یہ اِس لعنت کے خاتمے کی طرف قرآن کا پہلا قدم تھا۔ بعد میں سورۂ محمد (۴۷)، سورۂ نور (۲۴) اور سورۂ توبہ (۹) کے احکام نے اِس کی بنیاد ہی ختم کردی۔ یہ الگ بات ہے کہ نزول قرآن کے صدیوں بعد تک خود مسلمان اِسے ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئے، یہاں تک کہ پچھلی صدی کی ابتدا میں قرآن کا منشا پورا ہو گیا اور یہ لعنت دنیا سے ختم ہو گئی۔

۳۴؎ کھانا، ظاہر ہے کہ اُن کی ضروریات میں سے ایک بنیادی چیز ہے۔ تاہم اِس سے مقصود محض کھانا نہیں ہے، بلکہ تمام مایحتاج ہیں جنھیں پورا کرنا چاہیے۔ اِس کے ساتھ 'فِیۡ یَوۡمٍ ذِیۡ مَسۡغَبَةٍ' (بھوک کے دن) کی قید اپیل کو موثر بنانے کے لیے ہے۔ یتیم اور مسکین کے ساتھ 'ذَا مَقۡرَبَةٍ' (قرابت مند) اور 'ذَا مَتۡرَبَةٍ' (خاک آلود) کی صفات بھی اِسی مقصد سے آئی ہیں۔

۳۵؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡمَرۡحَمَةِ'۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''یہاں 'مَرۡحَمَة' (ہم دردی) کے ساتھ 'صبر' کا ذکر اُسی طرح آیا ہے، جس طرح سورۂ عصر (۱۰۳) میں 'حق' اور 'صبر' کا ذکر ایک ساتھ آیا ہے۔ اِس کی وجہ نیکی کے کاموں کا وہ مزاج ہے جس کی طرف ہم 'اِقۡتِحَامُ عَقَبَة' کی وضاحت کرتے ہوئے اشارہ کر چکے ہیں کہ نیکی کے کام بالعموم نفس کی خواہشوں کے خلاف ہیں، اِس وجہ سے اُن کے انجام دینے کے لیے انسان کو نفس کی مزاحمت کرنی اور ایک چڑھائی سی چڑھنی پڑتی ہے۔ یہ چڑھائی وہی لوگ چڑھ سکتے ہیں جن کے اندر 'صبر' کی خصلت مستحکم ہو۔ 'صبر' کا اصل مفہوم عزیمت واستقامت ہے۔ جن کے اندر یہ وصف نہ ہو، وہ کوئی کام بھی پامردی کے ساتھ نہیں کر سکتے۔ اِس وجہ سے ضروری ہوا کہ جن کو نیکی کا درس دیا جائے، اُن کو ساتھ ہی صبر واستقامت کی بھی تلقین کی جائے۔'' (تدبر قرآن ۹/ ۳۷۷)

كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْـَٔمَةِ ﴿۱۹﴾ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ﴿۲۰﴾

بہشت میں ہوں گے۔[۳۶] اور جنھوں نے ہماری آیتوں کا انکار کر دیا، وہی بدبخت ہیں۔ وہ آگ میں موندے ہوئے ہوں گے۔ ۸-۲۰

۳۶؎ تقابل کے اسلوب پر یہ الفاظ اصل میں محذوف ہیں۔

کوالالمپور

۴؍ مارچ ۲۰۱۰ء

البلد
۹۰

الشمس - الليل

۹۱ ـــــ ۹۲

الشمس - اللیل

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ میں آخرت کے خسران اور اُس میں فوز و فلاح کے جس راستے کا ذکر بالاجمال ہوا ہے، دوسری سورہ میں اُس کی تفصیل کر دی گئی ہے۔ دونوں میں خطاب قریش کے سرداروں سے ہے، لیکن اسلوب میں اعراض کا پہلو نمایاں ہے۔ اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ پچھلی سورتوں کی طرح یہ بھی ام القریٰ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ انذار عام میں نازل ہوئی ہیں۔

پہلی سورہ ــــ الشمس ــــ کا موضوع قانون جزا و سزا کے حوالے سے قریش کے سرداروں کو طغیان اور سرکشی کے اُس رویے پر تنبیہ ہے جو دعوت حق کے مقابلے میں وہ اختیار کیے ہوئے تھے۔

دوسری سورہ ــــ اللیل ــــ کا موضوع قریش کے لیے اُس راستے کی وضاحت ہے جس کا ذکر سورۂ شمس میں 'قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا' کے الفاظ میں بالاجمال ہوا ہے۔

سورة الشمس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالشَّمۡسِ وَضُحٰہَا ۪ۙ﴿۱﴾ وَالۡقَمَرِ اِذَا تَلٰىہَا ۪ۙ﴿۲﴾ وَالنَّہَارِ اِذَا جَلّٰىہَا ۪ۙ﴿۳﴾ وَالَّیۡلِ اِذَا یَغۡشٰىہَا ۪ۙ﴿۴﴾ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰىہَا ۪ۙ﴿۵﴾ وَالۡاَرۡضِ وَمَا طَحٰىہَا ۪ۙ﴿۶﴾ وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىہَا ۪ۙ﴿۷﴾ فَاَلۡہَمَہَا

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

سورج گواہی دیتا ہے اور اُس کا چڑھنا؛ اور چاند جب اُس کے پیچھے آئے؛ اور دن جب اُس کو روشن کرے؛ اور رات جب اُس کو ڈھانپ لے؛ اور آسمان اور جیسا اُسے بنایا؛ اور زمین اور جیسا اُسے بچھایا؛[۱] اور نفس اور جیسا اُسے سنوارا[۲]، پھر اُس کی بدی اور

۱؎ آسمان اور زمین، دونوں کے لیے 'مَا بَنٰىهَا' اور 'مَا طَحٰىهَا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'مَا' ہمارے نزدیک مصدریہ ہے۔ یہی 'مَا' آگے 'وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا' میں بھی ہے۔ 'فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا' اِسی 'مَا' کے تحت ہے۔ گویا پوری بات یوں ہے کہ نفس اور اُس کے سنوارنے، پھر اُس کی نیکی اور بدی اُسے الہام کر دینے کی قسم۔ اِس اسلوب میں کیا ندرت ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''مَا' مصدریہ... فعل کو صرف مصدر کے معنی میں کر دینے ہی کے لیے نہیں آتا، بلکہ اُس فعل میں جو قدرت، جو شان، جو حکمت، جو فیض بخشی، جو ندرت اور جو حیرت انگیز صنعت گری مضمر یا ظاہر ہوتی ہے، اُن سب کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ مثلاً، آسمان کے ساتھ 'وَمَا بَنٰىهَا' جو فرمایا تو اِس کے معنی ہوں گے: اور شاہد ہے آسمان اور اُس کی حیرت انگیز ساخت، اور اِس کے اندر

فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ﴿٨﴾ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ﴿٩﴾ وَقَدْ خَابَ

نیکی اُسے سجھا دی[۳] کہ روز قیامت شدنی ہے[۴]۔ (اِس لیے) فلاح پا گیا وہ جس نے نفس

آسمان کے وہ تمام عجائب اور کرشمے مضمر ہوں گے جن کی طرف قرآن نے گوناگوں اسلوبوں سے توجہ دلائی اور اپنے مختلف بنیادی دعاوی پر اُن سے دلیل قائم کی ہے۔ ظاہر ہے کہ 'مَا' موصولہ کے اندر اِن استدلالی پہلوؤں کی طرف توجہ دلانے کی کوئی صلاحیت نہیں ہوتی۔

... 'وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا' کو بھی اِسی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ سورۂ غاشیہ میں فرمایا ہے: وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ*... اِس اجمال کے اندر وہ ساری تفصیل مضمر ہے جو قرآن نے دوسرے مقامات میں زمین کے آثار و عجائب سے متعلق بیان فرمائی اور اُس سے اپنے مختلف دعاوی پر دلیل قائم کی ہے۔ گویا جن حقائق پر غور کرنے کے لیے سورۂ غاشیہ میں 'كَيْفَ' سے ابھارا ہے، اُنھی پر غور کرنے کے لیے یہاں 'مَا' مصدریہ سے کام لیا ہے۔ لیکن دونوں کے محل استعمال میں ایک دقیق فرق بھی ہے جس پر گفتگو کا یہاں موقع نہیں ہے۔''

(تدبر قرآن ۹/۳۸۶)

۲؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا'۔ اِن میں 'نَفْسٍ' کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے۔ اِس سے بھی اُس کی حیرت انگیز ساخت اور اُس کی حکیمانہ تشکیل کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔ اِس کے بعد — 'جیسا کہ اُسے سنوارا' — کے الفاظ اِسی پر دلالت کرتے ہیں اور اِس لیے آئے ہیں کہ یہاں استدلال میں نفس انسانی کی تخلیق کا تکمیلی مرحلہ بھی پیش نظر ہے، جب وہ قدرت کے ایک شاہ کار کی حیثیت سے اِس کا اہل ہوا کہ خیر و شر کے الہام سے بہرہ مند کیا جائے۔

۳؎ یہ تسویہ کا نتیجہ بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح انسان کو دیکھنے کے لیے آنکھیں اور سننے کے لیے کان دیے ہیں، بالکل اُسی طرح نیکی اور بدی کو الگ الگ پہچاننے کے لیے ایک حاسۂ اخلاقی بھی عطا فرمایا ہے۔ وہ محض ایک حیوانی اور عقلی وجود ہی نہیں ہے، اِس کے ساتھ ایک

*۸۸:۲۰۔

اخلاقی وجود بھی ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ خیر و شر کا امتیاز اور خیر کے خیر اور شر کے شر ہونے کا احساس انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی اُس کے دل و دماغ میں الہام کر دیا گیا ہے۔ بعض دوسرے مقامات پر یہی حقیقت 'اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ*' (ہم نے اُسے خیر و شر کی راہ سجھا دی) اور 'هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ**' (ہم نے کیا اُسے دونوں راستے نہیں سجھائے) کے الفاظ میں واضح کی گئی ہے۔ یہ امتیاز و احساس ایک عالم گیر حقیقت ہے۔ چنانچہ برے سے برا آدمی بھی گناہ کرتا ہے تو پہلے مرحلے میں اُسے چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دینے کے بعد اُس کی لاش چھپانے کی کوشش کی تھی تو ظاہر ہے کہ احساس گناہ کی وجہ سے کی تھی۔ یہی معاملہ نیکی کا ہے۔ انسان اُس سے محبت کرتا ہے، اُس کے لیے اپنے اندر عزت و احترام کے جذبات پاتا ہے اور اپنے لیے جب بھی کوئی معاشرت پیدا کرتا ہے، اُس میں حق و انصاف کے لیے لازماً کوئی نظام قائم کرتا ہے۔ یہ اِس امتیاز خیر و شر کے فطری ہونے کا صریح ثبوت ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ برائی کے حق میں انسان بعض اوقات بہانے بھی تراش لیتا ہے، لیکن جس وقت تراشتا ہے، اُسی وقت جانتا ہے کہ یہ بہانے وہ اپنی فطرت کے خلاف تراش رہا ہے، اِس لیے کہ وہی برائی اگر کوئی دوسرا اُس کے ساتھ کر بیٹھے تو بغیر کسی تردد کے وہ اُسے برائی ٹھیراتا اور اُس کے خلاف سراپا احتجاج بن جاتا ہے۔

۴؎ اوپر جو گواہی پیش کی گئی ہے، وہ قسم کے اسلوب میں ہے۔ یہ اُن قسموں کا مقسم علیہ ہے جسے قرآن نے اصل میں حذف کر دیا ہے۔ آگے کا جملہ اِس کی طرف اشارہ کر رہا ہے، اِس وجہ سے اِس کے اظہار کی ضرورت نہیں رہی۔ اِن قسموں میں پہلے اُس شان و عظمت، تدریج و اہتمام اور قدرت و حکمت کی شہادت ہے جس کا مشاہدہ ہم مہ و آفتاب کے طلوع و غروب، لیل و نہار کی گردش اور زمین و آسمان کی خلقت میں کرتے ہیں۔ اِن میں سے ایک ایک چیز خدا کی آیات خلق و

---

*الدہر ۷۶: ۳۔

**البلد ۹۰: ۱۰۔

تدبیر اور اُس کے عجائب قدرت کا ایک دفتر ہے۔ انسان اِن کو جس پہلو سے دیکھتا ہے، اگر آنکھیں کھلی ہوئی اور عقل بیدار ہو تو علم و حکمت کا ایک دبستان کھل جاتا ہے۔ اِن کی ایک ایک حرکت گواہی دیتی ہے کہ اِن کے بنانے والے کی قدرت عظیم ہے، اُس کی حکمت بے پایاں ہے، اُس کی ربوبیت بے نہایت اور عالم گیر ہے اور اُس کے لیے کوئی بڑے سے بڑا کام بھی ناممکن نہیں ہے۔ یہ اضداد ہیں، لیکن جس سازگاری اور فرماں برداری سے اپنے خالق کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں، وہ حیرت انگیز ہے۔ آیتوں میں 'ضُحٰهَا'، 'اِذَا تَلٰهَا'، 'اِذَا جَلّٰهَا' اور 'اِذَا یَغْشٰهَا' کے الفاظ اِسی پہلو کو نمایاں کرتے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...نہ سورج چاند کے حدود میں مداخلت کرتا، نہ چاند اپنے وقت سے پہلے ظہور میں آنے کے لیے زور لگاتا، نہ دن کی یہ تاب کہ وہ اپنے وقت سے پہلے برآمد ہو جائے اور نہ رات کی یہ مجال کہ وہ دن کو اُس کی ڈیوٹی پوری کرنے سے پہلے ہی برخاست کر دے۔''

(تدبر قرآن ۹/۳۸۵)

اِس کے بعد نفس کی شہادت پیش فرمائی ہے کہ انسان اِس پر غور کرے اور دیکھے کہ اپنی تشکیل کے لحاظ سے یہ کیسا غیر معمولی شاہ کار ہے، اِسے کیا صلاحیتیں دی گئی ہیں، یہ علم و عقل کی کن نعمتوں سے نوازا گیا ہے، اِس میں کیا کیا امکانات چھپا کر رکھے گئے ہیں جو اپنے وقت پر اِس طرح ظہور میں آتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ انسان اُس کے عجائب پر غور کرے تو گویا ایک پوری کائنات ہے جو اُس کے جسمانی قالب کے اندر رکھ دی گئی ہے۔ پھر یہی نہیں، سب سے زیادہ قابل توجہ چیز یہ ہے کہ اِسے خیر و شر کا شعور دیا گیا ہے۔ یہ اِسی شعور کا نتیجہ ہے کہ اُس کے ضمیر میں ایک نگران ہر وقت اُس کی برائیوں پر اُسے متنبہ کرتا رہتا ہے۔ یہ ایک چھوٹی عدالت ہے جو انسان کے اندر قائم ہے اور ہر موقع پر اپنا بے لاگ فیصلہ سناتی ہے۔ انسان اِس فیصلے کو مانے یا نہ مانے، وہ فکر و خیال اور علم و عمل کی ہر لغزش کے بعد اُسے سنتا ضرور ہے، یہاں تک کہ اُس کی بدنفسی اِس قدر بڑھ جائے کہ اعمال کی سیاہی اُس کے دل کا احاطہ کر کے اُس کو بالکل اندھا بہرا کر دے۔ یہ انسان کے اوپر خود اُس کے باطن کی گواہی ہے جسے سورۂ قیامہ (۷۵) میں نفس لوامہ کی شہادت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

مَنۡ دَسّٰىهَا ﴿١٠﴾
كَذَّبَتۡ ثَمُوۡدُ بِطَغۡوٰىهَاۤ ﴿١١﴾ اِذِ انۡۢبَعَثَ اَشۡقٰىهَا ﴿١٢﴾

کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اُسے آلودہ کر ڈالا۔[5] ۱-۱۰

ثمود[6] نے اپنی سرکشی کے باعث[7] اِسے جھٹلا دیا، جب اُن کا سب سے بڑا بد بخت اٹھ[8]

نفس اور مادہ کے اِن تمام مظاہر کی طرف توجہ دلا کر قرآن نے استدلال فرمایا ہے کہ یہ دنیا کوئی اتفاقی حادثہ یا کھیل تماشا نہیں ہے اور نہ انسان کوئی شتر بے مہار ہے کہ یونہی غیر مسئول چھوڑ دیا جائے اور اُس کا خالق علم و عمل میں اُس کے رویوں کے لحاظ سے اُس کو جزا یا سزا نہ دے۔ وہ لازماً مسئول ٹھیرایا جائے گا اور دنیا کا کارخانہ بھی ایک بامقصد اور باغایت کارخانہ ہے، یہ غایت ایک دن لازماً ظہور میں آئے گی۔ اللہ تعالیٰ نے قیامت کا دن اِسی غایت کو ظہور میں لانے کے لیے مقرر کیا ہے۔ لہٰذا قیامت شدنی ہے۔

۵ یہ نتیجہ ہے جس کے لیے قیامت برپا کی جائے گی۔ انبیا علیہم السلام جس چیز کی دعوت دیتے ہیں، وہ یہی تزکیہ ہے جس کے حاملین کو اِن آیتوں میں فلاح کی بشارت دی گئی ہے۔ انبیا کی ہدایت میں غایت اور مقصود کی حیثیت اِسی کو حاصل ہے۔ اِس کے معنی کسی چیز کو آلایشوں سے پاک کرنے کے بھی ہیں اور نشو و نما دینے کے بھی۔ چنانچہ جو لوگ اپنے نفس کو فجور سے پاک کر لیں اور اُس کو ابھار کر معرفت الٰہی کے اُس درجے تک پہنچا دیں جسے قرآن نے نفس مطمئنہ سے تعبیر کیا ہے، اُن کے لیے اُن کے پروردگار کی طرف سے فلاح کی ضمانت ہے۔ دین اصلاً اِسی مقصود کو پانے اور اِسی غایت تک پہنچنے میں انسان کی رہنمائی کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ وہ لوگوں کے لیے داروغہ بن کر اُن پر خدائی فوج داروں کی حکومت قائم کر دینے کے لیے نازل نہیں کیا گیا۔

۶ انفس و آفاق کی نشانیوں سے استدلال کے بعد یہاں سے آگے ایک ایسی قوم کی تاریخ سے استدلال فرمایا ہے جس کے لیے خدا کی دینونت کا ظہور ہوا۔ اِس کا انتخاب بطور خاص اِس

فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَ سُقْيٰهَا ﴿۱۳﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۙ۬ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ﴿۱۴﴾

کھڑا ہوا تو اللہ کے رسول نے اُنھیں متنبہ کیا کہ اللہ کی اِس اونٹنی اور اِس کے پینے کی باری سے خبردار رہو۔[9] مگر اُنھوں نے اُسے جھٹلایا اور اونٹنی کی کوچیں کاٹ دیں۔[10] سو اُن کے اِس گناہ کی پاداش میں[11] اُن کے پروردگار نے اُن پر ایسی آفت توڑی کہ سب کو برابر کر دیا۔[12] اور

لیے کیا گیا ہے کہ اہل عرب اِس کے حالات سے پوری طرح واقف تھے اور اِس کی تباہی کی داستان اُن کے بچے بچے کو معلوم تھی۔

۷ رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اللہ تعالیٰ نے جن قوموں کو دنیا میں سزا دی ہے، اُن کا اصل جرم یہی تھا کہ اُنھوں نے رسولوں کی تکذیب اِس وجہ سے نہیں کی کہ اُن پر حق واضح نہیں ہوا، بلکہ اُنھوں نے حق کے واضح ہو جانے کے باوجود محض سرکشی کے باعث اُنھیں جھٹلا دیا۔

۸ مراد ہے قوم ثمود کا سردار، قدار۔ عرب جاہلیت کی شاعری میں اِس کا ذکر اِسی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔

۹ یہ اونٹنی قوم ثمود کے پیغمبر، حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کے اِس مطالبے پر نامزد کی تھی کہ وہ اُنھیں عذاب کی کوئی نشانی دکھائیں۔ اِس کے ساتھ اُنھوں نے یہ امتحان مقرر کر دیا تھا کہ ایک دن یہ پانی پیے گی اور ایک دن وہ اپنے جانوروں کو پانی پلائیں گے۔ اِس کے لیے اصل میں 'نَاقَةَ اللّٰهِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں لفظ 'نَاقَة' کا نصب بربناے تحذیر ہے۔ کسی خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے یہ اسلوب ہماری زبان میں بھی عام ہے کہ جملے میں فعل اِسی طریقے سے مقدر کر دیا جائے۔

۱۰ یہ اونٹنی کے قتل کی تعبیر ہے، اِس لیے کہ کونچیں کاٹ دی جائیں تو اونٹ لازماً مر جاتا ہے۔

۱۱ یعنی اِس گناہ کی پاداش میں کہ جو اونٹنی عذاب کی ایک نشانی کے طور پر خود اُن کے مطالبے پر

وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ﴿۱۵﴾

اُسے کوئی اندیشہ نہ تھا کہ اِس کے پیچھے کیا ہوگا۔[۱۳] ۱۱-۱۵

نامزد کی گئی تھی، اُنھوں نے اُسے گزند پہنچانے کی جسارت کی اور اِس طرح ثابت کر دیا کہ اُن کی سرکشی اُس انتہا کو پہنچ چکی ہے جس کے بعد عفو و درگذر کی گنجایش ختم ہو جاتی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... یہ اونٹنی عذاب الٰہی کی نشانی تھی اور... بطور امتحان مقرر کی گئی تھی کہ اندازہ ہو جائے کہ قوم کا طغیان کس درجے تک پہنچ چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ اِس جرم کے بعد اگر اُن کو ڈھیل ملتی تو وہ خود اللہ کے رسول پر ہاتھ ڈالنے کی جسارت کر گزرتے اور یہ وہ جرم ہے جس کی مہلت اللہ تعالیٰ کسی قوم کو نہیں دیتا، بلکہ جب کسی قوم نے رسول کے قتل کرنے کا ارادہ کر لیا ہے تو وہ لازماً تباہ کر دی گئی ہے۔'' (تدبر قرآن ۹/ ۳۹۳)

۱۲؎ اصل میں لفظ 'دَمْدَمَ' استعمال ہوا ہے۔ سرما کے بادلوں، طوفانی ہواؤں اور ژالہ باری کا جو عذاب قوم ثمود پر آیا، اُس کے لیے یہ لفظ نہایت موزوں ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... 'دَمْدَمَة' کے معنی ہلاک کر دینے کے ہیں، لیکن اِس کے اندر عذاب کی شدت اور بے پناہی کا مضمون بھی مضمر ہے جو مجرد 'ہلاک کر دینے' کے لفظ سے واضح نہیں ہوتا۔ اگر اِس کو ٹھیک ٹھیک تعبیر کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ تب اُن کے خداوند نے اُن کے اوپر دھادھم عذاب برسا دیا۔'' (تدبر قرآن ۹/ ۳۹۳)

۱۳؎ یعنی اُس نے یہ کام اپنے بے پایاں علم، اپنی بے پناہ قدرت اور اپنی اتھاہ حکمت کے تحت کیا ہے، اُس پر اُسے کوئی پچھتاوا نہیں ہو سکتا۔ اِس سے ضمناً قرآن مجید نے بائیبل کی کتاب پیدایش کے اُن بیانات کی بھی تردید کر دی ہے جن میں یہ ذکر ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض فیصلوں پر ملول ہوا ــــــ ملاحظہ ہو: باب ۶، آیات ۵-۶ اور باب ۸، آیت ۲۱۔

سورة اللیل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالَّیۡلِ اِذَا یَغۡشٰی ۙ﴿۱﴾ وَالنَّہَارِ اِذَا تَجَلّٰی ۙ﴿۲﴾ وَمَا خَلَقَ الذَّکَرَ وَالۡاُنۡثٰۤی ۙ﴿۳﴾ اِنَّ سَعۡیَکُمۡ لَشَتّٰی ؕ﴿۴﴾

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

رات گواہی دیتی ہے، جب وہ چھا جائے؛ اور دن بھی، جب وہ روشن ہو؛[۱۴] اور نر و مادہ کی تخلیق بھی[۱۵] کہ دنیا ہے تو قیامت بھی ہے[۱۶] اور جو کچھ تم کر رہے ہو، اُس کے نتائج (وہاں) لازماً الگ الگ ہوں گے۔[۱۷] ۱-۴

۱۴؎ رات اور دن کی گواہی کے ساتھ 'اِذَا یَغۡشٰی' اور 'اِذَا تَجَلّٰی' کے الفاظ پچھلی سورہ ـــــ الشّمس ـــــ کی طرح یہاں بھی شب و روز کے باہمی توافق اور اُس کی نتیجہ خیزی کو نمایاں کرتے ہیں۔

۱۵؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَمَا خَلَقَ الذَّکَرَ وَالۡاُنۡثٰی'۔ یہ 'مَا' مصدریہ ہے۔ اِس کی بلاغت ہم پچھلی سورہ کے حواشی میں آیات ۱-۶ کے تحت بیان کر چکے ہیں۔

۱۶؎ دنیا میں دو ہی چیزیں ہیں: ایک نفس اور دوسرے مادہ۔ پہلی چیز کے مظاہر میں سے نر و مادہ اور دوسری کے مظاہر میں سے شب و روز کو لے کر قیامت پر استدلال فرمایا ہے۔ یہ استدلال اِس پہلو سے ہے کہ اِن چیزوں میں نسبت زوجین کی ہے اور یہ دونوں عالم کی مجموعی مصلحت کے تناظر میں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں، اِن میں سے ایک کو مان کر دوسرے کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ قیامت بھی بالکل اِسی طرح دنیا کا جوڑا ہے۔ دنیا کے ساتھ قیامت کو مان کر ہی اُس کے تمام مظاہر و احوال کی توجیہ کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا دنیا ہے تو قیامت بھی ہے۔ اِن میں سے ایک کو مان کر دوسری کا

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ﴿۵﴾ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ﴿۶﴾ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ﴿۷﴾ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ﴿۸﴾ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ﴿۹﴾ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ﴿۱۰﴾ وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰى ﴿۱۱﴾

پھر جس نے (راہ خدا میں) دیا اور پرہیزگاری اختیار کی[۱۸] اور اچھے انجام کو سچ مانا، اُسے ہم سہج سہج راحت میں لے جائیں گے۔ اور جس نے بخل کیا اور بے پروائی برتی اور اچھے انجام کو جھٹلایا، اُسے ہم سہج سہج سختی میں پہنچا دیں گے[۱۹]۔ اور اُس کے کیا کام آئے گا

انکار نہیں کرسکتے، الاّ یہ کہ انسان دنیا کو رام کی لیلا اور یزداں کی تماشا گاہ مان کر مطمئن ہو جائے اور اُس کے خالق کے بارے میں بھی یہ تصور کرلے کہ وہ کوئی علیم و حکیم ہستی نہیں ہے، بلکہ ایک کھلنڈرا ہے جو اپنی دنیا کے خیر و شر سے بے نیاز اُس کی سیر دیکھ رہا ہے۔

۱۷؎ یہ نتیجہ ہے جس کے لیے قیامت برپا کی جائے گی۔ اِس کے لیے اصل میں 'اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى' کے الفاظ آئے ہیں۔ لفظ 'سَعْی' اِن میں نتیجۂ سعی کے مفہوم میں ہے۔ اِس مفہوم میں اِس کا استعمال عربی زبان میں معروف ہے۔ لفظ 'شَتّٰى'، 'شتیت' کی جمع ہے۔ اِس کے معنی متفرق اور الگ الگ کے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...یعنی عقل اور فطرت کا بدیہی تقاضا ہے کہ نیکوں اور بدوں، دونوں کی سعی کا نتیجہ ایک ہی شکل میں نہ برآمد ہو، بلکہ اُن کی جدوجہد کے اعتبار سے الگ الگ ہو۔ جنھوں نے نیکی کمائی ہو، وہ اُس کا صلہ فضل و انعام کی شکل میں پائیں اور جنھوں نے بدی کمائی ہو، وہ اُس کے انجام سے دوچار ہوں۔ گویا قیامت کا دعویٰ یہاں اُس کی اصل ضرورت کے پہلو سے سامنے رکھا ہے کہ اُس کا آنا اِس وجہ سے ضروری ہے کہ قیامت اور جزا و سزا کے بغیر یہ دنیا ایک اندھیر نگری اور ایک کھلنڈرے کا کھیل بن کے رہ جاتی ہے۔" (تدبر قرآن ۹/۴۰۲)

۱۸؎ یعنی ریا اور نمایش کے لیے نہیں، بلکہ خدا کے خوف اور اُس کی خوشنودی کی تمنا میں خرچ

البیان

اللیل ۹۲

اِنَّ عَلَیۡنَا لَلۡہُدٰی ﴿۱۲﴾ وَ اِنَّ لَنَا لَلۡاٰخِرَۃَ وَ الۡاُوۡلٰی ﴿۱۳﴾
فَاَنۡذَرۡتُکُمۡ نَارًا تَلَظّٰی ﴿۱۴﴾

اُس کا مال، جب وہ گڑھے میں گرے گا؟ ۵-۱۱

ہمارا کام سمجھانا تھا، اور حقیقت یہ ہے کہ دنیا بھی ہمارے ہی اختیار میں ہے اور آخرت بھی۔[20] سو، (ام القریٰ کے رہنے والو)، میں نے دہکتی آگ سے تمھیں خبردار کر دیا ہے۔[21] ۱۲-۱۴

کیا۔ آیت میں 'اَعۡطٰی' کے بعد 'اِتَّقٰی' کے ذکر سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو رہی ہے۔

۱۹؎ اصل میں 'حُسۡنٰی'، 'یُسۡرٰی' اور 'عُسۡرٰی' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ صفات ہیں جن کا موصوف محذوف ہے، یعنی 'اَلۡعَاقِبَۃُ الۡحُسۡنٰی' اور 'اَلۡعَاقِبَۃُ الۡیُسۡرٰی وَ الۡعُسۡرٰی'۔ لفظ 'تَیۡسِیۡر' 'یُسۡرٰی' کے ساتھ توفیق اور 'عُسۡرٰی' کے ساتھ امہال کے مفہوم پر دلالت کرتا ہے۔ یہ اُس سنت الٰہی کو واضح کر دیتا ہے جو نیکی اور بدی کا راستہ اختیار کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے مقرر کر رکھی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"قرآن میں یہ سنت الٰہی جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ جو لوگ نیکی کی راہ اختیار کرنے کا حوصلہ نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ اُن کی باگ اُن کے نفس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اُن کو اپنے نفس سے کوئی مزاحمت نہیں کرنی پڑتی، اِس وجہ سے وہ سمجھتے ہیں کہ اُن کی راہ نہایت ہموار ہے۔ نفس کی پیروی کرتے ہوئے وہ خوش خوش زندگی کی آخری منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔ اِس کے بعد اُن کو اُس مرحلے سے سابقہ پیش آتا ہے جس کو قرآن نے 'سَاُرۡہِقُہٗ صَعُوۡدًا'* (میں اُس کو چڑھاؤں گا ایک کٹھن چڑھائی) سے تعبیر کیا ہے۔ یہاں اِسی مرحلے کی طرف اشارہ ہے۔

اِس کے بالکل برعکس اُن لوگوں کی زندگی ہوتی ہے جو ایمان اور عمل صالح کی راہ پر چلنے کا

* المدثر ۷۴: ۱۷۔

لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ﴿١٥﴾ الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿١٦﴾ وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ﴿١٧﴾ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ﴿١٨﴾ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ﴿١٩﴾ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ﴿٢٠﴾

اِس میں تمھارا وہ سب سے بڑا بد بخت[۲۲] ہی پڑے گا جس نے جھٹلایا اور منہ پھیر لیا ہے۔ اور اُس سے یقیناً دور رکھا جائے گا (ہمارا پیغمبر)، وہ انتہائی پرہیز گار جو اپنا مال اِس لیے دیتا ہے کہ اُسے تزکیہ حاصل ہو اور جس کی کوئی عنایت بھی کسی پر اِس لیے نہیں

الليل ۹۲

حوصلہ کر لیتے ہیں۔ اُن کو قدم قدم پر اپنے نفس کی خواہشوں سے لڑائی کرنی پڑتی ہے اور اِس لڑائی ہی سے اُن کو بالتدریج وہ قوت حاصل ہوتی ہے جو راہ کے عقبات عبور کرنے میں اُن کو مدد دیتی ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے اُن کے سامنے 'فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ، وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ*' کی آخری منزل آجاتی ہے۔" (تدبر قرآن ۹/۴۰۴)

۲۰؎ مطلب یہ ہے کہ متنبہ ہو جاؤ، اپنی تدبیر اور زور سے نہ تم دنیا میں کچھ بنا سکتے ہو اور نہ آخرت میں بنا سکو گے۔ دونوں کے مالک ہم ہی ہیں۔ تم میں سے اگر کسی کو اپنے مال و دولت، حسب و نسب یا اپنے خیالی معبودوں پر ناز ہے تو اُسے یاد رکھنا چاہیے کہ اِن میں سے کوئی چیز بھی آخرت میں کام نہ آسکے گی۔

۲۱؎ مرحلۂ انذار عام کی سورتیں یہاں ختم ہو رہی ہیں۔ تسلی اور بشارت کی دو سورتوں سے پہلے انذار کے مضمون کی یہ آخری سورہ ہے۔ اِس آیت کو پڑھتے ہوئے یہ بات پیش نظر رہے تو اِن الفاظ کا زور پوری طرح سمجھ میں آسکتا ہے۔

۲۲؎ ابولہب کی طرف اشارہ ہے جس کی شخصیت اِس باب کے آخر میں بالکل نمایاں ہو کر سامنے آجائے گی۔

* الفجر ۸۹: ۲۹-۳۰۔ "(لوٹ) اور میرے بندوں میں شامل ہو اور میری جنت میں داخل ہو۔"

وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ﴿٢١﴾

کہ اُسے بدلہ ملے، بلکہ صرف اپنے خداے برتر کی رضا جوئی کے لیے ہے۔ اور اب زیادہ دیر نہ ہوگی کہ (اپنے پروردگار کی عنایتوں سے) وہ نہال بھی ہو جائے گا۔[۲۳] ۱۵-۲۱

۲۳؎ یہی مضمون ہے جو بعد کی سورتوں میں اصل مضمون کی حیثیت سے بیان ہوا ہے۔

کوالالمپور

۷/ مارچ ۲۰۱۰ء

الليل
۹۲

الضحیٰ - الم نشرح

۹۳ ـــ ۹۴

الضحیٰ - الم نشرح

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ اِن میں خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ قرآن کی ترتیب میں اِن کا یہ مقام بتاتا ہے کہ ام القریٰ مکہ میں آپ کی دعوت کا مرحلۂ انذار عام اِنھی دو سورتوں پر ختم ہوا ہے۔ یہی بات اِن کے مضمون سے بھی واضح ہوتی ہے۔

دونوں سورتوں کا موضوع نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور آیندہ ایک بڑی کامیابی کی بشارت ہے۔

سورۃ الضحیٰ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالضُّحٰی ① وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی ② مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی ③
وَلَلۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ لَّکَ مِنَ الۡاُوۡلٰی ④ وَلَسَوۡفَ یُعۡطِیۡکَ رَبُّکَ فَتَرۡضٰی ⑤

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

دن گواہی دیتا ہے، جب وہ روشن ہو؛ اور رات بھی، جب وہ پرسکون ہو جائے[۱] کہ (انسان کی تربیت کے لیے بھی رنج وراحت، دونوں چاہییں[۲]، اِس لیے) تمھارے پروردگار نے تمھیں چھوڑا ہے، نہ وہ تم سے ناراض ہوا ہے[۳]۔ آنے والے دن تمھارے لیے اِن

۱؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَالضُّحٰی وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی'۔ 'ضُحٰی' چاشت کے وقت کو کہتے ہیں۔ 'اِذَا سَجٰی' اِسی کے مقابل میں ہے۔ لہٰذا لفظ 'ضُحٰی' سے دن کا جو حصہ مراد لیا گیا ہے، رات کا بھی وہی حصہ مراد ہے۔

۲؎ یعنی جس طرح دنیا کی زندگی کے لیے دن کی روشنی اور حرارت، اور رات کی تاریکی اور سکون، دونوں ضروری ہیں، اُسی طرح انسان کی روحانی اور اخلاقی تربیت کے لیے بھی رنج وراحت، دونوں ناگزیر ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ دعوت کی مشکلات، مخالفتوں کا ہجوم اور توقعات کے خلاف قوم کا ردعمل اگر کمر شکن ہو رہا ہے تو اِس میں یہی حکمت ملحوظ ہے۔ وحی کے نزول میں بھی اِس طرح کی تمام حکمتیں ملحوظ رکھی جاتی ہیں۔ یہ تمھاری اور تمھارے ساتھیوں کی تربیت کی ناگزیر ضرورت ہے۔ مطمئن رہو، اِس معاملے میں سنت الٰہی یہی ہے۔

۳؎ شب و روز کے تقاعل کی گواہی جس مدعا کو مبرہن کرنے کے لیے پیش کی گئی ہے، یہ اُس کا

اَلَمۡ يَجِدۡكَ يَتِيۡمًا فَاٰوٰى ۞ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۞

پہلے دنوں سے کہیں بہتر ہوں گے[۴] (اے پیغمبر)، اور تمھارا پروردگار عنقریب تمھیں اتنا دے گا کہ نہال ہو جاؤ گے[۵]۔ ۱-۵

کیا[۶] یہ حقیقت نہیں ہے کہ اُس نے تمھیں یتیم دیکھا تو ٹھکانا دیا[۷]؟ راستہ ڈھونڈتے

وہ پہلو نمایاں کر دیا ہے جو اُس وقت آپ کی پریشانی کو دور کرنے اور آپ کی تسلی کے لیے ضروری تھا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... مطلب یہ ہوا کہ اِس وقت اگر تم مخالفوں کی مخالفت، اعوان و انصار کی قلت اور اسباب و وسائل کی کمی سے دوچار ہو یا آسمانی و روحانی کمک کی جتنی ضرورت محسوس کر رہے ہو، اتنی تمھیں نہیں پہنچ رہی ہے تو اِس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ تمھارے رب نے تمھیں چھوڑ دیا ہے یا تم سے بے زار ہو گیا ہے، بلکہ یہ تمھاری تربیت کے لیے تمھارا امتحان ہے تاکہ تم اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے اچھی طرح تیار ہو جاؤ۔'' (تدبر قرآن ۹/ ۴۱۳)

۴؎ اصل میں 'اَلْاُوْلٰی' اور 'اَلْاٰخِرَة' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ اِس آیت میں دنیا اور آخرت کے اصطلاحی مفہوم میں نہیں، بلکہ اپنے عام معنی میں استعمال ہوئے ہیں، یعنی پہلے اور بعد کا دور۔ آیت میں جو بشارت دی گئی ہے، وہ ایک جامع بشارت ہے۔ اِس میں وہ تمام فتوحات شامل ہیں جو بعد میں آپ کو حاصل ہوئیں اور جن کے نتیجے میں پورے جزیرہ نماے عرب میں آپ کی حکومت قائم ہو گئی، بیت اللہ آپ کے حوالے کر دیا گیا، آپ کے دشمن پامال ہو گئے اور دین میں داخل ہونے والوں کے ہجوم کسی گنتی کرنے والے کی گنتی میں نہیں رہے۔

۵؎ یعنی تمھاری اور تمھارے ساتھیوں کی وہ سب آرزوئیں پوری ہو جائیں گی جو اسلام کے مستقبل سے متعلق تم اپنے دلوں میں رکھتے ہو۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... چونکہ ابھی یہ ساری باتیں پردۂ غیب میں تھیں، اِس وجہ سے 'یُعْطِیْكَ' کے مفعول ثانی کو ظاہر نہیں فرمایا، لیکن اِس کے بعد 'فَتَرْضٰی' کے لفظ نے کسی قدر اِس شان دار مستقبل کی جھلک

وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ⑧ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ⑨ وَاَمَّا

دیکھا تو راستہ دکھایا؟[8] اور محتاج دیکھا تو (وہ شرحِ صدر عطا فرمایا کہ) غنی کر دیا۔[9] اِس

دکھادی کہ اتنا دے گا کہ بس تم نہال ہو جاؤ گے! ـــــ اِس ایک ہی لفظ کے اندر وہ سب کچھ موجود ہے جو ایک دفتر میں بھی نہیں سما سکتا۔'' (تدبرقرآن ۹/۴۱۵)

۶۔ یہاں سے آگے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بعض اہم واقعات کی طرف توجہ دلا کر اُسی بات کو موکد کر دیا ہے جو اوپر ارشاد ہوئی ہے۔

۷۔ یہ اُس عزت و محبت، سرپرستی اور شفقت کی طرف اشارہ ہے جو آپ کو پہلے اپنے دادا اور بعد میں چچا سے حاصل ہوگئی۔

۸۔ اصل میں لفظ 'ضَآلّ' آیا ہے۔ بعثت سے پہلے آپ جن الجھنوں کو سلجھانے میں گم رہے، یہ اُنھی کی تعبیر ہے۔ گویا 'ضَلَّ' یہاں 'لم یھتد الی الطریق' کے معنی میں ہے، اِس لیے 'ضَآلّ' کا ترجمہ گم راہ نہیں، بلکہ جویاے راہ کرنا چاہیے۔ یعنی وہ شخص جو راستے کی تلاش میں سرگرداں ہو، لیکن اُس کا کوئی سراغ اُسے نہ مل رہا ہو۔ عرب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے دین حنیفی کے سب پیرو اِسی صورت حال سے دوچار تھے۔ تاریخ کی روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ وہ حرم کی دیواروں سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے اور بڑی حسرت کے ساتھ کہتے تھے: پروردگار، ہم نہیں جانتے کہ تیری عبادت کس طرح کریں، ورنہ اُسی طرح کرتے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...حضرات انبیا علیہم السلام بعثت سے پہلے بھی فطرت سلیم پر ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کے ابتدائی دور میں بھی فطرت کی بدیہیات سے کبھی منحرف نہیں ہوتے۔ لیکن فطرت صرف عقائد و اعمال کی موٹی موٹی باتوں ہی میں رہنمائی کر سکتی ہے۔ تمام عقائد اور اُن کے سارے تضمنات و لوازم کی نہ وہ تشریح کر سکتی اور نہ تمام اعمال و اخلاق کی صحیح صحیح حد بندی اُس کے بس میں ہے۔ اِس وجہ سے فطرت پر ہونے کے باوجود ایک شخص یہ جاننے کا محتاج ہی رہتا ہے کہ جس خدا کے وجود پر اُس کا دل گواہی دے رہا ہے، اُس کی صفات اور اِن صفات کے تقاضے اور مطالبے کیا

السَّآئِلَ فَلَا تَنۡهَرۡ ﴿۱۰﴾ وَاَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ ﴿۱۱﴾

لیے اب یتیم ہو تو اُسے دباؤ نہیں[10]، اور پوچھنے والا ہو[11] تو اُسے جھڑکو نہیں، اور ہدایت کی جو نعمت تمھارے پروردگار نے تمھیں دی ہے، اُس کا چرچا کرتے رہو[12]۔ ۶-۱۱

ہیں؟ اُس کے کیا حقوق بندے پر عائد ہوتے اور وہ کس طرح ادا کرنے ہیں؟ زندگی کی ایسی ضابطہ بندی کس طرح کی جائے کہ وہ پوری کی پوری اپنے بعید ترین گوشوں میں بھی خالق کی پسند کے مطابق ہو جائے؟ جب تک یہ سوالات حل نہ ہوں، اُس وقت تک نہ انسان کو حقیقی اطمینان حاصل ہو سکتا اور نہ رب کے ساتھ اُس کا تعلق ہی استوار ہو سکتا۔ یہی سوالات ہیں جو پوری شدت کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر زندگی کے اُس دور میں مستولی تھے جس کی طرف 'وَوَجَدَكَ ضَآلًّا' کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ حالت نہ ضلالت کی ہے اور نہ اِس کو ہدایت سے تعبیر کر سکتے، بلکہ صحیح الفاظ میں یہ جستجوے راہ کی سرگردانی ہے۔ گویا ایک شخص چوراہے پر کھڑا ہو اور فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ کس سمت میں قدم بڑھائے۔'' (تدبر قرآن ۹/۴۱۶)

۹۔ یہ غنا اُس ہدایت کا ثمرہ ہے جس کا ذکر پچھلی آیت میں ہوا ہے۔ اِس کا حق آگے 'وَاَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ' کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اِس سے واضح ہے کہ اِس غنا کا تعلق اصلاً مال سے نہیں، بلکہ قلب کے احوال سے ہے۔ اِس کی صحیح تعبیر وہ شرح صدر ہے جس کا ذکر آگے سورہ ـــــ الم نشرح ـــــ میں آئے گا۔ آدمی کو یہ چیز خدا کی سچی معرفت اور اُس قانون و حکمت سے حاصل ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے آتا ہے۔ دنیا میں سب سے بڑے محتاج وہی ہیں جو اِس دولت سے محروم ہیں۔ بعثت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہی احتیاج سرگرداں کیے ہوئے تھی۔ یہ دولت حاصل ہو گئی تو آپ سے بڑھ کر کوئی غنی نہیں تھا۔

۱۰۔ اوپر کی نعمتیں جس ترتیب سے مذکور ہیں، یہ اب اُسی ترتیب سے اُن کا حق بتا دیا ہے۔ اِس میں، اگر غور کیجیے تو قریش کے اُن فراعنہ پر ایک لطیف تعریض بھی ہے جن کا رویہ خدا کی نعمتوں کے بارے میں اِس سے پہلے زیر بحث رہا ہے۔ وہ جب اپنے رویے کی اصلاح کے لیے آمادہ نہیں

سورۃ الم نشرح

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَکَ صَدۡرَکَ ۙ﴿۱﴾ وَ وَضَعۡنَا عَنۡکَ وِزۡرَکَ ۙ﴿۲﴾

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

کیا ہم نے تمھارا سینہ تمھارے لیے کھول نہیں دیا، (اے پیغمبر)[۱۳]؟ اور تمھارا وہ بوجھ

ہوئے تو اُنھیں نظر انداز کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمادی ہے کہ اِنھیں چھوڑیے، آپ تو یتیمی کے احوال سے واقف ہیں، آپ کو بہر حال یتیموں کے حقوق کی حفاظت کرنی ہے، آپ کے ہاتھ سے اُن پر کوئی ظلم یا زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔

۱۱؎ ترتیب بیان کے لحاظ سے یہ جملہ 'وَوَجَدَکَ ضَآلًّا' سے متعلق ہے۔ لہٰذا پوچھنے والے سے مراد یہاں اصلاً وہ شخص ہے جو اپنی کسی ذہنی یا عقلی الجھن کو دور کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ اپنے پیٹ یا تن کی ضرورت کے لیے سوال کرنے والے بھی اِسی کے تحت ہیں اور یقیناً مستحق ہیں کہ اُن کے ساتھ بھی اچھا سلوک کیا جائے اور خدمت کا موقع نہ ہو تو اُنھیں جھڑکا اور ڈانٹا نہ جائے، بلکہ خوب صورتی کے ساتھ معذرت پیش کر دی جائے۔

۱۲؎ یہ اُس فضل و انعام کا حق ہے جس کی وضاحت ہم 'وَوَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغۡنٰی' کے تحت کر چکے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... یہاں لفظ 'فَحَدِّثۡ' خاص طور پر نگاہ میں رکھیے۔ یہ مال کی نعمت کے لیے نہیں، بلکہ حکمت کی نعمت ہی کے لیے موزوں ہے۔ فرمایا کہ جس حکمت کے خزانے سے تمھارے رب نے تم کو بہرہ ور کیا ہے، اُس کی تحدیث کرو، یعنی جس طرح تمھارے رب نے تمھیں مفت بخشا ہے، تم بھی اُس کو مفت بانٹو، فیاضانہ بانٹو، ہر آنے جانے والے کے سامنے اُس کا چرچا کرو اور ہر بزم و

الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝۳ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝۴
فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝۵ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝۶

تم پر سے اتار نہیں دیا جو تمھاری کمر توڑے دے رہا تھا[14]؟ اور تمھاری خاطر[15] تمھارا آوازہ بلند نہیں کر دیا[16]؟ ۱-۴

سو (مطمئن رہو)، اِس سختی کے ساتھ[17] (جو اِس وقت تمھیں درپیش ہے)، ایک بڑی آسانی منتظر ہے[18]۔ اِس سختی کے ساتھ ایک بڑی آسانی منتظر ہے[19]۔ ۵-۶

انجمن کو اُس کے ذکر سے معمور کر دو۔'' (تدبر قرآن ۹/۴۱۹)

۱۳؎ یہ اُس معرفت و بصیرت کی تعبیر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دین اور اُس کی دعوت کے باب میں خاص اپنے پروردگار کی طرف سے عطا ہوئی۔ وہ اعتماد و توکل جو آپ کی تمام قوت و عزم کا سرچشمہ تھا، آپ کے اندر اِسی سے پیدا ہوا۔ فرمایا ہے کہ ہم نے یہ خاص تمھارے لیے اور تمھاری تائید و نصرت کے لیے کیا تاکہ کوئی بڑی سے بڑی مزاحمت بھی تمھارے عزم و استقلال کو متزلزل نہ کر سکے۔

۱۴؎ یہ اور اِس کے بعد کا جملہ پہلے جملے پر عطف ہیں، اِس لیے ترجمہ اُسی کے لحاظ سے ہونا چاہیے۔ آیت میں جس بوجھ کا ذکر ہے، اِس سے مراد وہ بارِ غم ہے جو بعثت سے پہلے ہدایت کی راہ نہ پا کر اور بعثت کے بعد قوم کا رویہ دیکھ کر آپ اپنے اوپر محسوس کرتے تھے۔

۱۵؎ یعنی تمھاری تقویت اور حوصلہ افزائی کے لیے۔

۱۶؎ یہ اُس رفعِ ذکر کا بیان ہے، جب آپ کی دعوت کا چرچا عرب کے اطراف و اکناف میں پھیل گیا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...مکہ کے سادات جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے دعوت دی، وہ تو ایک عرصے تک دعوت اور داعی کی مخالفت پر جمے رہے، لیکن حج کے موسم میں باہر کے جو لوگ آتے، اُن

فَاِذَا فَرَغۡتَ فَانۡصَبۡ ۙ﴿۷﴾ وَ اِلٰی رَبِّکَ فَارۡغَبۡ ﴿۸﴾

اِس لیے جب اِس کام سے فارغ ہو جاؤ[20] تو عبادت کے لیے کمر باندھ لو اور اپنے رب سے لو لگائے رکھو[21]۔ ۷-۸

کے ذریعے سے یہ دعوت مکہ کے اطراف، خصوصیت کے ساتھ مدینہ کے انصار میں پھیل گئی۔ پھر بالتدریج نہ صرف عرب کے دور و قریب کے قبائل، بلکہ اطراف کے دوسرے ملکوں میں بھی اِس کا ذکر پہنچ گیا اور یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں رہا کہ یہ آواز دبنے والی نہیں ہے، بلکہ جلد وہ وقت آنے والا ہے کہ بچے بچے کی زبان پر اِس کا چرچا ہو گا اور گوشہ گوشہ 'اَللّٰہُ اَکۡبَر' کی صدا سے گونج اٹھے گا۔'' (تدبر قرآن ۹/۴۲۷)

۱۷؎ یعنی اِس قدر قریب کہ گویا ساتھ ہی چلی آ رہی ہے۔

۱۸؎ اِس سے مراد وہ آسانی ہے جو آپ کو ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں میسر ہوئی۔ آپ کی دعوت اِسی کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ دور اقتدار میں داخل ہو گئی، بلکہ اِسی اقتدار کی مدد سے بالآخر پورا عرب آپ کے سامنے سرنگوں ہو گیا۔

۱۹؎ یہ تکرار بشارت کی تاکید کے لیے ہے۔ جن حالات میں یہ سورہ اتری، وہ بظاہر بڑے حوصلہ شکن تھے۔ اللہ تعالیٰ نے خاص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے تجربات کو دلیل کے طور پر پیش کیا کہ جس پروردگار نے یہ سب عنایتیں فرمائی ہیں، اُس کی نصرت تمھارے ساتھ ہے۔ اب زیادہ دیر نہ ہو گی کہ سختی کے دن گزر جائیں گے، راستے کے عقبات دور ہوں گے اور بالآخر تم اور تمھارے ساتھی اُس منزل تک پہنچ جائیں گے جو رسولوں کے لیے ایک سنت الٰہی کے طور پر مقرر کی گئی ہے۔ یہاں اجمال ہے، لیکن سورۂ نصر (۱۱۰) میں اِس کی تفصیل فرما دی ہے کہ اللہ کی مدد اور فتح آئے گی اور تم دیکھو گے کہ لوگ جوق در جوق اُس کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔

۲۰؎ یعنی اُس مشن سے فارغ ہو جاؤ جو تمھارے سپرد کیا گیا ہے۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں وضاحت ہے کہ یہ مشن سرزمین عرب میں خدائی دینونت کے ظہور اور اِس کے نتیجے میں غلبۂ حق

الم نشرح ۹۴

کا مشن تھا۔ 'فَرَغْتَ' کے لفظ میں بشارت ہے کہ تمام مشکلات راہ کو عبور کرتے ہوئے آپ سرخ روئی کے ساتھ اِس عظیم ذمہ داری کو پورا کرنے کا شرف حاصل کریں گے۔

۱۲؎ یعنی جب فتح ونصرت کا مرحلہ آ جائے اور تم اپنی ذمہ داری سے فارغ ہو جاؤ تو پورے انہماک کے ساتھ اپنے آپ کو اپنے پروردگار کی عبادت میں لگا دو، اِس لیے کہ لقاے رب کی منزل کے لیے اگر کوئی زادسفر ہے تو یہی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"اِسی آخری ہدایت کی تعمیل کا اہتمام تھا کہ آخر دور حیات میں آپ کا انہماک عبادت الٰہی میں بہت بڑھ گیا تھا۔ بعض لوگوں نے آپ کا یہ حال دیکھ کر سوال کیا کہ حضور آپ کے تو تمام اگلے پچھلے گناہ بخشے جا چکے ہیں تو آپ عبادت میں اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں؟ آپ نے جواب میں فرمایا: 'افلا اکون عبدًا شکورًا' (تو کیا میں اپنے رب کا شکر گزار بندہ نہ بنوں*)!" (تدبر قرآن ۴۲۹/۹)

کوالالمپور

۹ / مارچ ۲۰۱۰ء

---

*بخاری، رقم ۴۸۳۶۔

مرحلۂ اتمام حجت

التین - قریش

۹۵ — ۱۰۶

التین ۹۵ - قریش ۱۰۶

اتمام حجت کے اسلوب میں قیامت کا اثبات، اُس کے بارے میں قریش کے رویے پر اُن کو تنبیہ، اُن کے بڑے سردار کو تہدید جو قرآن جیسی کتاب کے ذریعے سے تعلیم کے بعد بھی اپنی سرکشی پر قائم رہا ۹۵-۹۶

نذیر کی حیثیت سے قرآن کی عظمت کا بیان ـــــ قریش کو اور اُن کی پشت پر کھڑے ہوئے اہل کتاب کو اُن کے اِس مطالبے کی لغویت پر تنبیہ کہ قرآن کے بجائے اُن پر ایک ایسی کتاب اتاری جائے جسے خدا کا کوئی فرستادہ آسمان سے اُن کے لیے پڑھتا ہوا لے کر اترے ۹۷-۹۸

اِسی اسلوب میں قیامت کے متعلق قریش کو نصیحت کہ اُس کے بارے میں وہ کسی غلط فہمی میں نہ رہیں۔ وہاں چھوٹی بڑی ہر نیکی اور برائی پوری قطعیت کے ساتھ اُن کے سامنے آجائے گی ـــــ اُنھیں تنبیہ کہ لوٹ مار اور بدامنی کے ماحول میں محض حرم سے اپنے تعلق کی بنا پر جس امن سے وہ رہ رہے ہیں اور خدا کی جو نعمتیں اِس گھر کے طفیل اُنھیں حاصل ہیں، اُن پر خدا کا شکر ادا کریں اور اُس کے دیے ہوئے رزق میں سے اُس کی راہ میں خرچ کریں۔ اِس کے بجائے جو کچھ وہ کر رہے ہیں، اُس کے ساتھ اُنھیں سوچنا چاہیے کہ اُن کا انجام کیا ہوگا ۹۹-۱۰۰

قیامت کی تصویر اور اُس سے اُن کی غفلت پر انتہائی موثر اسلوب میں تنبیہ ۱۰۱-۱۰۲

خدا کے قانون مجازات کا اثبات اور اُس کے حوالے سے اُن کے سرداروں کو تہدید کہ اُن کا ٹھکانا اب وہ آگ ہوگی جو دلوں تک پہنچے گی ۱۰۳-۱۰۴

واقعۂ فیل کے حوالے سے تنبیہ و تہدید اور بیت اللہ کی تولیت کے طفیل جو نعمتیں اُنھیں حاصل تھیں، اُن کے حوالے سے تلقین کہ اُن کا حق اب اُنھیں ادا کرنا چاہیے ۱۰۵-۱۰۶

التين - العلق

٩٥ ـــــ ٩٦

التین - العلق

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ خدا کے جس قانون مجازات کو ثابت کرتی ہے، دوسری میں اُسی کے حوالے سے قریش کے بڑے سردار کو تہدید ہے کہ وہ اگر اپنی شرارتوں سے باز نہ آیا تو لازماً اُس کی زد میں آجائے گا۔ دونوں میں خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن روے سخن، اگر غور کیجیے تو قریش کے اُنھی سرداروں کی طرف ہے جن کی سرکشی اب اپنی انتہا کو پہنچ رہی تھی۔ اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ ام القریٰ مکہ میں یہ ہجرت سے کچھ پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ اتمام حجت میں نازل ہوئی ہیں۔

پہلی سورہ —— التین —— کا موضوع روز جزا کا اثبات اور اُس کے حوالے سے قریش کو تنبیہ ہے کہ اُن پر خدا کی حجت ہر لحاظ سے پوری ہو گئی ہے، لہٰذا ضد اور ہٹ دھرمی کے سوا قیامت کو جھٹلانے کے لیے اب اُن کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔

دوسری سورہ —— العلق —— کا موضوع قریش کے بڑے سردار کو تہدید ہے کہ قرآن جیسی کتاب کے ذریعے سے تعلیم و تذکیر کے بعد بھی وہ اگر سرکشی پر قائم ہے تو اِس کا نتیجہ بھگتنے کے لیے تیار رہے۔ خدا کے سرہنگ بہت جلد اُسے گھسیٹ کر جہنم کے گہرے کھڈ میں ڈال دیں گے اور اُس کے اعوان و انصار میں سے کوئی بھی اُس کی کچھ مدد نہ کر سکے گا۔

سورۃ التین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالتِّیۡنِ وَالزَّیۡتُوۡنِ ۙ﴿۱﴾ وَطُوۡرِ سِیۡنِیۡنَ ۙ﴿۲﴾ وَھٰذَا الۡبَلَدِ الۡاَمِیۡنِ ۙ﴿۳﴾
لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ۫﴿۴﴾ ثُمَّ رَدَدۡنٰہُ

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

تین اور زیتون کے پہاڑ[۱] گواہی دیتے ہیں اور طور سینین[۲] اور تمھارا یہ شہر امین[۳] بھی کہ انسان کو ہم نے (اِن مقامات پر) پیدا کیا تو اُس وقت وہ بہترین ساخت پر تھا۔ پھر

۱؎ زیتون وہ پہاڑ ہے جہاں مسیح علیہ السلام کے دنیا سے اٹھائے جانے کے بعد اُن کے منکرین پر قیامت تک کے لیے عذاب کا فیصلہ سنایا گیا اور بنی اسرائیل میں سے اُن کے ماننے والوں کی ایک نئی امت نصاریٰ کی ابتدا ہوئی۔ پھر یہیں اعلان کیا گیا کہ مسیح علیہ السلام کے منکرین پر اُن کے ماننے والوں کو قیامت تک غلبہ حاصل رہے گا۔ تین اِسی پر واقع ایک گاؤں ہے۔ اِس کا ذکر انجیل میں Bethphage کے نام سے ہوا ہے۔ اِس میں phage وہی fig ہے جسے عربی زبان میں تین کہتے ہیں۔ لوقا ۱۹: ۲۹ میں ہے کہ سیدنا مسیح جب یروشلم آئے تو شہر میں داخل ہونے سے پہلے اِسی جگہ ٹھیرے۔

۲؎ لفظ 'سِیۡنِیۡنَ'، جمع سالم کی صورت میں ہے، جیسے عربی زبان میں 'اجمعون'، مستعمل ہے۔ یہ جمع پہاڑ کی وسعت اطراف کو ظاہر کرتی ہے۔ عبرانی میں اِس کی علامت 'یم' ہے۔ چنانچہ تورات میں اِس کا نام کہیں 'سینا' اور کہیں 'سینیم' آیا ہے۔ بنی اسرائیل نے بحیثیت امت اپنی زندگی اِسی پہاڑ سے شروع کی۔ پھر اِسی پہاڑ سے خدا نے اپنی کتاب میں اعلان کیا کہ وہ حق پر قائم رہیں

اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ ﴿۵﴾ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

ہم نے اُسے پستی میں ڈال دیا، جب کہ وہ خود پستیوں میں گرنے والا ہوا[4]۔ رہے وہ جو

گے تو دنیا کی قوموں پر اُنھیں غلبہ حاصل ہوگا اور اُس سے انحراف کریں گے تو اُنھی کے ذریعے سے ذلت اور محکومی کے عذاب میں مبتلا کر دیے جائیں گے۔

۳؎ 'اَمِیۡن' 'ماموں' کے معنی میں ہے، یعنی وہ شہر جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کے طفیل ماموں قرار دیا۔ سورۂ آل عمران (۳) آیت ۹۷ میں فرمایا ہے: 'وَمَنۡ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا' (جو اِس میں داخل ہو جائے، وہ ماموں ہے)۔ اِسے مکہ یا ام القریٰ مکہ کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو امامت کا منصب اِسی شہر میں عطا ہوا اور خدا کی زمین پر اُس کی عبادت کے اولین مرکز، بیت الحرام کی تولیت ہمیشہ کے لیے اُن کی ذریت کے سپرد کر دی گئی۔ پھر یہیں اعلان کیا گیا کہ امامت کا یہ وعدہ اُن لوگوں کے لیے نہیں ہے جو اُن کی ذریت میں سے اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہوں گے۔

۴؎ اوپر کی تفصیل سے واضح ہے کہ خدا کی جو دینونت پوری انسانیت کے لیے قیامت میں ظاہر ہوگی، ذریت ابراہیم کے لیے وہ اِسی دنیا میں ظاہر ہوئی۔ تین و زیتون، طور سینا اور شہر امین، تینوں اِسی دینونت کے مقامات ظہور ہیں۔ اِن پر جو واقعات پیش آئے، قرآن نے ترتیب صعودی کے ساتھ اُن کا ذکر کر کے اِس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ذریت ابراہیم کی ہر شاخ نے اپنی ابتدا کی تو اُس وقت وہ ٹھیک اُس ساخت پر تھے جس پر فاطر فطرت نے اُنھیں پیدا کیا ہے۔ وہ توحید پر قائم تھے، پورے یقین کے ساتھ آخرت کو مانتے تھے اور اُن کی اکثریت اخلاقی لحاظ سے حسن عمل کا بہترین نمونہ پیش کرتی تھی، لیکن جب اُنھوں نے انحراف اختیار کیا تو ہم نے اُنھیں اُس پستی میں ڈال دیا جس میں اب صدیوں سے اُنھیں گرا ہوا دیکھتے ہو۔ وہ ذلت اور محکومی کے عذاب میں مبتلا ہیں اور اُس سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں پاتے۔

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ آیت میں 'اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ' کے جو الفاظ آئے ہیں، اُن میں 'اَسۡفَلَ'

فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ؕ﴿۶﴾
فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ؕ﴿۷﴾ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸﴾

ایمان پر قائم رہے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے تو اُن کے لیے ایسا اجر ہے جو کبھی ختم نہ ہو گا۔[۵] ۱-۶

سو، (اے پیغمبر)، اِس کے بعد کیا چیز ہے جو روز جزا کے بارے میں تمھیں جھٹلاتی ہے؟[۶] (اِن سے پوچھو)، کیا اللہ سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر فیصلہ کرنے والا نہیں ہے؟[۷] ۷-۸

التین ۹۵

ظرف اور 'سٰفِلِيْنَ' ہمارے نزدیک 'رَدَدْنٰهُ' کی ضمیر مفعول سے حال واقع ہوا ہے۔ ضمیر کا مرجع 'الْاِنْسَان' ہے جو معناً جمع ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اِن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اُس وقت پستیوں میں ڈالا، جب اِنھوں نے خود پستیوں کو چاہا اور بلندیوں پر چڑھنے کا حوصلہ نہیں کیا۔

۵۔ آیت میں فعل 'اٰمَنُوْا' آیا ہے۔ یہ اپنے کامل معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ استثنا اِس لیے بیان فرمایا ہے کہ قومی حیثیت سے پستی میں گرانے اور عذاب میں مبتلا کیے جانے کے یہ معنی نہ سمجھ لیے جائیں کہ اُن میں سے جو لوگ انفرادی حیثیت سے ایمان پر قائم رہے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے، اُن کا اجر بھی ضائع ہو جائے گا۔ فرمایا کہ نہیں، وہ اپنے ایمان و عمل کا پورا اجر پائیں گے اور خدا کی ابدی بادشاہی میں داخل کیے جائیں گے۔ قوموں کا محشر یہ دنیا ہے، قیامت میں ہر شخص اپنی انفرادی حیثیت سے جواب دہ ہو گا اور اُس کے نیک و بد کا فیصلہ بھی اِسی لحاظ سے کیا جائے گا۔ بلکہ قوم کی پستی کے زمانے میں جو لوگ بلندیوں پر چڑھنے کا حوصلہ کریں گے، وہ زیادہ اجر کے مستحق ہوں گے، اِس لیے کہ وہ اُس وقت جاگتے رہے، جب دوسرے سو رہے تھے اور اُس وقت زندہ رہے، جب شہر قبرستان بن چکے تھے۔

سورة العلق

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ ۚ﴿۱﴾ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ۚ﴿۲﴾

—— ۲ ——

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

اِنھیں پڑھ کر سناؤ[8] (اے پیغمبر)، اپنے اُس پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا

۶؎ یہ استفہام انکار کے لیے ہے اور روے سخن اُنھی منکرین قیامت کی طرف ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انذار کو جھٹلا رہے تھے۔ فرمایا ہے کہ علم و عقل کے ہاتھ میں فیصلہ ہو تو ذریت ابراہیم کے لیے خدائی دینونت کے اِس ظہور کو دیکھنے کے بعد کوئی چیز بھی قیامت کے بارے میں تمھارے انذار کو نہیں جھٹلا سکتی۔ اثبات قیامت کے لیے یہ ایک حتمی حجت ہے۔ اِس کے بعد صرف ضد، ہٹ دھرمی اور اندھی تقلید ہی لوگوں کو جھٹلانے پر آمادہ کر سکتی ہے۔

۷؎ یہ استفہام اقرار کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ یقیناً سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے، اُس کی اِس صفت سے کوئی عاقل انکار نہیں کر سکتا، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ قیامت برپا نہ کرے اور اِس طرح مجرموں اور نیکوکاروں کو اُن کے انجام کے لحاظ سے برابر کر دے؟

۸؎ اصل میں لفظ 'اِقۡرَاۡ' آیا ہے۔ یہ اِس آیت میں 'اقرأہ علیھم' کے معنی میں ہے، یعنی لوگوں کو پڑھ کر سناؤ۔ یہ بطریق دعوت سنانا ہے۔ قرآن میں یہ لفظ جگہ جگہ اِس مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ اعراف (۷) کی آیت ۲۰۴ اور سورۂ بنی اسرائیل (۱۷) کی آیت ۴۵ میں۔ قرآن کے بارے میں معلوم ہے کہ دعوت وانذار کے لیے وہ اِسی طرح پورا کا پورا لوگوں کو پڑھ کر

اِقۡرَاۡ وَرَبُّكَ الۡاَكۡرَمُ ۝٣ الَّذِىۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ۝٤ عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ يَعۡلَمۡ ۝٥

ہے[9]، جمے ہوئے خون جیسے ایک لوتھڑے سے انسان کو پیدا کیا ہے[10]۔ اِنھیں پڑھ کر سناؤ[11]، اور حقیقت یہ ہے کہ تمھارا پروردگار بڑا ہی کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے یہ قرآن سکھایا[12]۔ انسان[13] کو اِس میں وہ علم دیا جسے وہ نہیں جانتا تھا[14]۔ ۱-۵

العلق ۹۶

سنایا گیا تھا۔

۹۔ یعنی اُس کے فرمان واجب الاذعان کی حیثیت سے پڑھ کر سناؤ تاکہ لوگ یہ جانیں کہ یہ کسی سائل کی درخواست نہیں ہے، بلکہ پروردگار عالم کا کلام ہے جو اُن کا خالق اور مالک ہے اور اُنھیں جو حکم چاہے، دے سکتا ہے۔ لوگوں کو بے چون و چرا اُس کی تعمیل کرنی چاہیے۔ وہ اگر اُس کا مذاق اڑانے یا اُس کی مخالفت کرنے کی جسارت کریں گے تو اِس کا انجام سوچ لیں، اِس کے نتائج اُن کے لیے نہایت خطرناک ہو سکتے ہیں۔

۱۰۔ یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے، یعنی تمام کائنات کو پیدا کیا ہے اور اُس میں، خاص طور پر انسان کو جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے پیدا کر دیا ہے۔ اِس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ اولاً، جس خالق نے خون کی ایک حقیر پھٹکی سے سقراط و فلاطوں بنا کر کھڑے کر دیے ہیں، اُس کے لیے کیا مشکل ہے کہ جب چاہے، اُنھیں دوبارہ پیدا کر کے اپنے سامنے محاسبے کے لیے لا کھڑا کرے؟ ثانیاً، انسان کی تخلیق میں اُس کی جس قدرت و حکمت کا ظہور ہوا ہے، اُس کو دیکھنے کے بعد کوئی عاقل کس طرح باور کر سکتا ہے کہ وہ عبث اور بے غایت پیدا کیا گیا ہے؟ یہ اہتمام تو بتا رہا ہے کہ انسان کے لیے ایک ایسا دن لازماً آنا چاہیے جس میں اُس کے علم و عمل کا محاسبہ کیا جائے۔

۱۱۔ یہ پہلی آیت سے بدل ہے اور اُسی کے حکم کی تاکید کے لیے دہرایا گیا ہے۔

۱۲۔ یعنی وہ کریم ہے، اِس لیے اپنے اِسی کرم کے باعث اُس نے تم پر یہ احسان کیا ہے کہ

كَلَّآ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَيَطۡغٰۤى ۙ﴿۶﴾ اَنۡ رَّاٰهُ اسۡتَغۡنٰى ؕ﴿۷﴾
اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجۡعٰى ؕ﴿۸﴾
اَرَءَيۡتَ الَّذِىۡ يَنۡهٰى ۙ﴿۹﴾ عَبۡدًا اِذَا صَلّٰى ؕ﴿۱۰﴾ اَرَءَيۡتَ اِنۡ

(اِس کے مقابلے میں جو باتیں یہ بناتے ہیں، وہ کچھ نہیں، اے پیغمبر)، ہرگز نہیں۔ انسان یقیناً سرکشی کر رہا ہے۔ اِس لیے کہ اپنے آپ کو اُس نے بے نیاز سمجھ لیا ہے۔[۱۵] اِس میں شبہ نہیں کہ اُسے (ایک دن) تیرے رب ہی کی طرف پلٹنا ہے۔ ۶-۸

تم نے دیکھا اُسے جو (خدا کے) ایک بندے کو روکتا ہے، جب وہ نماز پڑھتا ہے[۱۶]؟

تمھیں یہ قرآن پڑھ کر سنایا بھی جا رہا ہے اور خاص اہتمام کے ساتھ اُس کی ہدایت کے تحت اور اُس کے پیغمبر کی رہنمائی میں لکھ کر بھی دیا جا رہا ہے تاکہ یہ عظیم آسمانی خزانہ صرف تمھارے لیے نہیں، بلکہ تمام دنیا کے لیے سرمایۂ حیات بن جائے۔ اِس میں قریش کے لیے ایک تنبیہ بھی ہے کہ اُنھوں نے اِس نعمت کی قدر نہ کی تو سوچ لیں کہ اِس کا نتیجہ اُن کے لیے کیا ہو سکتا ہے۔

۱۳؎ لفظ 'اِنْسَان' اگرچہ عام ہے، لیکن پہلے مخاطب چونکہ قریش تھے، اِس لیے اصلاً وہی مراد ہیں۔

۱۴؎ اشارہ ہے اُس علم و حکمت اور قانون و شریعت کی طرف جس کا ذکر سورۂ بقرہ (۲) کی آیات ۱۲۹، ۱۵۱، آل عمران (۳) کی آیت ۱۶۴ اور سورۂ جمعہ (۶۲) کی آیت ۲ میں اِسی اہتمام کے ساتھ ہوا ہے۔ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ خاص فضل ہے کہ اُس نے امیوں کے اندر ایک رسول اُنھی میں سے اٹھایا ہے جو اُن کا تزکیہ کرتا ہے اور اِس کے لیے اُنھیں قانون و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

۱۵؎ یعنی دنیا کا مال و منال اور ترقی و کامیابی حجاب بن گئی ہے اور لوگ اپنے آپ کو خدا سے مستغنی خیال کرنے لگے ہیں۔

۱۶؎ بندے سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ اب اُن کی سرکشی کو ممثل کر کے دکھا دیا

كَانَ عَلَى الْهُدٰٓى ﴿۱۱﴾ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى ﴿۱۲﴾ اَرَءَيْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۱۳﴾ اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ﴿۱۴﴾

كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ۬ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ﴿۱۵﴾ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ﴿۱۶﴾ فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ ﴿۱۷﴾ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ﴿۱۸﴾

ذرا دیکھو تو، اگر وہ بندہ ہدایت پر ہو یا پرہیزگاری کی تلقین کرتا ہو...؟[۱۷] ذرا دیکھو تو، اگر اِس (بدبخت) نے جھٹلایا اور منہ موڑ لیا ہو...؟[۱۸] کیا اِس نے نہیں جانا کہ اللہ دیکھ رہا ہے؟ ۹-۱۴

(یہ کچھ نہیں)، ہرگز نہیں۔ اگر یہ باز نہ آیا تو ہم اِس کی چوٹی پکڑ کر گھسیٹیں گے، جھوٹی نابکار چوٹی![۱۹] پھر وہ بلا لے اپنے ہم نشیں، ہم اپنے سرہنگ بلاتے ہیں۔[۲۰] ۱۵-۱۸

ہے کہ قرآن کی دعوت پر خدا کے آگے سجدہ ریز ہونا تو ایک طرف، یہ ایسے ظالم ہیں کہ خدا کے ایک بندے کو سجدوں سے روک دینے پر اتر آئے ہیں۔

۱۷؎ معاملے کی سنگینی احاطۂ بیان سے باہر ہے، اِس لیے جواب شرط حذف کر دیا ہے۔ اِسے کھول دیجیے تو پوری بات اِس طرح ہے: ذرا دیکھو تو اگر وہ بندہ ہدایت پر ہو یا پرہیزگاری کی تلقین کرتا ہو تو کیا اِس روکنے والے نے اپنی شامت نہیں بلائی؟

۱۸؎ یہاں بھی وہی اسلوب ہے جو اوپر کی آیت میں ہے، یعنی تب کیا اِس نے جہنم نہیں خریدی؟

۱۹؎ اصل الفاظ ہیں: 'نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ'۔ یہ پچھلی آیت میں 'لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ' سے بدل ہیں۔ اِن میں سے ایک اگرچہ معرفہ اور دوسرا نکرہ ہے، لیکن یہ نکرہ موصوفہ ہے، اِس لیے معرفہ سے بدل واقع ہو گیا ہے۔

كَلَّا ۭ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ⑲ السجدة

ہرگز نہیں، تم اِس کی بات پر ہرگز دھیان نہ دو اور سجدہ ریز رہو اور اِس طرح میرے قریب ہو جاؤ[21]۔ ۱۹

[20] چنانچہ یہی سرہنگ ہیں جو بدر کے موقع پر آسمان سے اترے اور اُن کے مقابلے میں قریش کی پوری قوت و جمعیت خس و خاشاک بن کر اڑ گئی۔

[21] مطلب یہ ہے کہ اپنے موقف پر صبر و استقامت کے ساتھ جمے رہو اور حق و باطل کی اِس کشمکش میں نماز اور سجدوں کے ذریعے سے میرا قرب حاصل کرو۔

کوالالمپور

۱۰/ مارچ ۲۰۱۰ء

العلق
۹۶

القدر - البينة

٩٧ ـــ ٩٨

القدر - البينة

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ جس کتاب الٰہی کی عظمت کو واضح کرتی ہے، دوسری میں اُسی کے منکروں کو اُن کے انجام پر متنبہ کیا گیا ہے۔ دونوں میں روے سخن اصلاً قریش کی طرف ہے، لیکن دوسری سورہ میں اہل کتاب بھی اپنے اُن اعتراضات کی وجہ سے نمایاں ہو گئے ہیں جو دعوت کے اِس آخری مرحلے میں وہ قریش کو القا کر رہے تھے۔ اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ پچھلی سورتوں کی طرح یہ بھی ام القریٰ مکہ میں ہجرت سے کچھ پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ اتمام حجت میں نازل ہوئی ہیں۔

پہلی سورہ ــــ القدر ــــ کا موضوع قریش پر یہ حقیقت واضح کرنا ہے کہ قرآن مجید کی صورت میں جو کتاب اُنھیں پڑھ کر سنائی جا رہی ہے، وہ نہ کسی شیطان کا الہام ہے، نہ پیغمبر کی ذاتی امنگ کا نتیجہ، بلکہ آں سوے افلاک کا پیغام ہے جو رب دو جہاں نے خاص اہتمام کے ساتھ ایک ایسی رات میں نازل کرنا شروع کیا ہے جو اُس کے نظام میں امور مہمہ کی تنفیذ کے لیے مقرر ہے۔ اِس لیے وہ اُسے کوئی معمولی چیز نہ سمجھیں۔ اُس کے بارے میں اُن کا رویہ اُن کے لیے ابدی خسران کا باعث بن سکتا ہے۔

دوسری سورہ ــــ البینۃ ــــ کا موضوع قریش اور اہل کتاب، دونوں کو متنبہ کرنا ہے کہ اُن کا یہ مطالبہ انتہائی لغو ہے کہ قرآن کے بجاے ایک ایسی کتاب آنی چاہیے جسے خدا کا

کوئی فرستادہ آسمان سے لے کر اُن کے لیے پڑھتا ہوا اترے۔ وہ اِس روش پر قائم رہے تو خبردار ہو جائیں، وہ بہت جلد جہنم کا ایندھن بن جائیں گے۔

سورة القدر

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ ① وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا لَیۡلَةُ الۡقَدۡرِ ② لَیۡلَةُ الۡقَدۡرِ ۙ۬ خَیۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَهۡرٍ ③ تَنَزَّلُ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوۡحُ

—— ١ ——

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

ہم نے اِس قرآن کو اُس رات میں نازل کیا ہے جس میں تقدیر کے فیصلے ہوتے ہیں[1]۔ اور تمھیں کیا معلوم کہ وہ فیصلوں کی رات کیا ہے[2]؟ فیصلوں کی رات ہزار

---

[1] اصل الفاظ ہیں: 'اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ'۔ 'اَنۡزَلۡنٰهُ' میں ضمیر مفعول مرجع کے بغیر آ گئی ہے، اِس لیے کہ نازل کرنا خود بخود اِس پر دلالت کرتا ہے کہ مراد قرآن ہے۔ اِس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ پورا قرآن اِسی ایک رات میں نازل ہوا ہو، بلکہ اِس کے نزول کا فیصلہ اگر اِس رات میں کر دیا گیا اور پہلی وحی نازل ہوگئی تو 'اَنۡزَلۡنٰهُ' کے الفاظ اِس صورت حال کی تعبیر کے لیے بھی بالکل موزوں ہوں گے۔

یہ رمضان کی کوئی رات تھی۔ سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱۸۵ میں قرآن نے صراحت کر دی ہے کہ وہ رمضان کے مہینے میں نازل ہوا۔

'قَدۡر' کے معنی فیصلوں کی رات کے بھی ہو سکتے ہیں اور عظمت والی رات کے بھی۔ سورۂ دخان (۴۴) کی آیت ۴ میں یہی مضمون 'فِیۡهَا یُفۡرَقُ كُلُّ اَمۡرٍ حَكِیۡمٍ' کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ اِس سے متعین ہو جاتا ہے کہ پہلے معنی ہی مقصود ہیں۔

آیت میں لفظ 'اِنَّا' بھی قابل توجہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ أَمْرٍ ۝٤

مہینوں سے بہتر ہے[3]۔ اُس میں فرشتے اور روح الامین[4] اپنے پروردگار کے اذن سے ہر معاملے کا حکم لے کر اترتے ہیں۔ ۱-۴

''اِنَّا' میں جو زور اور تاکید ہے، اُس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ کتاب نہ اِس کے پیش کرنے والے کی ذاتی اپج کا نتیجہ ہے، نہ اِس میں کسی شیطانی تحریک یا وسوسے کو کوئی دخل ہے، جیسا کہ اِس کے مخالفین سمجھتے ہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ نے خاص اپنی جانب سے خلق کی تعلیم و ہدایت کے لیے اتاری ہے، کسی دوسری طاقت کو اِس میں کوئی دخل نہیں ہے۔'' (تدبر قرآن ۹/۴۶۶)

۲۔ کسی چیز کے ہول یا اُس کی عظمت کا تصور دلانے کے لیے یہ اسلوب قرآن میں جگہ جگہ اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں اِس سے مقصود شب قدر کی عظمت کی طرف متوجہ کرنا ہے، یعنی یہ ایک ایسی رات ہے کہ کوئی شخص اِس کی عظمتوں اور برکتوں کا کما حقہ اندازہ نہیں کر سکتا۔

۳۔ یہ تعبیر بیان کثرت کے لیے ہے۔ اِس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امور مہمہ کی تنفیذ کے ساتھ خاص ہونے کی وجہ سے جو رحمتیں، برکتیں اور قرب الٰہی کے جو مواقع اِس ایک رات میں حاصل ہوتے ہیں، وہ ہزار راتوں میں بھی حاصل نہیں ہو سکتے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اِس رات میں جو فیصلے ہوتے ہیں، وہ رحمت و نقمت، دونوں طرح کے امور سے متعلق ہوتے ہیں، لیکن چونکہ اُس ذات کی طرف سے ہوتے ہیں جس کا ہر فیصلہ رحمت و حکمت پر مبنی اور سراسر عدالت ہے، اِس وجہ سے باعتبار نتیجہ یہ ہر لحاظ سے مبارک ہی ہوتے ہیں۔ سورۂ دخان (۴۴) کی آیت ۳ میں اِسی بنا پر اِسے 'لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ' سے تعبیر فرمایا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِس کی اِن صفتوں کے بیان سے مقصود... قرآن کے مخالفوں کو یہ آگاہی دینا ہے کہ ایسی عظیم اور مبارک رات میں نازل ہونے والی کتاب کو اگر کسی نے کہانت، نجوم اور شاعری کے قسم کی کوئی چیز سمجھا تو وہ گہر اور پشیز میں امتیاز کرنے سے قاصر رہا۔ اِس مبارک رات میں شیطانی

القدر
۹۷

سَلٰمٌ ۛ قف هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ﴿۵﴾

سورة البينة

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ

وہ سراسر سلامتی ہے، طلوع فجر تک۔[۵] ۵

—— ۲ ——

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

اہل کتاب اور مشرکین[۱] میں سے جن لوگوں نے (قرآن کا) انکار کیا ہے[۲]، وہ اپنی

القا کی تمام راہیں مسدود ہوتی ہیں۔ اِس میں وحی کا ابرنیساں برستا ہے جس کا ایک ایک قطرہ ایک گوہر گراں مایہ ہوتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۹/۴۶۷)

اِس سے یہ بات بھی ضمناً معلوم ہوئی کہ جس طرح مادی عالم میں خاص چیزوں کے لیے موسم اور مہینے مقرر ہیں، اُسی طرح روحانی عالم میں بھی خاص خاص کاموں کے لیے دن اور مہینے مقرر کیے گئے ہیں۔ اگر کوئی معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِن کے ساتھ متعلق کر دیا جائے تو اُس کی تمام برکتیں اُسی دن اور مہینے کی پابندی سے حاصل ہوتی ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر لیلۃ القدر کی جستجو میں سرگرم رہے یا لوگوں کو اِس کی ترغیب دی تو اِس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ پروردگار کی طرف سے یہ جان لینے کے بعد کہ یہ بڑی رحمت و برکت کی رات ہے، ایک بندۂ مومن کا ردعمل یہی ہو سکتا تھا۔ مسلمان آپ ہی کی اتباع میں ہر سال رمضان کے مہینے میں اِس کی جستجو کرتے اور اِس کے لیے عبادت و ریاضت میں سرگرم ہو جاتے ہیں۔

[۴] اصل میں لفظ 'الرُّوْح' استعمال ہوا ہے۔ اِس سے جبریل امین مراد ہیں۔ اُن کے فضل و

حَتّٰی تَاْتِیَهُمُ الْبَیِّنَةُ ۙ ﴿۱﴾ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۙ ﴿۲﴾ فِیْهَا كُتُبٌ قَیِّمَةٌ ؕ ﴿۳﴾

ضد سے باز آنے والے نہیں ہیں، یہاں تک کہ (اُن کی خواہش کے مطابق) واضح نشانی اُن کے پاس آ جائے، یعنی اللہ کی طرف سے ایک ایسا پیغمبر جو اچھوتے اوراق تلاوت کرتا ہوا (آسمان سے) اترے، جن میں (اُن کے لیے) صاف ہدایتیں لکھی ہوئی ہوں[۸]۔ ۱-۳

البینة
۹۸

شرف کی بنا پر اُن کا ذکر دوسروں سے الگ کیا گیا ہے۔

۵۔ یعنی فجر کے نمودار ہونے تک یہ امان ہی امان ہے۔ اِس میں کسی شیطان کے لیے دراندازی کا کوئی موقع نہیں ہوتا۔

۶۔ یہ لفظ جب قرآن میں اِس طریقے سے آتا ہے تو مشرکین قریش کے لیے خاص ہو جاتا ہے۔ اِس سے دنیا کے تمام مشرکین مراد نہیں ہوتے۔ اِسی طرح اہل کتاب بھی اِس میں شامل نہیں ہوتے، اگرچہ وہ شرک کرتے رہے ہوں۔

۷۔ یہ مزید وضاحت ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین میں سے صرف وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے اندھے بہرے ہو کر قرآن کا انکار کر دیا۔ اُن میں سے جو لوگ اسلام نہیں لائے، مگر حق طلبی کے جذبے سے بات سنتے رہے، وہ مراد نہیں ہیں۔ لفظ قرآن 'الَّذِیْنَ كَفَرُوْا' کا مفعول ہے۔ یہ اصل میں حذف کر دیا گیا ہے، اِس لیے کہ آگے کی آیت اِس پر دلالت کر رہی ہے۔

۸۔ یعنی ایمان لانے کے لیے مطالبہ کرتے ہیں کہ یہ پیغمبر اور یہ قرآن نہیں، بلکہ اِن کی جگہ ایک فرستادہ آنا چاہیے جس کے پاس ایسے اوراق ہوں جنھیں اِس سے پہلے کسی جن و بشر نے ہاتھ نہ لگایا ہو۔ وہ اُنھیں تلاوت کرتا ہوا اترے۔ اُس میں الواح تورات کی طرح چند متعین احکام ہمارے لیے لکھے ہوئے ہوں۔ قرآن میں جس طرح کی غیر متعلق باتیں سنائی جا رہی ہیں، وہ ہم

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝۴ؕ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ۵ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝۵ؕ

البینۃ ۹۸

حقیقت یہ ہے کہ اہل کتاب اِس طرح کی واضح نشانی[9] اپنے پاس آ جانے کے بعد ہی تفرقے میں پڑے۔ اُن کو حکم یہی ہوا تھا کہ اللہ کی عبادت کریں، اطاعت کو اُس کے لیے خالص کرتے ہوئے، پوری یک سوئی کے ساتھ، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ یہی سیدھی ملت کا دین ہے[10]۔ ۴-۵

نہیں سننا چاہتے۔

۹ اِس سے مراد الواح تورات ہیں جنھیں سیدنا موسیٰ علیہ السلام جبل طور سے غیر معمولی معجزات کے جلو میں لے کر اترے۔ مطلب یہ ہے کہ جس چیز کا مطالبہ کر رہے ہیں، وہ جب صدیوں پہلے اِسی طریقے سے اُنھیں دی گئی تو اُس کے ساتھ اُنھوں نے کیا معاملہ کیا؟ یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد اُس کے ساتھ وفاداری کا حق اُنھوں نے یوں ادا کیا کہ سامری کی شرارت سے متاثر ہو کر بچھڑے کو معبود بنا بیٹھے۔ یہ تمام انتشار و اختلاف جو اُن کے اندر دیکھتے ہو، اُسی واضح نشانی کے باوجود پیدا ہوا ہے جس کا یہ مطالبہ کر رہے ہیں۔

۱۰ اصل الفاظ ہیں: 'ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ'۔ یہ اصل میں 'دِيْنُ الْمِلَّةِ الْقَيِّمَةِ' ہے۔ 'قَيِّمَة' کا موصوف اِس جملے میں عربی قاعدے کے مطابق حذف ہو گیا ہے۔ سیدھی ملت سے ملت ابراہیم مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہی صاف ہدایتیں ہیں جو حضرت ابراہیم کے خاندان کی دونوں شاخوں کو اُن کے جد امجد کی وراثت کے طور پر منتقل ہوئی تھیں۔ تورات میں بھی اِنھی کی تعلیم دی گئی۔ اب قرآن نازل ہوا ہے تو وہ بھی اِنھی کی تلقین کر رہا ہے۔ یہ کس ہدایت کے منتظر ہیں اور کس طرح کے

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ؕ﴿٦﴾

اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے (اِس ہٹ دھرمی کے ساتھ قرآن کا) انکار کر دیا ہے، وہ یقیناً جہنم کی آگ میں جائیں گے، اُسی میں ہمیشہ رہنے کے لیے[11]۔ یہی بدترین خلائق ہیں[12]۔ ۶

احکام چاہتے ہیں؟ خدا کا دین تو ہمیشہ سے یہی رہا ہے، لیکن اِن میں سے کون سی چیز ہے جس پر یہ قائم رہے ہیں۔ جس تفرقے میں یہ پڑے ہوئے ہیں، اُس کی بدولت اِن میں سے ایک ایک چیز انھوں نے ضائع کر دی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''اُن کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے توحید کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ ہی کی بندگی کریں، اُسی کے لیے اطاعت کو خالص کر کے، بالکل یک سو ہو کر، لیکن اُنھوں نے دین کی یہ بنیادی تعلیم برباد کر دی۔ اپنے پیغمبر کی موجودگی میں اُنھوں نے ایک بچھڑے کی پرستش کی، عزیر کو ابن اللہ اور اپنے علما و فقہا کو 'اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ' بنایا، جادو اور اعمال سفلیہ اختیار کر لیے، یہاں تک کہ دوسری قوموں کے بتوں کی بھی پوجا کی جس پر اُن کے نبیوں نے نہایت دردانگیز الفاظ میں نوحہ کیا۔

اِسی طرح اُنھیں نماز اور زکوٰۃ کا بھی حکم دیا گیا تھا، لیکن نماز اُنھوں نے... بالکل ہی ضائع کر دی، یہاں تک کہ تورات میں اُس کا ذکر بھی باقی نہیں رہا۔ تورات میں قربانی کا ذکر آتا ہے، لیکن نماز کا ذکر بمنزلۂ صفر ہے۔ یہی حال زکوٰۃ کا بھی ہوا۔ رسمی طور پر تو وہ باقی رہی، لیکن اُس کے اصلی حق دار فقرا و غربا کی جگہ بنی لاوی کے علما و فقہا بن گئے اور اُن کے علما و فقہا کی خست و بخالت کا جو حال رہا ہے، اُس کا اندازہ کرنا ہو تو انجیلوں اور دوسرے نبیوں کے صحیفوں میں اُن کی زر پرستی کی جو تصویر کھینچی گئی ہے، اُس کو ملاحظہ فرمائیے۔'' (تدبر قرآن ۴۸۲/۹)

[11] اِن الفاظ کو پڑھتے ہوئے اہل کتاب کا یہ زعم بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ اُنھیں اگر دوزخ سے سابقہ پڑا بھی تو چند دنوں سے زیادہ کے لیے نہیں ہوگا۔ وہ خدا کی چہیتی امت ہیں۔ ہمیشہ کی

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۭ ﴿٧﴾ جَزَاۗؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ﴿٨﴾

اِس کے برخلاف جو لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے، وہی بہترین خلائق ہیں[13]۔ اُن کا صلہ اُن کے پروردگار کے پاس ابد کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ وہ اُن میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ اُن سے راضی ہوا اور وہ اُس سے راضی ہوئے۔ یہ صلہ ہے اُن کے لیے جو اپنے پروردگار سے (بن دیکھے) ڈرے[14]۔ ۷-۸

جہنم اُن کے لیے نہیں ہے۔

[12] یہ اُن مغروروں کے پندار پر ضرب لگائی ہے جو ایمان لانے کے لیے صحیفوں کے براہ راست اترنے کی شرط لگاتے، پیغمبر کا استخفاف کرتے، مسلمانوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے، اُن پر پھبتیاں چست کرتے اور اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے تھے۔

[13] یہ اللہ کے اُن بندوں کی سرفرازی کا بیان ہے جو اُس زمانے میں قریش کی اِن پھبتیوں کا ہدف بنے ہوئے تھے۔ فرمایا کہ اہل کتاب اور مشرکین کے مغروروں نے جو مطالبات کیے ہیں، اُنھوں نے اِس طرح کا کوئی مطالبہ نہیں کیا، بلکہ ایمان قبول کیا اور پورے شرح صدر کے ساتھ عمل صالح کی راہ اختیار کر لی۔ چنانچہ وہ بہترین خلائق ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...انسان کی قدر و قیمت مال و اسباب اور خاندان و نسب سے نہیں، بلکہ اُس کے عقلی و اخلاقی اوصاف سے ہے۔ جن کے اندر یہ اوصاف موجود ہیں، اللہ کے نزدیک وہی اشراف و سادات ہیں، اگرچہ وہ روم یا حبش کے غلام ہوں اور جو اِن اوصاف سے محروم ہیں، وہ اللہ کے

البینة ۹۸

نزدیک ارذل خلائق ہیں اگرچہ وہ قرشی وہاشمی سادات ہوں۔'' (تدبر قرآن ۹/۴۸۴)

۱۴؎ یعنی حق کو ماننے کے لیے حقائق کو آنکھوں سے دیکھنے پر مصر نہیں ہوئے، بلکہ علم و عقل سے بات کو سمجھا اور محض اِسی بنیاد پر اپنے پروردگار سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کی۔

کوالالمپور

۱۱/ مارچ ۲۰۱۰ء

البینة
۹۸

الزلزال- العٰدیٰت

٩٩ ـــــ ١٠٠

المبین

الزلزال - العٰدیٰت

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ قیامت کی جس صورت حال سے قریش کو متنبہ کرتی ہے، دوسری میں اُسی کے حوالے سے اُن کے اُس رویے پر اُنھیں خبردار کیا گیا ہے جو اپنے اوپر خدا کی بے پناہ عنایتوں کے باوجود وہ اُس کے معاملے میں اختیار کیے ہوئے تھے۔ دونوں میں روے سخن قریش کے سرداروں کی طرف ہے اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ پچھلی سورتوں کی طرح یہ بھی ام القریٰ مکہ میں ہجرت سے کچھ پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ اتمام حجت میں نازل ہوئی ہیں۔

پہلی سورہ ـــــ الزلزال ـــــ کا موضوع قریش کو متنبہ کرنا ہے کہ قیامت کے بارے میں وہ کسی غلط فہمی میں نہ رہیں۔ اُس دن کوئی چیز بھی خدا سے چھپی نہ رہے گی۔ چھوٹی بڑی، ہر نیکی اور برائی پوری قطعیت کے ساتھ انسان کے سامنے آجائے گی۔

دوسری سورہ ـــــ العٰدیٰت ـــــ کا موضوع اُنھیں اِس حقیقت سے خبردار کرنا ہے کہ اُن کے گردوپیش میں ہر طرف لوٹ اور بدامنی پھیلی ہوئی ہے۔ یہ محض حرم سے اُن کا تعلق ہے جس کی بنا پر وہ اِس ماحول میں امن سے رہ رہے ہیں۔ حق تو یہ تھا کہ خدا کی جو نعمتیں اِس گھر کے طفیل اُنھیں حاصل ہیں، اُن پر وہ اُس کا شکر ادا کرتے، لیکن اِس کے بجاے جو رویہ اُنھوں نے اختیار کر رکھا ہے، اُنھیں سوچنا چاہیے کہ اُس کے ساتھ اُن کا انجام کیا ہوگا۔

سورة الزلزال

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالَہَا ۙ﴿۱﴾ وَ اَخۡرَجَتِ الۡاَرۡضُ اَثۡقَالَہَا ۙ﴿۲﴾ وَ قَالَ الۡاِنۡسَانُ مَا لَہَا ۚ﴿۳﴾ یَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخۡبَارَہَا ۙ﴿۴﴾ بِاَنَّ رَبَّکَ اَوۡحٰی لَہَا ؕ﴿۵﴾

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

جب زمین ہلا دی جائے گی، جس طرح اُسے ہلانا ہے[۱] اور زمین اپنے سب بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی[۲] اور انسان کہے گا: اِس کو کیا ہوا؟ اُس دن وہ اپنی سب کہانی کہہ سنائے گی[۳]، اِس لیے کہ تیرے پروردگار نے اُسے ایسا کیا ہوگا[۴]۔ ۱-۵

[۱] اصل الفاظ ہیں: 'اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالَہَا'۔ یعنی زمین جیسے کرۂ عظیم کے ساتھ تمھارے تصورات سے مافوق یہ حادثہ جس طرح پیش آنا چاہیے، اُسی طرح پیش آئے گا۔ آیت میں یہ مضمون فعل 'زِلۡزَال' کے محض مفعول مطلق کے طور پر آنے سے نہیں، بلکہ زمین کی طرف اُس کے مضاف ہونے سے پیدا ہوا ہے۔

[۲] مطلب یہ ہے کہ اپنی قبروں کے مردے، اپنے خزینے اور دفینے اور مجرموں کے جرائم کی یادگاریں، سب اپنے اندر سے نکال کر باہر ڈال دے گی۔

[۳] یعنی انسان کے اعضا و جوارح کی طرح زمین بھی اُس روز گویا ہوگی اور اپنی سب کہانی کہہ سنائے گی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''اِس دنیا میں انسان جو کچھ بھی کرتا ہے، اِسی زمین کے اوپر یا نیچے کرتا ہے۔ اِس وجہ سے یہ

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ۬ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ؕ﴿۶﴾ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ؕ﴿۷﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ﴿۸﴾

سورة العٰدیٰت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۙ﴿۱﴾ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۙ﴿۲﴾ فَالْمُغِيْرٰتِ

اُس دن لوگ الگ الگ نکلیں گے،[۵] اِس لیے کہ اُن کے اعمال اُنھیں دکھائے جائیں۔ پھر جس نے ذرہ برابر بھلائی کی ہے، وہ بھی اُسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہے، وہ بھی اُسے دیکھ لے گا۔[۶] ۶-۸

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

ہانپتے دوڑتے گھوڑے[۷] گواہی دیتے ہیں، پھر ٹاپوں سے چنگاریاں جھاڑتے،[۸] پھر

انسان کے اعمال و اقوال کی سب سے بڑی گواہ ہے۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جس طرح انسان کے اعضا و جوارح اور اُس کے بدن کے روئیں روئیں کو اُس کے خلاف گواہی دینے اور اُس کی زندگی کا ریکارڈ سنانے کے لیے گویا کر دے گا، اُسی طرح زمین کو بھی ناطق بنا دے گا کہ وہ ہر ایک کا ریکارڈ سنا دے۔'' (تدبر قرآن ۹/۴۹۳)

۴؎ اصل میں لفظ 'وَحٰی' استعمال ہوا ہے۔ یہ ایما اور اشارہ کے مفہوم میں ہے۔ قرآن کے بعض دوسرے مقامات میں بھی یہ اِس معنی میں آیا ہے۔

۵؎ یعنی اکیلے اور تنہا نکلیں گے۔ کسی کے ساتھ کوئی نہ ہوگا، نہ اُس کے اعزہ و اقربا، نہ ساتھی، نہ احباب، نہ خدم و حشم، نہ مال و منال اور نہ اعوان و انصار۔

صُبۡحًا ﴿۳﴾ فَاَثَرۡنَ بِهٖ نَقۡعًا ﴿۴﴾ فَوَسَطۡنَ بِهٖ جَمۡعًا ﴿۵﴾ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوۡدٌ ﴿۶﴾ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيۡدٌ ﴿۷﴾ وَاِنَّهٗ

صبح دم[9] دھاوا کرتے، پھر اُس میں غبار اڑاتے[10] اور اُسی کے ساتھ[11] مجمع میں گھس جاتے[12] ہیں کہ (حرم کے سایۂ امن میں رہنے والا) یہ انسان یقیناً اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔[13] حقیقت

۶۔ یعنی ہر ایک کا نامۂ اعمال پوری جزئیات کے ساتھ اُس کے سامنے آجائے گا۔ پھر جیسا کہ دوسرے مقامات میں تصریح ہے، جس کے پلڑے بھاری ہوں گے، اُسے جنت کے اور جس کے ہلکے ہوں گے، اُسے دوزخ کے حوالے کر دیا جائے گا۔

۷۔ اصل میں لفظ 'الْعٰدِیٰت' استعمال ہوا ہے۔ اِس کے معنی دوڑنے والے کے ہیں۔ آگے کی صفات سے واضح ہے کہ اِس سے مراد دوڑنے والے گھوڑے ہیں۔

۸۔ یہ اور اِس سے آگے تمام صفات 'ف' کے ساتھ عطف ہوئی ہیں۔ عربیت کی رو سے یہ عطف ترتیب پر بھی دلالت کرتا ہے اور اِس بات پر بھی کہ یہ تمام صفات ایک ہی موصوف سے متعلق ہیں۔

۹۔ یہ اِس لیے کہا ہے کہ عرب میں دشمنوں پر غارت گری کا سب سے موزوں وقت یہی سمجھا جاتا تھا۔ 'وا صباحا' کے نعرے میں صبح کا حوالہ اِسی پہلو سے ہے۔ لفظ 'صبح' اِسی بنا پر عربی زبان میں حملے اور غارت گری کے لیے ایک معروف لفظ بن گیا ہے۔

۱۰۔ اصل الفاظ ہیں: 'فَاَثَرۡنَ بِهٖ نَقۡعًا'۔ اِن میں 'ب' ظرف کے لیے ہے اور ضمیر کا مرجع وہ تگاپو ہے، جو پیچھے لفظ 'مُغِیْرٰت' سے مفہوم ہوتی ہے، یعنی دھاوا کرنے کی اِس تگاپو میں غبار اڑاتے۔

۱۱۔ یعنی اُسی غبار کے ساتھ۔ اصل میں 'فَوَسَطۡنَ بِهٖ جَمۡعًا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'ب' ملابست کے مفہوم میں ہے اور ضمیر کا مرجع 'نَقۡعًا' ہے۔

۱۲۔ ابتدا سے یہاں تک یہ اُس غارت گری اور لوٹ مار کی تصویر ہے جس سے قریش کے سوا

لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝٨

اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۝٩ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ۝١٠ اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَىِٕذٍ لَّخَبِيْرٌ ۝١١

یہ ہے کہ وہ اپنے اِس رویے پر خود گواہ ہے[۱۴] اور حقیقت یہ ہے کہ وہ دولت کی محبت میں بڑا ہی سخت ہے[۱۵]۔ ۱-۸

پھر کیا وہ نہیں جانتا، جب قبریں اگلوائی جائیں گی اور سینوں میں جو کچھ ہے، وہ اُن سے نکال لیا جائے گا[۱۶]؟ بے شک، اُن کا پروردگار اُس دن اُن سے خوب واقف ہو گا۔ ۹-۱۱

عرب کا کوئی قبیلہ اُس زمانے میں محفوظ نہ تھا۔

۱۳؎ مطلب یہ ہے کہ بڑا ہی ناشکرا اور لئیم ہے وہ انسان جو اِس لوٹ مار اور غارت گری کو شب وروز اپنے گردوپیش میں دیکھتا ہے اور جانتا ہے کہ وہ اگر اِس سے محفوظ ہے تو اِسی وجہ سے محفوظ ہے کہ اُسے حرم کی تولیت حاصل ہے، جانتا ہے کہ یہ گھر اور اِس کی برکتیں نہ ہوتیں تو اُس پر بھی اُسی طرح دھاوے ہوتے، جس طرح دوسروں پر ہورہے ہیں، لیکن اِس کے باوجود سرکشی پر آمادہ ہے اور اُس خدا کو جھٹلا رہا ہے جس کی عنایتوں سے امن وآشتی کی یہ نعمت اُسے عطا ہوئی ہے۔

۱۴؎ یعنی یہ بات محتاج دلیل نہیں ہے۔ اِس پر انسان کے اپنے ضمیر کی شہادت کافی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”جو باتیں انسان کی فطرت کے بدیہی مقتضیات میں سے ہیں، وہ دلیل کی محتاج نہیں ہوتیں۔ اُن کے حق میں سب سے بڑی گواہی خود انسان کی فطرت اور اُس کے ضمیر کے اندر موجود ہوتی ہے۔ انسان اگر اُن سے گریز اختیار کرتا ہے تو اِس وجہ سے نہیں کہ اُن کے حق میں اُس کو کوئی دلیل نہیں ملی، بلکہ اُن کو وہ اپنے نفس کی سفلی خواہشوں کے خلاف پاتا ہے، اِس وجہ

العٰدیٰت ۱۰۰

سے اُن سے گریز کے لیے بہانے تلاش کرتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۹/۵۰۳)

۱۵؎ یعنی حق و انصاف کے بجائے دولت کا متوالا ہے۔ چنانچہ یہی چیز اِس ناشکرے پن کا باعث بن گئی ہے۔

۱۶؎ اِس لیے کہ ہر شخص پر حجت قائم کی جا سکے کہ اُس نے کون سا عمل کس نیت سے اور کس محرک کے تحت کیا ہے۔

کوالالمپور

۱۲/ مارچ ۲۰۱۰ء

القارعة-التكاثر

١٠١ ــــ ١٠٢

القارعة-التکاثر

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ قیامت کی جس صورت حال سے مخاطبین کو خبردار کرتی ہے، دوسری میں اُسی کے حوالے سے اُن کی غفلت پر اُنھیں متنبہ کیا گیا ہے۔ دونوں میں روے سخن قریش کے سرداروں کی طرف ہے اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ پچھلی سورتوں کی طرح یہ بھی ام القریٰ مکہ میں ہجرت سے کچھ پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ اتمام حجت میں نازل ہوئی ہیں۔

پہلی سورہ ـــــ القارعة ـــــ کا موضوع لوگوں کو اِس حقیقت سے خبردار کرنا ہے کہ جس طرح بے خبری میں آکر کوئی دروازے پر دستک دیتا ہے، قیامت اِسی طرح ایک دن اُن کے دروازوں پر آدھمکے گی اور اُنھیں قبروں سے اٹھا کر اُن کے اعمال کے لحاظ سے اُن کے لیے جنت اور جہنم کا فیصلہ سنا دے گی۔

دوسری سورہ ـــــ التکاثر ـــــ کا موضوع اِسی قیامت کے حوالے سے اُنھیں متنبہ کرنا ہے کہ دنیا کی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی خواہش نے اُن کو اِس سب سے بڑی حقیقت سے غافل کر دیا ہے۔ وہ اگر جانتے کہ محاسبے کا یہ دن اُن سے زیادہ دور نہیں ہے تو اِس سے ہرگز اِس طرح غافل نہ ہوتے۔

سورة القارعة

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلۡقَارِعَةُ ۙ﴿۱﴾

مَا الۡقَارِعَةُ ۚ﴿۲﴾

وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡقَارِعَةُ ؕ﴿۳﴾

يَوۡمَ يَكُوۡنُ النَّاسُ كَالۡفَرَاشِ الۡمَبۡثُوۡثِ ۙ﴿۴﴾ وَتَكُوۡنُ

—— ۱ ——

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

کھٹکھٹانے والی[۱]!

کیا ہے کھٹکھٹانے والی!

اور تمھیں کیا معلوم کہ کیا ہے کھٹکھٹانے والی[۲]! ۱-۳

اُس دن لوگ بکھرے ہوئے پتنگوں کی طرح ہوں گے[۳] اور پہاڑ دھنی ہوئی اون کی

۱؎ اصل میں لفظ 'اَلْقَارِعَة' استعمال ہوا ہے۔ یہ قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ یعنی جو رات میں آنے والے کی طرح اچانک آئے گی اور جس طرح دروازے کھٹکھٹا کر وہ سونے والوں کو ہڑبڑا دیتا ہے، اُسی طرح پورے عالم کو ہڑبڑا دے گی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''یہ اسلوب بیان جو یہاں اختیار فرمایا گیا ہے، ایک الارم کی نوعیت کا ہے تاکہ تمام کان رکھنے والے اِس مبتدا کی خبر سننے کے لیے تیار ہو جائیں۔ گویا قیامت جس نوعیت کی ہڑبڑاہٹ اِس دنیا میں پیدا کرے گی، اُسی نوعیت کی ہڑبڑاہٹ یہاں اُس کا نام پیدا کر رہا ہے۔''

(تدبر قرآن ۵۱۲/۹)

الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۝٥
فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝٦ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝٧
وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝٨ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝٩ وَمَآ اَدْرٰىكَ
مَاهِيَهْ ۝١٠ نَارٌ حَامِيَةٌ ۝١١

التکاثر
١٠٢

سورۃ التکاثر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝١ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝٢ كَلَّا سَوْفَ

طرح ہو جائیں گے۔[۴] ۴-۵

پھر جس کے پلڑے بھاری ہوئے، وہ دل پسند عیش میں ہوگا اور جس کے پلڑے ہلکے ہوئے، اُس کا ٹھکانا[۵] گہری کھائی ہے۔ اور تم کیا سمجھے کہ وہ کیا ہے[۶]؟ دہکتی آگ ہے۔ ۶-۱۱

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

بہت پانے اور اُس میں دوسروں سے بڑھ جانے کی حرص[۱] نے تمھیں غفلت میں

۲؎ یہ حسرت و افسوس کا اسلوب ہے۔ یعنی اے کاش، تم جانتے! لیکن تم پر افسوس، تم کیا جانو گے!

۳؎ یعنی بالکل تنہا، الگ اور پراگندہ، کوئی کسی کے ساتھ نہ ہوگا۔

۴؎ اصل میں لفظ 'عِھْن' آیا ہے۔ یہ اُس اون کو کہتے ہیں جو دھنے اور رنگنے کے بعد کاتنے کے لیے تیار کی جا چکی ہو۔ یہاں تشبیہ میں اُس کا رنگ نہیں، بلکہ پراگندگی پیش نظر ہے۔ مطلب یہ

تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳﴾ ثُمَّ كَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴﴾

ڈالے رکھا،[8] یہاں تک کہ قبروں میں جا پہنچے۔ (نہیں، یہ کچھ نہیں لوگو[9])، ہرگز نہیں، تم جلد جان لو گے۔ پھر سنو، (یہ کچھ نہیں)، ہرگز نہیں، تم جلد جان لو گے۔[10] ۱-۴

ہے کہ جس طرح دھنکی ہوئی اون کا ریشہ ریشہ الگ ہو جاتا ہے، اُسی طرح پہاڑ بھی ذرہ ذرہ ہو کر پراگندہ ہو جائیں گے۔

۵۔ یہاں اصل میں لفظ 'اُمّ' استعمال ہوا ہے اور دیکھیے کہ کس بلاغت کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔

۶۔ اصل الفاظ ہیں: 'وَمَآ اَدۡرٰكَ مَاهِيَهۡ'۔ 'مَاهِيَهۡ' کی 'ہ' سکتہ کی ہے اور یہاں قافیے کی رعایت سے آئی ہے۔

۷۔ اصل میں لفظ 'تَكَاثُر' آیا ہے۔ اِس کے معنی مال و اولاد کی کثرت میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی تگ و دو کے ہیں۔ قرآن نے یہ لفظ اِس لیے اختیار کیا ہے کہ اُس زمانے کے تمدنی حالات میں رفاہیت اور اقتدار کی بنیاد یہی دو چیزیں تھیں۔ تاہم مدعا وہی ہے جو ہم نے ترجمے میں ادا کر دیا ہے۔

۸۔ یعنی خدا اور آخرت کے بارے میں غفلت میں ڈالے رکھا اور اِس سوال پر غور کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوئی کہ اگر خدا ہے اور اُس نے پکڑ بلایا تو اُس کے احتساب سے بچنے کی کیا صورت ہو گی؟

۹۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا کی یہ زندگی کچھ نہیں، یہ محض متاع غرور ہے جس کے سحر میں شیطان نے تمھیں مبتلا کر رکھا ہے۔

۱۰۔ یعنی دنیا اور آخرت، دونوں میں جلد جان لو گے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''یہ تاکید در تاکید انذار کو موثر بنانے کے لیے بھی ہے اور اِس حقیقت کے اظہار کے لیے بھی کہ جس قوم کو اللہ کا رسول انذار کرتا ہے، وہ اُس کی تکذیب کے نتیجے میں اِس دنیا میں بھی

التکاثر
۱۰۲

كَلَّا لَوۡ تَعۡلَمُوۡنَ عِلۡمَ الۡيَقِيۡنِ ۝۵ لَتَرَوُنَّ الۡجَحِيۡمَ ۝۶ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيۡنَ الۡيَقِيۡنِ ۝۷ ثُمَّ لَتُسۡـَٔلُنَّ يَوۡمَئِذٍ عَنِ النَّعِيۡمِ ۝۸

تم اِس طرح غافل نہیں ہو سکتے تھے[11]، ہرگز نہیں، اگر تم یقین سے جانتے کہ دوزخ دیکھ کر رہو گے[12]۔ پھر جانتے کہ تم اُسے یقین کی آنکھوں سے دیکھو گے۔ پھر دنیا کی سب نعمتوں کے بارے میں اُس دن تم سے ضرور پوچھا جائے گا[13]۔ ۵-۸

گرفتارِ عذاب ہوتی ہے اور آخرت میں بھی اُس کے آگے وہ سب کچھ آئے گا جس سے رسول نے آگاہ کیا۔ مطلب یہ ہوا کہ اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی تو اِس دنیا میں بھی دیکھو گے اور آخرت میں بھی دیکھو گے، اور اِس میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ تمھارے لیے عدالت قائم ہو چکی ہے اور فیصلہ ہوا ہی چاہتا ہے۔ لفظ 'تَعْلَمُوْنَ' کے ابہام کے اندر جو وعید مضمر ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔'' (تدبر قرآن ۹/ ۵۲۳)

۱۱؎ آگے 'لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن کی ابتدا حرف 'لَوْ' سے ہوئی ہے۔ یہ اِسی 'لَوْ' کا جواب ہے جسے قرآن نے بلاغت کے تقاضے سے حذف کر دیا ہے۔ سورہ کے آخر تک سارا کلام اِسی 'لَوْ' کے تحت ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ اِس کی مثالیں ہیں کہ شرط کا جواب اُن مواقع میں حذف کر دیا جاتا ہے، جہاں وہ اظہار کے بغیر واضح ہو۔

۱۲؎ یعنی جزا و سزا کے جو دلائل انفس و آفاق میں موجود ہیں اور قرآن نے بیان کر دیے ہیں، اُن کی روشنی میں یقین سے جان لیتے کہ ایک دن جہنم سامنے آجائے گی۔ اِس سے معلوم ہوا کہ نظری دلائل سے جو علم حاصل ہوتا ہے، وہ علم الیقین ہی ہو سکتا ہے، اُس کو عین الیقین کا درجہ آخرت میں حاصل ہو گا، جیسا کہ آگے کی آیت میں تصریح ہے۔

۱۳؎ یہ اِن نعمتوں کا فطری حق ہے کہ انسان کو اِن کے لیے مسئول ٹھیرایا جائے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...انسان کے کان، آنکھ، دل، دماغ اور تمام اعضا و جوارح نعمت ہیں، اِسی طرح اِس کو جو ظاہری و باطنی قوتیں اور صلاحیتیں عطا ہوئی ہیں، وہ بھی نعمت ہیں، علیٰ ہٰذا القیاس اِس دنیا میں زندگی کے جو اسباب و وسائل اُس کو عطا ہوئے ہیں، وہ بھی اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمت ہیں۔ اُن کا فطری حق ... یہی ہے کہ انسان اُن کو برتے اور اپنے رب کا شکر گزار رہے۔ اِس شکر گزاری کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ اُن کے برتنے میں نہ خدا کے مقرر کیے ہوئے حدود سے تجاوز کرے اور نہ اُن میں سے کسی کے عشق میں اِس طرح مبتلا ہو جائے کہ اُسی کو معبود بنا بیٹھے اور خدا کو بھول جائے۔ جو لوگ اِس طرح کے کسی تجاوز میں مبتلا ہوں گے، وہ قیامت کے دن لازماً اُس کی سزا بھگتیں گے۔“ (تدبر قرآن ۹/۵۲۵)

کوالالمپور

۱۳/ مارچ ۲۰۱۰ء

العصر - الهمزة

١٠٣ ـــــ ١٠٤

العصر - الھمزۃ

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ خدا کے جس قانون مجازات کو ثابت کرتی ہے، دوسری میں اُسی کے حوالے سے قریش کی قیادت کو اُس کے انجام پر متنبہ کیا گیا ہے۔ دونوں میں روے سخن قریش کے سرداروں کی طرف ہے اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ پچھلی سورتوں کی طرح یہ بھی ام القریٰ مکہ میں ہجرت سے کچھ پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ اتمام حجت میں نازل ہوئی ہیں۔

پہلی سورہ ـــــ العصر ـــــ کا موضوع خدا کے اُس قانون مجازات کو ثابت کرنا ہے جس کے مطابق خدا کی عدالت قریش کے لیے اپنا فیصلہ صادر کرنے والی تھی۔

دوسری سورہ ـــــ الھمزۃ ـــــ کا موضوع اِسی قانون کے حوالے سے اُن کی قیادت کو اُس کے انجام سے خبردار کرنا ہے جو دولت کے غرور میں مبتلا اور پیغمبر کے مقابلے میں سرکشی، تضحیک اور عیب چینی کے رویے پر مصر تھی۔

سورۃ العصر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالۡعَصۡرِ ۙ﴿۱﴾ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۙ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

زمانہ گواہی دیتا ہے[1]، یہ انسان خسارے میں پڑ کر رہیں گے[2]۔ ہاں[3]، مگر وہ نہیں جو

---

[1] یعنی سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور تک وہ پورا زمانۂ رسالت گواہی دیتا ہے جس میں رسولوں کی مخاطب قوموں کے لیے خدا کی عدالت زمین پر قائم رہی اور سرکش قوموں کے لیے اُس کے فیصلے اِس دنیا میں صادر ہوئے۔ یہ بات اِس طرح بھی کہی جا سکتی ہے کہ تاریخ گواہی دیتی ہے۔ اِس لحاظ سے دیکھیے تو یہ ایک لفظ اُن تمام سرگذشتوں کا عنوان ہے جو قرآن میں اثبات قیامت کے لیے مذکور ہوئی ہیں۔ عاد و ثمود، قوم نوح، قوم لوط، قوم شعیب اور اِس طرح کی دوسری قوموں کی سرگذشت سے قرآن نے جگہ جگہ استدلال کیا ہے۔ یہی استدلال یہاں ایک لفظ میں بیان کر دیا ہے۔ یہ درحقیقت قیامت پر اُس قیامت صغریٰ سے استدلال ہے جو بار بار اِس لیے برپا کی گئی کہ آخرت کے تصور کو اُسی معیار پر ثابت کر دیا جائے جس معیار پر سائنسی حقائق معمل (laboratory) کے تجربات سے ثابت کیے جاتے ہیں۔ انفس و آفاق کے دلائل کے ساتھ اثبات قیامت کے لیے یہ تاریخ کی گواہی ہے۔

[2] لفظ 'اَلْاِنْسَان' یہاں عام نہیں ہے۔ اِس کا الف لام عہد کے لیے ہے اور اشارہ اُنھی لوگوں کی طرف ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اتمام حجت کے بعد آپ کے مقابلے میں سرکشی اور تمرد پر اتر آئے تھے۔ خسارے سے مراد دنیا اور آخرت، دونوں کا خسارہ ہے، یعنی دنیا میں بھی عذاب سے دوچار ہوں گے، جس طرح رسولوں کی مخاطب قومیں اِس سے پہلے ہوتی رہی ہیں

الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ۬ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿۳﴾

ایمان لائے[4] اور اُنھوں نے نیک عمل کیے[5]، اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور حق پر ثابت قدمی کی نصیحت کی[6]۔ ۱-۳

اور آخرت میں بھی ایک بڑا عذاب اِن کے لیے منتظر ہے۔ اِن کی نگاہ دنیا کے مال و جاہ اور دولت و اقتدار پر ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ پیغمبر کی مخالفت کر کے یہ نفع کا سودا کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ خدا کے قانون مکافات کی زد میں ہیں جس سے یہ عنقریب دوچار ہو جائیں گے، اِس لیے متنبہ ہو جائیں، اِن کی روش یہی رہی تو لازماً خسارے میں پڑیں گے۔

۳۔ اِس سے آگے دوٹوک طریقے سے بتا دیا ہے کہ خسارے سے بچنے کا طریقہ کیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اگرچہ یہ طریقہ صرف چند لفظوں میں بتایا گیا ہے، لیکن ایسے جامع اور حکیمانہ اسلوب میں بتایا گیا ہے کہ انسان تدبر کرے تو اُس کو معلوم ہو جائے گا کہ اُس کی انفرادی اور اجتماعی، دونوں زندگیوں سے متعلق اُس پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں جو اُسے ادا کرنے ہیں اور جن کے ادا کرنے ہی پر اُس کی ابدی فلاح کا انحصار ہے۔
>
> غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ قرآن کا بھی اصل مقصد اِسی صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرنا اور انسان کی شخصی و اجتماعی زندگی کو آخرت کے نصب العین کے تحت منظم کرنا ہے۔ گویا جو بات قرآن کی ایک سو چودہ سورتوں میں سمجھائی گئی ہے، وہ اِس سورہ کی تین آیتوں میں سمو دی گئی ہے۔ اِسی حقیقت کی طرف حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یوں اشارہ فرمایا ہے کہ ”اگر لوگ تنہا اِسی سورہ ـــ العصر ـــ پر غور کریں تو اُن کے لیے کفایت کرے۔“*“ (تدبر قرآن ۹/۵۳۰)

۴۔ ایمان ایک قدیم دینی اصطلاح ہے۔ ’اٰمن‘ کا مادہ عبرانی زبان میں بھی موجود ہے اور صدق و اعتماد کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اِسی سے ’اٰمین‘ کا کلمہ ہے جس سے ہم کسی بات کی تصدیق

* تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ۴/۵۴۸۔

کرتے ہیں۔قرآن مجید میں یہ تعبیر اسی مفہوم میں آئی ہے۔ چنانچہ جب کسی چیز کو دل کے پورے یقین کے ساتھ تسلیم کرلیا جائے تو اُسے ایمان کہا جاتا ہے۔ اِس کی اصل خدا پر ایمان ہے۔ انسان اگر اپنے پروردگار کو اِس طرح مان لے کہ تسلیم ورضا کے بالکل آخری درجے میں اپنے دل و دماغ کو اُس کے حوالے کردے تو قرآن کی اصطلاح میں وہ مومن ہے۔

ایمان کی یہی حقیقت ہے جس کی بنا پر قرآن تقاضا کرتا ہے کہ دل کی تصدیق کے ساتھ انسان کے قول و عمل کو بھی اُس پر گواہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ ہر نیکی کو وہ ایمان کا خاصہ اور ایمان والوں کا لازمی وصف بتاتا ہے۔ ایمان کے بعد عمل صالح کا ذکر گویا ایک طرح کی وضاحت ہے۔ اِس کی نوعیت بالکل وہی ہے جو عام پر خاص کے عطف کی ہوتی ہے۔ امام حمید الدین فراہی لکھتے ہیں:

"...ایمان کا محل دل اور عقل ہے اور عقل و دل کے معاملات میں انسان نہ صرف دوسروں کو دھوکا دے سکتا ہے، بلکہ بسا اوقات خود بھی دھوکے میں رہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ مومن ہے، حالاں کہ وہ مومن نہیں ہوتا۔ اِس وجہ سے ایمان کے دو شاہد قرار دیے گئے: ایک قول، دوسرے عمل۔ اور چونکہ قول بھی جھوٹ ہوسکتا ہے، اِس وجہ سے صرف زبان سے اقرار کرنے والا مومن نہیں قرار دیا گیا، بلکہ ضروری ہوا کہ آدمی کا عمل اُس کے ایمان کی تصدیق کرے۔"

(نظام القرآن ۳۹۶)

اِس میں شبہ نہیں کہ قانون کی نگاہ میں ہر وہ شخص مومن ہے جو زبان سے اسلام کا اقرار کرتا ہے۔ اُس کا یہ ایمان کم یا زیادہ بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن جہاں تک حقیقی ایمان کا تعلق ہے، وہ ہرگز کوئی جامد چیز نہیں ہے۔ اللہ کے ذکر، اُس کی آیتوں کی تلاوت اور انفس و آفاق میں اُن کے ظہور سے اُس میں افزونی ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے اُسے ایک ایسے درخت سے تشبیہ دی ہے جس کی جڑیں زمین کے اعماق میں اتری ہوئی اور شاخیں آسمان کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہوں*۔ یہی معاملہ ایمان میں کمی کا ہے۔ انسان اگر اپنے ایمان کو علم نافع اور عمل صالح سے برابر بڑھاتے رہنے کے بجائے اُس کے تقاضوں کے خلاف عمل کرنا شروع کردے تو یہ کم بھی ہوتا ہے،

*ابراہیم ۱۴: ۲۴۔

بلکہ بعض حالات میں بالکل ختم ہوجاتا ہے۔ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ* (اُس دن وہ ایمان سے زیادہ کفر کے قریب تھے) اور اِس طرح کی دوسری آیات سے یہی حقیقت واضح ہوتی ہے۔

چنانچہ ایمان اور عمل لازم وملزوم ہیں۔ جس طرح ایمان کے ساتھ عمل ضروری ہے، اُسی طرح عمل کے ساتھ ایمان بھی ضروری ہے۔ نجات کے لیے قرآن نے ہر جگہ اِسے شرط اولین قرار دیا ہے۔ سورۂ نور میں ایمان کی دولت سے محروم لوگوں کے اعمال کی مثال کسی چٹیل صحرا کے سراب سے دی گئی ہے جس کی حقیقت فریب نظر سے زیادہ نہیں ہوتی۔ پیاسا پانی سمجھ کر اُس کی طرف لپکتا ہے، مگر جب اُس کے قریب پہنچتا ہے تو راز کھلتا ہے کہ جس چیز کو وہ لہریں لیتا ہوا دریا سمجھ رہا تھا، وہ درحقیقت چمکتی ہوئی ریت تھی۔**

یہ ایمان درج ذیل پانچ چیزوں سے عبارت ہے:

۱۔ اللہ پر ایمان

۲۔ فرشتوں پر ایمان

۳۔ نبیوں پر ایمان

۴۔ کتابوں پر ایمان

۵۔ روز جزا پر ایمان

۵؎ اِس سے مراد قرآن کی اصطلاح میں ہر وہ عمل ہے جو خدا کی اُس حکمت کے موافق ہو جس پر کائنات کی تخلیق ہوئی، اور جس کے مطابق اُس کی تدبیر امور کی جاتی ہے۔ اِس کی تمام اساسات عقل وفطرت میں ثابت ہیں اور خدا کی شریعت اِسی عمل کی طرف انسان کی رہنمائی کے لیے نازل ہوئی ہے۔

---

* آل عمران ۳: ۱۶۷۔

** النور ۲۴: ۳۹۔

۶۔ یہ دعوت و تبلیغ کی وہ ذمہ داری ہے جو قرآن نے اپنے ہر ماننے والے پر عائد کی ہے۔ اِس لیے کہ انسان صرف انفرادی زندگی نہیں رکھتا، وہ جہاں بھی پایا جاتا ہے کسی خاندان کے رکن اور معاشرے کے ایک فرد کی حیثیت سے پایا جاتا ہے۔ اُس کی یہ حیثیت بالکل فطری ہے۔ وہ اپنی مادی زندگی کے لیے بھی خاندان اور معاشرے کا محتاج ہے اور اپنے اخلاقی اور روحانی ارتقا کے لیے بھی اُنھی کا سہارا حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ اِسی بنا پر پابند کیا گیا ہے کہ اپنے گردوپیش کی صلاح و فلاح سے غافل نہ رہے۔

اِس کا ذکر یہاں عمل صالح کے ایک جزو اور اُس کی توضیح کے طور پر ہوا ہے، اِس لیے کہ حق کے ساتھ انسان کی محبت کا یہ لازمی تقاضا ہے۔ وہ جس چیز کو محبوب رکھتا ہے، پوری شدت سے چاہتا ہے کہ دوسرے بھی اُس کو اِسی طرح محبوب رکھیں۔

یہ ذکر جس طریقے سے ہوا ہے، اُس سے واضح ہے کہ یہ ایمان کے بنیادی تقاضوں میں سے ایک ہے۔ بندۂ مومن نیک عمل کرے اور ایمان کا یہ تقاضا بھی پورا کر دے تو اِن آیتوں میں ضمانت دی گئی ہے کہ قیامت میں خسارے سے محفوظ رہے گا اور جنت کی ابدی بادشاہی اُسے حاصل ہو جائے گی۔

آیت میں 'حَقّ' اور 'صَبر' کے الفاظ بھی قابل توجہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ 'اُنھوں نے نیک عمل کی تلقین کی'، بلکہ یہ فرمایا کہ 'حق اور حق پر ثابت قدمی کی تلقین کی'۔ اِس کی وجہ کیا ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''...اِس اسلوب نے وہ باتیں بھی اپنے اندر سمیٹ لی ہیں جو (اِس سے) پہلے ٹکڑے میں ہیں اور اُن کے اوپر مزید نہایت اہم اضافے بھی کر دیے ہیں۔ لفظ 'حَقّ' کے اندر ایمان بدرجۂ اولیٰ داخل ہے، اِس لیے کہ وہ خدا کا حق ہے اور سب سے بڑا حق ہے۔ اِسی طرح اعمال حسنہ کا تعلق بھی یا تو خدا کے حقوق سے ہے یا بندوں کے حقوق سے، اِس وجہ سے وہ بھی اِس میں داخل ہیں۔ اِس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ وہ یہ ساری باتیں حقوق اور فرائض کی

سورة الهمزة

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَیۡلٌ لِّکُلِّ ہُمَزَۃٍ لُّمَزَۃِ نِ ۙ﴿۱﴾ الَّذِیۡ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَہٗ ۙ﴿۲﴾ یَحۡسَبُ اَنَّ مَالَہٗۤ اَخۡلَدَہٗ ۚ﴿۳﴾

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

تباہی ہے ہر اُس شخص کے لیے جو تم پر اشارے کرتا اور تمھیں عیب لگاتا ہے[۷]، (اے پیغمبر)۔ یہ جس نے مال جمع کیا اور اُسے گن گن کر رکھا ہے[۸]۔ اِس کا خیال

طرح ادا بھی کرتے ہیں، دوسروں کو اِس کی تلقین بھی کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ حکمت بھی لوگوں کو بتاتے ہیں کہ حقوق کو ادا کرنا کوئی سہل بازی نہیں ہے، اِس کے لیے صبر و عزیمت ضروری ہے۔ جن کے اندر یہ وصف نہیں ہوگا، اُن کے لیے حقوق کا ادا کرنا نہایت مشکل ہے۔''

(تدبر قرآن ۹/۵۳۶)

لفظ 'تَوَاصَوْا' بھی قابل غور ہے۔ اِس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اِس دعوت کا دائرۂ عمل انسان کا اپنا ماحول ہے۔ چنانچہ داعی اور مدعو اِس میں الگ الگ نہیں ہیں، بلکہ ہر شخص ہر وقت جس طرح داعی ہے، اُسی طرح مدعو بھی ہے۔ قرآن نے بعض مقامات پر اِسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے بھی تعبیر کیا ہے۔ یعنی وہ باتیں جو عقل و فطرت اور دین و شریعت کی رو سے معروف ہیں، اپنے قریبی ماحول میں لوگوں کو اُن کی تلقین کی جائے اور جو باتیں اُن کی طرف سے منکر قرار دی گئی ہیں، اُن سے لوگوں کو روکا جائے۔

۷؎ پہلی چیز کا تعلق حرکتوں اور اداؤں سے ہے اور دوسری کا زبان سے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

كَلَّا لَيُنۢبَذَنَّ فِي الۡحُطَمَةِ ۝٤ وَمَآ اَدۡرٰىكَ مَا الۡحُطَمَةُ ۝٥

ہے کہ اِس کے مال نے اِسے حیات جاوداں بخش دی ہے۔[9] ۱-۳

ہر گز نہیں، یہ ضرور اُس میں پھینکا جائے گا جو توڑ کر رکھ دے گی۔ اور تمھیں کیا معلوم

"... یہ دونوں ایک ہی کردار کے دو پہلو ہیں۔ جب کسی کا مذاق اڑانا، اُس کا تہتک کرنا اور اُس کو دوسروں کی نگاہوں سے گرانا مقصود ہو تو اِس میں اشارہ بازی سے بھی کام لیتے ہیں اور زبان سے بھی۔ اشارہ بازی سے کسی کی تضحیک و تحقیر کے جو پہلو پیدا کیے جا سکتے ہیں، بسا اوقات وہ زبان کی فقرہ بازیوں سے زیادہ کارگر ہوتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے 'هُمَزَة' کو مقدم رکھا ہے۔"
(تدبر قرآن ۹/۵۴۸)

یہ، اگر غور کیجیے تو اشاروں کی زبان میں مضحکہ اڑانے اور پھبتیاں چست کرنے کا وہی طریقہ ہے جو اخبارات کے فکاہی کالموں، کارٹونوں اور لیڈروں وغیرہ کے بیانات کی صورت میں اب بھی دیکھ لیا جا سکتا ہے۔

۸۔ یہ نہایت جامع تصویر ہے۔ انسان بخیلی کا خوگر ہو تو مال کی حرص میں مبتلا ہو جاتا ہے، پھر اِسی طرح سرمایے کے حساب و کتاب میں لگا رہتا ہے۔

۹۔ یہ اُس کا باطن ہے۔ اِس لیے کہ مال اور زندگی کو فانی سمجھتا تو کبھی یہ رویہ اختیار نہ کرتا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"آدمی کے باطن کا سراغ دینے والی اصل چیز اُس کی زبان نہیں، بلکہ اُس کی زندگی کا رویہ ہے۔ جو آدمی اِسی دنیا کو اپنی منزل سمجھتا ہے، اُس کی زندگی اُس شخص کی زندگی سے بالکل مختلف ہوتی ہے جو اِس دنیا کو منزل نہیں، بلکہ راہ سمجھتا ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ جو شخص آخرت کا قائل اور اُس کا طالب ہو، وہ اپنا مال گن گن کر اِس دنیا کے بنکوں اور تجوریوں میں رکھے، بلکہ وہ اپنا مال اپنے خداوند کے پاس رکھتا ہے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ "تو اپنا مال اپنے خداوند کے پاس رکھ، اِس لیے کہ جہاں تیرا مال رہے گا، وہیں تیرا دل بھی رہے گا۔"" (تدبر قرآن ۹/۵۴۹)

نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ﴿۶﴾ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْـِٕدَةِ ؕ﴿۷﴾ اِنَّهَا عَلَیْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۙ﴿۸﴾ فِیْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ﴿۹﴾

کہ جو توڑ کر رکھ دے گی، وہ کیا ہے؟ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ جو دلوں تک پہنچے گی۔[۱۰] یہ (سرکش) اُس میں موندے ہوئے ہوں گے۔ اونچے ستونوں میں جکڑ کر باندھے ہوئے۔ ۴-۹

۱۰؎ یعنی اُن دلوں تک پہنچے گی جو خدا کے خوف سے خالی، حاجت مندوں کے حقوق سے بے پروا اور مال و دولت کی محبت میں غرق رہے۔ اِس آگ کی پسندیدہ غذا یہی دل ہوں گے۔ اِس لیے سب سے پہلے یہ اِنھی پر حملہ آور ہوگی۔

کوالالمپور

۱۴/ مارچ ۲۰۱۰ء

الفيل - قريش

١٠٥ ـــــ ١٠٦

الفیل ۔ قریش

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ میں واقعۂ فیل کے حوالے سے قریش کو تہدید ہے کہ وہ خدا کے قہر سے ڈریں اور دوسری میں بیت الحرام کے حوالے سے اُنھیں تلقین کی گئی ہے کہ خدا کی جو نعمتیں اِس گھر کی بدولت اُنھیں حاصل ہیں، اُن کا لحاظ کریں اور خدا کے مقابلے میں سرکشی چھوڑ کر تنہا اُسی کی بندگی اختیار کرلیں۔

دونوں میں روے سخن قریش کے سرداروں کی طرف ہے اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ پچھلی سورتوں کی طرح یہ بھی ام القریٰ مکہ میں ہجرت سے کچھ پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ اتمام حجت میں نازل ہوئی ہیں۔

پہلی سورہ ــــ الفیل ــــ کا موضوع قریش کو اِس حقیقت پر متنبہ کرنا ہے کہ جس پروردگار نے اپنے دشمنوں کو تمھارے سامنے اِس طرح پامال کیا ہے، تم اُس کی دشمنی کے لیے اٹھے ہو تو وہ تمھیں چھوڑ نہیں دے گا۔ تم بھی اِسی طرح پامال کر دیے جاؤ گے۔

دوسری سورہ ــــ قریش ــــ کا موضوع اُنھیں اِس بات کی تلقین کرنا ہے کہ جس گھر کے مالک نے اُنھیں رزق و امن سے نوازا ہے، اُس کا یہ حق تو کم سے کم پہچانیں کہ تنہا اُسی کی عبادت کریں اور دنیا میں اُس کے بندے بن کر رہیں۔

سورة الفیل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِیۡلِ ؕ﴿۱﴾ اَلَمۡ یَجۡعَلۡ

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

تو نے دیکھا نہیں[1] کہ تیرے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟[2] اُن کی

الفیل
۱۰۵

۱۔ خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، مگر اصل مخاطب قریش کے لوگ ہیں۔ واحد کے صیغے سے خطاب کا یہ اسلوب اُس وقت اختیار کیا جاتا ہے، جب مخاطبین کے ایک ایک شخص کو فرداً فرداً متوجہ کرنا پیش نظر ہو۔ اصطلاح میں اِسے 'خطاب لغیر معین' کہا جاتا ہے۔

۲۔ یہ سارا واقعہ مخاطبین کو معلوم تھا۔ مکہ اور اطراف مکہ میں ایسے بہت سے لوگ اُس وقت زندہ موجود تھے جنھوں نے اپنی آنکھوں سے اِسے دیکھا تھا۔ باقی لوگوں کے لیے یہ خبر ایک خبر متواتر تھی اور آنکھوں دیکھے واقعے کی طرح وہ اِس کا یقینی علم رکھتے تھے۔ قرآن نے اِسی بنا پر اِس کی تفصیل نہیں کی۔ اصحاب الفیل کے الفاظ سے حملہ آوروں کا تعارف ہی یہ سمجھ لینے کے لیے کافی تھا کہ یہ یمن کے حبشی حکمران ابرہہ کا ذکر ہو رہا ہے جو کوہ پیکر ہاتھیوں اور ایک لشکر جرار کے ساتھ بیت اللہ پر حملہ آور ہوا تھا۔

اِس واقعے کی جو تفصیلات امام حمید الدین فراہی نے سورہ کی تفسیر میں اپنی تحقیق کے مطابق بیان کی ہیں، اُن کی رو سے ابرہہ نو ہاتھیوں اور ساٹھ ہزار کا لشکر لے کر بیت الحرام کو ڈھانے کی غرض سے مکہ پر حملہ آور ہوا۔ قریش کھلے میدان میں اُس کے مقابلے کی طاقت نہ پا کر پہاڑوں میں چلے گئے۔ اُنھوں نے وہاں سے اِس لشکر جرار پر سنگ باری کی۔ اُن کی یہ مدافعت انتہائی کم زور تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی قوت قاہرہ اُس میں شامل کر دی۔ چنانچہ اذن الٰہی سے ہوا کے تند و تیز

كَيۡدَهُمۡ فِيۡ تَضۡلِيۡلٍ ۙ﴿۲﴾ وَّ اَرۡسَلَ عَلَيۡهِمۡ طَيۡرًا اَبَابِيۡلَ ۙ﴿۳﴾

چال کیا اُس نے اکارت نہیں کر دی[۳]؟ اور اُن پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے مسلط نہیں کر دیے[۴]؟ ۱-۳

طوفان (حاصب) نے ابرہہ کی فوجوں کو اِس طرح پامال کیا کہ وادی محصب میں پرندے دنوں اُن کی نعشیں نوچتے رہے*۔ اُس زمانے کے ایک شاعر ابوقیس کا بیان ہے:

فارسل من ربهم حاصب يلفهم مثل لف القزم

''پھر اُن کے پروردگار کی طرف سے اُن پر حاصب بھیجی گئی جو خس وخاشاک کی طرح اُنھیں لپیٹتی جاتی تھی۔''

۳۔ چال سے مراد یہاں وہ بہانہ ہے جو اِس نہایت ظالمانہ اقدام کا جواز پیدا کرنے کے لیے تراشا گیا۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حملے سے پہلے ابرہہ نے اِس بے ہودہ الزام کا پروپیگنڈا کیا کہ کسی عرب نے اُن کے کلیسا کو ناپاک کر دیا ہے۔ لہٰذا وہ محض اپنے کلیسا کی توہین کا بدلہ لینے کے لیے بیت اللہ پر حملہ آور ہوا ہے۔ عیسائیوں کے جذبات بھڑکانے اور نجاشی کی تائید حاصل کرنے کے لیے اِس جھوٹ کو خوب شہرت دی گئی، یہاں تک کہ ساٹھ ہزار کا لشکر اُس کے ساتھ مکے پر حملے کے لیے جمع ہو گیا۔ یہ محض ایک چال تھی، ورنہ اصلی مقصود یہ تھا کہ مکہ کے معبد کو ڈھا کر عربوں کے حج کا رخ بھی اُس گرجے کی طرف موڑ دیا جائے جو اُس نے یمن کے دارالسلطنت صنعاء میں بنوایا تھا۔ اپنے مذہب کے ساتھ تعصب کے جنون میں یہ اسکیم عربوں کو عیسائی بنانے کے لیے بنائی گئی تھی**۔

۴۔ یہ ابرہہ کی فوجوں کی بے بسی سے کنایہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ساف وحاصب کے طوفان

* نظام القرآن، حمید الدین فراہی ۴۴۴۔

** البدایۃ والنہایہ، ابن کثیر ۲/ ۱۷۰۔

تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿۴﴾ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ﴿۵﴾

اِس طرح کہ تو پکی ہوئی مٹی کے پتھر[5] اُنھیں مار رہا تھا[6] اور اُس نے اُنھیں کھانے کے بھوسے کی طرح کر دیا[7]۔۴-۵

سے اُنھیں اِس طرح پامال کیا کہ کوئی اُن کی لاشیں اٹھانے والا نہ رہا۔ وہ میدان میں پڑی تھیں اور گوشت خوار پرندے اُنھیں نوچنے اور کھانے کے لیے اُن پر جھپٹ رہے تھے۔

۵۔ اصل میں لفظ 'سِجِّيْل' ہے۔ یہ فارسی کے لفظ سنگ گل کا معرب ہے۔ اِس سے مراد وہ پتھر ہیں جو مٹی کے گارے سے بنے ہوں اور پک کر سخت ہو گئے ہوں۔

۶۔ اصل میں 'تَرْمِيْهِمْ' ہے۔ یہ اِس سے پچھلی آیت میں 'عَلَيْهِمْ' کی ضمیر مجرور سے حال واقع ہوا ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ پتھر پرندوں نے پھینکے، مگر حقیقت یہ ہے کہ پرندوں کے پتھر پھینکنے کے لیے یہ لفظ کسی طرح موزوں نہیں ہے۔ ہوا کے تند و تیز تھپیڑوں کے ساتھ ابرہہ کے لشکر پر آسمان سے جو سنگ باری ہوئی، اُس کے لیے، البتہ یہ لفظ نہایت صحیح استعمال ہوا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...چڑیاں اپنی چونچوں اور چنگلوں سے سنگ ریزے گرا تو سکتی ہیں، لیکن اُس کو 'رَمْی' نہیں کہہ سکتے۔ 'رَمْی' صرف اُسی صورت میں ہو گی، جب پھینکنے میں بازو یا فلاخن کا زور استعمال ہو یا ہوا کے تند و تیز تھپیڑے اُس کے ساتھ ہوں۔'' (تدبرقرآن ۵۶۴/۹)

بعض اہل علم اِس کی توجیہ فعل کو نتیجۂ فعل کے معنی میں لے کر کرنا چاہتے ہیں، لیکن عربیت کے اداشناس جانتے ہیں کہ نتیجہ آگے بیان ہو گیا ہے اور یہاں موقع کلام تحقیر کا ہے، 'حِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ' کے الفاظ اِسی تحقیر پر دلالت کے لیے آئے ہیں، اِس لیے فعل نتیجۂ فعل کے لیے نہیں ہو سکتا۔

۷۔ اصل میں 'كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ' کے الفاظ آئے ہیں۔ کسی چیز کا نام اُس کے انجام کے لحاظ سے رکھنا عربی زبان کا ایک معروف اسلوب ہے۔ یہ اِسی نوعیت کی ترکیب ہے۔ مدعا یہ ہے کہ کھلے میدان میں مقابلے کی ہمت نہ پا کر تم پہاڑوں میں چھپے ہوئے اُنھیں کنکر پتھر مار رہے تھے۔ تمھاری یہ مدافعت ایک کم زور مدافعت تھی اور جو لشکر جرار حملہ آور ہوا تھا، اُس کے سامنے کوئی حقیقت

سورۃ قریش

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لِاِیۡلٰفِ قُرَیۡشٍ ﴿۱﴾ اٖلٰفِہِمۡ رِحۡلَۃَ الشِّتَآءِ وَالصَّیۡفِ ﴿۲﴾

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

قریش مانوس کیے گئے،[۸] وہ سردی اور گرمی کے سفروں سے مانوس کیے گئے۔[۹] سو (اور

نہیں رکھتی تھی۔ مگر تم نے حوصلہ کیا اور جو کچھ کر سکتے تھے کر ڈالا تو اللہ نے اپنی سنت کے مطابق تمھاری مدد کی۔ چنانچہ اُس کی فوجیں ساف وحاصب کا طوفان بن کر نمودار ہوئیں اور ایسی شان دکھائی کہ اِسی کم زور مدافعت کو لشکروں کی مدافعت میں تبدیل کر دیا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جانوروں کے کھانے کے بھوسے کی طرح ہو کر رہ گئے۔

۸۔ یہ نہیں بتایا کہ کس چیز سے مانوس کیے گئے، اِس کی وضاحت اگلے جملے میں کی ہے جس میں لفظ 'اٖلٰفِہِمۡ' پہلے 'اِیۡلٰف' سے بدل واقع ہوا ہے۔ یہ اسلوب کلام قرآن مجید میں بعض دوسرے مقامات میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...اِس کا پہلا فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ مخاطب بات کو سننے کے لیے بیدار ہو جاتا ہے اور دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اِس کی نوعیت اجمال کے بعد گویا تفصیل کی ہوتی ہے، اِس وجہ سے بات اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتی ہے۔'' (تدبر قرآن ۵۷۲/۹)

۹۔ اِس سے مراد وہ تجارتی سفر ہیں جو قریش کی رفاہیت اور خوش حالی کا ذریعہ بنے ہوئے تھے۔ گرمی کے زمانے میں یہ سفر شام و فلسطین کی طرف ہوتے تھے، اِس لیے کہ وہ ٹھنڈے علاقے ہیں اور سردی کے زمانے میں جنوبی عرب کی طرف ہوتے تھے، اِس لیے کہ وہ گرم علاقے ہیں۔ اہل مکہ کی تمام دولت و ثروت اِنھی سفروں کی مرہون منت تھی۔ تہذیب و ثقافت اور دانش و بینش

فَلۡیَعۡبُدُوۡا رَبَّ ہٰذَا الۡبَیۡتِ ﴿۳﴾ الَّذِیۡۤ اَطۡعَمَہُمۡ مِّنۡ جُوۡعٍ ۬ۙ

کچھ نہیں تو تنہا) اِسی کے باعث[10] اُنھیں چاہیے کہ اِس گھر کے مالک کی عبادت کریں[11]

میں جو برتری اُنھیں عرب کے دوسرے قبائل پر حاصل تھی، اُس میں بھی اِن سفروں کا بڑا دخل تھا۔ لیکن یہ سفر اُس زمانے میں آسان نہیں تھے۔ اِن میں قافلے علانیہ لٹ جاتے، راستے کے قبائل اپنے علاقوں سے اجازت کے بغیر گزرنے نہیں دیتے تھے اور اجازت کے لیے بھاری معاوضے طلب کرتے تھے۔ مگر قریش کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ تمام قبائل بیت اللہ کے متولی اور خدام ہونے کی حیثیت سے اُن کا احترام کرتے تھے۔ اپنے تمام سامان تجارت کے ساتھ وہ اُن کے علاقوں سے بغیر کسی خوف و خطر کے گزرتے اور کسی کا اُن سے تعرض کرنا تو در کنار، بارہا ایسا ہوتا کہ یہ قبائل اُنھیں بدرقہ فراہم کر دیتے تھے۔ قرآن نے اِن آیتوں میں خدا کی یہی عنایت اُنھیں یاد دلائی ہے کہ لوگوں میں جو مرجعیت تمھیں حاصل ہے اور جس سے اپنے اِن سفروں میں فائدے اٹھا رہے ہو، وہ اِسی گھر کی بدولت ہے جو پوری دنیا میں توحید کے مرکز کی حیثیت سے بنایا گیا تھا اور تمھارے کرتوتوں کے نتیجے میں اِسی توحید کے لیے اجنبی ہو کر رہ گیا ہے۔

[10] اِس جملے کی صحیح تالیف وہی ہے جسے زمخشری نے 'اِمَّا لَا فَلۡیَعۡبُدُوۡہُ لِاِیۡلٰفِہِمۡ' کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ترجمے میں اِسی کی رعایت ملحوظ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قریش کسی اور چیز کا خیال نہیں کر رہے تو کم سے کم اُس عزت و وقار اور اِس کے نتیجے میں حاصل ہونے والے دنیوی مفادات ہی کو دیکھیں جو اُنھیں حاصل ہیں۔ اِن میں سے کوئی چیز بھی اصلاً اُن کی ذہانت و فطانت، علم و قابلیت اور تدبیر و تدبر کی بنا پر حاصل نہیں ہوئی۔ یہ سب اُس گھر کی برکت سے ہے جس کے حقوق و فرائض اُنھوں نے یک سر فراموش کر رکھے ہیں۔ یہ تمام خداؤں سے اظہار براءت اور ایک خدا کی بندگی کے لیے تعمیر ہوا تھا۔ اِس سے ایک مشن وابستہ تھا جس کی دعوت اقصائے عالم تک پہنچانا مقصود تھا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اِسی بنا پر اِس کے خدام کے لیے رزق و امن کی دعا کی تھی اور کچھ نہیں تو وہ اِنھی چیزوں کا لحاظ کریں۔

وَّاٰمَنَهُمۡ مِّنۡ خَوۡفٍ ﴿۴﴾

جس نے (اِن بنجر پہاڑوں کی) بھوک میں اُنھیں کھلایا اور (اِن کے) خوف میں اُنھیں امن عطا فرمایا۔[۱۲] ۱-۴

۱۱؎ یعنی شرک کی ہر غلاظت سے پاک کر کے تنہا اُس کی عبادت کریں۔ خدا کا پیغمبر اُنھیں اِس عبادت کی دعوت دے رہا ہے۔ یہ اُن کے لیے کوئی اجنبی دعوت نہیں ہے۔ وہ اِس سے پوری طرح واقف ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے یہ گھر اِسی مقصد سے بنا کر اُن کے اجداد کو اِس کا متولی اور خادم مقرر کیا تھا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...یہ امر واضح رہے کہ شرک کی تمام آلودگیوں کے باوجود قریش اِس گھر کے خداوند سے ناآشنا نہیں ہوئے تھے۔ اپنے بتوں میں سے کسی کو بھی وہ اِس گھر کا خداوند نہیں سمجھتے تھے۔ عبدالمطلب نے جو دعا ابرہہ کے حملے کے موقعے پر جبل حرا پر کی... اُس کو پڑھیے۔ اُس میں اِس گھر کی حفاظت کے لیے جو استغاثہ اُنھوں نے کیا ہے، وہ تمام تر اِس گھر کے خداوند ہی سے کیا ہے۔ اُس میں کوئی ادنیٰ اشارہ بھی بتوں میں سے کسی کی طرف نہیں ہے۔* اِن بتوں کی حیثیت اُن کے نزدیک... اِس سے زیادہ کچھ نہیں تھی کہ اِن کو وہ خدا کے تقرب کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اپنا خالق و مالک اور بیت اللہ کا رب وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے۔ اُن کے اِس عقیدے میں کوئی فرق کبھی نہیں آیا۔" (تدبر قرآن ۹/۵۷۵)

۱۲؎ اصل میں 'مِنۡ جُوۡعٍ' اور 'مِنۡ خَوۡفٍ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'مِنۡ' بیان سبب کے لیے ہے۔

کوالالمپور

۱۵؍ مارچ ۲۰۱۰ء

---

* السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۱/۱۶۹۔

مرحلۂ ہجرت و براءت

الماعون - الاخلاص

۱۰۷ —— ۱۱۲

الماعون ۱۰۷ - الاخلاص ۱۱۲

قریش کے سرداروں کی فردِ قرارداد جرم، اُنھیں عذاب کی وعید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بشارت کہ حرم کی تولیت اب اُن کی جگہ آپ کو حاصل ہو گی اور آپ کے دشمنوں کی جڑ سرزمین عرب سے ہمیشہ کے لیے کٹ جائے گی ۱۰۷-۱۰۸

ام القریٰ کے ائمۂ کفر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلان براءت اور سرزمین عرب میں غلبۂ حق کی بشارت ۱۰۹-۱۱۰

قریش کی قیادت، خاص کر ابولہب کا نام لے کر اُس کی ہلاکت کی پیشین گوئی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے عقیدۂ توحید کا فیصلہ کن اعلان ۱۱۱-۱۱۲

الماعون - الکوثر

۱۰۷ــــــ۱۰۸
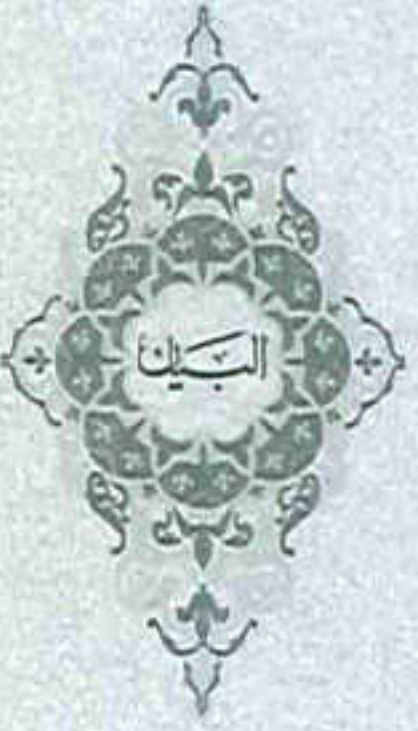
الماعون - الکوثر

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ قریش کے سرداروں، خاص کر ابولہب کی فرد قرارداد جرم بیان کرتی اور دوسری اِن جرائم کی پاداش میں حرم کی تولیت سے اُن کی معزولی کا اعلان کرتی ہے۔ دونوں کے مضمون سے واضح ہے کہ پہلی سورہ ام القریٰ مکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ ہجرت و براءت میں قریش کے لیے آخری تہدید کے طور پر اور دوسری آپ کے لیے ایک عظیم بشارت کی حیثیت سے نازل ہوئی ہے۔

پہلی سورہ ـــــ الماعون ـــــ میں روے سخن قریش کی طرف ہے اور اِس کا موضوع اُن کی قیادت، خاص کر ابولہب کو یہ بتانا ہے کہ اُن کے جرائم کی پاداش میں تباہی اُن کا مقدر ہو چکی ہے۔

دوسری سورہ ـــــ الکوثر ـــــ میں خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور اِس کا موضوع آپ کو یہ خوش خبری دینا ہے کہ حرم کی تولیت اب آپ کو حاصل ہوگی اور آپ کے دشمنوں کی جڑ ہمیشہ کے لیے دنیا سے کٹ جائے گی۔

سورة الماعون

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ ؕ﴿۱﴾ فَذٰلِکَ الَّذِیۡ یَدُعُّ الۡیَتِیۡمَ ۙ﴿۲﴾ وَ لَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ ؕ﴿۳﴾ فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ ۙ﴿۴﴾ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنۡ صَلَاتِہِمۡ سَاہُوۡنَ ۙ﴿۵﴾

الماعون
۱۰۷

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

تم نے دیکھا اُس شخص کو[۱] جو روز جزا کو جھٹلاتا ہے؟ یہ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھلانے کے لیے نہیں ابھارتا[۲]۔ ۱-۳

سو بربادی ہے (حرم کے پروہت) اِن نمازیوں[۳] کے لیے جو اپنی نمازوں کی

۱۔ یعنی ابولہب کو جس کی شخصیت اِس باب کے آخر میں بالکل نمایاں ہو کر سامنے آجائے گی۔

۲۔ روز جزا کو جھٹلانے کے نتیجے میں یہ ابولہب کا کردار بیان ہوا ہے، دراں حالیکہ اُس زمانے میں وہ بیت اللہ کے خاص اُس شعبے کا نگران تھا جو غربا اور یتامیٰ کی خدمت کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...جو شخص آخرت کا منکر ہوگا، اُس کے اندر اُس انفاق کا کوئی محرک سرے سے باقی رہ ہی نہیں جاتا جو خدا کی خوشنودی اور خالصتاً خدمت خلق اور ہم دردی غربا کے لیے ہو۔ ایسا شخص اگر کچھ خرچ کرتا ہے تو اپنی کسی ذاتی غرض یا ریا و نمایش کے لیے کرتا ہے۔ بے غرض فیاضی صرف اُسی شخص کے اندر پیدا ہوتی ہے جو آخرت کی جزا و سزا پر صدق دل سے ایمان رکھتا ہے۔" (تدبر قرآن ۹/ ۵۸۲)

۳۔ یہ لفظ اِس لیے استعمال کیا ہے کہ قریش بیت اللہ کے متولی تھے اور اپنی اِس حیثیت کے

الَّذِيۡنَ هُمۡ يُرَآءُوۡنَ ۙ‏ ﴿۶﴾ وَيَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ ﴿۷﴾

حقیقت سے غافل ہیں۔ یہ جو (عبادت کی) نمایش کرتے اور برتنے کی کوئی ادنیٰ چیز بھی کسی کو دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔[۴] ۶-۷

پیش نظر اپنی مذہبیت کا کچھ نہ کچھ بھرم قائم رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک مذہبی رسم کی حیثیت سے نمازیں بھی ادا کر لیتے تھے۔ ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کی قائم کردہ سنت کی جو کچھ باقیات رہ گئی تھیں، یہ نمازیں اُسی کے مطابق ادا کی جاتی تھیں۔

[۴] یہ وضاحت فرمائی ہے کہ کیوں نمازوں کی حقیقت سے غافل ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''نماز کی اصل حقیقت اخلاص ہے۔ یعنی وہ صرف اللہ وحدہ لاشریک کی خوشنودی اور رضا طلبی کے لیے پڑھی جائے۔ اِس کے سوا اگر کوئی اور غرض اُس میں شامل ہو جائے تو نماز بالکل باطل اور اپنے اصل مقصد کے اعتبار سے نہ صرف بے نتیجہ، بلکہ نہایت مہلک ہوتی ہے۔ اِن لوگوں کی نمازیں اول تو اِن کے فسادِ عقیدہ کے سبب سے اخلاص سے محروم تھیں۔ ثانیاً، وہ پڑھتے بھی... محض دکھاوے ہی کے لیے تھے تاکہ اُن کے عوام اُن کو مذہبی سمجھیں۔ اِس طرح کی نماز، ظاہر ہے کہ محض ایکٹنگ ہوتی ہے جس کا زندگی کے حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہوا کرتا۔ جس طرح کسی ڈرامے میں مجنوں کا پارٹ ادا کر دینے سے کوئی مجنوں نہیں بن جاتا، اُسی طرح اِس قسم کے لوگ مسجد میں آجانے اور رکوع و سجود اور قیام و قعود کی نمایش کر دینے سے نمازی نہیں بن جاتے۔

علاوہ ازیں اِن لوگوں کی خست بھی اِس بات کی دلیل تھی کہ اِن کی نمازیں بالکل بے روح و بے جان ہیں۔ نماز کی اصل روح اپنے رب کی شکرگزاری ہے۔ جو بندہ اپنے رب کا شکرگزار ہوتا ہے، وہ خسیس و لئیم نہیں ہوتا، بلکہ فیاض و کریم ہوتا ہے۔ وہ اپنے رب کی نعمتوں میں دوسروں کو شریک کرتا اور اِس کو اُن کا حق سمجھتا ہے۔ اُس کا ذہن یہ ہوتا ہے کہ جب میرے رب نے مجھے بخشا ہے تو اُس کی شکرگزاری کا تقاضا یہ ہے کہ میں اُس میں اُن لوگوں کو شریک کروں جو اُس سے محروم ہیں۔ اور یہ جذبہ اُس پر اِس قدر غالب ہوتا ہے کہ بسا اوقات وہ اپنی ضرورت

سورۃ الکوثر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ ۙ﴿۱﴾ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانۡحَرۡ ؕ﴿۲﴾ اِنَّ

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

ہم نے یہ خیر کثیر تمھیں عطا کر دیا ہے[5] (اے پیغمبر)، اِس لیے تم (اِس بیت عتیق میں اب) اپنے پروردگار کی نماز پڑھنا اور اُسی کے لیے قربانی کرنا[6]۔ اِس میں شبہ نہیں

کو نظر انداز کر کے دوسروں کی مدد کرنے میں لذت وحلاوت محسوس کرتا ہے۔''

(تدبر قرآن ۹/ ۵۸۴)

۵۔ اصل میں لفظ 'اَلْکَوْثَر' آیا ہے۔ 'فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ' کے جملے میں آگے اِس کا حق بیان ہوا ہے۔ اُس سے واضح ہے کہ اِس سے بیت الحرام مراد ہے، اِس لیے کہ یہ دونوں عبادات پوری شان کے ساتھ اِسی میں جمع ہوتی ہیں۔ بصیرت کی نگاہ سے دیکھیے تو یہی معبد ہے جو ہر صاحب ایمان کے لیے خیر کثیر کا خزانہ اور دنیا میں اُس کوثر کا مجاز ہے جس کی حقیقت قیامت کے دن ایک نہر کی صورت میں سامنے آئے گی۔ یہ کوثر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو عطا کیا جائے گا۔ اِس کا ذکر متعدد روایتوں میں ہوا ہے۔ امام حمید الدین فراہی لکھتے ہیں:

''معراج میں جو نہر کوثر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مشاہدہ کرائی گئی تھی، اُس کی صفات پر جو شخص بھی غور کرے گا، اُس پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ نہر کوثر درحقیقت کعبہ اور اُس کے ماحول کی روحانی مثال ہے۔ اِس کے متعلق مختلف طریقوں سے جو روایات مروی ہیں، اُن کی مشترک حقیقت یہ ہے کہ کوثر ایک نہر ہے۔ اُس کے کناروں پر مجوف موتیوں کے محل ہیں۔ اُس کی زمین یاقوت و مرجان اور زبرجد کی ہے۔ اُس میں ظروف ہیں جو آسمان کے ستاروں

شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ﴿۳﴾

کہ تمھارا دشمن ہی جڑ کٹا ہے، اُس کا کوئی نام لیوا نہ رہے گا۔۱-۳

کے مانند ہیں۔ اُس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید، شہد سے زیادہ شیریں اور برف سے زیادہ ٹھنڈا ہے۔ اُس کی مٹی مشک سے زیادہ خوشبودار ہے۔ اُس پر چڑیاں اترتی ہیں جن کی گردنیں قربانی کے جانوروں کی طرح ہیں۔*

...اب ایک لمحہ توقف کر کے کعبہ اور اُس کے ماحول کے مشاہدات پر غور کرو، جب تمام اکناف عالم سے جاں نثاران توحید کے قافلے عشق و محبت الٰہی کی پیاس بجھانے کے لیے اِس چشمۂ خیر و برکت کے پاس اکٹھے ہوتے ہیں۔ کیا اُن کے احساس روحانی میں اِس مقدس وادی کے سنگ ریزے یاقوت و زمرد سے زیادہ پر جمال، اِس کی مٹی مشک سے زیادہ خوشبودار اور اِس کے اردگرد حجاج کے خیمے مجوف موتیوں کے قبوں سے زیادہ حسین و خوب صورت نہیں ہیں؟ پھر حجاج اور اُن کے ساتھ قربانی کے اونٹوں کی قطاروں پر ایک نظر ڈالو۔ کیا یہ ایک چشمے کے کنارے لمبی گردن والی چڑیوں کا جھنڈ نہیں ہے؟'' (نظام القرآن ۴۹۵)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت جن مقاصد کے لیے ہوئی، اُن میں سے ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ بیت اللہ کو شرک کی ہر غلاظت سے پاک کر کے ایک مرتبہ پھر دنیا والوں کے لیے اُسی توحید کا مرکز بنا دیا جائے جس کے لیے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے مقدس ہاتھوں نے اُسے تعمیر کیا تھا۔ قرآن نے جب یہ اعلان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خیر کثیر کا یہ خزانہ آپ کو عطا کر دیا ہے تو اِس کے معنی یہ تھے کہ قریش معزول ہوئے۔ حرم کی بدولت سرزمین عرب میں جو اقتدار اُنھیں حاصل رہا ہے، وہ اُن سے چھین لیا جائے گا اور خدا کے اِس گھر کی تولیت اُن سے لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ماننے والوں کو سونپ دی جائے گی۔ اِس لحاظ سے دیکھیے تو یہ ایک عظیم بشارت تھی جو اپنی قوم سے ہجرت و براءت کے موقع پر آپ کو دی گئی، جبکہ دور دور تک اِس کے کوئی آثار نظر نہیں

* بخاری، رقم ۴۵۸۳، ۶۰۹۵۔ ترمذی، رقم ۲۴۶۵۔ ابن ماجہ، رقم ۴۳۲۵۔ احمد، رقم ۵۶۴۳۔ المعجم الکبیر، رقم ۲۹۶۰۔

آتے تھے کہ یہ کبھی واقعہ بن سکے گی۔

۶۔ یہ اُس عطیۂ خداوندی کا حق بیان ہوا ہے جسے کوثر سے تعبیر کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قریش نے تو اِن دونوں عبادات میں اپنے شرکا و اصنام کو بھی شریک کر رکھا ہے، لیکن اِس گھر کی تولیت تمھیں حاصل ہو جائے تو شرک و بدعت کی ہر آلودگی سے پاک ہو کر تم اِس میں اپنے پروردگار کی نماز پڑھنا اور اُسی کے لیے قربانی کرنا۔

۷۔ یہ ایک عظیم پیشین گوئی ہے جو حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ مدعا یہ ہے کہ تمھارے دشمن تو اِس وقت تمھارے بارے میں کہہ رہے ہیں کہ اِس شخص نے ایک نیا دین ایجاد کر لیا ہے، اِس کے نتیجے میں یہ اپنی قوم اور اپنے دینی مرکز بیت اللہ الحرام سے کٹ چکا ہے، یہ اب اجنبیوں میں جا کر رہے گا تو اِس کی مثال ایک شاخ بریدہ کی ہو گی جو درخت سے جدا ہو چکی ہے اور جس کا سوکھ جانا لازمی ہے۔ لیکن اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ دنیا اور آخرت، دونوں میں تمھیں شان دار فیروزمندیاں عطا فرمائے گا اور تمھارے دشمنوں کی جڑ اِس سرزمین سے ہمیشہ کے لیے کاٹ دے گا۔ تم دیکھو گے کہ اِن کا یہاں کوئی نام لیوا نہ ہو گا۔

کوالالمپور

۱۵/ مارچ ۲۰۱۰ء

الكٰفرون - النصر

١٠٩ ــــ ١١٠

الکٰفرون - النصر

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ قریش سے علیحدگی کا اعلان اور دوسری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے فتح ونصرت کی بشارت ہے۔ دونوں کے مضمون سے واضح ہے کہ ام القریٰ مکہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ ہجرت وبراءت کے خاتمے پر نازل ہوئی ہیں۔

پہلی سورہ ــــ الکٰفرون ــــ میں روے سخن قریش کی طرف ہے اور اِس کا موضوع اُن کے ائمۂ کفر سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلان براءت ہے جو سنت الٰہی کے مطابق رسول اور اُس کے ساتھیوں کے لیے لازماً غلبۂ حق کی تمہید بن جاتا ہے۔

دوسری سورہ ــــ النصر ــــ کے مخاطب نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اِس کا موضوع آپ کے لیے غلبۂ حق کی بشارت اور اِس کے نتیجے میں اپنے پروردگار سے ملاقات کے لیے تیاری کی ہدایت ہے۔

سورۃ الکٰفرون

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قُلۡ یٰۤاَیُّہَا الۡکٰفِرُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ لَاۤ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ۙ﴿۲﴾ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ

—— ۱ ——

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

تم اعلان کرو، (اے پیغمبر) کہ اے کافرو[۱]، میں اُن کی عبادت نہیں کروں گا جن کی

۱ یہ خطاب قریش کے ائمۂ کفر سے ہے۔ آگے کے مضمون سے واضح ہے کہ 'اے کافرو'، کے صاف صاف الفاظ میں یہ خطاب اُس موقع پر ہوا ہے، جب اُن سے حتمی طور پر قطع تعلق اور براءت کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...یہ اعلان براءت رسولوں کی اُس سنت کے مطابق ہوا ہے جس کی وضاحت پچھلی سورتوں میں ہو چکی ہے کہ اللہ کے رسول اپنی قوم کو پہلے دین کی بنیادی باتوں —— توحید اور قیامت —— کی دعوت دیتے ہیں۔ اِس دعوت میں وہ قوم کو 'اپنی قوم' ہی کی حیثیت سے خطاب کرتے ہیں اور اِس پر اُس وقت تک پوری استقامت سے جمے رہتے ہیں، جب تک قوم کے اعیان و اکابر اپنے رویے سے اُن کو مایوس نہیں کر دیتے۔ جب وہ مایوس کر دیتے ہیں اور بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ہٹ دھرم اپنی ضد سے باز آنے والے نہیں ہیں، تب اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول کو ہجرت کا حکم ہوتا ہے اور وہ قوم سے اعلان براءت کر کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہجرت کر جاتا ہے۔ رسول کی ہجرت قوم کے لیے گویا آخری تنبیہ ہوتی ہے۔ اِس کے بعد اگر اُس کے رویے میں کوئی اچھی تبدیلی نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ ایک محدود مہلت دینے کے بعد قوم کے تمام مکذبین کو تباہ کر دیتا ہے، خواہ یہ تباہی رسول کی زندگی ہی میں واقع ہو یا اُس کے بعد اور خواہ اِس کے لیے اللہ تعالیٰ کوئی قہر آسمانی نازل کرے یا رسول کے ساتھیوں کی تلوار اِس کے لیے بے نیام ہو۔'' (تدبر قرآن ۹/۶۰۱)

عْبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۚ﴿۳﴾ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۙ﴿۴﴾ وَلَآ اَنْتُمْ

عبادت تم کرتے ہو[۲]، اور نہ تم کبھی (تنہا) اُس کی عبادت کرو گے جس کی عبادت میں کرتا ہوں[۳]۔ اور نہ (اِس سے پہلے) میں کبھی اُن چیزوں کی عبادت کے لیے تیار ہوا ہوں

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ ائمۂ قریش کی یہ تکفیر خدا کی طرف سے ہے اور اِس بنا پر کی گئی ہے کہ مخاطبین نے اتمام حجت کے درجے تک دعوت وتبلیغ اور تذکیر و تلقین کے بعد بھی رسول کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ چنانچہ معلوم ہے کہ آگے جس مایوسی کا اظہار کیا گیا ہے، وہ بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ اِن مکذبین میں سے کوئی بھی ایمان لانے والا نہیں بنا، بلکہ سب اپنے غرور اور انانیت کا شکار ہو کر عذاب الٰہی سے دوچار ہو گئے۔ رسولوں کے بعد کوئی فرد یا جماعت بھی اِس طرح اتمام حجت نہیں کر سکتی اور نہ اُسے خدا کی طرف سے اعلان تکفیر کا اذن حاصل ہو سکتا ہے۔ اِس وجہ سے اب کوئی شخص کسی دوسرے کی تکفیر نہیں کر سکتا، الّا یہ کہ وہ خود اپنے کفر کا اعلان کرے۔ حق کے داعی زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتے ہیں، وہ یہی ہے کہ زندگی کے آخری مرحلے تک کفر وشرک کی حقیقت لوگوں پر واضح کرتے رہیں اور اُن کے اُن افعال میں شرکت سے اجتناب کریں جو شرک و بدعت کی نوعیت کے ہوں۔

۲ اصل الفاظ ہیں: 'لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ'۔ اِن میں مضارع پر 'لَآ' ہے۔ یہ دلیل ہے کہ یہ ایک قطعی فیصلہ ہے جس سے مستقبل میں شرک و توحید کے مابین سمجھوتے کی ہر توقع بالکل ختم کر دی گئی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ مجھ سے یہ امید اب کسی کو نہیں رکھنی چاہیے کہ اپنے پروردگار کی عبادت کے معاملے میں میں تمھارے ساتھ کوئی سمجھوتا کروں گا۔ اِس طرح کی خواہش اگر کسی کے دل میں ہے تو وہ اُسے ہمیشہ کے لیے ختم کر لے۔ شرک و توحید کے مابین ہرگز کوئی مصالحت نہیں ہو سکتی۔ میں اِس باب میں کوئی لچک قبول کرنے والا نہیں ہوں۔ لٰہذا تمھارے تمام معبودوں سے اظہار براءت کرتا ہوں۔

عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ﴿۵﴾

جن کی عبادت تم نے کی ہے،[۴] اور نہ تم کبھی (تنہا) اُس کی عبادت کے لیے تیار ہوئے، جس کی عبادت میں کرتا رہا ہوں۔[۵] ۱-۵

۳۔ اللہ تعالیٰ کے لیے 'مَآ اَعْبُدُ' کے الفاظ مجانست کے اسلوب پر آئے ہیں 'لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ' کے بعد یہ جملہ بتا رہا ہے کہ مخاطبین کی طرف سے بھی یہ توقع ختم ہوگئی ہے کہ وہ خدا کو اُس طرح پوجنے کے لیے تیار ہو جائیں گے، جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم شرک کی ہر آلایش سے پاک ہو کر خالص اُسی کو پوج رہے تھے۔ اُن کے رویے سے صاف واضح تھا کہ وہ اپنے دیوی دیوتاؤں سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اِس کے معنی یہ تھے کہ وہ خدا کے پرستار نہیں بن سکتے، اِس لیے کہ خدا اپنی بندگی میں کبھی کوئی شراکت قبول نہیں کرتا۔

۴۔ اوپر کی بات مستقبل سے متعلق تھی۔ یہ اُس پر ماضی و حال کی شہادت پیش کی ہے۔ 'لَآ اَنَا عَابِدٌ' جملہ اسمیہ ہے۔ اِس میں نفی ماضی سے متعلق ہے۔ 'مَا عَبَدْتُّمْ' کے الفاظ اِس کا واضح قرینہ ہیں۔ اِس سے، اگر غور کیجیے تو اعلان براءت کی شدت میں بڑا اضافہ ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب میں نبوت کی روشنی حاصل ہو جانے سے پہلے کبھی تمھارے معبودوں کو خاطر میں نہیں لایا تو اب جب کہ میرا پروردگار براہ راست مجھ سے ہم کلام ہے اور اُس کی کتاب مجھ پر نازل ہو رہی ہے تو میں تمھاری اِس ضلالت میں کس طرح مبتلا ہو سکتا ہوں؟ میری دعوت تمھارے سامنے ہے۔ نبوت کے بعد بھی برسوں سے تم مجھے دیکھ رہے ہو۔ تمھیں معلوم ہے کہ میں شرک کی غلاظت کے قریب بھی جانے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوا۔ پھر کس طرح توقع کرتے ہو کہ آگے کبھی اِس کے لیے تیار ہو جاؤں گا؟

۵۔ پچھلے جملے نے اِس جملے کو بھی ماضی سے متعلق کر دیا ہے۔ چنانچہ 'مَآ اَعْبُدُ' سے پہلے یہاں ایک فعل ناقص حذف ماننا چاہیے۔ یہ استمرار پر دلالت کرے گا اور آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ میں

لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ﴿٦﴾

سورة النصر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ﴿١﴾ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ

(اِس لیے اب) تمھارے لیے تمھارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین[٦]۔ ٦

—— ٢ ——

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

جب[٧] اللہ کی مدد اور فتح آ جائے[٨] اور تم لوگوں کو دیکھ لو کہ فوج در فوج اللہ کے دین میں

جس خدا کی بندگی ہمیشہ سے کرتا رہا ہوں اور اب بھی اُس پر قائم ہوں، تم ماضی میں بھی کبھی اُس کے پوجنے والے نہیں بنے۔ شرک کے ساتھ اگر تم نے اُس کی پرستش کی بھی ہے تو درحقیقت نہیں کی، اِس لیے کہ شرک کے ساتھ میرے معبود کی پرستش کا کوئی امکان نہیں ہے۔

٦؎ یہ رواداری کا کوئی پیغام نہیں ہے، بلکہ منکرین سے انتہائی بے زاری اور ابدی مفارقت کا اعلان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں تم سے بری اور تم مجھ سے بری۔ میرے اور تمھارے درمیان اب کسی سمجھوتے یا مصالحت کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ تم اپنی بات پر قائم ہو تو میں بھی پوری استقامت کے ساتھ اپنی بات پر قائم ہوں۔ شرک اور توحید میں نہ پہلے کبھی پیوند لگا ہے، نہ اب لگ سکتا ہے، اِس لیے انتظار کرو، میں بھی انتظار کرتا ہوں۔ ہم میں سے کون حق پر ہے، اِس کا فیصلہ عنقریب آسمان سے صادر ہو جائے گا۔

٧؎ پچھلی سورہ میں قریش کے ائمۂ کفر سے اظہار براءت ہے۔ یہ سورہ سراسر بشارت ہے اور اُس کی توام سورہ کے طور پر اُس کے ساتھ ہی رکھ دی گئی ہے تا کہ وہ رشتہ پوری طرح واضح ہو جائے

فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ

داخل ہورہے ہیں[9] تو اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرو[10] اور اُس سے معافی

جو رسولوں کی دعوت میں ہجرت و براءت اور فتح و نصرت کے درمیان ہوتا ہے۔ یہ بشارت جس شان کے ساتھ واقعہ بنی، اُس کی تفصیلات تاریخ کے صفحات میں ثبت ہیں۔ یہ کسی انسان کے الفاظ نہیں تھے کہ ابدی حسرتوں کے ساتھ فضا میں تحلیل ہو جاتے۔ یہ خدا کے الفاظ تھے جو اُس کے پیغمبر کی زبان پر جاری ہوئے۔ جب یہ کہے گئے، اُس وقت اِن سے زیادہ ناممکن الوقوع اور ناقابل یقین کوئی چیز نہیں تھی، لیکن تھوڑے ہی دنوں میں تاریخ بن گئے، ایک ایسی تاریخ جس کی کوئی مثال دنیا کی تاریخ سے پیش نہیں کی جا سکتی۔

8۔ یہ وہی مدد اور فتح ہے جس کا اللہ نے اپنے پیغمبر سے وعدہ کیا تھا اور مسلمان دعوت حق کے سخت سے سخت مراحل میں بھی جس کے منتظر اور متوقع رہے تھے۔ سورۂ صف (۶۱) کی آیت ۱۳ میں قرآن نے اِسی کے بارے میں فرمایا ہے کہ 'وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا، نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ' (اور وہ دوسری چیز بھی جو تم چاہتے ہو، یعنی اللہ کی مدد اور فتح جو عنقریب حاصل ہو جائے گی)۔ اِس سے، ظاہر ہے کہ فتح مکہ کے سوا کوئی اور فتح مراد نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ جس مدد کا یہاں ذکر ہوا ہے، وہ بھی اُسی کے لیے حاصل ہونے والی مدد ہے جس کا آخری ظہور اُس وقت ہوا، جب دس ہزار قدوسیوں کے سامنے اہل مکہ نے بغیر کسی مزاحمت کے سر تسلیم خم کر دیا۔ سنت الٰہی کے مطابق یہ فتح و نصرت خدا کے رسولوں کو اتمام حجت اور اپنی قوم سے ہجرت و براءت کے بعد لازماً حاصل ہو جاتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں یہی فتح و نصرت تھی جس کی طرف مخاطبین کے ذہن اُس کا نام لیے بغیر منتقل ہو سکتے تھے۔ قرآن نے اِسی بنا پر اِس اجمال کے ساتھ اور محض ایک الف لام سے اُس کا ذکر کر دیا ہے۔

9۔ یہ اُس بشارت کا سب سے نمایاں پہلو ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ اِس کے معنی یہ تھے کہ

كَانَ تَوَّابًا ﴿٣﴾

چاہو۔ بے شک، وہ بڑا معاف فرمانے والا ہے۔[11] ۱-۳

اللہ تعالیٰ آپ کی قوم کو ایمان و اسلام کی نعمت سے نوازے گا۔ وہ عاد و ثمود کی طرح مٹا نہیں دیے جائیں گے، بلکہ اللہ کی عنایت سے ایمان کی توفیق پائیں گے اور استبداد کے بند ٹوٹتے ہی رکے ہوئے سیلاب کی طرح آپ کی دعوت پر لبیک کہنے کے لیے ٹوٹ پڑیں گے۔ یہ اِس بات کی تائید مزید ہے کہ جس فتح کا ذکر ہوا ہے، اُس سے مراد فتح مکہ ہی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''یہی فتح ہے جس نے ملک کے حالات میں وہ تبدیلی پیدا کی کہ لوگ اپنے دین کے انتخاب کے معاملے میں بالکل آزاد ہو گئے اور سرزمین عرب سے اُس فتنے کا بالکلیہ خاتمہ ہو گیا جس کے بل پر قریش کے لیڈر لوگوں کے دین وایمان کے مالک بنے بیٹھے تھے۔ اِس بشارت کے پردے میں گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتا دیا گیا کہ اب جلد وہ وقت آنے والا ہے کہ لوگ قریش کے ظلم واستبداد سے بالکل آزاد ہو کر اللہ کے دین کی طرف دوڑیں گے اور کسی کی مجال نہ ہو گی کہ اُن کی راہ میں کوئی مزاحمت پیدا کر سکے۔ یہ چیز اِس بات کی نہایت محکم دلیل ہے کہ اِس سے مراد فتح مکہ ہی ہے۔ اِس کے سوا کوئی اور فتح نہیں ہے جس سے یہ اثرات نمایاں ہوئے ہوں۔'' (تدبر قرآن ۹/۶۲۲)

۱۰ یعنی توحید کے صحیح تصور کے ساتھ اُس کو یاد کرو، اِس لیے کہ حقیقی توحید تنزیہہ اور اثبات، دونوں کے امتزاج سے وجود میں آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ ماننا بھی ضروری ہے کہ وہ اُن باتوں سے پاک ہے جو اُس کی شان الوہیت کے منافی ہیں اور یہ بھی کہ وہ اُن تمام اوصاف سے متصف ہے جو اُس کے شایان شان ہیں۔

۱۱ یہ وہی ہدایت ہے جو اِس سے پہلے سورۂ الم نشرح میں بیان ہوئی ہے، یعنی 'فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ، وَاِلٰی رَبِّكَ فَارْغَبْ'*۔ مطلب یہ ہے کہ جب یہ چیزیں ظہور میں آجائیں تو یہ اِس

---

*۹۴: ۷-۸۔ ''اِس لیے جب فارغ ہو جاؤ تو (عبادت کے لیے) کمر باندھ لو اور اپنے رب سے لو لگائے رکھو۔''

النصر ۱۱۰

بات کی علامت ہوگی کہ آپ کا مشن پورا ہو گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو عظیم ذمہ داری آپ پر ڈالی تھی، آپ نہایت باعزت طریقے سے اُس سے سبک دوش ہو گئے ہیں، اِس لیے اب اپنے پروردگار سے ملاقات کی تیاری کیجیے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ اپنے مشن سے فراغت کے بعد پورے انہماک کے ساتھ اللہ کی عبادت میں لگ جاؤ، ہر لحظہ اُس کی پاکی بیان کرو، اُس کی صفات کو مستحضر رکھو اور دعوت کے کام میں اگر کہیں حد مطلوب سے تجاوز ہوا ہے تو اپنے پروردگار سے معافی چاہو۔ اپنے بندوں پر وہ بڑا مہربان اور اُن کی لغزشوں سے درگذر فرمانے والا ہے۔

کوالالمپور

۱۶/ مارچ ۲۰۱۰ء

اللهب - الاخلاص

١١١ ـــــ ١١٢

اللھب - الاخلاص

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ قریش کے ائمۂ کفر کی ہلاکت اور دوسری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اُس عقیدے کا فیصلہ کن اعلان ہے جس کے منکرین کے لیے ہلاکت کی یہ پیشین گوئی کی گئی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے نتیجے میں شرک و توحید کی جو کشمکش سرزمین عرب میں برپا ہوئی، اُس کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ شرک مٹا دیا جائے اور توحید کا غلبہ پورے جزیرہ نمائے عرب میں قائم ہو جائے۔ یہ دونوں سورتیں اِسی نتیجے کو پوری قطعیت کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ اِس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہجرت و براءت اور فتح و نصرت کی بشارت کا جو مضمون 'الماعون' اور 'الکوثر' سے شروع ہوا تھا، وہ اِن سورتوں میں اپنے اتمام کو پہنچ گیا ہے۔ اِس کے ساتھ، اگر غور کیجیے تو قرآن کی دعوت بھی اتمام کو پہنچ گئی ہے اور سورۂ اخلاص میں، جو مضمون کے لحاظ سے قرآن کی آخری سورہ ہے، اُس کی دعوت کے بنیادی پتھر ــــــ توحید ــــــ کو اُس کے اصلی مقام میں نصب کرنے کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ یہ اعلان دوسرے مقامات میں بھی ہے، لیکن اِس کے لیے یہ مختصر اور جامع سورہ اِس لیے نازل کی گئی کہ مخالفین اِس کو شب و روز سنیں اور ماننے والے بھی یاد کر کے تعویذ کی طرح حرز جاں بنا لیں۔

دونوں سورتوں میں روے سخن قریش کی طرف ہے اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ ام القریٰ مکہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ ہجرت و براءت کے خاتمے پر نازل ہوئی ہیں۔

پہلی سورہ ـــــ اللھب ـــــ کا موضوع قریش کے ائمۂ کفر، خاص کر ابولہب کی ہلاکت کا اعلان ہے۔

دوسری سورہ ـــــ الاخلاص ـــــ کا موضوع اُس عقیدۂ توحید کا فیصلہ کن اعلان ہے جو قرآن کی دعوت کا مرکز و محور ہے۔

سورة اللهب

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَہَبٍ وَّ تَبَّ ؕ﴿۱﴾ مَاۤ اَغۡنٰی عَنۡہُ مَالُہٗ وَ مَا

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

ابولہب[۱] کے ہاتھ ٹوٹ گئے[۲] اور وہ خود بھی ہلاک ہوا[۳]۔ نہ اُس کا مال اُس کے کام آیا

۱ اِس کا اصل نام عبدالعزیٰ تھا۔ سرخ وسپید اور شعلہ رو ہونے کی وجہ سے کنیت ابولہب مشہور ہو گئی تھی۔ اِس کا انجام بیان کرتے ہوئے آگے دوزخ کے لیے 'ذَاتَ لَہَبٍ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ اِسی رعایت سے استعمال ہوئے ہیں۔ قریش کے ائمۂ کفر میں سب سے زیادہ شقی یہی تھا۔ اِس کی مخالفت سراسر اِس کے ذاتی مفادات پر مبنی تھی۔ اِس میں نہ اِس نے کبھی رشتہ وتعلق کی پروا کی، نہ قبائلی روایات کا پاس کیا اور نہ شریفانہ اخلاق کے اصول ملحوظ رکھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں یہ سب کا سرخیل تھا اور لوگ زیادہ تر اِسی کے اقدامات کی پیروی کرتے تھے۔ پھر قریش کی مذہبی حکومت میں بھی اُس زمانے میں اِس کو ایسا مقام حاصل ہو گیا تھا کہ استاذ امام کے الفاظ میں، یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ پوری حکومت عملاً اِس کے انگوٹھے کے نیچے آ گئی تھی۔ پچھلی سورتوں میں زیادہ تر اِسی کا کردار زیر بحث رہا ہے، اِس لیے یہی مستحق تھا کہ قریش کے ائمۂ کفر کی ہلاکت کی پیشین گوئی اِسی کا نام لے کر کی جائے۔

۲ یعنی اُس کے اعوان وانصار ہلاک ہوئے اور اُس کا اقتدار ختم ہو گیا۔ اِس مفہوم کے لیے یہ تعبیر اردو زبان میں بھی موجود ہے۔ آیت میں ماضی کا صیغہ مستقبل میں اِس پیشین گوئی کے پورا ہو جانے کی قطعیت پر دلالت کرتا ہے۔ گویا اُس کا ہونا ایسا یقینی ہے، جیسے وہ ہو چکی ہے۔ چنانچہ اس

كَسَبَ ۝٢ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝٣ وَّامْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ

اور نہ وہ خیر جو اُس نے کمایا۔[۴] یہ (شعلہ رو) اب شعلہ زن آگ میں پڑے گا[۵]

کے کم وبیش دو سال بعد غزوۂ بدر کے موقع پر یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوگئی اور ابوسفیان کے سوا قریش کے تمام بڑے بڑے سردار اُس غزوے میں ہلاک ہوگئے۔

۳۔ ابولہب معرکۂ بدر میں شریک نہیں ہوا۔ اپنی جگہ اُس نے اپنے ایک مقروض کو اِس وعدے کے ساتھ بھیج دیا تھا کہ اِس کے عوض وہ اُس کا قرض معاف کر دے گا، لیکن خدا کے عذاب سے بچنے کی یہ تدبیر بھی کارگر نہیں ہوئی اور غزوۂ بدر کے صرف سات دن بعد قرآن کی پیشین گوئی پوری ہوگئی۔ اُس کی موت نہایت عبرت ناک تھی۔ اُسے عدسہ (malignant pustule) کی بیماری ہوگئی اور وہ اِس رسوائی اور بے بسی کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوا کہ چھوت کے اندیشے سے اُس کے خاندان والوں، دوست احباب، یہاں تک کہ اُس کے بیٹوں نے بھی اُس کی خبر گیری نہیں کی۔ مرنے کے بعد کئی دن تک اُس کی لاش گھر میں پڑی سڑتی رہی۔ بالآخر لوگوں نے طعنے دیے تو اُس کے بیٹوں نے کچھ حبشیوں کو اجرت دے کر اُس کی لاش اٹھوائی اور ایک دیوار کے ساتھ رکھ کر اُسے پتھروں سے ڈھانک دیا۔* آیت میں 'تَبَّ' کا لفظ اُس کے اِسی انجام کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

۴۔ اِس سے وہ کام مراد ہیں جو بظاہر نیکی کے سمجھے جاتے ہیں اور بیت اللہ کے شعبۂ مالیات کا ذمہ دار ہونے کی وجہ سے لوگوں کو دکھانے اور اپنی خیانتوں پر پردہ ڈالنے کے لیے ابولہب کو بھی کرنے پڑتے تھے۔

۵۔ آیت میں 'ذَاتَ لَهَبٍ' کے الفاظ ہیں۔ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ یہ اُس کی کنیت کی رعایت سے آئے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...قرآن نے یہاں اُس کا یہ انجام بیان کر کے یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ اِس دنیا میں

* السیرۃ النبویہ، ابن کثیر ۲/۴۷۹۔

الْحَطَبِ ۚ ﴿٤﴾ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ﴿٥﴾

سورة الاخلاص

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ ﴿١﴾ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ ﴿٢﴾ لَمْ يَلِدْ ۙ ﴿٣﴾ وَلَمْ

الاخلاص
١١٢

اور اِس کے ساتھ اِس کی بیوی بھی[6]۔ وہ دوزخ میں اپنے لیے ایندھن ڈھو رہی ہو گی[7]۔ اُس کے گلے میں موٹی بٹی ہوئی رسی ہو گی[8]۔ ۱-۵

—— ۲ ——

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

تم اعلان کرو[9]، (اے پیغمبر)، حقیقت یہ ہے کہ اللہ یکتا ہے[10]۔ اللہ سب کا سہارا ہے[11]۔

اُس کو اپنی جس شعلہ روئی پر ناز رہا، آخرت میں یہ اُس کے لیے وبال بنے گی۔ وہ شعلوں والی آگ میں جھونکا جائے گا، جس سے یہ سبق ملتا ہے کہ ظاہر کا حسن کوئی فخر کی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ آدمی کے لیے وبال بن سکتا ہے، اگر اِس کے ساتھ باطن کا حسن نہ ہو۔''

(تدبر قرآن ۹/۶۳۶)

۶ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ عرب کی یہ خاتون اول بھی اپنے شوہر کی طرح دولت کی حریص، نمایش کی رسیا اور شوہر کے جرائم میں پوری طرح شریک، بلکہ اُن کے لیے سب سے بڑا محرک بنی ہوئی تھی۔

۷ اصل الفاظ ہیں: 'حَمَّالَةَ الْحَطَبِ'۔ تالیف کے لحاظ سے یہ حال واقع ہوئے ہیں۔ اِن میں اُس کی وہ حالت مذکور ہوئی ہے، جب شوہر کے ساتھ اُسے دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ گویا اُس وقت اُس کا حال اُس مجرم کا سا ہو گا جو اپنے جلانے کا ایندھن خود ہی ڈھو کر لا رہا ہو۔

۸۔ یہ ایندھن ڈھونے والی لونڈیوں کی تصویر ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ جزا و سزا میں عمل اور نتیجۂ عمل کی موافقت ملحوظ رکھی جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں وہ اپنے گلے میں جو قیمتی ہار پہن کر اتراتی تھی، وہی وہاں بٹی ہوئی موٹی رسی کی صورت اختیار کر لے گا جس سے اُس کی مثال اُس لونڈی کی ہو جائے گی جو گلے میں رسی ڈال کر لکڑیاں چننے جا رہی ہو۔

۹۔ اصل میں لفظ 'قُلْ' ہے۔ یہ اُسی مفہوم میں ہے جس میں پیچھے 'قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ'* میں آیا ہے، یعنی برملا کہہ دو اور اِس طریقے سے منادی کر دو کہ کسی کو کوئی شبہ باقی نہ رہے، ہر شخص اِس کو اچھی طرح سن لے اور جان لے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"اِس طرح کے اعلان کی ضرورت اُس وقت پیش آتی ہے، جب بحث و مناظرہ کا پورا دور گزر چکتا ہے اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سمجھانے کا حق ادا ہو چکا ہے، اب جو لوگ مزید بحثیں اٹھا رہے ہیں، وہ سمجھنے کے لیے نہیں، بلکہ بات کو الجھانے اور طول دینے کے لیے اٹھا رہے ہیں۔ اِس طرح کے موقع پر یہ مناسب ہوتا ہے کہ بات دوٹوک اور فیصلہ کن انداز میں اِس طرح کہہ دی جائے کہ مخاطب اندازہ کر لے کہ متکلم نے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا، اب وہ نہ اپنا مزید وقت ضائع کرنے کے لیے تیار ہے اور نہ اُس کے موقف میں کسی تبدیلی یا لچک کی گنجایش ہے۔"

(تدبر قرآن ۹/ ۶۴۸)

۱۰۔ اصل الفاظ ہیں: 'هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ'۔ اِن میں 'هُوَ' ضمیر شان ہے۔ یہ جملے سے پہلے آتی ہے اور اہل نحو کے نزدیک مجہول ہوتی ہے۔ اردو زبان میں ہم اِس کا مفہوم "بات یہ ہے"، "قصہ یہ ہے"، "حقیقت یہ ہے" اور اِس طرح کے بعض دوسرے جملوں سے ادا کر سکتے ہیں۔ اِس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اگلے جملے کے لیے ایک ایسا مبتدا میسر ہو جائے جو مخاطب کو خبر کے لیے پوری طرح تیار کر دے۔

'اللّٰه' اسم ذات ہے اور لفظ 'اله' پر الف لام داخل کر کے بنا ہے۔ نزول قرآن سے پہلے عرب

---

* ۱۰۹: ۱۔

يُولَدْ ﴿٣﴾ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴿٤﴾

وہ نہ باپ ہے، نہ بیٹا[12] اور نہ اُس کا کوئی ہم سر ہے۔[13] ۱-۴

جاہلیت میں بھی یہ نام اُسی پروردگار کے لیے خاص تھا جو زمین و آسمان اور اُن کے مابین تمام مخلوقات کا خالق ہے۔ اہل عرب مشرک ہونے کے باوجود اپنے دیوی دیوتاؤں میں سے کسی کو بھی اُس کے برابر قرار نہیں دیتے تھے۔ قرآن نے اِسی نام کو اختیار کیا اور تمام صفات حسنیٰ کا موصوف بنایا ہے۔

'اَحَدٌ' کے معنی ہیں جو ہر پہلو سے یگانہ و یکتا اور بے ہمہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اہل لغت نے 'وَاحِد' اور 'اَحَد' میں یہ فرق کیا ہے کہ 'اَحَد' وہ ہے جس کی ذات میں کوئی شریک نہ ہو اور 'وَاحِد' وہ ہے جس کی صفات میں کوئی اُس کا شریک نہ ہو۔ غالباً اِسی وجہ سے لفظ 'اَحَدٌ' اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کے لیے صفت کے طور پر نہیں آیا۔ اِس سے یکتائی و بے ہمگی من کل الوجوہ سمجھی جاتی ہے۔ ہر رشتہ و قرابت سے پاکی و برتری اِس کا لازمہ ہے۔ اِس سے یہ بات بھی نکلی کہ وہ قدیم ہے اور باقی سب حادث و مخلوق۔ ظاہر ہے کہ جو سب سے پہلے خود بخود تھا، وہ ہمیشہ سے تھا، کیونکہ جو کبھی نیست رہا ہو، وہ خود ہرگز ہست نہیں ہو سکتا۔ اِس وجہ سے دو باتیں ماننی ضروری ہوئیں: ایک یہ کہ وہ ہمیشہ سے ہے۔ دوسری یہ کہ اُس کے سوا جو بھی ہیں، وہ سب اُس کی مخلوق ہیں۔ بے ہمگی کے یہ لازمی نتیجے ہیں جن کا انکار عقل کے خلاف ہے۔ پس یہ کہنا کہ وہ 'اَحَدٌ' ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہنا ہے کہ وہ قدیم لم یزل اور خالق کل ہے۔"

(تدبر قرآن ۹/۶۵۰)

۱۱۔ اصل میں لفظ 'صَمَد' استعمال ہوا ہے۔ یہ اُس بڑی چٹان کے لیے آتا ہے جو حملے کے وقت پناہ کا کام دے۔ زبور اور دوسرے صحیفوں میں اللہ تعالیٰ کو اِسی لحاظ سے 'چٹان' اور 'مدد کی چٹان' کہا گیا ہے۔ 'اَحَدٌ' کے ساتھ یہ اُسی طرح بطور بدرقہ لایا گیا ہے، جس طرح 'غَنِيٌّ' کے ساتھ 'حَمِيْد' لایا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ یقیناً سب سے الگ اور ہر لحاظ سے بے ہمہ ہے، مگر اِس کے ساتھ وہی سب کے لیے پناہ کی چٹان اور سب کا ملجا و ماویٰ بھی ہے۔ اُس کے بندے جب اُس کی طرف

رجوع کرتے ہیں تو وہ اُن کی بات سنتا اور اُن کی فریاد کو پہنچتا ہے۔ اُس کے یگانہ و یکتا ہونے سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ وہ کوئی خاموش علۃ العلل یا محرک اول ہے جسے اپنی مخلوقات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۱۲؎ یہ بات لفظ 'اَحَدٌ' کے اندر بھی موجود تھی، لیکن قرآن کے مخاطبین چونکہ خدا کے بیٹے اور بیٹیاں بنائے ہوئے تھے، اِس لیے لفظ کا یہ مضمر اُس نے کھول دیا ہے تاکہ خدا کی یکتائی اور بے ہمگی کی حقیقت اِس طرح بے نقاب کر دی جائے کہ نہ اشتباہ کی گنجایش باقی رہے، نہ کوئی چیز مزلۂ قدم بن سکے۔

۱۳؎ اصل میں لفظ 'کُفُوًا' ہے۔ یہ نظیر، مشابہ، مماثل اور ہم رتبہ کے معنی میں آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ساری کائنات میں کوئی نہیں ہے جو اللہ کے ساتھ کسی بھی لحاظ سے کسی نوعیت کی کوئی مشابہت رکھتا ہو۔ وہ اپنے مقام و مرتبہ اور اپنی صفات، افعال اور اختیارات میں بالکل یکتا اور یگانہ ہے۔

ایمان و عقیدہ کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ یہ سورہ اتمام حجت کے درجے تک اِس مسئلے کو واضح کر دیتی ہے۔ چنانچہ غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِسی بنا پر سورہ کی تفسیر کے آخر میں اِس کے مباحث کا خلاصہ کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اِس سورہ میں جو مثبت و منفی صفات اللہ تعالیٰ کی مذکور ہوئی ہیں، اُن سب کو سامنے رکھ کر اللہ تعالیٰ کا تصور ذہن میں آراستہ کیجیے تو بالاجمال وہ تصور یہ ہوگا کہ وہ ازلی و ابدی ہے۔ جب کچھ نہیں تھا تو وہ تھا اور جب کچھ نہیں ہوگا، تب بھی وہ ہوگا۔ وہ اپنی ذات میں کامل اور بالکل بے نیاز ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں ہے، سب اُس کے محتاج ہیں۔ وہ سب کے لیے سہارا اور سب کے لیے پناہ ہے۔ ہر چیز اُس کے حکم سے وجود میں آتی ہے اور اُسی کے حکم سے فنا ہوتی ہے۔ نہ وہ کسی کا باپ ہے، نہ کسی کا بیٹا، بلکہ سب کا خالق اور سب کا پروردگار ہے۔ کوئی چیز اُس کی ذات یا

اُس کے جوہر سے نہیں ہے، بلکہ ہر چیز اُس کی مخلوق و مربوب ہے اور کوئی اُس کا ہم سر یا اُس کی برابری کا نہیں ہے، بلکہ سب اُس کے بندے، غلام اور محکوم ہیں۔'' (تدبر قرآن ۶۵۲/۹)

کوالالمپور

۱۸/ مارچ ۲۰۱۰ء

خاتمہ

الفلق - الناس

۱۱۳ —— ۱۱۴

الفلق ۱۱۳ ـ الناس ۱۱۴

خاتمۂ باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین کہ آپ اپنی اور اپنے مشن کی حفاظت کے لیے دنیا کی تمام آفتوں سے اپنے پروردگار کی پناہ مانگتے رہیں۔ یہود و قریش اور ذریت ابلیس کے شیاطین جن و انس اگلے مراحل میں پوری قوت کے ساتھ آپ پر حملہ کرنے والے ہیں۔

الفلق - النـاس

۱۱۳ ـــــــ ۱۱۴

الفلق - الناس

یہ دونوں سورتیں خاتمۂ قرآن کی دعا اور ہر لحاظ سے توام ہیں۔ اِسی بنا پر اِنھیں معوذتین کہا جاتا ہے۔ پہلی سورہ میں استدلال اور دوسری میں استرحام کا پہلو نمایاں ہے۔ اِن میں خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں یہ اُس وقت نازل ہوئی ہیں، جب یہود و قریش اور ذریت ابلیس کے سب شیاطین جن و انس آپ کی دعوت کو کامیابی سے ہم کنار ہوتے دیکھ کر آپ پر حملہ آور ہونے کی تیاری کر رہے تھے۔

دونوں سورتوں کا موضوع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تلقین ہے کہ اپنی اور اپنے مشن کی حفاظت کے لیے آپ اِس دنیا کی تمام آفتوں اور تمام مخلوقات کے شر سے اپنے پروردگار کی پناہ مانگیں، اِس لیے کہ تنہا وہی ہے جو اِن سب آفات و شرور سے انسان کو فی الواقع پناہ دے سکتا ہے۔

یہ مضمون، اگر غور کیجیے تو قرآن کے ہر طالب علم کو اُس کی ابتدا میں سورۂ فاتحہ کی طرف متوجہ کرتا ہے، جہاں بندہ توحید کا اقرار کرتا اور اپنے پروردگار کے حضور میں دست بدعا ہوتا ہے کہ وہ اُسے صراط مستقیم کی ہدایت بخشے۔ اِس کے جواب میں پورا قرآن ہے جو اُس کے لیے صراط مستقیم کی وضاحت کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ توحید کی جامع ترین سورہ —— الاخلاص —— تک پہنچ جاتا ہے۔ اِس کے بعد یہ سورتیں ہیں جن میں بندہ صفات الٰہی

کے توسل سے ایک مرتبہ پھر دعا کرتا ہے کہ اُس کا پروردگار اُسے توحید کی راہ پر کھڑے ہر رہ زن سے اپنی پناہ میں رکھے اور اِس راہ کے نشیب و فراز میں ہر قدم پر اُس کی حفاظت فرمائے۔ قرآن کی ابتدا کے ساتھ یہ خاتمہ جو مناسبت رکھتا ہے، وہ کسی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔

سورۃ الفلق

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِ ۙ﴿۱﴾ مِنۡ شَرِّ مَا خَلَقَ ۙ﴿۲﴾ وَمِنۡ

— ۱ —

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

تم دعا کرو[۱]، (اے پیغمبر) کہ میں اُس پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں جو نمودار کرنے والا ہے[۲]، ہر اُس چیز کے شر سے جو اُس نے پیدا کی ہے[۳]، خاص کر اندھیرے کے شر

الفلق ۱۱۳

۱ اصل میں لفظ 'قُلْ' ہے۔ سورہ کے مضمون سے واضح ہے کہ اِس کا ترجمہ یہاں وہی ہونا چاہیے جو ہم نے کیا ہے۔

۲ یعنی اُس پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں جو رات سے صبح، گٹھلی سے کونپل، دانے سے انکھوا، رحم سے بچہ اور پہاڑوں کا سینہ چاک کر کے اُن سے دریا اور چشمے نمودار کرتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کریں، اِس لیے کہ پناہ صرف وہی دے سکتا ہے اور اُس کی توحید پر ایمان کا تقاضا بھی یہی ہے کہ پناہ صرف اُسی سے مانگی جائے۔

۳ لفظ 'شَرّ' یہاں الم، تکلیف اور ضرر کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کو اِس طرح کے کسی شر کے لیے پیدا نہیں کیا ہے۔ جو چیزیں پیدا کی ہیں، اصلاً مقصد خیر سے پیدا کی ہیں۔ اپنی مخلوقات کے اندر جو صلاحیتیں، البتہ اُس نے رکھی ہیں، اُن سے بعض اوقات یہ شرور پیدا ہو جاتے ہیں۔ اِن سے پناہ حاصل کرنے کے لیے موزوں ترین اور موثر ترین استعاذہ اُسی سے ہو سکتا ہے جو مخلوقات کا خالق ہے، اِس لیے کہ کوئی دوسرا اُن کے شر سے اُسی صورت میں پناہ دے سکتا ہے، جب وہ اُن کے پیدا کرنے والے سے زیادہ طاقت ور ہو۔ یہ بات، ظاہر ہے کہ کوئی عاقل تسلیم نہیں

شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ﴿۳﴾ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ﴿۴﴾ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ﴿۵﴾

سے، جب وہ چھا جائے[۴] اور گرہوں پر پھونکنے والوں کے شر سے[۵] اور ہر حاسد کے شر

کر سکتا، اِس وجہ سے نری حماقت ہوگی، اگر کوئی شخص خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے شر سے کسی غیر خدا کی پناہ تلاش کرے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...یہ ایک ہی کلمہ شرک کے بہت سے دروازوں کے بند کر دینے کے لیے کافی ہے۔ اِس سے ثنویت اور خیر و شر کی الگ الگ خدائی کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ مشرک قومیں ہر آفت کو بجاے خود ایک مستقل نافع وضار وجود سمجھ کر اُس کی دہائی پکارنی شروع کر دیتی ہیں، حالاں کہ کوئی آفت اپنا خود کوئی مستقل وجود نہیں رکھتی، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں ہی کے ظلال و آثار میں سے ہیں جو اللہ ہی کے اذن سے وجود میں آتی ہیں، اُسی کے حکم سے اثر انداز ہوتی ہیں اور تنہا اُسی کی مدد سے اُن کے شر سے نجات ملتی ہے۔ اِس وجہ سے حقیقی پناہ اور ماویٰ و ملجا وہی ہے۔"

(تدبر قرآن ۹/۶۶۱)

۴؎ اس لیے کہ چور، قاتل، دشمن اور ہوام و حشرات، سب اندھیرے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اِس سے مزید وضاحت ہوئی کہ دنیا میں شر کا وجود مستقل بالذات نہیں ہے کہ خیر و شر کے الگ الگ خالق مانے جائیں اور دونوں کی دہائی دی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں پیدا کی ہیں، اُنھی کے ظلال و آثار ہیں جو دوسروں کے لیے الم، تکلیف اور نقصان کا باعث بن جاتے ہیں، اِس وجہ سے اِن سے بچنے کے لیے کسی دوسرے کی نہیں، بلکہ اللہ ہی کی پناہ ڈھونڈنی چاہیے۔

۵؎ اصل الفاظ ہیں: 'اَلنَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ'۔ اِس کا موصوف ہمارے نزدیک لفظ 'نفوس' ہے۔ یہ جادو کے لیے ایک طرح کا استعارہ ہے، کیونکہ جادوگر عموماً کسی ڈور یا تاگے میں گرہ دیتے اور اُس پر پھونکتے جاتے ہیں۔ اِس طرح کے لوگ یہود میں بھی بہت رہے ہیں اور عرب کے ساحروں اور کاہنوں میں بھی۔ آیت سے واضح ہے کہ اِن کے علوم بھی اپنی کچھ حقیقت ضرور رکھتے ہیں۔ چنانچہ

سے، جب وہ حسد کرے[6]۔ ۱-۵

ہدایت کی گئی ہے کہ اِن کے شر سے خدا کی پناہ مانگی جائے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ لوگ اپنے ذہن جس طرح کے بناتے ہیں، اُن کے ساتھ وہ اُسی طرح کا معاملہ کرتا ہے۔ ایک شخص اگر اپنا تعلق اپنے رب سے استوار رکھتا ہے، لاطائل اوہام سے اپنے آپ کو بچاتا ہے، خدا کی یاد سے اپنے دل کو آباد رکھتا ہے، اگر کوئی افتاد پیش آتی ہے تو اُس میں رہنمائی اور استعانت کے لیے اپنے رب ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص پر شیطان کو غلبہ پانے نہیں دیتا۔ اگر اتفاق سے اُس کو کوئی چھوت لگتی بھی ہے تو اللہ کی طرف توجہ اُس کے شر سے اُس کو بچا لیتی ہے۔

اِس کے برعکس، اگر کوئی شخص بالکل منفعل مزاج اور وہمی ہوتا ہے، عقل و بصیرت سے کام لینے کے بجائے وساوس میں مبتلا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ پر مضبوط بھروسا رکھنے کے بجائے اپنے دل کے دروازے شبہات و شکوک کے لیے کھول دیتا ہے تو اِس طرح کا آدمی بالعموم کسی شیطان جن و انس کے ہتھے چڑھ جاتا ہے، پھر وہ اُس کو ہر وادی میں گردش کراتے ہیں۔ اِس گردش سے اپنے کو محفوظ رکھنے کا واحد طریقہ اِس سورہ نے یہی بتایا ہے کہ آدمی اپنے کو ہمیشہ اپنے رب کی پناہ میں رکھے۔ جب کبھی دل میں کوئی دغدغہ محسوس کرے، فوراً اُس کی امان طلب کرے جس کا بہترین ذریعہ یہ دونوں سورتیں ـــ معوذتین ـــ ہیں۔'' (تدبرقرآن ۹/۶۶۳)

[6] یعنی جب حاسد حسد کے جوش میں اپنے ترکش کا ہر تیر آزمانے کے لیے تیار ہو جائے۔ لفظ 'حَاسِد' اگرچہ عام ہے اور اِس کو عام ہی رکھنا چاہیے، لیکن قرآن کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس میں خاص اشارہ شیطان کی طرف ہے جس نے پورے زور اور ولولے کے ساتھ اعلان کر رکھا ہے کہ وہ لوگوں کو خدا کی توحید سے برگشتہ کر کے رہے گا۔ چنانچہ دعوت حق اور اُس کے داعیوں کو خاص طور پر متنبہ رہنا چاہیے، اِس لیے کہ اُس کا اصل ہدف وہی ہوتے ہیں اور اُنھیں نقصان پہنچانے کے لیے وہ ہر اقدام کر گزرتا ہے۔ اگلی سورہ میں یہ چیز بالکل نمایاں ہو جائے گی۔

سورۃ الناس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ﴿۱﴾ مَلِکِ النَّاسِ ۙ﴿۲﴾ اِلٰہِ النَّاسِ ۙ﴿۳﴾ مِنۡ شَرِّ الۡوَسۡوَاسِ ۙ۵ الۡخَنَّاسِ ۪ۙ﴿۴﴾ الَّذِیۡ یُوَسۡوِسُ فِیۡ

—— ۲ ——

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

تم دعا کرو، (اے پیغمبر) کہ میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب، انسانوں کے بادشاہ، انسانوں کے معبود کی[۷] اُس کے شر سے جو وسوسہ ڈالتا[۸]، پھر الگ ہو کر بیٹھ جاتا

۷؎ یہ تینوں صفات لازم و ملزوم ہیں، اِس لیے کہ جو لوگوں کا پروردگار ہے، وہی حق دار ہے کہ اُن کا بادشاہ ہو اور وہی حق دار ہے کہ اُسے معبود حقیقی مانا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اُس خدا کی پناہ مانگو جو انسانوں کا رب، بادشاہ اور معبود ہونے کی حیثیت سے اُن پر پورا اقتدار رکھتا ہے، جو اِس کا اہل ہے کہ بڑے سے بڑے دشمن کے مقابلے میں اُن کو پناہ دے سکے اور جس کے سوا کوئی دوسرا در حقیقت ہے ہی نہیں کہ کوئی اُس کی پناہ مانگے۔

۸؎ الفاظ میں اگرچہ تصریح نہیں ہے، مگر یہ اور اِس سے آگے کی صفات بتا رہی ہیں کہ مراد شیطان ہے۔ یہ اُس کی خاص تکنیک ہے جس سے وہ لوگوں کو فریب دیتا اور اپنے دام میں پھنساتا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے پاس واحد ہتھیار یہی ہے جس سے وہ اپنے مقاصد پورے کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کو یہ اختیار ہرگز نہیں دیا کہ زبردستی لوگوں کو گم راہ کر ڈالے۔ وہ پر فریب وعدے کرتا ہے، بری سے بری چیز کو تزیین کر کے پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے، ناصح مشفق بن کر ترغیب و ترہیب کے حربوں سے کام لیتا ہے، مگر اِس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتا۔ اللہ کے جو

صُدُوۡرِ النَّاسِ ۙ﴿۵﴾ مِنَ الۡجِنَّۃِ وَ النَّاسِ ﴿۶﴾

ہے[9]، جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے[10]، جنوں اور انسانوں میں سے[11]۔ ۱-۶

بندے اُس کے وسوسوں سے متاثر نہ ہوں، قرآن نے اطمینان دلایا ہے کہ اُس کے لیے ممکن نہیں ہے کہ اُن کا کچھ بگاڑ سکے۔

۹ وسوسہ اندازی کرنے والے جن ہوں یا انسان، اُن کی عام نفسیات یہی ہے کہ جب کوئی شخص اُن کے فریب میں آ جاتا ہے تو نتائج کی ذمہ داری سے اپنے آپ کو بالکل بری قرار دے کر الگ ہو جاتے ہیں۔ انسانوں میں اِس طرح کے شیاطین ہر وقت دیکھ لیے جا سکتے ہیں۔ قرآن کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوں کے شیاطین کا معاملہ بھی یہی ہے۔ لفظ 'خَنَّاس' آیت میں اِسی کردار کی تصویر پیش کر رہا ہے تاکہ لوگ شیطان کی غداری اور بے وفائی کو بھی پیش نظر رکھیں۔ چنانچہ دوسرے مقامات میں فرمایا ہے کہ وہ ہمیشہ کا 'خَذُوۡل' (اپنے مریدوں کو دغا دینے والا) ہے، اُس کے تمام وعدے بالکل فریب ہیں، آخرت میں بھی وہ اُسی طرح بری الذمہ ہو کر الگ ہو جائے گا، جس طرح دنیا میں ہو جاتا ہے۔

۱۰ اصل میں 'صُدُوۡرِ النَّاسِ' کے الفاظ آئے ہیں، لیکن مراد وہی دل ہیں جو سینوں میں دھڑکتے ہیں۔

۱۱ یہ اُس کی ذات برادری کا پتا دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شیطان کوئی مستقل مخلوق نہیں جسے اللہ تعالیٰ نے اِسی مقصد سے پیدا کیا ہے کہ وہ لوگوں کو گم راہ کرے، بلکہ جنوں اور انسانوں میں سے جو یہ پیشہ اختیار کر لیں، وہی شیطان بن جاتے ہیں۔

کوالالمپور

۱۹/ مارچ ۲۰۱۰ء

خاتمہ

اِس ترجمہ وتفسیر پر کام کی ابتدا اگرچہ ۱۹۸۵ء میں کسی وقت ہو گئی تھی، لیکن ''میزان'' کی تصنیف کے دوران میں یہ اتنا ہی کیا جاتا تھا، جتنا ماہنامہ ''اشراق'' میں اِس کی اشاعت کے لیے ضروری ہوتا تھا۔ اِس پر باقاعدہ طریقے سے اور پوری یک سوئی کے ساتھ کام اُس وقت شروع ہوا، جب اپریل ۲۰۰۷ء میں ''میزان'' مکمل ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر کیا جائے، کم ہے کہ اُس کی عنایت سے ۱۵/ستمبر ۲۰۱۴ء کی رات ۲/بجے ''البیان'' کے نام سے ترجمہ و تفسیر کا یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔ اِس کے آخری دو باب چونکہ پہلے لکھے جا چکے تھے، اِس لیے کام کا خاتمہ سورۂ حجرات (۴۹) پر ہوا ہے جو قرآن کے پانچویں باب کی آخری سورہ ہے۔

قرآن کا انداز کلام یہ ہے کہ وہ بات کی تعلیل کرتا ہے، لیکن اُس پر دلالت کے لیے بارہا کوئی لفظ استعمال نہیں کرتا؛ تمثیل پیش کرتا ہے، لیکن تقابل کے اصول پر اُس کے بعض اجزا حذف کر دیتا ہے، اُنھیں لفظوں میں بیان نہیں کرتا؛ ایک آسمانی خطیب کی طرح کبھی ایک اور کبھی دوسرے گروہ کو مخاطب کرتا ہے، لیکن بارہا شان کلام کے سوا کسی چیز سے اُس پر متنبہ نہیں کرتا؛ پے در پے جوابات دیتا چلا جاتا ہے، لیکن جن سوالات، اعتراضات اور شبہات کا جواب دیتا ہے، اُن کو نقل نہیں کرتا یا کرتا بھی ہے تو نہایت اجمال کے ساتھ، جسے جواب ہی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اصل، فرع، اعتراض، اتمام، تقابل، تشابہ، استدراک اور عود علی البدء کے طریقے پر ایک کے بعد دوسری بات کہتا چلا جاتا ہے، لیکن آگے اور پیچھے سے کلام کے یہ روابط الفاظ

میں واضح نہیں کرتا۔ یہ اُسی انداز کلام کا منتہاے کمال ہے جو عہد عتیق کے خطبا اختیار کرتے تھے۔ اہل عرب اِس کے ذوق آشنا تھے اور خوب سمجھتے تھے کہ اِس سے کلام کی تاثیر اور بلاغت کس انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ برصغیر کے جلیل القدر عالم اور محقق امام حمید الدین فراہی نے علمی دنیا کو جس نظم سے متعارف کرایا ہے، وہ اِسی انداز کلام کو سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے کلام کے یہ مضمرات اپنی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں پوری وضاحت کے ساتھ کھول دیے ہیں، لیکن ترجمہ اُسی طریقے سے کیا ہے، جس طریقے سے قرآن کے مترجمین بالعموم کرتے رہے ہیں۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے میرا احساس تھا کہ الفاظ کے حسن اور جملوں کے غنا اور موسیقی اور دروبست کے جمال و کمال کو تو ہم کسی بھی کلام کے ترجمے میں منتقل نہیں کر سکتے، مگر قرآن کا ترجمہ کرتے وقت جب اِن روابط کو بھی چھوڑ دیتے ہیں تو اُس کے قاری کو مدعا کے ایک بڑے حصے سے، بلکہ بعض اوقات اصل مدعا ہی سے محروم کر دیتے ہیں۔

میں نے یہ ترجمہ اِسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کیا ہے اور کلام کے یہ روابط ترجمے کے اندر ہی اِس طرح کھول دیے ہیں کہ الفاظ اور جملوں کے لازمی متعلقات پر قوسین بھی نہیں لگائے ہیں، اِس لیے کہ وہ درحقیقت اُنھی کے مقدرات اور مدلولات ہیں جو عربیت کے اسلوب پر الفاظ میں بیان نہیں کیے گئے۔ اِس سے توقع ہے کہ قارئین قرآن کے مدعا اور نظم اور حسن بیان کے وہ پہلو اِس ترجمے میں کسی حد تک دیکھ سکیں گے جو بالعموم نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ وہ دیکھیں گے کہ اِن روابط کے اظہار سے ہر سورت اپنے موضوع کے لحاظ سے کس طرح ایک حسین وحدت میں ڈھل گئی ہے، تاویل کے اختلافات کی گنجایش کس طرح قریب قریب ختم ہو گئی ہے، قرآن کی ترتیب کا حسن کس طرح نمایاں ہوا ہے اور آیتوں کا مدعا کس وضاحت، تعین اور قطعیت کے ساتھ سامنے آیا اور اُن کی بلاغت کس شان کے ساتھ بے نقاب ہوئی ہے۔

پھر یہی نہیں، اِسی کا نتیجہ ہے کہ مجھے اِس ترجمے پر کسی جگہ طول طویل حواشی لکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ میں نے ہر جگہ نہایت مختصر طریقے پر صرف اُن چیزوں کی طرف توجہ دلا دی ہے جن

کی طرف قرآن کے ہر قاری کو لازماً متوجہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ یہ درحقیقت ترجمۂ قرآن ہے جس میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، شرح و وضاحت کی کوئی چیز اِس کتاب کے قاری اور قرآن کے درمیان حائل نہ ہونے پائے اور وہ محسوس کرے کہ وہ قرآن کی شرح و وضاحت میں لکھی گئی کوئی کتاب نہیں، بلکہ اِن حواشی کی مدد سے براہ راست قرآن کا مطالعہ کر رہا ہے۔

اپنے اِس کام کے بارے میں میں یہاں بھی وہی بات کہوں گا جو اِس سے پہلے ''میزان'' کے خاتمہ میں لکھ چکا ہوں کہ اِس میں جو رائے بھی قائم کی گئی ہے، ماضی و حال کی کسی شخصیت یا شخصیات کے اعتماد پر نہیں، بلکہ زبان و بیان اور فہم کلام کے اُن فطری اصولوں کی بنیاد پر قائم کی گئی ہے جو کلام کے مدعا تک پہنچنے کے لیے مسلمات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ متعدد مقامات پر میرا نقطۂ نظر میرے جلیل القدر استاذ امام امین احسن اصلاحی سے بھی مختلف ہو گیا ہے۔ تاہم یہ ایک انسان کا کام ہے جو غلطیوں سے مبرا نہیں ہو سکتا۔ میں اِسے بار بار دیکھتا اور اِس کی اصلاح کرتا رہا ہوں۔ پچھلے چند برسوں میں عزیزم رضوان اللہ نے بھی اِسے دو مرتبہ نہایت دقت نظر کے ساتھ پڑھا اور مفید اصلاحات تجویز کی ہیں جن میں سے زیادہ تر کو میں نے قبول کر لیا ہے۔ اِس کے بعد بھی ہر وقت اصلاح و ترمیم کی گنجایش ہے اور جب تک زندہ ہوں، اگر خدا نے چاہا تو کرتا رہوں گا۔ میں اِس بات سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ اُس کی کتاب کے معاملے میں جان بوجھ کر کوئی غلطی کروں یا کسی غلطی پر جما رہوں۔

پچھلے پانچ برس سے غریب الدیار ہوں اور اُن سب مراحل سے گزر رہا ہوں جن سے کوئی شخص اپنے وطن سے ہجرت کے بعد گزرتا ہے۔ تاہم اللہ کا شکر ہے کہ برادرم شیخ افضال احمد صاحب نے مجھے معاشی جدوجہد سے حسب سابق بے نیاز کیے رکھا اور میرے احباب و متعلقین، خاص طور پر میری اہلیہ کا تعاون مجھے ابتلا کے اِس دور میں بھی اُسی طرح حاصل رہا ہے، جس طرح ''میزان'' کی تصنیف کے دوران میں حاصل تھا۔ میں اِن سب کے نام ''میزان'' کے خاتمہ میں لکھ چکا ہوں۔ اِن میں ایک نمایاں اضافہ میر ابراہیم رحمٰن کا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا

ہے کہ اِس ترجمہ وتفسیر سے اگر اُس کی کتاب کی کوئی خدمت ہوئی ہے تو وہ اُسے قبول فرمائے اور میری اور میرے اِن احباب و متعلقین کی مغفرت کا ذریعہ بنا دے۔

اِس کتاب کی طباعت کا اہتمام ''المورد'' کے شعبۂ نشر و اشاعت میں عزیزم شاہد رضا اور اُن کا عملہ کر رہا ہے۔ مجھے یہاں اُن کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے۔ وہ یہ کام جس محنت اور ذمہ داری کے ساتھ کر رہے ہیں، وہ ہر لحاظ سے قابل تحسین ہے۔

خدایا، اِس کتاب کی تکمیل کے ساتھ میں اُس عمر کو پہنچ گیا ہوں، جب دنیا پیچھے رہ جاتی اور آخرت قریب ہوتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اگر آج بلا لیا جاؤں تو تیرے حضور میں پیش کرنے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ تاہم التجا کر رہا ہوں کہ اِس فقیر بے مایہ اور عاجز مطلق کے گناہوں اور غلطیوں اور کوتاہیوں کو معاف فرما دے، اِس لیے کہ تو قادر مطلق ہے اور تیرا کرم بے نہایت ہے:

عصیان ما و رحمت پروردگار ما

ایں را نہایتے ست نہ آں را نہایتے

لاہور ——— جاوید

اتوار ۲۸/ ستمبر ۲۰۱۴ء

بمطابق ۲/ ذوالحجہ ۱۴۳۵ھ